دُنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

سب رنگ

ڈائجسٹ

فروری 2010ء

MASROOR

03336744167

عشق کا شین

علیم الحق حقی کی یادگار تخلیق

اندرونی صفحات میں ملاحظہ کیجیے

14 اپنا اپنا رنگ — سید علی

مشورے اور تبصرے، شکایتیں اور حکایتیں، سب رنگ کے رنگوں میں شامل قارئین کے رنگ

18 ساتواں پتھر — ہیرولڈ روبنس/علیم شام

زندگی گزارنے والوں کے لیے ایک زندہ انسان کی رُوداد۔ عالمی ادب سے منتخب شاہ کار ناول

61 رکھشا بندھن — عشرت فاطمہ عظمی

بہن کی خوشیوں کے حقیقی محافظ بھائی کا احوال اپنی خوشیاں اُس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھیں

68 شاہ نظر — یاور

ماضی کا خزانہ... گم گشتہ اور فراموش کردہ، اَن کہے اور اَن سُنے، سنسنی خیز اور سحر انگیز واقعات

82 بازی گر — بابر زماں خاں

سب رنگ کا مقبول اور پسندیدہ سلسلہ اُمنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان

117 فتنہ بدوش — ہادی

لمبے سنہرے بالوں، جھیل سی گہری آنکھوں اور فریبی مسکراہٹ کا شکار ایک شخص کی بے چارگی

127 ڈرائنگ روم — محمد

ایک مسافر کے بکیں ہونے کا فسانہ سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر ہیں، پہلی منتخب کہانی

133 مرن بیل — ابن حسن

ایک تناور درخت کے سہارے پھلتی پھولتی نازک سی بیل کا احوال اردو ادب کا عطر، دوسری کہانی

137 من کی من میں — راجن

رجائیت پسند بیوی کے قنوطی شوہر کا قصہ، وہ تحریریں جو شاذ و نادر لکھی جاتی ہیں، تیسری منتخب کہانی

مدیرِ اعلیٰ: محمد راشد ملک
مدیر: شکیل عدنان

14 بدصورت مخلوق — طاہر محمود

اپنے حسن پر نازاں ایک مخلوق کی خود پسندی کا عالم کائنات میں جیسے اُن کے سوا کچھ رکھا ہی نہ تھا

15 پریم کہانی — یعقوب جمیل

اس کہانی کا مصنف، کہانی کے کچھ کرداروں سے ملنا چاہتا تھا... وہ مل بھی لیا اور اُسے پتا بھی نہ چلا!

15 جینیئس — جان ونڈہیم/مامون الحق

والدین سے بچوں کو ملنے والے موروثی خواص پر تحقیق کرنے والے ایک ماہر کی کامیابی... اور ناکامی!

16 عشق کا شین — علیم الحق حقی

اُن تحریروں میں سے ایک، جو کبھی کبھار لکھی جاتی ہیں... اور جن کا بے تابی سے انتظار کیا جاتا ہے

224 زنانہ — اختر شہاب

ایک ناتواں مرد کے پچھتاوے کا ماجرا، ایک واقعے کے بعد اُسے اپنے مردانے پر شک ہونے لگا

229 بڑبولا

ایڈونچر کے دل دادہ ایک بڑبولے اور اُس کے حقیقت شناس دوست کے شوق مہم جوئی کا دلچسپ حال

247 گنجی چڑیا — فاروق

ایک غریب الوطن کی کیفیات، ایک چڑیا اُس کے لیے رہنما تھی، چڑیا... جو اپنا وطن کبھی نہیں چھوڑتی!

256 گناہِ محبت — عافیہ

آخری صفحات کا توشۂ خاص۔ ایک سیاہ کار کا فسانہ۔ کوئی اُسے روشن کرنے کی کوشش تو کرتا!

000 کنارے — ادارہ

لطائف اور خاکے، اقتباسات اور اقوال، یارانِ سب رنگ کو شاد اور ان سب رنگ کا تحفہ

اسی ادارے کے تحت ہفت روزہ "سمندر پار" دبئی، روزنامہ "الشرق" کراچی، راول پنڈی/اسلام آباد اور دبئی سے بہ یک وقت شائع ہوتے ہیں

نزی وائس پبلی کیشنز کے زیر اہتمام "سب رنگ" کے علاوہ خواتین کا پسندیدہ ماہنامہ [illegible] "مرد و کہانی" "فیملی میگزین" [illegible] (انگریزی) شائع کیے جاتے ہیں

ادارۂ تحریر: کاشف حسین عامر ☆ سرورق: ذاکر ☆ مصور: ذوالفقار ذکی ☆ اشتہارات: عمر صدیقی ☆ سرکولیشن: محمد اقبال
☆ ڈیزائن: اسد علی [illegible] ☆ قانونی مشیر: [illegible] ☆ ای میل: sabrang736@gmail.com پی او بکس نمبر 12353
زرسالانہ: [illegible] ایشیا، یورپ، افریقہ، مڈل ایسٹ =/2900 روپے یا مساوی زرمبادلہ

پبلشر [illegible] 67-A [illegible] کراچی
جلد نمبر: 41 ☆ شمارہ نمبر: 161 ☆ فروری 2010 ☆ [illegible] ☆ فون [illegible] ☆ اشتہارات: [illegible] ☆ فیکس: [illegible]
زرسالانہ: [illegible] 3400 روپے یا مساوی زرمبادلہ

اپنا اپنا رنگ

مُدیرِ اعلیٰ

عزیز قارئین!
السلام علیکم۔

یقین ہے، مزاج بہ خیر ہوں گے۔ خاص شمارے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ محبتوں، دعاؤں اور حمایتوں کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو وہ وقت دور نہیں جب ان شاء اللہ سب رنگ اپنا ہی عبور کیا ہوا وہ سنگ میل ایک بار پھر عبور کرے گا جس کی گرد کو بھی کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکا۔ مسلسل محنت، لگن اور صادق طلب کے ساتھ اللہ کی رضا بھی شامل ہو جائے تو کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا۔ پھر بدخواہوں کی بدخواہیاں کچھ بگاڑ پاتی ہیں اور نہ بلیک میلروں کی شاطرانہ چالیں۔ کسی کی بدطینی اور بدفطرتی، دوسرے کو اتنا نقصان نہیں پہنچا پاتی جتنا کہ خود بدطینت اور بدفطرت شخص کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور وہ خود فریبی کا مارا، اس وبال کو اپنے مقدر... یا آزمائش پر محمول کرتے ہوئے ہر ایک کو، اپنے دکھ بھرے فسانے سُنا سُنا کے، اپنے پھپھولے پھوڑتا اور حقائق سے آنکھیں چُراتا رہتا ہے۔ بہ ہر حال، خود کردہ را علاجے نیست! کفرانِ نعمت کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر، ہم شکر کرنے کی توفیق عطا ہونے کی دعا کرتے ہیں اور آپ کے خطوط کی روشنی میں گذشتہ شمارے کا جائزہ لیتے ہیں۔

ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی کا عالم شوق، راولپنڈی کینٹ سے۔ ''انتہائی محترم راشد صاحب، السلام علیکم۔ دیدار محبوب کو ترستے رہے، پورا دسمبر خزاں لگا اور کہتے رہے۔

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے (سب رنگ)
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے (سب رنگ)

دسمبر کے بعد جنوری 2010ء میں چند روز بھی صبر کا دامن نہ تھام سکے مگر خوش ہوئے کہ

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

اور واقعی دل کی گہرائیوں میں ''سب رنگ'' آ کر اتر گیا۔ قارئین جو دل و جان سے ''سب رنگ'' کو چاہتے ہیں اور سالنامہ آنے پر گنگنا رہے ہیں

تیرے دم سے ہے گلستاں میں بہاروں کو قرار
تیرے لوٹ آنے کی ہم کیوں نہ تمنا کرتے

اور کیوں نہ ہو کہ آشفتہ سروں نے کئی دہائیوں تک لڑکپن سے جوانی تک دے دی اور بہت سے جوانی سے بڑھاپے میں بھی اس حسینۂ بے مثال کے لیے راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں۔

''سب رنگ'' کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

اور پھر نیا خون رگوں میں کیا گردش کرنے لگا کہ نئی نویلی دلہن کی طرح حیران و پریشان کر کے دشمنوں کو غموں کے ساتھ رکھ دیا۔ ویسے تو اکیلا ''سب رنگ'' کہہ رہا ہے۔

میں اکیلی ہی چلی تھی جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور آخر میں عرض خدمت کروں گا کہ ہمارا اول وار کیسے چڑھتے سورج کے مانند چھا گیا۔

ڈوبتے چاند کے پہلے آنسو کلی کلی پر شبنم تھے
چڑھتا سورج دیکھتے دیکھتے ہر گوشے میں پھیل گیا

کتنی ہی دیر، کئی لمحے تو ٹائٹل دیکھتے گزرے اور پھر فہرست تو ایسی لگی جیسے بہار میں بارش کا پہلا قطرہ کہ دل میں اتر اتر گئی۔ پھر عمر صدیقی اور ذیشان حیدر کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے فہرست کے بعد ''رنگ اپنا اپنا'' پر جا ٹھہرے۔ ہاں، مرتضیٰ علی کا تبصرہ دو دفعہ شائع ہونے سے ہم اضافی تبصرے سے محروم رہ گئے۔ خیر، ممتاز علی کو پڑھتے ہوئے ناظم بخاری کے موتی چننے لگے۔ بھئی، صحیح اندازہ ہے آپ کا۔ وہاں بھی لکھتا ہوں مگر دوسرے انداز سے۔ باقی آپ بھی موتی بکھیرتے ہیں، پسندیدگی کے لیے تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ مرتضیٰ علی آپ کی انوکھی کہانی کا انتظار رہے گا۔ رانا عبدالمجید کی جاسوسی و سسپنس والی تجویز کی میں بھی بھرپور تائید کرتا ہوں۔ منظوم تبصرہ بے حد اچھا تھا۔ دانا بشیر احمد کی دعائیں خوب تھیں اور ''عشق کا شین'' کا تو تجزیہ ایسے کر ڈالا جیسے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہوں۔ واہ صاحب واہ۔ گہرائی لیے ہوا تبصرہ خوب تھا۔ کہانیوں میں کس کس کی تعریف کروں۔ ہاں رنجنی پٹیل کا ''دکھ نامہ'' بھی پڑھا۔ بجا کہا ہے اور اس دفعہ کی کہانی تو دم بخود کر گئی۔ یہ انداز تحریر تو کئی اچھے قد آور ادیبوں کا بھی شیوہ رہا ہے پھر اعتراض کیوں؟ یعقوب جمیل اور احمد صغیر صدیقی کی کہانیاں بھی میگزین کے مزاج کے مطابق ہوتی ہیں۔ ''سب رنگ'' میں بہترین سے بہترین کہانی لاتے ہیں۔ ایک اور دعا کا جو بھولی بسری کہانی کی شکل میں ہوا۔ بے حد دلچسپ اور سبق آموز۔ واہ حسنا بیگم کی ''چلتی پھرتی چھاؤں'' تو بڑی ہی دل گداز داستان ثابت ہوئی۔ خوانِ ہفت رنگ تو ہیرے تھے۔ ''ساتواں پتھر'' مسلسل قاری کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے اور کہانی کا [illegible] کر بول رہا ہے۔ کس کس کہانی کی تعریف کروں۔ اور پھر آخری صفحات واقعی خاص شمارہ کا جھومر ثابت ہوئے کہ امرتا پریتم پوری طرح ''پنجر'' لے کر [illegible] ہوئی ہیں۔ آخر میں ایک بڑے روزنامہ کے مشہور کالم نگار 15 نومبر 09ء کے شمارے میں ادیبوں کی کمی کی وجہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایک ناول [illegible] ناول نہ لکھا گیا جو کسی ایک دور کی نسل کے المیے کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھتا ہو یا پھر مجھے 'جانگلوس' اور 'بازی گر' میں وہ جھلکیاں نظر آتی ہیں [illegible] ایک بڑا ادیب ثابت کرتی ہیں... ایسا ادیب جس کی تحریروں سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ ایسی تحریریں جن کا انتظار کیا جاتا ہے۔'' یہ سب رنگ کے [illegible] ہی فخر اور اعزاز کی بات ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ کر دوں۔ دریائے شوق کو ہر لگانے پر آمادہ مگر خط کی طوالت کہیں آپ کو ناگوار نہ گزرے اور [illegible] سودا کے الفاظ میں کہنے لگیں۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

ہاں منجھلے بیٹے کو شادی خانہ آبادی کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ دعاؤں سے قارئین ضرور نوازیے۔ تمام احباب مجلس کو آداب۔'' بھئی مقبول صاحب! آپ کے خطوط آپ کی مقبولیت میں اضافے کا سبب بن جائیں گے... اور آپ کے خطوط کے سحر سے نکلیں گے تو آپ کو مبارک باد اور دعائیں دیں گے۔ دوسرا ظلم یہ ہو گا کہ سراپا ناز 'عشوہ طراز سب رنگ' اور مغرور... اور نخریلا ہو جائے گا۔ جب آپ سے ناز پرور ہوں گے' ناز برداریاں کریں گے تو ایسا تو ہونا ہی ہے۔ بہ ہر حال اللہ آپ کو خوش رکھے آپ یونہی سب رنگ کے ناز اٹھاتے رہیے۔

ناظم بخاری کا مراسلہ، لودھراں سے، ''بے حد محترم مدیر صاحب، السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟ امید ہے کہ بفضل خدا خیریت ہوں گے۔ چند دنوں بعد اپنی ایک بالکل تازہ تحریر 'عجیب محبت' کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں۔ سر! یہ کوئی خاص کہانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا آئیڈیا کوئی خاص تھا۔ دراصل میں لکھنا کوئی اور تحریر چاہتا تھا اور تحریر یہ کہانی ہو گئی۔ خیر... اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ یہ 'سب رنگ' کے کڑے معیار و مزاج پر تو پوری نہیں اترے گی۔ مگر شاید... 'سب رنگ' میں کہیں نہ کہیں اس کے لیے گنجائش نکل آئے۔ پلیز، آپ اپنے بے حد قیمتی وقت میں سے کچھ وقت اس تحریر کے لیے بھی نکال کر اسے پڑھ لیجیے۔ اگر یہ تحریر قابل اشاعت نہ بھی ٹھہرے تو بھی پلیز اپنے قیمتی مشوروں سے ضرور نوازیے گا۔ میں منتظر رہوں گا۔ مزید کیا تحریر کروں؟ صرف اتنا ہی کہ بہت سی دعائیں آپ کے لیے، جناب راشد ملک صاحب کے لیے اور اس ادارے کے لیے کہ خدا ہمیشہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور مزید ترقی و خوش حالی عطا کرے آمین۔''

سید شاہد علی شاہ، لاہور سے رقم طراز ہیں۔ ''مدیر محترم ''سب رنگ'' ڈائجسٹ، آداب عرض۔ دو ماہی شمارے کے سرورق پر دو گلاب جلوہ گر ہیں۔ دونوں کی دل فریبی مسلم، دونوں کی نازکی مسلم، پنکھڑیوں کی تاثیر البتہ جدا جدا ہو گی۔ ایک کی تپش آتشیں، دوسرے کی مہک آفریں، ذاکر صاحب کے لیے... نعرۂ تحسین، ذکر ذاکر۔ رنگوں کی بھول بھلیاں میں پہلے ہی قدم پر دو بخاری بھائی محوِ کلام ملے۔ ناظم بخاری صاحب تو ہم مراسلہ نگاروں کے بھی ناظم اعلیٰ ہیں کہ سب کے خطوط کا حساب کتاب رکھتے اور حسب مراتب داد و تحسین سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔ ناظم بھائی! آپ کی ذرہ نوازی ہے، ہم جو الٹا سیدھا لکھ سکتے ہیں، لکھ دیتے ہیں لیکن آپ کا اشارہ باقاعدہ خامہ فرسائی کی طرف ہے تو وہ اپنے بس کی بات نہیں۔ یوں تو شاید ہر قاری کے اندر ہی ایک لکھاری بھی کہیں موجود ہوتا ہے لیکن اظہار اور بیان کی قوت کسی میں کم اور کسی میں بالکل نہیں ہوتی۔ اور مستند لکھاری ہونے کے لیے چند شرائط لازم ہیں، ہم ان سے متصف نہیں۔ یوں بھی لکھاری بننے سے قاری ہونا سہل ہے۔ قلم کار اپنے دنوں کا سکون اور راتوں کی نیند برباد کر کے تخیلات کے پیرائے ترتیب دیتا ہے، انھیں کہانی کی صورت یکجا کرتا ہے۔ پھر ان کی اشاعت کے لیے جتن کرتا ہے اور قاری چند گھنٹے مطالعے کے بعد لکھاری کی دنوں، مہینوں، بسا اوقات برسوں کی محنت پر خطِ تنسیخ پھیر دیتا ہے۔ سو قاری ہونے میں زیادہ مزہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ مراسلہ لکھیے اور شائع ہونے پر بغلیں بجائیے۔ اپنے برادر سید مرتضیٰ علی واسطی کو ہی لیجیے۔ ابھی صرف قاری ہیں، باقاعدہ لکھاری نہیں بنے مگر ایک ہی مہینے پر دو دو بار چھپ رہے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں وہ بڑے لکھاری بنیں اور یہ رنجنی پٹیل صاحبہ کو دیکھیے، کیسے دھڑلے سے ہم بے وسیلہ مراسلہ نگاروں کی صفوں میں براجمان ہیں اور شکوہ کناں ہیں۔ لکھاری ہو کر بھی عام قاری بننے کی کوشش! لکھاری کو تو اپنا دل اتنا... بڑا کرنا پڑتا ہے 'آکاش جتنا بڑا!... کہ اس میں سب ناگواریاں، تلخیاں، طنز، طعن و تشنیع، تنقید، تنقیص، تمام مخالف عناصر ایک نکتے کی صورت سما جائیں اور معدوم ہو جائیں۔ قاری اتنا تردد کیونکر کرے، اس میں یہ حوصلہ کہاں۔ جناب سید خبیب عارف نے 'امبر بیل' بارے ہماری تکرار پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ خبیب بھائی! چار جلدوں میں بند 'امبر بیل' جو لاہور کے ایک ناشر و پبلشر نے شائع کی، گزشتہ آٹھ نو برس سے ہماری الماری میں محفوظ ہے۔ اسے ہم بصد خوشی آپ کو ہدیتاً پیش کرتے ہیں۔ محب بھائی، بعض تحریریں خونِ جگر میں قلم ڈبو کر لکھی جاتی ہیں۔ انھیں کم سے کم من کی آنکھوں سے تو پڑھا جائے، اور پڑھا جاتا ہے۔ ہم نے پڑھا ہے، ہمیں یہ اعزاز حاصل ہے۔ یہ وہ کم ترین خراج ہے جو اپنے عظیم قلم کاروں کو ہم جیسے بے مایہ سودائی ادا کر سکتے ہیں۔ ہماری مثال تو یوں بھی اب ڈھلتی شام کے سایوں جیسی ہے اور تیزی سے رت بدلتے موسموں کا کیا اعتبار؟ سو زنجیر ہلائے جاتے ہیں کبھی تو فریاد رسا ہو گی۔ جب تک مہلت حاصل ہے 'تب تک آس باقی۔' 'بازی گر' اس بار چونکا دینے والا موڑ مڑی ہے۔ '[illegible] مولوی شفیق کا قصہ تمام ہو جانا اور لڑکی تک تھیلے والوں کی رسائی، دونوں ہی الجھن میں ڈالنے والی باتیں ہیں لیکن بہ ہر حال، بابر زماں کی منزل قریب تر [illegible] کم از کم ہماری خواہش یہی ہے اور وصال کا وہی لمحہ اس داستان کا ماحصل ہوگا جس کے انتظار میں ہم دیوانوں نے 35 سال تک اشکوں کی لڑیاں [illegible] کہانی سنائی ہے۔ 'عشق کا شین' جیسی عظیم کاوش پر ہماری ناقص خیال آرائی اگلی باری تک ادھار رہی۔ جناب علیم الحق حقی کی صحت کاملہ اور خیر و عافیت کے [illegible] چلتے چلتے کہ ماہ نومبر کے 'خوانِ ہفت رنگ' کی تیسری ڈش 'جنگلی گھوڑے' کا ذائقہ خاصی تاخیر سے چکھا اور اس کہانی کا آخری سطر، آخری

سطور پڑھتے جیسے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ سچ ہے انسان کو حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے لیکن اسے حیوان مطلق بنتے دیر نہیں لگتی۔ انسانی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کے منہ پر یہ کہانی ایک زنّانے دار تھپڑ ہے۔ اسی شمارے کی کہانی 'سودر کمی' بہت سال پہلے بھی پڑھی تھی۔ 'سب رنگ' میں شائع ہونے سے پہلے 'عشق کا شین' کسی دوسرے رسالے یا کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے؟ سرفراز خان آفریدی صاحب کے بچے کو اللہ پاک مکمل شفا اور صحت عطا فرمائے۔ رانا بشیر احمد صاحب کو ایک بھرپور تبصرہ لکھنے پر دلی مبارک باد۔ تمام قارئین، خصوصاً حاجی لیاقت علی ذکی صاحب کی خدمت میں اور ادارہ 'سب رنگ' کے تمام کار پردازان کو ہمارا اسلام پہنچے۔''

سرفراز خان آفریدی کا مکتوب، نیو چشمہ کالونی، میانوالی سے۔ ''مدیرِ گرامی، آداب۔ زہے نصیب! اطلب ناسور کا دریا جنوری کے دوسرے ہفتے میں عبور ہوا۔ سردیوں کی یخ بستہ شقاوت میں خلوص کی تمازت کے انتظار کے بعد جب اپنے محبوب پرچے کو پایا تو اس کے بعد نہ زیاں تھا، نہ سود تھا۔ میرے ہاتھوں میں ہست و بود (سب رنگ) تھا۔ مدیرِ گرامی! آپ نے بدخواہوں کے 'شادیانے بجانے' کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ ہمیں تو 'یاد تمہیں جتنی دعائیں صرف وِرد زباں ہو گئیں'۔ ہمیں تو ذرہ بھر بھی بدگمانی نہ ہوئی۔ بلکہ وصل سے ہم کنار ہوتے ہی لحاتِ جاں ''گسل'' آفات ''مسل'' میں ''بدل'' گئے۔ اللہ کرے ''سب رنگ'' اپنی مداومت کی مدافعت تادیر کرے۔ چار مختصر کہانیاں کوئی تاثر قائم نہ کر سکیں۔ پانچویں کہانی 'ردِعمل' کے عنوان سے سامنے آئی۔ اور پہلی کہانیوں کے پیدا کردہ عمل کو 'ردِعمل' کے ذریعے رد کیا۔ مدیرِ گرامی! بدخواہوں سے زیادہ توجہ کے مستحق آپ کے بہی خواہ ہیں۔ مختصر کہانیوں پر تھوڑی توجہ دیں۔ ہمیں آپ کی مشکلات کا اندازہ و بدیہی طور پر ہے۔ ''چلتی پھرتی چھاؤں'' میں صنفِ نازک کی مخصوص نائٹ جیبائی چلت پھرت پھڑ پھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی اور بس۔ خوانِ ہفت رنگ میں پہلی کہانی میں انگریزی لفظ 'فونیکس' استعمال ہوا ہے۔ اس کا انگریزی میں صحیح تلفظ 'فینکس' ہے اور اردو میں اس کے لیے عمدہ ترجمہ ''ققنس'' کے نام سے موجود ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہی لفظ استعمال کیا جاتا۔ وقت کی کمی کی بنا پر پچھلے دنوں میں، میں اشفاق صاحب کے افسانے پر سیر حاصل بحث چاہتے ہوئے بھی نہیں کر سکا اور اب تو محترم واسطی صاحب کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام۔ سلسلے وار کہانیاں اب تک نہیں پڑھ پایا۔ کیوں کہ 'بازی گر' تو ٹکسال کا ڈھلا ہوا سکہ ہے۔ سرورق پر 'عشق کا عین' کی بھرپور قسط کی سرخی جمی ہوئی نظر آئی اور آپ کا کہا ساتواں پتھر کے بارے میں، ایسے ہی ٹکسال ہے۔ 'یہ خوب صورت لب جھوٹ کیسے بولیں گے!' اس لیے چسکے لے لے کر پڑھیں گے.. آرام سے! ناظم علی بخاری صاحب اشرفوں کا تھیلا پیٹھ پر لٹکائے بیچی جیسے منہ سے کیونکر آپ کا شکریہ ادا کروں۔ ''پیراں نمی پرند و مریداں مے پرانند'' (پیر نہیں اڑتے بلکہ ان کے مرید انہیں اڑاتے ہیں) لیکن یہاں تو گنگا ہی الٹ بہہ پڑی۔ پیر خود مرید کو جو بزعم خود مرید بننے کا بھی اہل نہیں، اسے اڑایا جا رہا ہے۔ قبلہ و کعبہ! آپ نے مجھے لکھنے کی تحریک دی ہے، اس کا جواب آپ کو جنوری کے خاص نمبر میں مل گیا ہوگا کہ کبھی کبھار شعر کہہ لیتا ہوں۔ افسانہ چاہتے ہوئے بھی نہیں لکھ سکا۔ ہاں، آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے کہ اپنے ایک دوست محمد عمران کا تازہ بہ تازہ افسانہ اگلے شمارے کے لیے بھجواؤں گا۔ مجھے اچھا لگا ہے، امید کرتا ہوں دل دارانِ ''سب رنگ'' کے لیے افسانہ اور افسانہ نگار بذاتِ خود بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوں گے۔''

فاروق احمد کی نکتہ چینی، لاہور سے۔ ''محترم مدیرِ اعلیٰ، السلام علیکم۔ ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد جنوری کا خاص شمارہ ملا۔ ''سب رنگ'' تو ہمیشہ ہمارے لیے خاص رہا ہے۔ محترم، میرے ہر خط میں آپ کو تنقید نظر آتی ہوگی لیکن اس کی وجہ آپ بھی جانتے ہوں گے۔ محترم، میں نے پچھلے شمارے میں کہانیوں پر دی گئی تصاویر پر تنقید کی تھی۔ اس شمارے کا کاغذ بھی Low Quality کا ہے جس کی وجہ سے بھی تصاویر میں وہ چمک نہیں ہے جو ''سب رنگ'' کا خاصہ تھی۔ براہِ مہربانی تاریخی کہانی کا انداز بدلیں، یوں لگتا ہے کہ ''سب رنگ'' کی تاریخی کہانی پڑھنے کے بعد بھی تشنگی باقی رہ گئی۔ جس کے لیے میں نے پچھلے شمارے میں اپنا شعر بھیجا تھا اور اس پر ناظم بخاری صاحب کا تبصرہ اس شمارے میں ہے۔ محترم ناظم بخاری صاحب سے گزارش ہے کہ محترم میں کوئی شاعر نہیں ہوں۔ میری مادری زبان سندھی ہے، اردو میں کچھ شعر ضرور لکھے ہیں، آپ کی تجویز پر ضرور عمل کروں گا۔ لگتا ہے ''بازی گر'' بھی اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔''

ایس امتیاز احمد کی خبر گیری، کراچی سے۔ ''محترم مدیر صاحب، السلام علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہِ نومبر کا دل کش شمارہ سامنے ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کا انتخاب لاجواب رہا۔ اسٹوریز کا جواب نہیں۔ میں بھی اکثر میگزین میں لکھتا ہوں۔ آپ کے پرچے ''نئی آواز'' اور ''الشرق'' کے لیے کافی لکھا ہے۔ ''سب رنگ'' کے لیے 'شیطانی کھیل' ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''سب رنگ'' کے تمام قارئین کو دعا سلام۔'' امتیاز صاحب 'شیطانی کھیل' کے بارے میں پڑھنے کے بعد آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔

خرم علی راؤ کی ای میل، ماڈل کالونی کراچی سے۔ ''پیارے مدیر صاحب، السلام علیکم۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''سب رنگ'' نے طویل انتظار کرایا۔ آخر کار آج یہ حاصل ہوا۔ اپنی ای میل اس میں شامل دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ آپ کا پیش کردہ خاص شمارہ بہت پسند آیا۔ تقریباً اب تک پڑھ چکا ہوں۔ میں نے پچھلی ای میل میں بھی لکھا تھا کہ بازی گر خاصی تبدیل ہو گئی ہے۔ ''سب رنگ'' میں روشن صفحات کی اشاعت کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ یعنی اولیائے کرام کے حالات و واقعات۔ 'عشق کا شین' بھی اچھی کہانی ہے۔ آخر میں اللہ الوہاب سے دعا ہے کہ آپ کو اور ''سب رنگ'' کو مزید ترقی عطا فرمائے، آمین۔''

سید مرتضیٰ علی واسطی کا خط، شہزاد ٹاؤن، اسلام آباد سے۔ ''محترمی جناب ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم۔ آپ نے جنوری کے شمارے میں ناچیز کا خط شائع کر کے ہمت افزائی فرمائی، میں اس کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔ حسبِ وعدہ 'اشرف اسٹیل مارٹ' جو آپ کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئی' کا دوسرا حصہ ارسال کر رہا ہوں اور دعا گو ہوں کہ یہ آپ کے معیار کے مطابق ہو اور فروری یا مارچ 2010ء کے شمارے کی زینت بن سکے۔ آپ کے اور ''سب رنگ'' کے لیے بہت سی دعائیں۔ فقط آپ کا مخلص۔'' واسطی صاحب آپ کی ارسال کی ہوئی کہانی مل گئی۔ قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں قریبی شمارے میں شائع کر دی جائے گی۔ قلمی تعاون جاری رکھیے گا۔

احمد نعیم، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے رقم طراز ہیں۔ ''مدیرِ محترم! خدا کا شکر ہے کہ سب رنگ کی اشاعت میں تسلسل آ گیا۔ عدمِ تسلسل نے 'بازی گر' کا سارا مزہ کرکرا کر دیا

تھا۔ میانوالی سے سرفراز خان آفریدی نے بھی اس بات پر تنقید کی تھی۔ ساجد شکیل کا خط بھی نومبر کے شمارے میں دل خوش کر گیا۔ موصوف نے ٹھیک ہی لکھا تھا کہ ''بازی گر'' پر یہ لکھنا بند کر دیں کہ اس تحریر کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اب کہانی صحیح ڈگر پر گامزن ہے۔ رائٹر کو ہدایت کریں کہ اسی ٹریک پر قلم چلائیں۔ کورا کا اغوا اچھا موڑ ثابت ہوا ورنہ اب تک صرف بخمل اور بابر زماں ہی میدان مارتے رہتے تھے۔ 'عشق کا شین' اچھی جا رہی ہے، حقی صاحب نے پہلے بھی قارئین کو اچھی کہانیاں دی ہیں۔ رنجنی پٹیل کا 'الو کا پٹھا' متاثر کن تخلیق تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ اپنے اسٹائل میں خوب صورت نفسیاتی کہانیاں کسی دوسرے ڈائجسٹ میں تحریر کر چکی ہیں۔ اردو ادب سے آپ کا انتخاب بلاشبہ معیاری ہے۔ شکایات کے موضوع پر بھی کبھی کہانی ہونی چاہیے۔ ایک فرمائش نوٹ کریں، 'امربیل' کا بقیہ حصہ پڑھوا دیں، نوازش ہوگی... اور ہاں جناب، دسمبر کا شمارہ کیوں کھا گئے؟'' نعیم میاں! ہم نے ہمیشہ عوام کی رائے کو مشعلِ راہ جانا ہے۔ 'بازی گر' میں کورا کا اغوا کیا رنگ لائے گا، اس کا انتظار کریں۔ اپنے مشوروں سے آئندہ بھی نوازتے رہیے گا۔

ارباب جاموٹ، رحیم یار خان سے مدح سرا ہیں۔ ''راشد ملک صاحب! 'بازی گر' میں ماحول بدل کر رائٹر نے بقول ابنِ صفی جو 'لپاڈگی' کی، اس کے بعد میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب ''سب رنگ'' سے منہ موڑ لوں گا۔ ایک دوست کے اصرار پر جنوری کا شمارہ پڑھا۔ 'بازی گر' میں ایسا ہی لگا جیسے مردے میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ لکھنے والے کو زیادہ ڈھیل نہ دیں، کہیں دوبارہ کہانی کو گھما پھرا کر ٹریک توڑ دیا تو سب بددل ہوں گے۔ جنوری کی قسط اچھی لگی۔ کورا کے اغوا کے بعد بابر زماں اور بخمل کو احساس ہوگا کہ دوسرے بھی مرد ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ اگلی قسط میں بابر زماں، بخمل اور ان کے ساتھی کیا تیر چلاتے ہیں۔ 'عشق کا شین' حقی صاحب کی بہت اچھی تخلیق ہے۔ پہلے ماورائی کہانیوں کی وجہ سے ''سب رنگ'' پہچانا جاتا تھا۔ انکا، اقابلا اور امربیل وغیرہ انوار صدیقی کے نام سے سالوں پیش تر بازار میں آ گئی ہیں۔ آپ نے ایک سابقہ شمارے میں لکھا تھا کہ 'امربیل' کی طرح 'بازی گر' بھی نامکمل رہ گئی جس کا افسوس ہے۔ 'بازی گر' تو دوبارہ شروع ہو گئی، 'امربیل' کا کیا رہا؟ کیا انوار صدیقی خدانخواستہ... ہو گئے، ان کی کہانی تو ابھی حال کے شمارے میں چھپی تھی۔ ان سے نئی قسط اسی پرانے انداز میں شروع کرائیں۔'' بھئی جاموٹ صاحب 'ذرا تحمل' سے کام لیں۔ انوار صدیقی صاحب ماشاء اللہ جواں عزم اور جواں حوصلہ ہیں اور ہمارے رابطے میں ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ امربیل کا باقی حصہ بھی جلد پڑھ سکیں۔

شبنم فاروقی کا اظہارِ خیال، سیالکوٹ سے۔ ''راشد ملک صاحب، ہم نے ایک پیر سے چلّہ کرایا تھا کہ 'بازی گر' دوبارہ صراطِ مستقیم پر آ جائے اور بھرتی کے کردار نیا ماحول دیکھ کر 'چھومنتر' ہو جائیں۔ دیکھا آپ نے چلّہ کامیاب رہا۔ 'بازی گر' جنوری میں واپس راہِ راست پر آ گئی۔ کورا کے اغوا کے بعد کیا گزرے گی، بابر زماں پر؟.. وہ کیا جوابی کارروائی کرے گا اس کا انتظار رہے گا۔ رنجنی پٹیل کی 'الو کا پٹھا' خوب صورت کہانی تھی، بہت پسند آئی۔ 'عشق کا شین' حقی صاحب کی مایہ ناز تخلیق ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ خدا ان کے قلم کو تابندگی بخشے۔ میں نے جو چلّہ 'بازی گر' کے سلسلے میں کرایا تھا اس پر جو رقم خرچ ہوئی وہ کون دے گا؟'' شبنم بی بی! آپ نے خرچا تو کیا ہی نہیں، صرف زبانی جمع خرچ کر رہی ہیں۔ ویسے شکر ہے آپ کو 'بازی گر' کی قسط پسند آئی۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو مزید چلّے کرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ثمین شاہ، جہلم سے لکھتے ہیں۔ ''محترمی و مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سدا خوش رہیں۔ ''سب رنگ'' کے پرانے متاثرین میں سے ہوں۔ بہت ہی پرانے [illegible] اس وقت پڑھنے کو ملے جب سب رنگ گوشۂ گم نامی میں چلا گیا تھا۔ پھر کبھی کبھی اس کا کوئی تازہ شمارہ آتا تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا، پھر خبر ملی کہ اب یہ باقاعدگی سے [illegible] بیچ بیچ میں اس کا تسلسل ٹوٹتا رہا اور کچھ شمارے کراچی سے ایک دوست کے ذریعے منگوائے، ایک ای میل بھی کی تھی کہ قارئین و متاثرین سب رنگ کے خطوط بھی شائع کیے جائیں، یہ پوری تو ہو گئی مگر ای میل کا جواب موصول نہیں ہوا۔ بہرحال، میں اپنی خوشی ان الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ پڑھنے، لکھنے اور پڑھانے کا شغل ہے۔ کہانیوں کا معیار جو ''سب رنگ'' نے برقرار رکھا ہوا ہے اس کا تو جواب ہی نہیں۔ ''بازی گر'' کا تو واقعی جواب نہیں، اس کا آٹھواں حصہ کب شائع ہو رہا ہے؟ علیم الحق حقی صاحب کا تو سنا تھا بیمار [illegible] اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟ جنوری کے شمارے میں ''خوانِ ہفت رنگ'' کی تحریریں لاجواب تھیں خصوصاً ''ڈاکٹر، کاش اور جمرنے'' بھی عقل والوں کے لیے [illegible] اور امرتا جی کا تو کیا کہنا، ہم تو امرتا جی کے بہت بڑے فین ہیں۔ ''پنجر'' بھی ان کی سدا بہار تحریر ہے جیسے ان کی مشہورِ زمانہ نظم۔ ''آج آکھاں وارث شاہ نوں'' [illegible] نے ''امرہستی امرتا'' کا صحیح خطاب دیا ہے۔ امیر تیمور کی زندگی کا ایک ورق ''وعدہ'' کی شکل میں پڑھنے کا بھی لطف آیا۔ موصوف ہمارے [illegible] ہیں۔ محترم انوار صدیقی صاحب کی واپسی کی بھی بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ان کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ خطوط لکھنے والے دوستوں سے ابھی جان پہچان نہیں ہے، اس لیے ان کی گزارشات اور تبصروں پر کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں، سید محمد خبیب عارف صاحب کو اتنا ضرور کہوں گا کہ دیومالائی اور پُراسرار کہانیاں آج بھی اسی ذوق شوق سے پڑھی جاتی ہیں جس طرح آج سے 30 سال پہلے پڑھی جاتی تھیں۔ ذرا انوار صدیقی صاحب کی آج سے 30 سال پہلے لکھی گئی کتابوں کی 2010ء میں بھی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے کسی بک اسٹال پر چلے جائیں اور ''انکا''، ''اقابلا''، ''غلام روحیں'' اور ''امربیل'' کی ڈیمانڈ کا پتا کریں۔ یہ سارے سلسلے ''سب رنگ'' میں ہی شائع ہوتے رہے ہیں اور ساتھ دیگر تحریریں بھی تو شامل ہیں۔ باقی پسند اپنی اپنی ہے۔ میں نے بذریعہ ای میل یہ تجویز بھی دی تھی کہ پرانے شماروں کی تحریریں بھی دوبارہ سے شائع کریں تاکہ نئی نسل بھی ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ ویسے مرضی تو سرکار کی ہی چلتی ہے، عوام کی نہیں۔ بھئی معذرت ہمیں خط لکھنا نہیں آتا، اوپر سے طبیعت بھی کچھ ناساز ہے اس لیے معاف فرمائیے گا۔ زندگی کی سانسیں برقرار رہیں تو آئندہ ماہ ذرا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔ سب دوست ذرا اپنی اپنی ٹائی، کوٹ، آستینیں وغیرہ درست فرما لیں کیوں کہ ہم بقلم خود ''نقاد'' ہیں تو پھر آہو... سب رنگ اور اس کی پوری ٹیم کے لیے بہت سی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، اللہ حافظ۔ نوٹ: ''یہ ہمارا اصلی نام نہیں، مرحوم اشفاق احمد کے ایک کردار سے متاثر ہو کر رکھا ہے۔ اس لیے آئندہ ہمیں اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے ورنہ قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہے۔''

ساتواں پتھر

ہیرولڈ روبنس/علیم شام

زندگی کے بارے میں بہت کچھ سوچا، بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا۔ سوچیں تو زندگی ایک جام بھی ہے اور مشروب بھی۔ جیسے انسانوں کی شکلیں مختلف ہیں ویسے ہی کسی کو چھوٹا جام ملا، کسی کو بڑا۔ اور یہ مشروب بھی عجیب ہے۔ جس کے ہر گھونٹ کا رنگ بھی مختلف اور ذائقہ بھی جدا۔ ایک گھونٹ میں شہد کی شیرینی ہے تو دوسرے میں زہر کی تلخی اور پسند آئے نہ آئے، ہر گھونٹ پینا پڑتا ہے۔ اور مشروب ختم ہو جائے تو جام ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

یہ گھونٹ گھونٹ زندگی کی کہانی ہے جسے پڑھتے ہوئے کبھی آپ کے منہ میں حلاوت گھل جائے اور کبھی حلق تک کڑواہٹ کی لکیر سی کھنچ جائے گی۔ یہ کہانی کبھی آپ کو مسکرانے پر مجبور کرے گی اور کبھی آپ کو اداس کر دے گی۔ یہ عالمی ادب کے بہت قد آور ناول نگار ہیرولڈ روبنس کی تحریر ہے۔ ۵۰ء میں لکھے جانے والے اس ناول کا اسلوب آپ کو حیران کر دے گا کہ یہ آج بھی اتنا ہی تازہ، اتنا ہی منفرد اور اتنا ہی جدید ہے۔ یہ اس کہانی کی خوش قسمتی ہے کہ ترجمے کے لیے اسے ایک بے حد معتبر قلم کار میسر آگیا ہے۔ اس کا ترجمہ آپ کو اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دے گا بلکہ آپ خود کو کہانی میں شامل محسوس کریں گے۔ آیئے... ڈینی فشر کے ساتھ بے رحم، مادہ پرست دنیا میں گھوم پھر کر دیکھیے۔ زندگی دو گھونٹ تو لے کر دیکھیے اور بتایئے کہ کیسا لگا۔

زندگی گزارنے والوں کے لیے، ایک زندہ انسان کی روداد

میں نے پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ دروازے کے قریب ہی لوہے کی ایک سلاخ پڑی تھی جس کی مدد سے میں گرم راتوں میں اُوپر والی چھوٹی کھڑکی کھولا کرتا تھا۔ میں نے وہ اٹھائی اور دروازے کے پیچھے دبک گیا۔

دروازہ کھلا اور بین لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا۔ کلکٹر اس کے پیچھے تھا۔ اس نے لات مار کر دروازہ بند کیا پھر وہ پلٹ کر دیکھے بغیر بین کے پیچھے چل دیا۔

میں آگے بڑھا اور سلاخ سے اس کے سر پر وار کیا۔ وہ آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

”میں سوچ رہا تھا کہ تم کہاں ہو آخر؟“ بین نے سرگوشی میں کہا۔

”میں یہیں تھا۔ لیکن موقع کا انتظار کر رہا تھا۔“ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ میں ان لفنگوں کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

اُس نے اس پر غور بھی نہیں کیا۔ اسے تو اس وقت اپنی بہن کی فکر تھی۔ ”تم نے سنا‘ یہ ڈیبی کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا یہ سچ ہے؟“

میں نے اسے دیکھا۔ وہ اس وقت قلبی اذیت سے دوچار تھا۔ ڈیبورا اس کی چھوٹی بہن تھی۔ والدین کی موت کے بعد اُس نے اسے باپ بن کر پالا تھا۔ اور جب وہ معذور ہوا تو ڈیبورا نے اسے سہارا دیا۔ اب میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ میری ہر وضاحت قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے۔ البتہ اس وقت میرا جھ اس کے لیے ضرور رساں ہوگا۔ چاہے بعد میں کبھی حقیقت اس پر کھل جائے۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں‘ یہ سچ نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میکسی فیلڈز ایک بدمعاش ہے۔ ڈیبورا کو اس بات کا پتا اس کی سیکریٹری بننے کے بعد چلا۔ مگر اُس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ تم تو جانتے ہو کہ پھر اس چکر سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔“

اس کی اذیت دُور تو نہیں ہوئی‘ البتہ کم ہو گئی۔ ”بے چاری ڈیبی...!“ وہ بڑبڑایا۔ ”میری وجہ سے کتنی اذیتیں اٹھائی ہیں اس نے۔“ پھر اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تمھاری ڈیبی سے ملاقات کیسے ہوئی؟“

”میری اس لفنگے سے لڑائی ہوئی تھی۔ میں زخمی ہو گیا تھا۔ ڈیبی نے میری مدد کی اور مجھے بچا کر یہاں لے آئی۔“ میں نے کہا۔

وہ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن پھر اسے جیسے

یقین آ گیا۔ وہ پُرسکون نظر آنے لگا۔ "اور وہ جو دوسرے کمرے میں موجود ہے...؟"

"ہم اسے سنبھال لیں گے۔" میں نے کلکٹر پر جھکتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی جیکٹ کھولی اور کندھے کے ہولسٹر سے اس کی گن نکال لی۔ لیکن میں بہت محتاط تھا۔ گن میرے لیے بالکل نئی چیز تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی حادثہ رُونما ہو۔

بین گن کو گھور رہا تھا۔ "اب میری سمجھ میں آیا۔ اسی لیے تو ڈیبی جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مجھے یہ سب معلوم ہو۔"

"ہاں بین! یہی بات ہے۔"

باہر کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے بین کو بیڈ پر بیٹھنے کو کہا اور خود دروازے کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔

مرکزی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر اسپٹ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "ہائی بیب! جیسے ہی میکسی نے الماری سے تمھارے کپڑے غائب دیکھے، ہمیں یہاں بھیج دیا... تمھیں لانے کے لیے۔"

"بین! بین کہاں ہے؟" ڈیبورا چلّائی۔ "تم نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟"

"وہ خیریت سے ہے روتی۔ کلکٹر اسے پریشانی سے بچانے کے لیے عقبی کمرے میں لے گیا ہے۔"

میں نے آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ پھر دروازہ کھلا اور ڈیبورا کمرے میں داخل ہوئی۔ "بین... بین! تم ٹھیک تو ہو؟" اس کا لہجہ ہذیانی تھا۔

بین مسکراتا ہوا اٹھا۔ اسی لمحے اسپٹ بھی کمرے میں آ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر گن اُس کی کمر سے لگا دی۔ "ہلنا مت اسپٹ۔ میں بہت نروس ہو رہا ہوں۔ گنوں کا مجھے بالکل تجربہ نہیں ہے۔"

اسپٹ نے سر گھمانے کی بھی جرأت نہیں کی۔ "ڈیبی... تم!" اور یہ سوال نہیں تھا۔

میں نے گن سے اسے ٹہوکا دیا۔ "دیوار سے ٹک کر کھڑے ہو جاؤ۔ ایسے کہ تمھاری ناک دیوار سے لگی ہو۔"

اس نے بڑے محتاط انداز میں بے ہوش کلکٹر کو پھلانگا۔ "تم نہیں سدھرے ڈیبی! پہلے تم نے میکسی کی دولت پر ہاتھ صاف کیا... پھر اس کی لونڈیا پر۔"

میں نے گن کا دستہ اس کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑایا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور وہ دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے ریوالور اس کی پشت سے لگاتے ہوئے، اس کی جیب میں رکھی سے اس کا چاقو نکال لیا۔

"میکسی کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی ڈیبی..." اسپ نے مجھے دھمکی دی۔ "ایک بار بچنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم بار بچ جاؤ گے۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔ "تم زندہ ہی نہ رہے تو تمھیں کیا چلے گا۔"

ڈیبورا بین کے سینے سے لگ کر رو رہی تھی۔ بین اسے تس دے رہا تھا۔ "مت روؤ، میری بہن! تمھیں اب اس کے کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ڈیبورا کا رونا اچانک موقوف ہو گیا۔ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ "کیا اسے پتا چل گیا ڈیبی؟ کیا لوگوں نے..."

"میں نے بین کو بتا دیا ہے کہ تم لاعلمی میں کیسے خراب آ کی سیکریٹری بن گئی تھیں..." میں نے جلدی سے کہا۔ "میں اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کے کاروبار کے متعلق جاننے بعد تمھارے لیے جان چھڑانا ممکن نہیں رہا تھا۔"

"میں سب کچھ جان گیا ہوں ڈیبی..." بین نے کہا۔ نے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا مجھے؟ ہم مل کر کوئی راستہ نکال لیتے۔"

ڈیبورا اب مجھے تشکر آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مسکرایا۔ وہ اپنے بھائی کی طرف پلٹی۔ "میں اس سے خوف تھی بین۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی۔"

"اب تم فکر نہ کرو۔ ہم ان بدمعاشوں کو پولیس کے حوا کر کے یہاں سے نکل چلیں گے۔"

وہ پھر خوف زدہ ہو گئی۔ "ہم ایسا نہیں کر سکتے بین۔"

"ہاں۔ ورنہ پولیس والے تمھیں روک لیں گے۔ پھر نئے سرے سے زندگی شروع نہیں کر سکو گے..." میں نے ک "تم اب یہاں سے چلے جاؤ۔ تمھارے جانے کے بعد انھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"تمھیں کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی؟"

"بالکل نہیں۔ بس تم لوگ جلدی سے نکل جاؤ یہاں سے۔"

دیوار کی طرف سے اسپٹ کی منمناتی ہوئی آ ابھری۔ "میں بہت تکلیف میں ہوں ڈیبی۔ مجھے پلٹنے اجازت دے دو۔"

میں نے شیلف پر پڑا تار اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی ا منٹ میں تمھارا مسئلہ حل ہو جائے گا..." پھر میں نے اس

دونوں ہاتھ اس کی پشت پر لا کر سختی سے باندھ دیے۔ پھر اسے کہا۔ "اب آرام سے بیڈ پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بین اپنا سامان لے جا چکا تھا۔ بس ایک چھوٹا بیگ رہ گیا تھا۔ پھر اس بیگ کو اٹھاتے ہوئے اس نے ہچکچاہٹ سے مجھے کہا۔ "تم سب سنبھال سکو گے ڈیبی؟"

"ہاں تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم بس نکل لو یہاں سے۔"

بین نے نرمی اور محبت سے میرے کندھے کو چھوا۔ "خدا تمھیں خوش رکھے۔ تم نے ہم پر بہت مہربانیاں کی ہیں ڈیبی۔"

وہ پلٹا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ اسی لمحے ڈیبورا کمرے میں داخل ہوئی اور میری طرف آئی۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ "تم واقعی ہمارے ساتھ نہیں چلنا چاہتے؟"

میں زبردستی مسکرایا۔ "اب تو یہ ناممکن ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھو نا، یہ مصروفیت بھی تو ہے نا میرے لیے۔"

وہ کوشش کے باوجود مسکرا نہیں سکی۔ وہ جانے کے لیے مڑی مگر فوراً ہی پلٹ کر میری بانہوں میں آ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔

"جاؤ ڈیبی، چلی جاؤ... تاکہ یہ سب پیچھے رہ جائے... تاکہ تمھیں پچھلی زندگی یاد دلانے کے لیے تمھارے پاس کچھ بھی نہ ہو۔" میں نے کہا۔

وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر میرے رخسار پر پیار کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ "بائی ڈیبی، اینڈ گڈ لک!"

اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ جا چکی تھی۔

میں اسپٹ کی طرف مڑا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ "ہم نے تمھاری تلاش میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ بس یہیں کا خیال نہیں ا۔ اب مجھے یاد آیا ہے کہ اس رات روتی بھی ایسٹ سائیڈ میں موجود نہیں تھی۔ ہمیں یہ اندازہ لگا لینا چاہیے تھا۔"

مجھے وہ کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ اس تبدیلی کو سمجھنے میں مجھے کچھ لگی۔ اور وہ بڑی تبدیلی تھی۔ اب اس کے ساتھ رال اُڑانے الا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں یہ تبدیلی سمجھ گیا ہوں۔ س کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں تمھارا شکریہ ادا کرنا بھول گیا بی۔ تم نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس رات تمھاری ٹھوکر نے میرا ہونٹ پھاڑ ڈالا تھا۔ ڈاکٹر کو پلاسٹک سرجری کرنی ی۔ اس میں میرا وہ پرانا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔"

میں مسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ میری محنت تمھارے کسی کام آئی۔ شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا، اب ذرا پیٹ کے بل لیٹ جاؤ۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے تار سے اس کے دونوں ٹخنوں کو جوڑ کر باندھا۔ پھر اسی تار سے دونوں ہاتھوں کو کھینچ کر باندھا۔ اب وہ ایسی خمیدہ حالت میں تھا کہ چند گھنٹے اس حال میں رہنے کے بعد کئی دن تک وہ سیدھا نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر میں نے کلکٹر کے پپوٹوں کو چیک کیا۔ وہ بھی آسانی سے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنی گنی چنی چیزیں اپنے چھوٹے بیگ میں ڈالیں۔ اسپٹ اس تکلیف دہ پوزیشن میں بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ "اس بار تم بچ نہیں سکو گے ڈیبی!" اس نے کہا۔

میں نے ریوالور نکالا اور اس کی طرف بڑھا۔ میرے تیور دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا۔ "یہ تمھیں کیسے پتا چلا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ریوالور کو دیکھتا رہا۔ میں نے مسکرا کر ریوالور کو جیب میں رکھ لیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ میں نے اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ "اگر تم اتنے عقل مند ہو اسپٹ... جتنا کہ میں تمھیں سمجھتا ہوں تو آئندہ کبھی میرے راستے میں نہیں آؤ گے۔ اب تم ہر بار تو خوش قسمت ثابت نہیں ہو سکتے۔ اور یاد رکھو، ہونٹوں کا سوراخ تو ڈاکٹر بھر دیتے ہیں لیکن دماغ کا سوراخ دنیا کا کوئی ڈاکٹر نہیں بھر سکتا۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

* * *

میں باہر نکلا تو بارش شروع ہو گئی تھی۔ مجھے اچھا لگا۔ جو کچھ میں پیچھے چھوڑ کر آیا تھا، کاش بارش اسے دھو دے۔ اور ممکن ہے، کبھی میں یہاں واپس آؤں، اور اس وقت حالات مختلف ہوں۔

میں عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اخبار کھول لیا۔ میں اس وقت جنوب کی طرف جانے والی بس میں تھا۔ بس نیوجرسی کے مضافات سے گزر رہی تھی کہ براڈوے سے متعلق کالم میں اس خبر پر میری نظر پڑی۔

مجھے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بار بار آنکھیں مل کر دیکھا مگر وہ حقیقت تھی۔ لکھا تھا:

> تفریحی مقامات اور تفریح گاہوں کے سب سے بڑے ٹھیکے دار، معروف ہیٹ چیک کنگ اور سامی گورڈن کے نام سے لائٹ ہیوی ویٹ کے سابق چیمپئن سام واٹکن نے کل مریم (میمی) فشر سے شادی کر لی۔ واضح رہے کہ

مریم فشر، گلووز چیمپئن ڈینی فشر کی بہن ہے۔ برمودا میں ہنی مون منانے کے بعد دُلہا دُلھن سینٹرل پارک ساؤتھ کے علاقے میں اپنے نئے پینٹ ہاؤس میں زندگی کا آغاز کریں گے جسے سام واٹکن نے خاص طور پر اپنی دُلھن کے لیے بڑی محبت سے آراستہ کرایا ہے۔

غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ بس رُکوانے والی گھنٹی کے بٹن کی طرف لپکا۔ ایک لمحے کو میری انگلی بٹن پر جمی رہی... لیکن بغیر دباؤ ڈالے۔ پھر میں نے اپنے ہاتھ کو واپس کھینچ لیا۔ واپس جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے اس خبر کو دوبارہ پڑھا۔ تنہائی کے احساس نے مجھے نڈھال کر ڈالا۔ میمی اور مسٹر سام! یہ کیسے ہوگیا؟ وہ کیسے ملے؟ اور میمی جو اپنے دفتر میں کام کرنے والے اس لڑکے کے لیے پاگل ہو رہی تھی، اس لڑکے کا کیا بنا؟

میں نے آنکھیں موند لیں۔ کیا فرق پڑتا تھا؟ اب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کم از کم مجھ پر نہیں۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق تھا تو میں ان کی زندگی سے نکل چکا تھا۔ ان کے لیے میرا وجود اور عدم برابر تھا۔

بارش بس کی کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا کر اسے میرے ذہن کی طرح دُھندلاتی رہی۔ میں اونگھنے لگا۔ میمی اور مسٹر سام کی تصویریں میری آنکھوں میں چمکتی رہیں۔ لیکن وہ الگ الگ تصویریں تھیں، ایک ساتھ نہیں۔ جب ایک پوری طرح فوکس میں آتی تو دوسری معدوم ہو جاتی۔

میں انھیں باہمی خوشیوں کی دعا بھی نہیں دے سکا!

* * *

"میری غیر موجودگی میں..."

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اپنے آنسوؤں پر اس کا بس نہیں تھا۔ ہاتھ میں موجود رومال اس کے مُنھ پر رکھا تھا تاکہ سسکیوں کا گلا گھونٹ سکے۔

پاپا نروس ہونے لگے۔ "یہ آخر کس بات پر رو رہی ہے؟" انھوں نے ماما سے کہا۔ "آج اس کی شادی ہے۔ یہ کوئی رونے کا موقع ہے بھلا؟"

ماما نے سخت بدمزگی سے انھیں دیکھا اور ان کا ہاتھ تھام کر کمرے کے باہر دھکیلا۔ "جاؤ، تم مہمانوں کی فکر کرو..." ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔ "یہاں کے معاملات تمھارے سمجھنے کے نہیں ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ذرا دیر میں۔"

پاپا احتجاج کرتے رہے لیکن ماما نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ اس کے پاس چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر تفہیم تھی۔ وہ خاموشی سے طوفان کے گزرنے کا انتظار کرتی رہیں۔ اور انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بالآخر میمی کے آنسو تھم گئے۔ اب وہ نروس انداز میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے رومال کو مسل رہی تھی۔

"تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔" ماما نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

میمی نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ مگر اگلے ہی لمحے دوبارہ نظر جھکالی۔ "میں اس سے محبت کرتی ہوں۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"اگر تم اس سے محبت نہیں کرتیں تو یہ شادی نہ کرو۔" ماما نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

اس بار میمی نے پلکیں جھپکائے بغیر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ "اب میں ٹھیک ہوں ماما..." اس نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں خوامخواہ بچپنا کر رہی تھی۔"

ماما کے چہرے پر اب بھی سنگینی تھی۔ "شاید تم سمجھ رہی ہو کہ شادی کر کے تم بڑی ہو جاؤ گی۔ مت بھولو کہ تمھارے شادی کے لائسنس پر دست خط مجھے کرنے ہیں۔ اجازت دینے والی میں ہی ہوں۔"

میمی نے پلٹ کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ پھر وہ اٹھی اور کونے میں لگے واش بیسن کی طرف چل دی۔

ماما نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکا۔ "یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے میمی۔" انھوں نے کہا۔ "تمھیں اس کے ساتھ عمر گزارنی ہے۔ اگر..."

"ماما، ایسی باتیں نہ کریں..." میمی نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "اب بہت دیر ہو چکی۔"

"ہرگز نہیں۔ ابھی وقت ہے۔ تم ارادہ بدل سکتی ہو۔"

میمی نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے سے استقلال جھلکنے لگا۔ "نہیں ماما۔ بہت دیر ہوگئی۔ دیر تو اسی وقت ہوگئی تھی جب میں پہلی بار اس سے یہ پوچھنے گئی تھی کہ ڈینی کہاں گیا۔ اب میں کیا کر سکتی ہوں ماما؟ ڈینی کی تلاش میں جو کچھ اس نے خرچ کیا، وہ اسے لوٹا سکتی ہوں میں؟ اسٹور خریدنے اور جمانے کے لیے جو اس نے پاپا کو پانچ ہزار ڈالر قرض دیے، وہ چُکا سکتی ہوں میں؟ اس نے جو میرے لیے انگوٹھی خریدی، ملبوسات خریدے وہ لوٹا دوں اسے؟ اور اس سے کہوں کہ سوری، میں خود کو سمجھ نہیں پائی۔ یہ شادی مناسب نہیں ہے؟"

ماما کی آنکھوں کا دُکھ اور گہرا ہو گیا۔ "ہاں، عمر بھر ناخوش رہنے سے یہ بہتر ہے۔ تم مجھے اور اپنے پاپا کو اپنے ساتھ وہ کچھ کرنے دو، جو ہم ڈینی کے ساتھ کر چکے ہیں۔" دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"آپ خود کو بلاوجہ الزام نہ دیں..." میمی نے چمک کر کہا۔ "سب پاپا کا کیا دھرا ہے۔"

"نہیں میمی، میں انھیں روک سکتی تھی۔ مجھے انھیں روکنا چاہیے تھا..." ماما نے کہا۔ "اسی لیے میں اس وقت تم سے بات کر رہی ہوں۔ میں غلطی دُہرانا نہیں چاہتی۔"

میمی کے چہرے پر استقلال تھا۔ "نہیں ماما، یہ الگ بات ہے۔ سام مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بے شک، میں اُس سے اتنی محبت نہیں کرتی جتنی وہ مجھ سے کرتا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میں بھی اُس سے اتنی ہی محبت کرنے لگوں گی۔ وہ بہت اچھا، کشادہ دل اور مہربان ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ماما۔"

ماما سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کو تکتی رہیں۔

میمی نے اچانک جھک کر ماما کی پیشانی چوم لی۔ "آپ پریشان نہ ہوں ماما..." وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ اور میں یہی چاہتی ہوں۔"

* * *

وہ خوف زدہ سی بیڈ پر بیٹھی تھی۔ آنے والے لمحوں کے تصور سے اس کے اعصاب کھنچ رہے تھے۔ باتھ روم کی طرف سے سام کے دانت برش کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر بہتے ہوئے پانی کی آواز رُک گئی۔ لائٹ کے سوئچ کی کلک سنائی دی تو وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ کمرے میں اندھیرا سا ہو گیا تھا۔

پھر بستر سام کے بوجھ سے دبا۔ اس کے جسم کا تناؤ بڑھ گیا۔ اسے سردی کا احساس ہونے لگا۔

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر سام نے نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا۔ اس نے سختی سے دانت پر دانت جما دیے۔ اسی لمحے اس نے سام کی سرگوشی سنی۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں بے بی!"

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ "کیا سچ مچ سام؟ جو میں نے تمھارے ساتھ کیا، اس کے بعد بھی؟"

"ہاں، بے بی۔ اور تم نے کیا ہی کیا ہے۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

اس کے جسم کا تناؤ دُور ہو گیا۔ "شکریہ سام!" اس نے آہستہ سے کہا۔

لیکن قربت کے لمحوں میں اسے جارج کا خیال آتا رہا۔ وہ [illegible] سے لڑتی رہی۔ اسے اپنی سوچوں سے دُور دھکیلنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ خود کو یاد دلاتی رہی کہ یہ تو سام کے ساتھ زیادتی ہے۔ جو کچھ ہوا، اس میں سام کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ سب کچھ سام کی وجہ سے تو نہیں ہوا تھا۔ غلطی تو اس کی اپنی تھی۔ اس نے خود یہی چاہا تھا۔ جب وہ پہلی بار نیلی کے ساتھ سام کے پاس گئی تھی، تبھی سے اس نے یہی چاہا تھا۔

طوفان گزر گیا!

اس کے پہلو میں لیٹے ہوئے سام نے نرمی سے اس کے رخسار کو چھوا۔ "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

میمی نے اس کے سینے میں چہرہ چھپالیا۔ "ہاں، ٹھیک بھی اور خوش بھی...!" اس نے کہا۔ لیکن اپنے دل میں وہ جانتی تھی کہ یہ جھوٹ ہے۔ اور اب وہ ساری زندگی اس سے یہ جھوٹ بولتی رہے گی۔ وہ ہمیشہ خوف زدہ رہے گی۔ قربت کے نازک لمحوں میں اس کی نگاہوں میں سام کا نہیں، جارج کا چہرہ تھا۔

"اے خدا...!" اس نے خاموشی سے دل میں دعا کی۔ "کیا ساری عمر میرے ساتھ یہی ہوتا رہے گا؟ کیا میں ہمیشہ یونہی خوف زدہ رہوں گی؟"

جوابی آواز اس کے ذہن میں اُبھری... بھاری مردانہ آواز!

"میرے ساتھ دہراؤ میری بچی۔ میں مریم، اپنے وجود کی سچائی کے ساتھ... سیموئیل کو اپنے شوہر کی حیثیت میں قبول کرتی ہوں۔ میں عہد کرتی ہوں کہ غربت میں، پریشانی میں، بیماری میں ہر طرح اس کی شریک رہوں گی۔ میری محبت، میری آبرو اس کی امانت ہے۔ میں مرتے دم تک یہ ساتھ نبھاؤں گی۔"

سام سو چکا تھا۔ میمی نے تاریکی میں اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں خوشی تھی۔ اس نے سوچا، یہ بھی غنیمت ہے۔ پھر وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

او... وہ تو مجھے ڈھونڈنے نکلی تھی۔ اور اب وہ پوری زندگی... ہر دن اور ہر رات اُس کے ساتھ گزارے گی۔ لیکن وہ کبھی نہیں جان سکے گا کہ میمی اس کے پاس ہے، اس کی دست رس میں ہے۔ لیکن اس کی نہیں ہے۔

دن زندگی کے

بارش یوں برس رہی تھی جیسے کبھی نہیں رُکے گی۔ خیمے کی بھیگی ہوئی کینوس کی دیواریں تیز ہوا سے اندر کی طرف پچک رہی تھیں۔ میں نے سگریٹ کو ایک طرف پھینکتے ہوئے سوچا کہ بھیگی ہوئی سگریٹ کو دیکھنا بھی کتنی کوفت کا باعث ہوتا ہے۔

مجھے یہاں رہتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ یہاں موسم بہت سخت تھے اور کینوس کے خیمے ان کی سختی کو اور بڑھا دیتے

تھے۔ گرمی ہوتی تو خیمے کے اندر یہ احساس ہوتا کہ یہ جہنم کا کوئی خاص الخاص گوشہ ہے جہاں تپش نہ جینے دیتی ہے اور نہ مرنے دیتی ہے۔ سرد راتوں میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہڈیوں کے اندر موجود گودا جما جا رہا ہے۔

گھر سے دُور' گھر سے بے خبری کے وہ دو سال! میں نہیں جانتا تھا کہ نیلی کا کیا حال ہے' ماما اور پاپا کیسے ہیں... اور سیمی اور سام۔ یہ نام ہمیشہ اذیت جگاتے تھے۔ تنہائی کا احساس ستانے لگتا تھا۔

خیمے کے ساتھ سفر کرتے کرتے اب میں تقریباً گھر پہنچ چکا تھا۔ ہاں' گھر نہیں' تقریباً گھر۔ میں فلاڈلفیا میں تھا... گھر سے ستر منٹ کی مسافت پر۔ سوچتا تو بہت آسان لگتا۔

لیکن سوچنے اور عمل کرنے میں بہت فرق ہے۔ سوچنا آسان ہوتا ہے اور عمل کرنا مشکل۔ جو کچھ پیچھے ہو چکا تھا وہ سب یاد آتا تھا۔ اور میں پھر مشتعل ہو جاتا تھا۔ اپنی جلاوطنی پر مجھے غصہ آتا تھا۔ اور میں ڈرتا بھی تھا کہ واپس جاؤں گا تو نہ جانے کیا کچھ ہوگا۔

اس کے باوجود میں گھر واپس جانا چاہتا تھا... آج سے نہیں' ہمیشہ سے... میں کچھ رشتوں کی ڈور سے بندھا تھا' چاہے وہ مجھے قبول نہ کریں۔ وہ رشتے جنہیں میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ بس میرے جذبات ان کی تشریح کر سکتے تھے۔ آج میں ان سے ستر منٹ کے فاصلے پر تھا۔ لیکن کل جب یہ خیمے جنوب کی طرف سفر شروع کریں گے تو پرسوں میں گھر سے چھ گھنٹے دُور ہوں گا۔ اور ایک ہفتے بعد وہ مسافت چوبیس گھنٹے کی ہوگی اور ایک ماہ بعد وہ کئی دن پر محیط سفر ہوگا جو میں کبھی نہ کر سکوں گا۔

میں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ بارش چہرے کو تھپڑا رہی تھی۔ یہ بارش نہیں تھمے گی۔ دوسری سگریٹ بھی بھیگ کر مُردہ ہو گئی تھی۔ میں نے اسے پیروں کے پاس پانی کے چھوٹے سے تال میں پھینک دیا۔ پانی سے اپنی آگ کو بچانے کی کوشش میں وہ غصے سے پھنکاری۔ شاید میں بھی اس سگریٹ جیسا ہی ہوں۔ اپنی زندگی کے لیے لڑتا ہوا۔

تب ہی ایک پکار اُبھری۔ ایک مسلسل پکار... مجھے گھر جانا ہے' ہر حال میں' ہر صورت میں' چاہے کچھ بھی ہو... مجھے گھر جانا ہے' مجھے نیلی سے ملنا ہے' ماما اور سیمی سے بھی... اور پاپا سے بھی' چاہے وہ نہ ملنا چاہیں مجھ سے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے قبول نہیں کیا جائے گا... میں وہاں نہیں رہ سکوں گا... چاہے مجھے واپس یہیں آنا پڑے۔ چاہے مجھے کل ہی واپس آنا پڑے۔ میں تنہائی سے عاجز آ چکا ہوں۔

* * *

میں پہنچا تو وہاں بھی بارش ہو رہی تھی۔ لیکن ڈیلانسی اسٹریٹ ہمیشہ کی طرح پُرہجوم تھی۔ وہاں بارش کی پروا کسی کو نہ تھی۔ وہ اور جاتے بھی کہاں۔ ڈیلانسی اسٹریٹ پر چہل قدمی کے سوا وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ ڈیلانسی اسٹریٹ پر گھومتا میں ونڈو شاپنگ کرتا... یہ سوچتا کہ میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو خریدتا... اور اتنی رقم ہوتی تو کیا خریدتا' یہی ایک تفریح تھی۔

میں نے سگریٹ جلایا اور سڑک پار کرنے کے لیے سگنل کی روشنی تبدیل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ دکان کی ونڈوز اب بھی ویسی ہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ کبھی تبدیل نہیں ہوں گی۔ سب کچھ وہی تھا۔ میں بدل گیا تھا... مگر اور کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

سڑک پار کر کے میں ''فائیو اینڈ ٹین'' کی طرف چلنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ نیلی اب بھی وہیں کام کرتی ہوگی۔ اس یقین کی وجہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔ پیراماؤنٹ کی ونڈو کے کلاک میں میں نے وقت دیکھا۔ نو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ میں نے سوچا' پانچ منٹ بعد اسٹور بند ہوگا' اور وہ باہر آئے گی۔'

اس خیال نے کچھ اور سوچوں کے دریچے کھول دیے۔ کیا وہ بھی بدل گئی ہوگی میری طرح؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مجھے بھول گئی ہو۔ ممکن ہے' کسی اور سے اس کی دوستی ہو گئی ہو۔ لیکن مجھ سے اس کی دوستی تو نہیں تھی۔ مجھ سے تو وہ محبت کرتی تھی۔ کون جانے' ایک نوجوان لڑکی کی زندگی میں دو سال کا عرصہ بہت بڑا ہوتا ہے۔

اسٹور کے دروازے پر میں رُکا اور اندر جھانکنے لگا۔ اسٹور میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ لیکن نروس ہونے کی وجہ سے مجھ میں وہ چوکھٹ پار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ کیا پتا وہ مجھ سے ملنا ہی نہ چاہے۔ میں ایک لمحہ وہاں کھڑا ہچکچاتا رہا۔ پھر کارنر کی طرف چلا گیا۔

میں وہاں اسٹریٹ لائٹ کے نیچے کھڑا تھا... اسی اسٹریٹ لائٹ کے نیچے جہاں کھڑے ہو کر میں ہمیشہ اس کا انتظار کرتا تھا۔ میں نے لیمپ پوسٹ سے ٹیک لگائی اور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک فائیو اینڈ ٹین کی ونڈو کی روشنی گل ہوئی اور میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ سگریٹ کو میں نے نیچے پانی میں پھینک دیا۔ اب بس چند منٹ کی بات ہے... بس چند منٹ۔ میری کنپٹی میں کوئی نس پھڑکنے لگی۔ حلق خشک ہونے لگا۔

کام کرنے والی لڑکیوں کی ایک ٹولی اسٹور سے نکلی میرے سامنے سے گزری۔ مگر وہ ان میں نہیں تھی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کچھ اور لڑکیاں باہر آ رہی تھیں۔ لیکن وہ ان میں بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا... نو بج کر پانچ منٹ۔ اب وہ آتی ہی ہوگی۔

میں نے اپنے چہرے کو رومال سے پونچھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ اس کے باوجود مجھے پسینا آ رہا تھا۔ رومال جیب میں ٹھونس کر میں پھر دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لڑکیاں اب بھی باہر آ رہی تھیں۔ میری نگاہیں ایک ایک کو ٹٹول رہی تھیں۔ ہر ناکامی پر اُمید کے جام میں سے ایک قطرہ ٹپک جاتا تھا' اب باہر آنے والی لڑکیاں بھی کم ہی تھیں... اِکّا دُکّا۔ وہ باہر آتیں' سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتیں اور پھر اپنی راہ لیتیں۔

میں نے پھر گھڑی میں وقت دیکھا۔ اب نو بج کر دس ہو چکے تھے۔ مایوسی میرے وجود میں سرایت کر رہی تھی۔ میں واپس جانے کے لیے پلٹا۔ میں پاگل تھا کہ سوچا' دو سال سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن میرے قدم رُک گئے۔ میں نے سوچا۔ آنے کے بعد اس طرح لوٹ جانا بھی پاگل پن ہے۔ جب تک اسٹور خالی نہیں ہو جاتا' بند نہیں ہو جاتا' مجھے اس کا انتظار کرنا ہوگا۔

اندر اسٹور میں کچھ اور روشنیاں گل ہو گئیں۔ اب چند منٹ بعد منیجر باہر آئے گا اور اسٹور بند ہو جائے گا۔ میں نے پھر سگریٹ جلائی۔ دیاسلائی کو ہوا سے بچانے کے لیے میں نے رُخ بدلا۔ اسی لمحے نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ ان میں سے ایک آواز سن کر میں بُت بن گیا۔ میری سانسیں رُکنے لگیں۔ وہ تو اس کی آواز تھی!

''شب بخیر نولی۔'' اس نے کسی سے کہا تھا۔

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا... اور دیکھتا رہا۔ اس نے جس لڑکی کو شب بخیر کہا تھا' وہ مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا... وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ وہی ہونٹ' وہی رخسار' وہی آنکھیں' وہی گلابی جلد۔

میں ایک قدم اس کی طرف بڑھا مگر فوراً ہی رُک گیا۔ آگے [illegible] ممکن نہیں تھا۔ میں بے بسی سے اسے [illegible]

[illegible] چھتری کھول رہی تھی۔ چھتری کو اپنے [illegible] اس کی نگاہ اوپر اٹھی... اور مجھ پر [illegible] بے یقینی تھی۔ وہ [illegible] ''ڈیڈی...؟'' اس کے لہجے میں بھی بے یقینی تھی۔

میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میرے ہونٹ بے آواز ہل رہے ہیں۔ سگریٹ میرے ہونٹوں سے گری۔ اس کی چنگاریاں میرے کپڑوں کو چھوتی ہوئی جل بجھیں۔

''ڈیڈی... ڈیڈی...!'' اس بار وہ چلائی اور میری طرف لپکی۔ چھتری نیچے گر گئی۔ لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ میری بانہوں میں تھی اور بے تابانہ میرے چہرے کو چوم رہی تھی۔ اس کے آنسو میرے رُخسار بھگو رہے تھے۔ اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

میری آنکھوں میں دُھند سی چھانے لگی... اور وہ بارش کی

مسجد بیت المکرم

قومی سطح پر اگر جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں ماڈرن مسجد کی تعمیر کا نقطۂ آغاز ڈھاکا میں تعمیر ہونے والی مسجد بیت المکرم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُس کی تعمیر کا آغاز 1959ء میں ہوا اور یہ مسجد 1963ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ڈھاکا اُس وقت پاکستان کا حصہ تھا۔ بیت المکرم مسجد کی تعمیر کے پیچھے اصل دلچسپی معروف صنعت کار عبداللطیف بھاوانی کی تھی جب کہ ماہرِ فنِ تعمیرات عبدالحسین تھریانی جس نے ہندوستان سے فنِ تعمیر میں تعلیم حاصل کی تھی، پہلی مرتبہ خانۂ کعبہ کی مکعب شکل کو بنیاد بناتے ہوئے مسجد بیت المکرم کا ڈیزائن تیار کیا جو شباہت میں ہُو بہُو خانۂ کعبہ جیسا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بیت المکرم مسجد کی بیرونی دیواروں کو سیاہ رنگ کی بجائے سفید رنگ کیا گیا، اور صرف حاشیے ہی کو سیاہ رکھا گیا۔ دیکھنے میں یوں تو یہ بالکل خانۂ کعبہ جیسی عمارت ہی کی تعمیر تھی، اور اسی وجہ سے اِس مسجد میں مینار بھی تعمیر نہ کیا گیا، تاہم گرد و نواح کے اعتبار سے کئی مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ اِس کی تعمیر کو ممکن بنانے میں اُس وقت کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل امراؤ خان کا ہاتھ تھا جب کہ تعمیراتی اخراجات مقامی صاحبِ ثروت لوگوں نے اپنے ذرائع سے پورے کیے۔

تحریر: ڈاکٹر مبارک علی ✿ تعاون: احمد بن محمد

وجہ سے نہیں تھی۔ میں نے ایک پل اسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ ”نیلی!“ میں نے زیرِلب کہا۔

جدائی کے دو برس آنسوؤں نے دھو ڈالے۔ جیسے بیچ میں کچھ ہُوا ہی نہ تھا۔ اہمیت بس اس بات کی تھی کہ اب ہم یکجا تھے۔

”ڈینی... ڈینی...!“ اس کی نگاہیں میرے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا ڈینی؟ ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا... خبر نہیں لی!“

میں احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ تو میری سمجھ میں اب آیا کہ میں نے کیا کیا تھا۔ ذرا سنبھلا تو میں نے کہا۔ ”میں بے بس تھا بے بی! میں مجبور تھا!“

وہ رو رہی تھی۔ اس کی سسکیاں مجھے ہلا رہی تھیں۔ ”ہم نے تمھیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ڈینی... بہت کوشش کی۔ لیکن لگتا تھا کہ ظالم دنیا نے تمھیں نگل لیا ہے۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ مر جاؤں۔ حیران ہوں کہ میں مر کیوں نہیں گئی۔“

اس کی خوش بو کے سوا مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ میں نے اسے لپٹالیا۔ برسوں کے بعد مجھے ایسا سکون ملا تھا۔

”میں دوبارہ یہ سب کچھ نہیں سہہ سکوں گی ڈینی۔“ اس نے میرے سینے میں مُنہ چھپائے چھپائے کہا۔

تب میرے لیے سب کچھ آسان ہوگیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ کیا ہونا چاہیے۔ ”اب اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ اب ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔“

اس نے بچوں کی سی معصومیت سے مجھے دیکھا۔ ”سچ کہہ رہے ہو ڈینی؟“

اس روز وہ پہلا موقع تھا کہ میں مسکرایا۔ ”بالکل سچ نیلی...!“ میں نے کہا۔ ”تم سمجھتی ہو کہ میں واپس جانے کے لیے آیا ہوں۔ نہیں نیلی! اب کچھ بھی ہو، ہم ساتھ رہیں گے۔ جو کچھ بھی کریں، مل کر کریں گے۔“

* * *

وہ وہی چائنیز ریسٹورنٹ تھا جہاں ہم پہلی بار گئے تھے۔ وہاں بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔

نیلی نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ”تمھیں اب بھی یاد ہے؟“

میں مسکرایا۔ ”بھولا ہی کب تھا۔“

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟ پتا ہے، میں اکثر سو کر اٹھتی تھی تو میری آنکھیں سرخ ہوتی تھیں۔ اور میری بہن کہتی تھی کہ میں خواب میں روتی رہی ہوں۔“

میں نے اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔ ”دیکھ لو۔ یہ خواب نہیں ہے۔“

”اگر میں خواب دیکھ رہی ہوں تو میں جاگنا نہیں چاہتی...“ اس نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ میں سوتی رہوں اور یہ خواب دیکھتی رہوں۔“

”تم جاگ رہی ہو نیلی؟“

اس نے اور مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں تم سے محبت کرتی ہوں ڈینی... اس لمحے سے جب میں نے پہلی بار تمھیں دیکھا تھا۔ تمھارے بعد کوئی بھایا نہیں۔ میں کسی کے ساتھ بھی نہیں گئی۔ تم کیا گئے، دل ہی اُجڑ گیا۔“

مجھے احساسِ جرم ستانے لگا۔ میں اس سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔

”سچ کہہ رہی ہوں ڈینی! ماما نے بہت کہا کہ کیا یونہی بیٹھی رہوگی عمر بھر۔ مگر مجھے یقین تھا کہ تم واپس آؤ گے۔ میں ابتدا ہی سے یہ بات جانتی تھی۔ پھر میکسی فیلڈز کے ہاں کام کرنے والی اس لڑکی نے آ کر تمھارے بارے میں بتایا تو میرے یقین کی تصدیق ہوگئی۔“

میں بری طرح چونکا۔ ”کس لڑکی کی بات کر رہی ہو تم؟“

”مس ڈورف مین۔ تمھیں وہ یاد نہیں؟ بہ ہر حال، وہ اپنے بھائی کے ساتھ لیبر ڈے کے چند روز بعد اسٹور میں آئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ تم ان سے ملے تھے اور تم خیریت سے ہو اور تم نے میرے لیے پیار بھجوایا ہے۔ اس نے بتایا کہ تمھیں فیلڈز کی طرف سے پریشانی ہے۔ معاملات ٹھیک ہوتے ہی تم واپس آجاؤ گے۔“

مجھے ڈیبورا پر پیار آگیا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ دنیا میں ایسے پیارے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی محبت کو محبوب کے پاؤں کی زنجیر نہیں بناتے۔ بلکہ اس کی خوشی کی فکر کرتے ہیں۔ اگر ڈیبورا نے مجھ پر یہ احسان نہ کیا ہوتا تو شاید نیلی اس وقت یہاں نہ ہوتی۔

وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”وہ کہتے ہیں کہ تم نے اس رات کی فائٹ ہارنے کے بدلے فیلڈز سے رقم لی تھی۔ کیا یہ سچ ہے ڈینی؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ایک بات اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔ ”وہ کون؟“

”میمی تمھیں ڈھونڈتے ہوئے میرے پاس آئی تھی۔ تمھارے غائب ہونے کے ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔ تو میں اور زیپ اسے مسٹر واٹکن کے پاس لے گئے۔ مسٹر واٹکن کو فیلڈز نے یہ بات بتائی۔“ وہ اب بھی مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا یہ سچ ہے ڈینی؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے زخمی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا ڈینی؟ اور مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا...“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”مجھے رقم کی ضرورت بھی تھی... تاکہ پاپا وہ اسٹور خرید سکیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ فیلڈز کی بات نہ مانتا تو وہ مجھے نقصان پہنچا کر مجھے فائٹ کے قابل ہی نہ چھوڑتا۔ اور میں نے فائٹ ہارنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن میرا حریف نہایت نااہل تھا۔ اسے جیتنا آتا ہی نہیں تھا۔“

”لیکن میمی نے بتایا کہ اس رات تمھارے والد نے تمھیں گھر میں گھسنے ہی نہیں دیا...“ وہ بولی۔ ”تو تم میرے گھر کیوں نہیں آگئے۔ تم نے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟“

”مجھے تو یہاں سے بھاگنا تھا۔ فیلڈز میری جان کے در پے تھا۔“

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ”یہ سب کتنا خوف ناک ہے۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا اس پر۔ دو سال گزر گئے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم پر کیا گزری۔ کیسے کیسے وسوسے ہمیں ستاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کی بات پر یقین کریں۔“

اس کے دکھ اور لہجے کی شکستگی نے مجھے دہلا دیا۔ ”بہتر ہوتا کہ میں واپس ہی نہ آتا...“ میں نے دل گرفتگی سے کہا۔ ”میں نہ آتا تو تم بالآخر مجھے بھول جاتیں اور سب کچھ ٹھیک ہوجاتا۔“

”ایسا مت کہو ڈینی...!“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”آئندہ بھی کبھی ایسی بات نہ کہنا۔ مجھے کسی بات کی پروا نہیں... جو ہوا، اس کی بھی، اور جو ہونا ہے، اس کی بھی۔ بشرطیکہ تم میرے پاس ہو۔ اب میں تمھیں جانے نہیں دوں گی۔“ میرے ہاتھ پر اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

ویٹر نے ہمارا آرڈر سرو کیا۔ ہم کھانے میں مصروف ہوگئے۔

”تم بہت دبلے ہوگئے ہو۔“ اچانک اس نے کہا۔

”نہیں۔ ان دو برسوں میں میرا وزن دس پونڈ بڑھا ہے۔“

وہ مجھے پُرخیال نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”ممکن ہے لیکن بہ ہر حال، تم دبلے لگ رہے ہو۔ پہلے تمھارا چہرہ گول تھا... اس قدر لمبوترا نہیں تھا۔“

”شاید یوں ہے کہ اب میں لڑکا نہیں رہا۔“

”ہاں، یہی بات ہے...“ اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”ہاں ہاں... جب تم گئے تھے تو لڑکے تھے۔ اب تم بڑے ہوگئے ہو۔“

”تو یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ تم بھی بڑی ہوگئی ہو۔“

اس نے انگلی سے میرے چہرے کو نرمی سے چُھوا۔ ”ہاں، تم بدل گئے ہو۔ یہ بتاؤ، تمھارے گھر والوں نے تمھیں دیکھا تو کیا کہا؟“

”میں ان سے ملا ہی نہیں۔“

”نہیں ملا...!“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”کیوں ڈینی؟“

”پتا نہیں۔ شاید میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔“ میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ”اور شاید وہ بھی مجھ سے ملنا نہ چاہیں... اتنا کچھ ہونے کے بعد... مجھ پر ضرورت کے وقت گھر کے دروازے بند کرنے کے بعد۔“

اس نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”کچھ معاملات میں تم اب بھی چھوٹے سے بچے ہو...“ اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے، وہ تم سے ملنا چاہیں گے۔“

”سچ مچ تم ایسا سمجھتی ہو؟“ میں نے تلخی سے کہا۔ لیکن مجھے خوشی تھی کہ اس نے یہ بات کہی۔

”میں میمی اور تمھاری ماما کے بارے میں یقین سے یہ بات کہہ رہی ہوں...“ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ ”تمھیں معلوم ہے کہ میں اور میمی تمھارے سلسلے میں مسٹر واٹکن سے ملے تھے۔ پھر ان کی شادی ہوگئی۔ میمی کا ایک بیٹا ہے۔“

مزید حیرتیں! ”شادی کا تو مجھے علم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بیٹے کا نہیں۔ یہ کب کی بات ہے؟“

”پچھلے سال کی۔ اور اب وہ پھر ماں بننے والی ہے۔“

”تم اس کے متعلق اتنا کچھ کیسے جانتی ہو؟“ میرے لہجے میں تجسس تھا۔

”ہر مہینے فون پر ہمارے بات ہوتی ہے... اس اُمید پر کہ شاید تمھاری کوئی خبر ملی ہو۔“

مجھے خوشی ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ میمی مجھے مِس کرتی تھی۔ ”میں نے میمی کی شادی کی خبر پڑھی تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”مسٹر واٹکن میمی کے لیے بہت اچھے ہیں۔“ نیلی نے جلدی سے کہا۔ ”انھوں نے تمھارے والدین کے لیے بھی بہت

کچھ کیا۔ تمہارے پاپا کو کاروبار میں مدد دی۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے سب سے زیادہ اسی بات کی فکر تھی۔ پچھلے چند برسوں میں مجھے یقین ہوگیا تھا کہ پاپا کسی سہارے کے بغیر کھڑے ہونے... چلنے والے نہیں ہیں۔ اچھا ہے' انھیں سام کا سہارا مل گیا۔ اب یہ پتا نہیں کہ سام میرے بارے میں کس انداز میں سوچتا تھا۔ کیا وہ مجھ سے خفا ہوگا؟ یقیناً ہوگا... اور اس میں اس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ وہ حق بہ جانب تھا۔

"تم ان سے ملنے جاؤ گے؟" نیلی نے مجھے چونکا دیا۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن ڈینی' یہ ضروری ہے۔ وہ تمہاری فیملی ہے۔"

"پاپا کے نزدیک میں گندہ انڈا ہوں..." میں نے بے رحمی سے کہا۔ "اور تمھیں وہ کیا سمجھتے ہیں' یہ بھی مجھے معلوم ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے..." وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ وہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ لیکن پھر بھی تمھیں جانا چاہیے۔"

"میں نہیں جاؤں گا...!" میں نے سختی سے کہا۔ "میں تمہارے لیے آیا ہوں' ان کے لیے نہیں۔"

* * *

ہم اس ڈور وے میں ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے... دو برس پہلے کی طرح۔ اچانک وہ رونے لگی۔ میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر' اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا بات ہے نیلی؟"

"میں بہت خوف زدہ ہوں ڈینی۔ میں نہیں چاہتی کہ اب تم مجھے چھوڑ کر جاؤ۔ اس بار گئے تو تم کبھی واپس نہیں آؤ گے۔"

"میں جاؤں گا ہی نہیں۔ میں تمھیں گڈ نائٹ کہہ رہا ہوں' گڈ بائی نہیں۔"

"نہیں ڈینی' نہیں۔ میں نے تمھیں جانے دیا تو تم کبھی نہیں آؤ گے۔" وہ بچوں کی طرح بلکنے لگی۔

"مت رو نیلی... پلیز!"

اس کے لہجے کا خوف اور بڑھ گیا۔ "تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ ڈینی۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

"میں تمھیں کبھی نہیں چھوڑوں گا نیلی۔" میں اسے تھپکتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی سسکیاں تھم گئیں۔

وہ میرے سینے میں مُنہ چھپائے کچھ بول رہی تھی۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ سننے کے لیے مجھے کان لگانے پڑے۔ "کاش کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں ہم جا سکتے... جہاں ہم ساتھ رہ سکتے۔ وہاں میں بیٹھ کر تمھیں دیکھتی رہتی اور کہتی... میرا ڈینی واپس آگیا ہے۔" اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "میں آج رات گھر نہیں جانا چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی بہن کے ساتھ سوؤں اور صبح اٹھ کر سوچوں کہ تمہارا آنا محض ایک خواب تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ رہوں' تمہارا ہاتھ تھام کر بیٹھی رہوں اور جب صبح ہو تو کہوں کہ یہ خواب نہیں۔ میرا ڈینی اب بھی میرے ساتھ ہے۔"

"میں صبح تمہارے پاس آجاؤں گا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں... تم نہیں آؤ گے..." اس کا لہجہ یاس آمیز تھا۔ "اگر میں نے اس بار تمھیں جانے دیا تو تم واپس نہیں آؤ گے۔ کچھ نہ کچھ ایسا ہو جائے گا کہ تم واپس نہیں آسکو گے۔" اس کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔ "آخری بار بھی تم نے یہی کہا تھا ڈینی... یاد ہے نا تمھیں؟ تم نے کہا تھا' حالات کچھ بھی ہوں... میں یہ نہ بھولوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ یہی کہا تھا نا؟ پھر تم واپس نہیں آئے۔ لیکن مجھے تمہاری بات یاد رہی۔ میں نے یاد رکھا۔" اب آنسو اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے مسکرانے کی... بات کو شگفتہ بیانی سے ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ "لیکن نیلی' ہم اس ڈور وے میں پوری رات تو نہیں گزار سکتے۔"

"تو کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جہاں ہم رات گزار سکیں..." اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "جہاں میں بیٹھ کر تم سے بات کرسکوں' تمہارا ہاتھ تھام کر بیٹھی رہوں یہاں تک کہ آج گزر جائے اور کل آجائے۔ اور مجھے یقین آجائے کہ یہ خواب نہیں ہے۔"

●

کھڑکی سے در آنے والی دھوپ میری آنکھوں میں چُبھی تو آنکھیں کھل گئیں۔ وہ پہلو کے بل لیٹی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر اپنے ہاتھ پر ٹکا تھا اور نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

میں ایک لمحے' بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں بھی مسکرا دیا۔ مجھے رات کی یاد آئی۔ میرے جسم میں توانائی سی دوڑ گئی۔ "دیکھا تم نے..." میں نے کہا۔ "رات گزر گئی۔ نئی صبح آگئی۔ میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔"

اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ پھر کھڑکی کی طرف اور

میرے چہرے کو دیکھا۔ "ہاں... صبح ہوگئی۔"

"اور اس وقت تم اور زیادہ خوب صورت لگ رہی ہو۔"

اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "اور تم سوتے میں بہت خوب صورت لگ رہے تھے..." اس نے سرگوشی میں کہا۔ "میں رات بھر بیٹھی تمھیں دیکھتی رہی۔ سوتے میں تم چھوٹے سے لڑکے لگ رہے تھے۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ جاگنے کے بعد میں بُرا لگ رہا ہوں؟" میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

وہ ہنسنے لگی۔

"اور سنو... تم سوئی نہیں؟ رات بھر جاگتی رہیں؟"

"ہاں۔ سونا ہوتا تو گھر نہ چلی جاتی..." اس نے کہا۔ پھر بولی۔ "تمھاری تو پسلیاں نظر آنے لگی ہیں۔ بہت دُبلے ہوگئے ہو تم؟ تمھیں بہت کھلانا پڑے گا۔"

"تو ابھی سے شروع کردو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے مجھے۔"

وہ میرے چہرے کو انگلی سے سہلانے لگی۔ "ڈینی! تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟"

"نہ کرتا ہوتا تو اس وقت یہاں نہ ہوتا۔"

"سچ کہہ رہے ہو نا؟"

"اس میں جھوٹ بولنے کی گنجائش ہی کہاں ہے؟"

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ "بار بار کہتے رہو کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے۔ اچھا لگتا ہے۔"

میں... آئی لَو یُو نیلی... آئی لَو یُو نیلی... کی گردان کرتا رہا۔

چرچ کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ رُک گئی اور سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "ڈینی! میرے ساتھ اندر چلو گے؟"

میں نے چرچ کو اور پھر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔ میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم چرچ میں داخل ہوگئے۔ اندر نیم تاریکی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولی۔ "ڈینی! تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر تشکر آمیز مسکراہٹ مچلنے لگی۔ "اگر میں پہلے یہاں نہ آتی تو وہ سب کچھ بعد میں مجھے دُرست نہ لگتا۔"

وہ آگے بڑھی اور قربان گاہ کے سامنے جھک گئی۔ چند لمحے وہ وہاں آنکھیں بند کیے سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر وہ سیدھی ہوئی اور پلٹ کر میرے پاس چلی آئی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرہ دمک رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس نے میرا ہاتھ اور چرچ سے نکل آئے۔ ہم باہر آئے اور آگے بڑھنے چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ " میں بہتر محسوس کررہی ہوں۔" اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

"مجھے خوشی ہے۔"

"مجھے اندر جانا ہی تھا ڈینی۔ ورنہ یہ سب کچھ مجھے نہ لگتا۔"

"اچھا ہُوا..." میں نے کہا۔ "ایسی دُلہن مجھے اچھی لگتی جسے سب کچھ غلط لگ رہا ہو۔" پھر میں نے سیٹی کیب کو روکا۔ میں نے دروازہ کھولا اور سہارا دے کر کیب میں بٹھایا۔

ڈرائیور نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "سٹی پلیز۔" میں نے اس سے کہا۔

* * *

چند منٹ... صرف چند منٹ بعد ہم ٹاؤن ہال سے ٹاؤن ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر ہم نے ایک دوسر دیکھا۔ ہم صرف چند منٹ کے لیے ٹاؤن ہال میں گئے تھے باہر آگئے تھے۔ لیکن ان چند منٹوں میں سب کچھ بدل چکا تھا

اب ہم شادی شدہ تھے!

نیلی نے میری بانہہ تھام لی۔ "ہم لوگ سب سے میرے گھر والوں کو یہ خبر سنائیں گے۔" اس نے کہا۔

"اوکے۔"

"پھر ہم تمھارے گھر والوں سے ملیں گے اور بتائیں گے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیوں؟ ان کا اس کیا واسطہ؟ اور انھیں اس کی پروا بھی نہیں ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ایک ضدی چمک... ایک استقلا "لیکن میرے لیے اس بات کی بہت اہمیت ہے۔ میں ضرور بتاؤں گی۔"

"تم سمجھتی نہیں۔ انھیں ہماری کوئی پروا نہیں، بلکہ وہ ہمیں سمجھتے ہیں۔ اور تمھیں تو... نہیں نیلی، انھیں بتانے کی ضرو نہیں۔" میں نے احتجاج کیا۔

وہ میرا بازو سختی سے دباتے ہوئے مسکرائی۔ "ڈینی فنڈ جانتے ہو کہ ہماری ازدواجی زندگی کا آغاز جھگڑے سے لڑ کر اس نئی زندگی کا افتتاح کریں؟ اگر ایسا ہے تو میں اس ہاں... یہیں... اسی وقت۔"

نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ فرطِ محبت تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ "نن... میں یہ نہیں چاہتا۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"بس تو پھر انھیں بتائیں گے۔"

"ٹھیک ہے نیلی۔ ہم انھیں بتائیں گے۔" میں نے کہا اور ہاتھ تھام کر ٹاؤن ہال کی سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ "بلکہ تم تو میں ریڈیو اسٹیشن جا کر اعلان کرنے کو بھی تیار ہوں۔ ری دنیا کو اس کا علم ہوجائے۔"

وہ خوش ہوکر ہنسی اور میری طرف دیکھا۔ "واقعی... یہ آئیڈیا ی بہت اچھا ہے۔"

* * *

بان نے ہمیں روکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی ہوں میں استفسار تھا۔

"مسٹر واٹکن کا اپارٹمنٹ پلیز۔" میں نے کہا۔

اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں "مسٹر گورڈن کے اپارٹمنٹ کا نمبر C21 ہے... ایکس یں منزل۔"

ہم ایلی ویٹر کی طرف بڑھے۔ دروازہ ہمارے عقب میں ہو گیا۔

لفٹ میں مَیں نے سرگوشی میں نیلی سے پوچھا۔ "یہ مسٹر وران کا کیا مطلب ہے؟" لفٹ آپریٹر دروازے کی طرف کیے کھڑا تھا۔

"گزشتہ سال اس نے قانونی طور پر اپنا نام تبدیل کرلیا " نیلی نے بھی سرگوشی میں کہا۔

میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ واٹکن نام بروک لین کی حد تو مناسب تھا۔ لیکن سینٹرل پارک ساؤتھ کے اس علاقے ان ہوش اپارٹمنٹس میں گورڈن ہی زیادہ مناسب لگتا تھا۔ یہ کا اپنا نام تھا، اوقات بدل جائے تو لوگ باپ تک کا نام دیتے ہیں۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ نو بج چکے تھے۔ نیلی کے کے بعد ہم نے ڈنر کیا تھا۔ پھر ہم پاپا اور ماما کی گئے تھے۔ وہ اب واشنگٹن ہائٹس میں رہتے تھے۔ بہت تھی... لیکن اس جیسی نہیں۔ وہاں دربان نے ہمیں بتایا کہ منگل کی رات وہ دونوں اپنی بیٹی کے گھر پر ڈنر کرتے ہیں۔ چناں چہ ہم سام کے اپارٹمنٹ چلے آئے تھے۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ کیسے ہوں گے... کیا ردِّعمل ہوگا ان کا؟ میرے اندر ایک اضطراب سا اُمڈنے لگا۔ نیلی کے گھر والوں کا رویّہ تو برا نہیں تھا۔

جب ہم گئے تو دروازہ نیلی کے ڈیڈی نے کھولا تھا۔ وہ بہت غصے سے ہمیں دیکھتے رہے۔ جانے کیا سوچ رہے ہوں گے، یہ میں نہیں سمجھ پایا۔ مگر پھر وہ ایک طرف ہٹے اور انھوں نے ہمیں اندر جانے کے لیے راستہ دیا۔ اور ہم اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔

پھر اچانک نیلی کی ماں چیختی ہوئی ہماری طرف لپکی۔ انھوں نے نیلی کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور رونے لگیں۔ میں دروازے پر کھڑا رہا۔ مجھے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا جیسے میں بن بلایا مہمان تھا۔ میں انھیں دیکھتا رہا۔ اب نیلی بھی رو رہی تھی۔ اور میں اور اس کے ڈیڈی ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ ہم دونوں کی سمجھ میں اپنی پوزیشن نہیں آرہی تھی۔

پھر اچانک دوسرے کمرے سے ایک مسرت بھری چیخ سنائی دی... "ڈینی!" اور زیپ میری طرف لپکا۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور بانہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے لپٹا لیا۔

پھر نیلی کی چھوٹی بہن کمرے میں آئی۔ اور وہ بھی رونے لگی۔

ذرا سی دیر میں ماحول بدل گیا۔ نیلی کے ڈیڈی ہچکچاتے ہوئے اندر گئے اور وائن کی ایک بوتل نکال لائے۔ سب نے مل کر ہمارے لیے جامِ صحت تجویز کیا۔

بوتل ختم ہوتے ہوتے بے تکلفی کی فضا بن گئی۔ جو کچھ ہم نے کیا تھا، اس پر وہ لوگ بہت خوش تو نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے عالی ظرفی اور خوش دلی سے اسے قبول کرلیا تھا۔ ماما پیٹو نیلی کے مختصر سے سامان کی پیکنگ میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ انھوں نے ہمیں کھانے پر روکنے کی کوشش کی۔ لیکن ہم نے نرمی اور سلیقے سے ٹال دیا... یہ کہہ کر کہ ابھی ہمیں میرے گھر والوں سے بھی ملنا ہے۔

لفٹ رُکی، اس کے دروازے کھلے۔ لفٹ آپریٹر نے سر باہر نکال کر ہمیں بتایا۔ "ہال کے اس طرف چوتھا دروازہ مسٹر گورڈن کا ہے۔"

ہم اس طرف چلے گئے۔ دروازے پر سام گورڈن کی نیم پلیٹ موجود تھی۔ میں نے بزر کا بٹن دبایا اور اندر کہیں جل ترنگ بجنے لگے۔ "زبردست!" میں نے نیلی کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

ہال وے کی مدھم روشنی میں اس کے چہرے کی رنگت زرد لگ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ہم

دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی ہتھیلیاں نم ہو رہی تھیں۔

بالآخر دروازہ کھلا۔ وہ ایک سیاہ فام عورت تھی... خادمہ کی وردی میں۔

"ہمیں مسٹر واٹ... میرا مطلب ہے' مسز گورڈن سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے بے تاثر نظروں سے مجھے دیکھا۔ "آپ کا نام' پلیز؟" اس نے دھیمی خوش گوار آواز میں پوچھا۔

"میں ان کا بھائی ہوں۔"

خادمہ کی آنکھیں کچھ پھیل سی گئیں۔ وہ احترام سے ایک طرف ہٹی۔ "آپ یہاں چند لمحے انتظار کریں گے' پلیز!"

ہم محرابی دروازے والے برآمدے میں کھڑے ہو گئے اور نشست گاہ کا جائزہ لینے لگے۔ خادمہ اندر چلی گئی۔ وہ ڈیوڑھی نیلی کے پورے اپارٹمنٹ سے بھی بڑی تھی۔ اندر کسی کمرے سے لوگوں کی دھیمی آوازیں بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اچانک خاموشی چھا گئی اور خادمہ کی آواز سنائی دی۔

"باہر ایک جینٹل مین اور ایک لیڈی موجود ہیں..." خادمہ نے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ انھیں مسز گورڈن سے ملنا ہے۔"

پھر میں نے میمی کی آواز سنی۔ "تم نے پوچھا بھی کہ وہ کون ہیں؟" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

"جی مام' میں نے پوچھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے بھائی ہیں۔ اور..."

وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکی۔ میمی نے ہیجانی آواز میں کہا۔ "یہ ڈینی ہے... یہ ڈینی ہے۔" اور اگلے ہی لمحے وہ ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

ہم چند لمحے ساکت کھڑے رہے۔ پہلی نظر میں تو مجھے لگا کہ وہ بالکل نہیں بدلی ہے۔ لیکن غور سے دیکھنے پر تبدیلیاں نظر آئیں۔ اس کی آنکھوں کی رنگت گہری ہو گئی تھی اور ان کے نیچے ہلکے نیل گوں حلقے تھے جیسے وہ اچھی نیند سے محروم ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ دوبارہ ماں بننے والی تھی۔ لیکن اس کے دہانے کے قریب بھی مجھے چند لکیریں نظر آئیں جو پہلے نہیں تھیں۔

پھر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بے تابانہ میرے چہرے کو چومنے لگی۔ "ڈینی..." اس نے سرگوشی میں کہا۔ "کیسی خوشی ہو رہی ہے تمھیں دوبارہ پا کر۔" اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں مسکرایا۔ مجھے بھی اسے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ عجیب بات تھی۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہو سکا تھا کہ میں کمی محسوس کرتا ہوں... کتنا مس کرتا ہوں اسے۔ ہم ساتھ تھے تو ہمیشہ لڑتے رہتے تھے۔ اندر کتنی محبت ہے اس کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا۔

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے دوسرے کمرے کی کھینچنے لگی۔ "آ جاؤ... ماما اور پاپا بھی یہیں موجود ہیں۔" میں نے کندھوں کے پیچھے سے نیلی پر نظر ڈالی۔ وہ ہوئے سر ہلا رہی تھی۔ پھر وہ بھی ہمارے پیچھے آنے لگی مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔

ماما اور پاپا وہاں ایک کاؤچ پر بیٹھے تھے۔ درواز طرف ان کی پیٹھ تھی۔ لیکن وہ پلٹ کر دروازے کی طرف رہے تھے۔ ماما کا ایک ہاتھ ان کے سینے پر تھا اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پاپا کے چہرے پر ہلکی سی حیرت تھی۔ ان ہونٹوں میں سگار دبا تھا۔ سام ان کے سامنے کھڑا تھا... ہاتھ ایک بڑا جام لیے۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی چمک تھی۔

میمی نے مجھے ماما کے سامنے لے جا کر کھڑا کیا' تب میرا ہاتھ چھوڑا۔ ماما پلکیں جھپکائے بغیر میری آنکھوں میں رہی تھیں جیسے یہ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ جدائی کے عرصے میں مجھ پر کیا گزری۔

"ہیلو ماما!" میں نے دھیرے سے کہا۔

انھوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے کوٹ کو چھوا پھر ان کا آستین کی طرف آیا' یہاں تک کہ انھیں میرا ہاتھ مل گیا۔ پھر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور انھوں نے مجھے طرف کھینچ لیا۔ ان کے ہونٹ میرے ہاتھ پر جم گئے۔ بلونڈی!" انھوں نے سرگوشی میں کہا۔ "میرا بچہ!" ان کے میں دل شکستگی واضح تھی۔

میں کھڑا ان کے جھکے سر کو دیکھتا رہا۔ ان کے سارے سفید ہو چکے تھے۔ یہی تو وہ لمحہ تھا جس سے میں خوف زدہ تھا۔ مجھے یہ خوف نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کیسے ملیں گے۔ مجھے خوف تھا کہ میں انھیں دیکھ کر کیا محسوس کروں گا۔ اور اب حیرت ہو رہی تھی' اپنے سکون اور اپنی بے تعلقی پر۔ جیسے میں کی کسی سیٹ پر بیٹھا پردے پر وہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میں اس منظر کا حصہ ہوں۔ جیسے وہ ڈینی فشر کوئی اور تھا جو دو پہلے ان سے دُور چلا گیا تھا اور کبھی واپس نہیں آیا تھا۔

تو یہ ہُوا تھا اس جدائی میں! ان برسوں نے اور تنہائی ہمارے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی تھی... ایسی خلیج

برائے توجہ

مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام ہے۔ جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حُرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کوئی جذبہ اس خلیج کو پاٹ نہیں سکتا تھا۔ اور وہ اسی طرح میرے سینے میں بھی تھی جسے کوئی جذبہ پاٹ نہیں سکتا تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سی اُداسی بھر گئی۔ [illegible] بڑی چیز سے ہم محروم ہو گئے تھے... اپنائیت... ہمارے درمیان نہیں پنپ سکے گی۔

[illegible] جھک کر ماما کے سر پر بوسہ دیا۔ "آئی ایم سوری" [illegible] کہا۔ لیکن کوئی نہیں سمجھ سکا ہوگا کہ میں کس بات پر [illegible] رہا ہوں۔

[illegible] رہا ہوا اور میں نے پاپا کی طرف دیکھا جو دُور [illegible] اور دیوار سے ٹک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی [illegible] میں ایک اکیلا پن اور عجیب سا ایک خوف تھا۔ میں نے [illegible] سے ہاتھ چھڑایا اور ان کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے [illegible] قدموں کی چاپ اور ماما کی سسکیوں کے سوا کوئی [illegible] تھی۔

[illegible] ان کے سامنے رُکا اور ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے [illegible] "ہیلو پاپا!"

[illegible] کی آنکھیں ایک لمحے کو اِدھر اُدھر بھٹکیں۔ پھر انھوں نے [illegible] کہا۔ "ہیلو ڈینی!" ان کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیسے ہیں پاپا؟"

"میں ٹھیک ہوں ڈینی۔"

[illegible] ہم دونوں کا ذخیرۂ الفاظ جواب دے گیا۔ کہنے کو [illegible] کمرے کی فضا میں آہستہ آہستہ کشیدگی اور سنگینی [illegible] لگی۔ میں نے سام کو سر کے اشارے سے سلام [illegible] جواب میں سر ہلایا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

[illegible] لوگ خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

[illegible] وجود میں دھیرے دھیرے مایوسی پھیلنے لگی۔ [illegible] مجھے پہلے سے توقع تھی کہ یہی کچھ ہوگا۔ میں واپس [illegible] یہاں کسی کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھر [illegible] کے باوجود میرے لہجے میں تلخی تھی۔ "دو [illegible] "میں نے ایک ایک چہرے کو دیکھتے ہوئے [illegible] مجھ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ ان دو [illegible] کیا کیا؟ مجھ پر کیا گزری؟ کیا محسوس کر رہا ہوں میں؟"

ماما اب بھی رو رہی تھیں۔ لیکن کوئی کچھ نہیں بولا۔

میں پاپا کی طرف مڑا اور سرد نظروں سے انھیں دیکھا۔ "نہیں پوچھیں گے آپ؟ یا آپ کو کوئی پروا ہی نہیں؟"

پاپا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر میمی ہی میری طرف لپکی۔ اس نے میرا بازو تھامتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "کیوں نہیں ڈینی۔ ہم سب کو پروا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تم اس قدر اچانک اور خلافِ توقع آئے ہو کہ سب گنگ ہو کر رہ گئے ہیں۔"

میں اب بھی پاپا کو گھور رہا تھا۔ میرے اندر سرد مہری میں لپٹا ہُوا سکون اُترنے لگا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ جس رات گھر کا دروازہ مجھ پر بند کر دیا گیا تھا' اس رات ہمارے باہمی تعلق میں کوئی بڑی اہم چیز کم ہو گئی تھی۔ اور وہ جو کچھ کم ہُوا تھا' جدائی کے یہ دو برس بھی اسے واپس نہیں لا سکے تھے۔ میں ان سب سے ملنا بھی چاہتا تھا لیکن میرے اندر اس کے خلاف مزاحمت بھی موجود تھی۔ اور اب تو کسی بھی بات کی اہمیت نہیں رہی تھی۔

میں وہاں اپنے لوگوں کے درمیان ایسے کھڑا تھا جیسے اجنبی!

میمی نے مجھے پاپا سے دُور لے جانے کی کوشش کی۔ "آؤ... یہاں بیٹھو اور ہمیں بتاؤ کہ کیا کرتے رہے تم؟ ہم سب تمھیں مس کرتے رہے۔"

میں نے اس کے وجود کے پار دیکھا۔ نیلی اب بھی دروازے میں ہی کھڑی تھی جیسے کوئی متروک وجود۔ وہ اذیت بھری نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیسے' میں نے سمجھ لیا کہ اس کی وہ اذیت اس کی اپنی نہیں' وہ میرے لیے ہے۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر میمی کی طرف متوجہ ہُوا۔ "میں رُک نہیں سکتا۔"

میں نے نرم لہجے میں کہا' کیوں کہ میں اسے دُکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ ایک وہی تو تھی جو ناکام سہی... لیکن خلیج کو پاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "مجھے جانا ہے۔ کچھ کام کرنے ہیں مجھے۔"

"لیکن تم ایسے نہیں جا سکتے ڈینی...!" میمی نے احتجاج کیا۔ اس کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔ "ابھی تو آئے ہو تم۔"

میری نگاہ پھر نیلی کی طرف اٹھی۔ "میں درحقیقت واپس نہیں آیا

''میں نے کہا۔ ''ہاں' میں نے کوشش کی تھی واپس آنے کی۔''

''لیکن ڈیبی۔'' میمی میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

میں اس کے احساسات سمجھ رہا تھا' جانتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں تھا۔ جو کھو گیا' وہ اب ملنے والا نہیں تھا۔

میں نے اس کے لرزتے ہوئے کندھے کو چھوا۔ ''روؤ مت میم' اس طرح سے کوئی بہتری نہیں ہوگی...'' یہ کہہ کر میں نیلی کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور پلٹ کر ان سبھوں کو دیکھا۔ ''آج میں یہاں آیا تو صرف اپنی بیوی کی خاطر...!'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ ہمیں آپ لوگوں کو لازمی طور پر بتانا چاہیے... یہ کہ آج صبح ہم نے شادی کرلی ہے۔''

میں نے ان کے چہروں کے تاثرات دیکھے۔ ماں کا دکھ' باپ کی ملامت اور حقارت... اور میں اپنے اندر یوں سہم گیا جیسے کسی نے مجھے کوڑا مارا ہو۔

''ایک یہی تو تھی' جو چاہتی تھی... دل سے چاہتی تھی کہ میں واپس آجاؤں۔'' میں نے کہا۔

میں چند لمحے انتظار کرتا رہا کہ شاید کوئی کچھ بولے۔ لیکن وہ سب چپ تھے۔ نیلی کے گھر والوں کو بھی ہمارا شادی کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن کم از کم انھوں نے انسان ہونے کا ثبوت تو دیا تھا۔ انھوں نے یہ تو ثابت کیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے بہ ہر حال' محبت کرتے ہیں۔ میرے گھر والوں کے پاس تو کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں تھا... مستقبل کی خوشیوں کے لیے ایک دعا بھی نہیں... کچھ بھی نہیں!

میرے اندر کی اذیت ایک دم تحلیل ہوگئی' اور اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ گئی۔ سینے کا ایک حصہ جیسے سن ہوگیا۔ میں نے ماما کے رخسار پر بوسہ دیا۔ وہ رو رہی تھیں۔ پھر میں نے میمی کا رخسار چوما اور اپنے پاپا کے سامنے سے گزرا۔ ان کے چہرے پر تلخی کی ایک نقاب سی تھی۔ میں بغیر کچھ کہے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

* * *

میں نے بستر پر بے چینی سے کروٹ بدلی۔ مجھے احساس تھا کہ میں سوتے میں روتا رہا ہوں۔ لیکن اب میں جاگ گیا تھا' اور میری آنکھیں خشک تھیں۔ میں نے پُرسکون ہو کر لیٹنے کی کوشش کی تاکہ نیلی ڈسٹرب نہ ہو۔

ہم ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں تھے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے تلخی سے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم تو بہت اچھی طرح جانتی تھیں کہ میں ان لوگوں سے نہیں چاہتا۔ جانتی تھیں نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور پھر بھی تم نے مجھے جانے پر مجبور کیا؟'' میرے میں تلخی تھی۔

اس نے میرے کندھے کو تھپتھپایا اور میری آنکھوں دیکھا۔ ''تمھارا جانا ضروری تھا ڈیبی...!'' اس نے خلوص کہا۔ ''نہیں تو ہماری ازدواجی زندگی میں ایک خلا رہ جاتا کبھی نہ بھرتا۔ تم خوش گمانی میں مبتلا رہتے' حقیقت کبھی جان پاتے۔''

میں نے مُنہ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک کہتی ہو۔ اب نے حقیقت جان لی۔''

''اب جو کچھ ہوا' اسے بھول جاؤ۔''

''بھول جاؤں...؟'' میں نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ''کچھ با ایسی تھیں جو وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ ''کوئی کیسے بھول سکتا وہ سب کچھ جو ساتھ مل کر کیا ہو... مشترکہ اُمیدیں' مشتر خوف... بھلا' برا۔ یہ تم آسانی سے کہہ سکتی ہو۔ لیکن میں بھول سکتا ہوں۔ کیا میں اپنے جسم کا سارا لہو گٹر میں بہا دو اچھا ہو یا برا' خوشی ہو یا غم' میں بھول کیسے سکتا ہوں؟ کیا اپنے والدین کو بھول سکتی ہو؟ کیا اچھا اور برا' رشتوں زیادہ اہم ہو سکتا ہے؟''

''نہیں ڈیبی' تم سمجھے نہیں...'' اس کے لہجے میں تھی۔ ''یہ سب بھولنے کی باتیں نہیں' یہ تو یاد رکھنے کی با ہیں۔ جو دکھ پہنچا' اسے بھول جاؤ۔ یہ وہ دکھ ہے' جو آ بنا دیتا ہے۔ دکھ جو آدمی کو تلخ' سخت اور غصہ ور بنا دیتا جیسے تم اس وقت ہو رہے ہو۔ میں اس دکھ کو بھلانے کی با کر رہی ہوں۔''

میں اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ''یہ بھی کیسے بھول ہوں میں؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''یہ اس تعلق ہی حصہ ہے۔''

''نہیں ڈیبی' ایسا نہیں ہے۔ یہ اَور بات ہے...'' وہ مجھ لپٹ گئی اور مجھے چومنے لگی۔ ''میں تمھارا یہ دکھ بھلا دوں گی دور کردوں گی۔ میں تمھیں ایسا کردوں گی کہ تمھیں صرف باتیں یاد رہیں گی۔''

''ایسا کوئی کیسے کرسکتا ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میں کرسکتی ہوں اور کردوں گی...'' اس نے سرگوشی میں ''میرے پاس تمھارے لیے اتنی محبت ہے... اتنی کہ تمھیں کبھی کسی اور کی محبت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

تب میں سمجھ گیا۔ میں نے تشکر سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اس نے عہد کیا تھا مجھ سے' اور میں جانتا تھا کہ وہ سچی ہے۔ میں نے جان لیا کہ آنے والے وقت میں' وہ اچھا ہو یا برا' مجھے ہر آسائش' ہر طاقت اور مضبوطی اس کے وجود سے ملے گی۔ چاہے کچھ بھی ہو' اب میں کبھی تنہا نہیں ہوں گا۔

* * *

تبدیلی لانے والا دن

15 ستمبر 1936ء

ہم زینہ چڑھ رہے تھے۔ چوبی سیڑھیاں ہمارے بوجھ تلے چرچرا رہی تھیں۔ ہمارے لیے وہ دوستانہ آواز تھی جیسے وہ پرانی سیڑھیاں ایک نو بیاہتا جوڑے کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ مجھے وہ آواز اچھی لگی۔

میں جو سوٹ کیس اٹھائے ہوئے تھا' وہ زیادہ بھاری نہیں تھا۔ ہمارے پاس زیادہ کپڑے تھے ہی نہیں۔ سوچا تھا' بعد میں کماؤں گا تو اپنے اور اس کے لیے کچھ ڈھنگ کے کپڑے خریدوں گا۔ ابھی تو جو تھوڑی بہت رقم تھی' وہ گھر گرہستی کا سامان خریدنے میں صرف ہوگئی تھی' بلکہ اس کے لیے بھی ناکافی ثابت ہوئی تھی۔

چوتھی منزل پر وہ دروازے کے سامنے رُکی اور پلٹ کر مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ چابی اس کے ہاتھ میں تھی۔

میں جواباً مسکرایا۔ ''دروازہ کھولو جان' یہ ہمارا گھر ہے۔''

اس نے چابی قفل میں ڈالی اور اسے گھمایا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ میں نے سوٹ کیس ایک طرف رکھے' جھک کر اسے گود میں اٹھایا اور چوکھٹ پار کر کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا۔ وہ ہلکی پھول جیسی تھی۔ میں نے اسے اتار دیا۔

''خدا ہمارے گھر کو خوشیوں سے بھر دے' ڈیبی فشر۔'' وہ بولی۔

وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ پچیس ڈالر ماہانہ کرائے میں یہی مل سکتا تھا۔ تین کمرے اور ایک باتھ۔ پورے گھر میں ایک ہی رنگ تھا۔ لیکن بہ ہر حال' وہ صاف ستھرا تھا۔ گرم پانی کی سہولت بھی میسر تھی۔

اس فلیٹ کے لیے میں نے نو سو ڈالر کا فرنیچر خریدا تھا۔ پارلر کے لیے ایک لاؤنج اور کرسیاں' ایک بڑا ڈبل بیڈ' ایک ڈریسر جس میں آئینہ بھی لگا تھا۔ کچن سیٹ' دیگچیاں' برتن اور دوسری چیزیں۔ ہاتھ تو خالی ہوگیا لیکن گھر بھرنا بہت ضروری تھا۔ اور بہ ہر حال' ہم مقروض بھی نہیں تھے۔

''جاؤ... سامان بیڈ روم میں لے آؤ۔'' نیلی نے مجھ سے کہا۔

''جی بہتر مام۔'' میں نے خوش دلی سے کہا اور دروازے پر جا کر سوٹ کیس اٹھا لایا۔ انھیں میں نے بیڈ پر پٹخ دیا۔

''ڈیبی' یہ گندے سوٹ کیس بیڈ پر سے ہٹاؤ...'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ ہوٹل نہیں' ہمارا گھر ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا۔ عورت کو جیسے ہی گھر مل جائے' وہ مالکن بن جاتی ہے۔ میں نے جلدی سے سوٹ کیس نیچے رکھ دیے۔ پھر میں بیڈ کے نرم گدے پر قلابازیاں لگانے لگا۔ ''ذرا یہاں تو آؤ۔'' میں نے اس سے کہا۔

''کیوں؟'' وہ شک آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''تمھیں کچھ دکھانا ہے۔''

وہ ایک قدم میری طرف بڑھی' پھر رک گئی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے اسے اپنے اوپر کھینچ لیا۔

''یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے ڈیبی...'' وہ میری گدگدی سے بے حال ہونے لگی۔ پھر ہنستے ہوئے اس نے میری جسارتوں پر احتجاج کیا۔ ''پاگل ہوگئے ہو؟''

''ہو نہیں گیا' تم نے پاگل کردیا ہے مجھے...!'' میں نے کہا۔ ''آئی لو یو بے بی۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''ڈیبی' تمھیں کبھی کوئی پچھتاوا نہیں ہونے دوں گی میں۔''

''کیسا پچھتاوا؟''

''اس پر کہ تم نے مجھ سے شادی کی۔ میں بہترین بیوی ثابت ہوں گی۔''

میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ ''اس کا تو مجھے یقین ہے۔ کاش' میں تمھیں کبھی مایوس نہ کروں۔''

میری انگلیاں بھیگیں تو مجھے اس کے آنسوؤں کا احساس ہوا۔ ''ڈیبی... یاد رکھنا' میں نہ کبھی تم سے مایوس ہوں گی اور نہ میں کبھی پچھتاؤں گی۔''

* * *

ہم پردے لٹکا کر نمٹے ہی تھے کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ ''میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے دروازہ کھول دیا۔

نیلی کی ماما ایک پادری کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا شاپنگ بیگ تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر

مسکرائیں۔ "ہیلو ڈینی؟"

"ہیلو ماما پیٹیو۔" میں نے کہا۔ "آیئے... تشریف لایئے۔"

وہ ایک لمحے کو شرمندگی سے ہچکچائیں۔ "میں فادر برین کو ساتھ لائی ہوں۔"

میں پادری کی طرف بڑھا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "پلیز فادر، کم اِن۔"

میری ساس کے چہرے پر سکون نظر آیا۔ شاید انھیں مجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ فادر نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو ڈینی۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

کچن کی طرف سے نیلی نے پکارا۔ "کون آیا ہے ڈینی؟"

"تمھاری ماما اور فادر برین۔" میں نے جواب میں پکارا۔

وہ بھاگی بھاگی باہر آئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے ماں کے رخسار کو چوما اور فادر سے ہاتھ ملایا۔ "مجھے آپ کی آمد سے بہت خوشی ہوئی ہے فادر۔"

"میں تمھارا بوڑھا دوست ہوں میری بچی۔ مجھ سے رسمی باتیں مت کرو۔"

مسز پیٹیو نے محتاط نظروں سے میری طرف دیکھا اور شاپنگ بیگ زمین پر رکھ دیا۔ "میں گھر کے لیے کچھ چیزیں لائی ہوں۔" وہ بولیں۔

نیلی نے شاپنگ بیگ کھول کر اس میں جھانکا۔ پھر وہ اطالوی زبان میں جلدی جلدی کچھ بولنے لگی۔ اس کا لہجہ ہیجانی تھا۔ اس کی ماما نے بھی اطالوی میں ہی جواب دیا۔ پھر نیلی میری طرف مڑی۔ "ماما کچھ کھانے کی چیزیں لائی ہیں ہمارے نئے گھر کے لیے، تاکہ اس گھر میں کبھی بھوک نہ آئے۔" اس نے وضاحت کی۔

میں مسز پیٹیو کی طرف مڑا۔ لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کے بنیادی تفکرات مشترک ہی ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، جب ہم بروک لین والے گھر میں منتقل ہوئے تھے تو میری ماما بھی وہاں سب سے پہلے بریڈ اور نمک لے کر گئی تھیں۔ "شکریہ ماما۔" میں نے بے حد خلوص سے کہا۔

انھوں نے میرا رخسار تھپتھپایا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ اب تو تم میرے بیٹے ہو! کاش، میں وہ سب کچھ تمھیں دے پاتی جو دینے کو دل چاہتا ہے۔"

"کافی کے بارے میں کیا خیال ہے...؟" نیلی نے کہا۔ "ڈینی، تم جا کر کیک لے آؤ نا۔"

ماما پیٹیو نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، مجھے گھر پہنچ کر کھانا پکانا ہے اور فادر برین نیلی کو دعا دینے کے لیے آئے ہیں۔"

نیلی پادری کی طرف مڑی۔ "شکریہ فادر، مجھے سچ مچ بہت خوشی ہوئی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے ڈر تھا کہ..."

پادری نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ارے نہیں نیلی، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے بے شک اس پر مایوسی ہوئی کہ تمھاری شادی میرے ہاتھوں نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود میری خوشی تو اپنی جگہ ہے۔"

نیلی کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ "لیکن میں تو سمجھی تھی کہ ہماری شادی چرچ میں ہو ہی نہیں سکتی۔"

پادری ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اگر صحیح معنوں میں چرچ میں تمھاری شادی ہو تو تمھیں اعتراض تو نہیں ہوگا بیٹے؟"

لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نیلی بول پڑی۔ "یہ اچھا سوال نہیں ہے فادر! ہمارے درمیان اس پر کبھی بات نہیں ہوئی۔"

پادری نے اسے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ ہوا ہو گئی تھی۔ "تم جانتی ہو میری بچی کہ چرچ تمھاری شادی کو قبول تو کرتا ہے لیکن اسے مستند تسلیم نہیں کرتا۔"

نیلی کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ "میں جانتی ہوں فادر۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اور تم نے بچوں کے بارے میں سوچا...؟" فادر نے مزید کہا۔ "وہ کتنی برکتوں سے، کتنی مراعات سے محروم ہوں گے۔"

اس بار جواب میں نے دیا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ والدین کے عقیدے کی وجہ سے چرچ بچوں کو کوئی محرومی دے گا۔"

"یعنی تم اس بات کے خواہش مند ہو کہ تمھارے بچے چرچ کے سائے میں پروان چڑھیں؟" فادر نے کہا۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں فادر کہ بچے اپنے لیے عقیدہ منتخب کرنے میں آزاد ہوں گے۔ اور جب تک وہ اس فیصلے کی عمر کو پہنچیں گے، مجھے ان کی اپنی ماں کے چرچ سے وابستگی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

نیلی میرے قریب آئی اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میرا خیال ہے، ابھی یہ باتیں بہت قبل از وقت ہیں۔ ابھی تو شادی ہوئی ہے ہماری۔"

پادری نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ "نیلی، ایک کیتھولک ہونے کی حیثیت سے تم اپنی ذمے داریوں سے واقف ہو۔ بعد میں ناخوش ہونے سے بچنے کے لیے آدمی کو پہلے ہی ضروری فیصلے کر لینے چاہئیں۔"

"آپ کے تعلق خاطر کا شکریہ فادر...!" نیلی نے مضبوطی میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "لیکن یقین رکھیں کہ ہمیں وہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی جس میں ہم دونوں کی ی اور بہتری ہو۔ اور ہاں، اس طرف جب بھی آپ کا آنا ہو، ے گھر ضرور آیئے گا۔"

ادری کا چہرہ بے تاثر تھا۔ "ایک پادری کی زندگی میں تو ں مقام آتے ہی رہتے ہیں۔ اور وہ بھی انسان ہی ہوتا یہ الگ بات کہ لوگ رہنمائی اور دعا کے لیے اسی کی طرف تے ہیں۔ مجھے امید ہے... اور میں تمھاری خوشیوں کے لیے ا بھی کروں گا۔"

"ہم آپ کے شکر گزار رہیں گے فادر۔" میری بیوی نے ہا۔ وہ اب بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔

میں فادر برین کو رخصت کرنے دروازے تک گیا۔ وہاں ھوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "تم سے مل کر خوشی ہوئی ے بچے۔" انھوں نے کہا۔ لیکن اس بار نہ ان کے لہجے میں م جوشی تھی اور نہ ان کے ہاتھ کی گرفت میں۔

دروازہ بند ہوا تو نیلی اپنی ماں سے اطالوی میں شروع گی۔ مگر اس بار اس کا لہجہ تند تھا اور ماما کا انداز مدافعانہ۔ بلکہ ں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں بے بس کھڑا دیکھتا اور سنتا ا۔ میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر وہ مکالمہ ختم ہوا۔ ماما نے لی کو محبت سے لپٹا کر پیار کیا۔

نیلی میری طرف مڑی۔ "ماما شرمندہ ہیں کہ فادر کو یہاں یں۔ ان کا مقصد یہ نہیں تھا۔ یہ کہتی ہیں کہ اگر تمھیں توہین کا ماس ہوا ہے تو یہ شرمندہ ہیں۔"

میں ایک لمحہ انھیں دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا دیا۔ "آپ کو شرمندہ ے کی ضرورت نہیں ماما پیٹیو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ صرف ارے بھلے کی فکر کرتی ہیں۔"

اب کے انھوں نے مجھے لپٹا لیا اور میرا رخسار چوم لیا۔ "تم ے اچھے ہو ڈینی...!" انھوں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "بس تم ی نیلی کا خیال رکھنا۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں ماما..." میں نے نیلی کی طرف ہوئے ان سے وعدہ کیا۔ "یقین رکھیں، یہ کام میں زندگی ی سانس تک کروں گا۔"

نہ جانے کے بعد ہم نے اپارٹمنٹ سیٹ کیا۔ اس میں وگی۔ میں پارلر میں جا بیٹھا اور ریڈیو پر موسیقی سننے لگا۔

نیلی آئی اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "یہ بتاؤ، ڈنر میں کیا پسند کرو گے؟" اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"تمھارا مطلب ہے کہ تمھیں کھانا پکانا آتا ہے؟"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو..." اس نے غصے سے کہا۔ "میری بات کا جواب دو۔"

"پکانا چھوڑو۔ آج کھانا باہر کھائیں گے... سیلے بریٹ کریں گے۔"

"ہرگز نہیں۔ یہ بہت مہنگا پڑے گا۔ جب تک تمھیں جاب نہیں ملتی، ہمیں اپنی بچی کھچی رقم میں ہی گزارہ کرنا ہوگا۔ بعد میں جو جی چاہے کر لینا۔"

میں نے پہلی بار اسے احترام کی نظر سے دیکھا۔ ہر روز مجھے احساس ہوتا تھا کہ وہ کچھ اور بڑی ہو گئی ہے۔ میں اٹھا اور میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ "جو جی چاہے، پکا لو۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہاں بھی مجھے حیران ہی کرو گی..." میں نے کہا۔ "میں ذرا کام کی تلاش میں نکلتا ہوں۔"

باہر نکلا تو دھوپ میں میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں چند لمحے کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر سب وے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ میرے سامنے اچانک ایک سایہ سا آ گیا۔ بغیر دیکھے، میں اس سے کترا کر گزر رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ جانی پہچانی آواز میری سماعت میں پہنچی۔ "اب جب کہ تم یہاں آ بھی گئے اور سیٹل بھی ہو گئے ہو ڈینی، تو باس محسوس کرتا ہے کہ وہ تمھارے ایک وزٹ کا مستحق ہے۔"

مجھے سر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کون ہے، بلکہ میں تو کب سے اس تصادم کی توقع کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح کے لوگ کبھی کچھ بھولتے نہیں۔

اسپٹ میرے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کا حلیہ بدل گیا تھا۔ وہ ایک بیش قیمت سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا کہ میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ "میں ذرا جلدی میں ہوں۔" میں نے کہا اور آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

اس نے میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا اور اس کا دوسرا ہاتھ جیکٹ کی جیب کی طرف گیا۔ مجھے اس کی گن کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ "میرا خیال ہے، اب تمھیں اتنی جلدی نہیں رہی ہو گی ڈینی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب ایسی جلدی بھی نہیں ہے مجھے۔"

اس نے سائیڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کار کھڑی

تھی۔ اس کا انجن جاگ رہا تھا۔ "بس تو بیٹھ جاؤ۔"

میں نے دروازہ کھولا اور عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہاں کلکٹر پہلے سے موجود تھا۔ "ہیلو ڈینی!" اس نے آہستہ سے کہا اور پوری قوت سے میرے پیٹ میں گھونسا مارا۔ میں تکلیف کی شدت سے دہرا ہو کر کار کے فرش پر بیٹھ گیا۔ کار حرکت میں آ گئی تھی۔

"یہ سب کچھ نہ کرو۔" اسپٹ نے کہا۔ "باس کو برا لگے گا۔"

"یہ حرام زادہ میرا بہت مقروض ہے۔ کچھ حساب تو چکا لوں۔"

اسپٹ نے کالر سے تھام کر مجھے اٹھایا اور سیٹ پر بٹھا دیا۔ اب میں ان دونوں کے درمیان تھا۔ "اس پرانے حساب کے بارے میں باس سے کچھ نہ کہنا۔ ورنہ اگلی بار اس سے زیادہ سختی میں پڑو گے۔" اس نے مجھے دھمکی دی۔

میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس وقت تو میں کچھ سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ چند منٹ بعد میری سمجھ میں اس کی بات آئی... اگلی بار! اس کا مطلب صاف تھا... وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن اس بار میری بخشش ہو گئی تھی۔ کیوں... کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیوں کہ میکسی فیلڈز جیسے کینہ پرور اور منتقم مزاج لوگ کسی کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کرتے۔

کار فیلڈز کے اسٹور کے سامنے رُکی۔ ہم اترے۔ اسپٹ میرے آگے تھا اور کلکٹر میرے پیچھے۔ ہم اسٹور سے گزرے اور سیڑھیاں چڑھ کر فیلڈز کے اپارٹمنٹ تک پہنچے۔ اسپٹ نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے فیلڈز دہاڑا۔

"میں ہوں باس۔ ڈینی فشر کو ساتھ لایا ہوں۔" اسپٹ نے جواب دیا۔

"اندر لاؤ اسے۔" فیلڈز نے چیخ کر کہا۔

اسپٹ نے دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیلا۔ میرا پیٹ اب تک دُکھ رہا تھا۔ لیکن پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ اب کم از کم میں سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔

میکسی فیلڈز اپنی ڈیسک کے عقب میں بھاری ستون کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی دہکتی ہوئی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ "تو تم یہاں سے دور نہیں رہ سکتے تھے؟ تمہیں واپس بھی آنا تھا۔" یہ کہہ کر وہ گھوم کر میری طرف آیا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ بس اسے دیکھتا رہا۔ اب میں خوف زدہ نہیں تھا۔ اسپٹ نے اَن جانے میں مجھے بہت کام کی بات بتا دی تھی۔ پھر میں نے فیلڈز کے ہاتھ کو قوسی شکل میں گھوم کر اپنے چہرے کی طرف آتے دیکھا تو جبلی طور پر میں پھرتی سے جھک گیا۔

کمر پر لگنے والی تیز ضرب نے مجھے سیدھا ہونے پر مجب کر دیا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا ہوا اسپٹ تھا جس نے اپنے جا کے دستے سے وہ ضرب لگائی تھی۔ اس کے نتیجے میں فیلڈز دوسرا تھپڑ میرے رخسار پر پڑا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ لیکن بو کچھ نہیں۔ بولنا بات بڑھانے کے مترادف تھا۔ اور بات بڑھنا میرے مفاد میں نہیں تھا۔ فیلڈز جیسے انا پرست لوگوں فیصلے بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

فیلڈز کے دانت نکل پڑے۔ وہ بڑی بے رحمی مسکرایا۔ "واپس آنے والے تم اکیلے نہیں ہو۔" اس نے کہا پھر دوسرے کمرے کی طرف رُخ کر کے چلایا۔ "رونی میرے لیے ڈرنک لے کر آؤ۔ دیکھو تو، تمہارا ایک دوست مجھ سے ملنے آیا ہے۔"

میں نے اس دروازے کی طرف دیکھا۔ شاید میرے کا بج رہے تھے۔ پھر وہاں مجھے ڈیبورا نظر آئی۔ ڈرنک اس ہاتھ میں تھا اور اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ چ لمحے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ جھجکتے قدموں سے فیلڈز کی طرف بڑھی او ڈرنک اسے تھما دیا۔

فیلڈز شیطنت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "ہیلو نہیں کہو اپنے یار کو؟"

وہ میری طرف مڑی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خالی تھا۔ "ہیلو ڈینی!"

"ہیلو ڈیبورا!"

فیلڈز نے میری طرف دیکھا۔ "وہی پرانا انداز؟ بے کچھ بھی تو نہیں بدلا۔"

میں ڈیبورا کے بے تاثر چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ "ہاں، کچھ بھی نہیں بدلا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"فیلڈز کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں بدلتا۔ رونی بھلا مجھ دُور رہ سکتی تھی! خود ہی چلی آئی میرے پاس..." اس نے کہا۔ "کیوں رونی، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

ایک لمحے کو ڈیبورا کی آنکھوں میں شعلہ سا بھڑکا، مگر فوراً جل بجھا۔ "ہاں میکسی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

فیلڈز نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ "رونی اپنے میکسی کے ب رہ ہی نہیں سکتی۔ ہے نا رونی؟"

ڈیبورا کے ہونٹ تھرتھرائے۔ "ہاں میکسی۔"

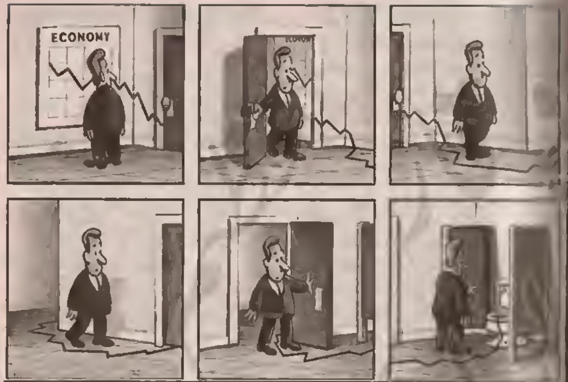

میکسی نے غصے سے اسے دُور دھکیل دیا۔ "اب تم دوسرے ے میں جاؤ۔" وہ دہاڑا۔

ڈیبورا میری طرف دیکھے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ں ایک لمحے کو دروازے پر اس کے قدم ٹھٹکے تھے جیسے وہ پلٹ کر مجھے دیکھنا چاہتی ہو۔

فیلڈز میری طرف مڑا۔ "میکسی فیلڈز کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا... کوئی بھی نہیں۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تو اس نے ثابت کر دکھایا تھا۔ میں سوچ رہا تھا... ڈیبورا کیوں واپس آئی؟ اور بین کا کیا بنا؟

فیلڈز اپنی ڈیسک کے پیچھے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب مجھے گھور رہا تھا۔ "یاد رکھنا ڈینی، میکسی فیلڈز سے کوئی نہیں [illegible]۔"

"میں یاد رکھوں گا۔"

اس نے اپنا جام خالی کیا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "او کے... اب تم جا سکتے ہو۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں ہل بھی نہیں [illegible] اتنی آسانی سے...!

"تم نے سنا نہیں۔" وہ دہاڑا۔ "دفع ہو جاؤ اور مجھ سے [illegible] اگلی بار خوش قسمتی تمہارا ساتھ نہیں دے گی۔ اگلی بار [illegible] ایسا نہیں ہوگا۔" اسی وقت میز پر رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا اور ماؤتھ پیس میں دہاڑا... "ہیلو..." مگر دوسری طرف کی آواز سنتے ہی اس کا لہجہ، اس کے چہرے کا تاثر اور اس کی آواز بھی کچھ بدل گیا۔ "ہیلو سام!" اس نے بڑی تہذیب سے کہا۔ پھر وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ اچانک اسے میرا خیال آیا تو اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اسپٹ، اگر یہ خود سے نہیں جاتا تو اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

مجھے اب کسی دعوت نامے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تیزی سے وہاں سے نکل لیا۔ باہر سڑک پر آ کر مجھے احساس ہُوا کہ میں آزاد ہوں۔ یہ میں اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ فیلڈز نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ ڈیبورا نے اس کے لیے فیلڈز سے ڈیل کی ہوگی۔ شاید اسی لیے وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ ہاں... یہی بات ہے۔ اور کچھ تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈھائی بجے تھے۔ گھر جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سوچا، ایجنسیوں کے چکر لگا لوں۔ نیلی کو میں اس واقعے کے بارے میں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں چار ایجنسیوں میں گیا۔ مگر بات نہیں بنی۔ انھوں نے مجھ سے اگلے روز صبح کے وقت آنے کو کہا۔ چار بجے کے قریب میں گھر کی طرف چل دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگلے روز سویرے

ہی نکلنا ہوگا۔ ملازمت ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔

* * *

دن زندگی کے

وہ کاسمیٹکس کے کاؤنٹر کے سامنے سے گزر کر آئی اور اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "جی مس... کیا حکم ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"شارٹ کوک ود لائم' ڈینی۔" وہ مسکرائی۔ اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔

"ابھی لیں۔" میں نے عقبی شیلف سے گلاس اٹھایا اور مشروب تیار کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی مسکراہٹ اور گہری، اور کشادہ ہو گئی۔ اس نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی۔ میں نے فوراً ہی لائٹر پیش کر دیا۔ "شکریہ ڈینی!"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے اس کی طرف اسٹرا بڑھائی۔

اس نے سِپ کھینچتے ہوئے کہا۔ "سب وے پر بھی کوک ملنی چاہیے۔"

"میں تو یہ نہیں چاہوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہاں کوک اور لائم ملے تو تم یہاں آنا چھوڑ دو گی۔"

اس نے ستائشی مسکراہٹ سے مجھے نوازا۔ میں دوسرے کاؤنٹر پر موجود جیک کی طرف بڑھ گیا۔ یہ وہاں کا کھیل تھا... کاروبار کا حصہ تھا۔ بیس سینٹ کا مشروب اور ساتھ میں بے ضرر سا رومانس فری!

"ایک بج چکا ہے جیک۔ اب صفائی ہو جائے؟" میں نے کہا۔

جیک نے رجسٹر سے سر اٹھا کر کلاک کو دیکھا۔ پھر اس نے لڑکی پر نگاہ دوڑائی۔ "ہاں ڈینی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے بلونڈ بالوں اور نیلی آنکھوں کی برکت ہے نا؟"

"ان کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس کسی کا ہونا ہی کافی ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "دس آنکھیں جو مجھے نظر انداز کر کے گزرتی ہیں، ان میں سے کم از کم آٹھ تمہیں دعوت ضرور دیتی ہیں۔"

"تو جلتے کیوں ہو۔ وہ آنکھیں میرے کسی کام کی نہیں۔ اور ان کا مال تو تم سمیٹتے ہو۔"

"سچ بتاؤ ڈینی، تم ان سے استفادہ نہیں کرتے؟"

"تم مجھے جانتے ہو جیک۔ شادی شدہ ہوں اور ایک بچ کا باپ بھی۔ میرے پاس ان حماقتوں کے لیے وقت کہاں اور پھر غریب آدمی ہوں۔" میں نے آئینے میں لڑکی کو دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ میں بھی مسکرا دیا۔ "اور یہ بھی سن لو۔" میں نے جیک سے کہا۔ "ان پر ہاتھ بھی رکھو گے تو چیخ چلا کر ساری دنیا کو جمع کر لیں گی۔"

وہ مسکرایا۔ "مذاق کر رہے ہو۔ مگر خیر... ہاں، اب صفائی کر لی جائے۔"

میں نے لڑکی سے پیسے وصول کیے، خوش اخلاقی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی دی ہوئی ٹپ جیب میں ڈال لی۔

اس وقت سوا بجا تھا۔ میں تھکن سے نڈھال تھا۔ شام بجے سے اب تک سوا سات گھنٹے ہو چکے تھے، اور مجھے آرام ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی میری خوش قسمتی تھی ورنہ جاب ملنا کوئی مذاق تھا۔ میں خود کتنا عرصہ خوار ہوا تھا۔

تین سال! ہاں، کبھی جاب بھی مل جاتی تھی، لیکن زیادہ دن رہتی نہیں تھی۔ کچھ بھی بہانہ ہو جاتا، اور میں پھر سڑک پر ہوتا جب تک نیلی کام کرتی رہی، صورتِ حال بہت خراب نہیں ہوئی۔ گزارہ ہو ہی جاتا تھا۔ مگر وکی پیدا ہوئی تو سب کچھ بدل گیا۔ علم معاشیات ہمیں درس دینے لگا۔

مجھے وہ دن یاد تھا جب نیلی کام سے گھر واپس آئی اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ میرے چہرے پر اس نے نہ جانے کیا دیکھا ہوگا کہ ہاتھ بڑھا کر میرا بازو تھام لیا۔ "ڈینی... تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" اس کے لہجے میں بھی دکھ تھا اور آنکھوں میں بھی۔

"ایسی بات نہیں۔ میں خوش ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ میرے نزدیک ہو گئی۔ "تو پھر بات کیا ہے؟"

"میں پیسوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"تمہیں جاب مل جائے گی۔ وقت ہمیشہ ایک سا کب رہتا ہے۔"

میں نے مُنہ پھیرا اور سگریٹ جلالی۔ "یہی تو میں خود کو یقین دلاتا رہتا ہوں۔"

اس کا دکھ اور گہرا ہو گیا۔ "تمہیں خوشی نہیں ہوئی کہ ہمارے ہاں اولاد ہونے والی ہے۔" اس نے الزام دینے والے انداز میں کہا۔

"میں خوش کیوں نہیں ہوں گا۔" میں نے نتھنوں سے ... نے کہا۔" میں سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ ... تا ہوں کہ یہی حالات رہے تو ہمارا سڑکوں پر ہی

... بغور اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ... کا طویل کش لیا۔

... چاہتے کہ ہمارے ہاں بچہ ہو؟"

... لہجے کی اذیت میرے وجود میں دوڑ گئی۔ میرا دل ... میں نے سختی سے اسے کھینچا اور اپنی باہوں میں بھر ... لی، اولاد تو ہر شخص کا خواب ہوتی ہے۔ بس میں ... ہوں۔ خدا تو بچے مفت دیتا ہے لیکن انسانوں کو پھر بھی ... دام پڑتا ہے۔ جب کہ میں قلاش ہوں۔"

... ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ وہ مسکرائی۔ "بچے کچھ نہیں ... محبت کے سوا۔"

... کہنا آسان تھا۔ پیسے کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ ... جب ہمارا آخری ڈالر بھی خرچ ہو گیا تو ہم ریلیف ... وہاں ہم نے امداد کے لیے درخواست دی۔ کلرک ... طرح ہمیں دیکھا... مجھے اور پھر نیلی کے پھولے ... کو... تو بغیر لفظوں کے اپنے تاثر سے اس نے کہہ دیا ... تو انہیں سنبھال سکتے تو بچے پیدا کرنے کا شوق کیوں ... پھر ہمیں ایک سوال نامہ بھرنا پڑا۔ تفتیش کار ہمارے ... گھنٹوں پوچھ گچھ کرتے رہے۔ ایسی پوچھ گچھ ہوئی کہ ... کا احساس ستانے لگا۔ ہماری نجی زندگی کا کوئی گوشہ ... گیا۔

... جب ہمیں پہلا امدادی چیک ملا۔ ایک موٹی عورت ... پہنے ہوئے تھی، وہ چیک لائی تھی۔ اس نے مجھے ... ہوئے کہا۔ "یہ تم لوگوں کی خوراک اور دیگر ... کے لیے ہے۔"

... نے اس سے نظریں چراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"اگر ہمیں پتا چلا کہ تم نے اس سے شراب خریدی یا جوا کھیلا ... کہیں بھی ضائع کیا ہے تو تمہاری امداد روک دی ... گی۔" اس نے مجھے تنبیہ کی۔

... ایک اچھا تھا۔ لیکن میں اس کی طرف دیکھنے کی ... نہیں کر سکا۔ بلکہ مجھے لگا کہ اب میں کبھی کسی کے بھی ... نہیں اٹھا سکوں گا۔

وہ وکی کے پیدا ہونے سے پہلے کی بات تھی۔ پھر مٹی ہاسپٹل میں جب نرس نے پہلی بار مجھے میری بچی کا چہرہ دکھایا... گلابی رنگت اور بلونڈ بال... تو میری ہر شرمندگی مٹ گئی۔ میں نے سوچا۔ 'اس خوشی، اس دولت کے لیے تو ہر توہین، ہر اذیت برداشت کی جا سکتی ہے... صرف اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے!'

پھر میں نیلی سے ملا۔ وہ جس وارڈ میں تھی، وہاں سات عورتیں اور تھیں۔ وہ مجھے آتے ہوئے دیکھتی رہی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں کچھ کہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جھک کر اُس کا رخسار چوما اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہمیں بیٹی ملی ہے۔" اس کے لہجے میں تھکن تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر اس کے بال تمہارے جیسے ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"اور چہرے کے نقوش اور آنکھیں تمہارے جیسی۔"

وہ مسکرائی۔ "تو تم مایوس نہیں ہوئے؟" اس کے لہجے میں بچوں کی سی معصومیت اور التجا تھی۔

میں نے بہت شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ "میں یہی تو چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ایک اور تم... ایک اور نیلی۔"

نرس ہماری طرف چلی آئی۔ "اب آپ کو جانا چاہیے مسٹر فشر۔"

میں نیلی کو پیار کر کے وارڈ سے نکل آیا۔ میں گھر گیا اور وہاں تنہا ایک بے آرام رات گزاری۔ صبح سویرے ہی میں کام کی تلاش میں نکل گیا۔

ہمیشہ کی طرح اس روز بھی ناکامی ہی ہوئی۔ میں نے پریشان ہو کر سوچا۔ 'کیا میں اپنی بچی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔' میں نے سوچا۔ 'سام سے ملوں۔ شاید وہ کچھ مدد کرے۔' اس کا آفس امپائر اسٹیٹ بلڈنگ میں تھا۔ مجھے یاد ہے، میں ایک گھنٹا اس عمارت کے سامنے کھڑا اپنا حوصلہ مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا، بالآخر میں اندر گیا اور لفٹ میں بیٹھ کر اُس کے آفس کی طرف گیا۔

استقبالیہ کلرک نے مجھے اس کے آفس میں نہیں گھسنے دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھ سے نہیں ملنا چاہتا۔ میں نے نیچے جا کر پبلک فون سے اس کا نمبر ملایا۔ اس کی آواز بہت کھردری تھی۔ اس کے ابتدائی الفاظ نے ہی میرے جسم کو سرد کر دیا اور میں نے ریسیور ہک پر لٹکا دیا۔ اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے، اور میرے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی... "کیا بات

ہے کِڈ؟ کوئی اور چوٹ دینا چاہتے ہو؟“

مجھے احساس ہُوا کہ میرے لیے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس سے میں مدد مانگ سکوں۔

نیلی بچی کے ساتھ گھر آ گئی تھی۔ پورا موسم گرما بے روزگاری میں گزر گیا۔ چند ہفتے ایک جاب ملی۔ رات کا کام تھا، اور تنخواہ گزارے لائق بھی نہیں تھی۔ لیکن میں نے یہ سوچ کر قبول کرلی کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہ ہر حال، بہتر ہے۔۔ سوڈا فاؤنٹین میں کلرک، تنخواہ چھ ڈالر فی ہفتہ اور ٹپس مقدر کے مطابق۔ اگر میں اس ملازمت کو ریلیف والوں سے چھپالوں تو یہ معمولی سی آمدنی اضافی بن کر خاصا کام آسکتی ہے۔ ریلیف والوں کے ماہانہ 72 ڈالر میں پورا مہینا نہیں چل پاتا تھا۔

میں نے صفائی مکمل کی اور کلاک پر نظر ڈالی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ تین بجے گھر پہنچوں تو ریلیف والی کے آنے تک چند گھنٹے کی نیند تو لے سکتا ہوں۔ آج اسے چیک لانا تھا۔ اور عام طور پر وہ صبح سات بجے آجاتی تھی۔

* * *

میں بیٹھا مسز اسنائیڈر کی خشخشی 'روں روں' کرتی آواز سنے جا رہا تھا۔ میرے لیے آنکھیں کھولنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی، جو ہر چیز میں ماہر ہوتے ہیں، یا یوں کہہ لیں کہ خود کو سمجھتے ہیں۔ اس وقت وہ نیلی کو گوشت کی ایک ڈش تیار کرنے کی ترکیب کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”زبردست... ہے نا ڈیئی؟“ نیلی نے اسے داد دیتے ہوئے مجھے ہلایا۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور گڑبڑا کر کہا۔ ”کیا... ؟ ہاں ہاں، بالکل۔“

”آپ میری بات نہیں سُن رہے تھے مسٹر فشر۔“ مسز اسنائیڈر نے سرد لہجے میں مجھے تنبیہ کی۔

”میں سُن رہا تھا مسز اسنائیڈر۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ایک ایک لفظ سنا میں نے آپ کا۔“

اس نے مجھے چشمے کے پیچھے سے بہ غور دیکھا۔ ”تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو مسٹر فشر۔“ اس نے شک آمیز لہجے میں کہا۔ ”کیا کرتے رہے رات بھر؟“

اب تو میں پوری طرح بیدار ہو گیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں مسز اسنائیڈر۔ میں سونے کے لیے جلدی لیٹ گیا تھا۔ مگر رات عجیب سی بے چینی رہی۔ اچھی نیند نہیں آئی۔“

وہ نیلی کی طرف مڑی۔ میں اسے متاثر نہیں کر پایا تھا۔ ”اور بچی کا کیا حال ہے مسز فشر؟“

”آپ اسے دیکھیں گی؟“ نیلی نے کہا اور اٹھ کر ہوئی۔ میں مسکرایا۔ نیلی مسز اسنائیڈر کو ہینڈل کرنا جانتی تھی۔ اسنائیڈر اولاد سے محروم تھی اور بچوں سے بہت پیار کرتی تھی اب چاہے میں خراٹے لیتا رہوں، مسز اسنائیڈر کو پتا بھی چلے گا۔ وہ وکی میں گم ہو جائے گی۔

مسز اسنائیڈر کے رخصت ہوتے ہی میں سو گیا۔ میری کھلی تو مجھے لگا کہ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ میں نے سر گھما وقت دیکھا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ بیڈ سائیڈ کلاک کے پاس رُقعہ رکھا تھا:

> چیک کیش کرانے جا رہی ہوں۔ پھر بل ادا کرنے ہیں۔ کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔ وکی کو ساتھ لے جا رہی ہوں تاکہ تم سکون سے سو سکو۔ کافی اسٹوو پر موجود ہے۔ میں تین بجے تک واپس آجاؤں گی۔

میں نے نوٹ کو وہیں رکھا اور اٹھ کر انگڑائی لی۔ باتھ میں جا کر میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میں تھکا تھکا اور ا عمر سے بڑا لگ رہا تھا۔ جلد خشک ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے میں لکیریں سی نمودار ہو گئی تھیں۔

میں نے گہری سانس لی اور شیو کی تیاری کرنے لگا۔

قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی تو میں شیو فارغ ہو چکا تھا۔ میں باہر نکلا تو دروازے میں نیلی کھڑی آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں وکی تھی اور دوسرے ہاتھ شاپنگ بیگ۔ میں نے بڑھ کر وکی کو گود میں لے لیا۔ سامان لے کر کچن میں چلی گئی۔

”میں نے گروسری والے کو اور قصائی کو ادائی کر دی۔“ اس نے بتایا۔ ”اور فلیٹ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد میرے 6 ڈالر بچے ہیں۔“

”گُڈ۔“ میں نے کہا۔ اسی وقت مجھے احساس ہُوا کہ بہت چپ چپ ہے۔ ورنہ عام طور پر میرے پاس آ کر وہ خو ہاتھ پاؤں چلاتی، خوب کھیلتی تھی۔ ”یہ وکی کو کیا ہُوا؟“ میں نیلی سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ نیلی نے فکرمندی سے کہا۔ ”صبح سے کیفیت ہے اس کی۔ اسٹور میں تو رونے لگی تھی۔ اسی لیے تو جلدی گھر آ گئی۔“

میں نے وکی کو ہاتھ پھیلا کر اپنے سامنے کیا اور اس کا جا لیا۔ ”کیا ہُوا میری ننھی گڑیا کو؟“ میں نے انگلی سے

میں معمول کے مطابق اس کی کھلکھلاہٹ کا منتظر تھا۔ وہ تو رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سے کمرا بھر بلبلا کر نیلی کی طرف مڑا۔ بچی روتی تھی تو مجھے کچھ تھا بلکہ میری انگلیاں سن ہو جاتی تھیں۔

اسے بیڈ پر لٹا دوں۔“ نیلی نے کہا اور بچی کو مجھ سے سونے کی تو شاید بہتر ہو جائے گی۔“

بیٹھ کر کافی پینے لگا اور نیلی بچی کو تھپکنے لگی۔ میں نے جائزہ لیا۔ ریلیف بیورو کے بارے میں ایک آرٹیکل چھپا وہ ایسے لوگوں کے بارے میں تفتیش کر رہے ہیں جو ق ہونے کے باوجود ان سے ناجائز طور پر امداد حاصل ہیں۔

واپس آئی تو میں نے وہ آرٹیکل اسے دکھایا۔ خیال میں مسز اسنائیڈر کو تم پر شک ہے؟“ اس نے پوچھا۔

نے کندھے جھٹک دیے۔ ”بہ ظاہر تو شک کرنے نہیں۔ وہ جب بھی آتی ہے، میں گھر پر ہی تا ہوں۔“

کتا ہے، کسی پڑوسی نے تمہارا بے وقت آنا نوٹ کیا ہو بتایا ہو۔“

ایسا کوئی نہیں کرے گا۔ ہر شخص اپنی پریشانیوں میں گم

مگر آج صبح اس کا طرز عمل عجیب سا تھا۔ جیسے وہ کچھ

ھول جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔“

ی پھر رونے لگی۔ اس بار رونے کے دوران وہ کھانس بھی وہ گہری اور بھاری کھانسی تھی۔ ایک لمحے کو ہم دونوں دوسرے کو دیکھا، پھر نیلی پلٹی اور بیڈ روم کی طرف میں اس کے پیچھے تھا۔

پہنچنے تک نیلی نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا تھا، ی کھانسی رُک گئی تھی۔ وہ اسے تھپک رہی تھی۔ نیلی نے نظروں سے اسے دیکھا۔ ”اس کا جسم گرم ہو رہا ہے۔“ ہتھیلی سے وکی کی پیشانی کو چھوا۔ ”لگتا ہے،

ابھی کھانسی ہو رہی تھی اسے۔ میرا خیال ہے، ٹھنڈ

تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ نیلی کو خود ایک ہفتے سے کھانسی تھی۔ ”ہمیں ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔“

بچی پھر رونے لگی۔ ہم دونوں بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نیلی نے بچی کو اور پھر مجھے دیکھا۔ ”میرا خیال ہے، ڈاکٹر کو بلانا ہی پڑے گا۔“ اس نے کہا۔ ”میڈیکل کارڈ کچن کے شیلف پر رکھا ہے۔ نیچے ہال میں فون موجود ہے۔ جلدی کرو۔“

* * *

ڈاکٹر نے بچی کا معائنہ کیا پھر نیلی کو اشارے سے بلایا۔ ”آپ کے شوہر بچی کو پنگھوڑے میں لٹا دیں تو میں آپ کا معائنہ کروں۔“

”بچی ٹھیک تو ہے۔“ نیلی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

میں وکی کو پنگھوڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔

”اسے ٹھنڈ لگی ہے جس نے اس کے گلے کو جکڑ لیا ہے۔ میں اسے دوا دے دوں گا۔ آپ ذرا منہ کھولیں اپنا... آ... آ...“

نیلی نے مُنہ کھولا۔ ڈاکٹر اس کے حلق کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے نیلی کو کھانسنے کو کہا۔ مگر نیلی پر سچ مچ کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے تھرمامیٹر نکال لیا۔

”کوئی مسئلہ ہے؟“ نیلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور مسکرایا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں مسز فشر۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے چیک کرنا ہے کہ آپ کو بخار تو نہیں ہے۔“ اس نے نیلی کے مُنہ میں تھرمامیٹر لگایا اور پیڈ نکال کر اس پر کچھ لکھنے لگا۔

میں اتنی دیر میں وکی کو لٹا کر اسے ڈھانپ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کے پاس اسائن مینٹ نمبر ہے؟“

”کچن میں ہے۔ میں ابھی لایا۔“

میں واپس آیا تو ڈاکٹر تھرمامیٹر دیکھ رہا تھا۔ ”بخار تو آپ کو بھی ہے مسز فشر۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو اس کا پتا تھا؟“

نیلی نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ کے لیے چند روز تک بیڈ ریسٹ ضروری ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر، آپ نے مجھے وکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ نیلی نے احتجاج کیا۔

ڈاکٹر نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ ”دونوں کا ایک ہی مسئلہ ہے۔ گلے آئے ہوئے ہیں۔ نزلہ ہے اور بخار ہے۔ میں لکھ رہا ہوں۔ حسب ہدایت استعمال کرتی رہیں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔

ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"آپ کا خیال ہے، بچی کی بیماری کا سبب میں ہوں۔" نیلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ "اسے آپ سے لگی یا آپ کو اس سے، یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ آپ یہ فارم بھر دیجیے، دوا لیتی اور دیتی رہیے اور سردی سے بچتی رہیے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں، نمبر ملا آپ کو؟" وہ میری طرف مڑا۔

میں نے خاموشی سے کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کارڈ ہمیں ریلیف بیورو والوں نے دیا تھا۔ ڈاکٹر اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنے لگا۔ پھر اس نے ریلیف کارڈ کے ساتھ ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔ "یہ اپنے ریلیف انویسٹی گیٹر کو دے دینا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ اٹھا لیا۔ "میں کل پھر چکر لگا لوں گا۔"

"یس ڈاکٹر۔"

دروازے پر پہنچ کر وہ پلٹا اور تنبیہی لہجے میں بولا۔ "میری ہدایات پر عمل کرنا۔ مکمل بیڈ ریسٹ اور حسب ہدایت وقت پر دوا لینا بہت ضروری ہے۔"

اس کے جانے کے بعد نیلی نے مجھے دیکھا۔ غصہ میرے اندر اُمڈ رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے دیے ہوئے کاغذ کو گولا بنا کر ایک طرف اُچھال دیا۔ "انھیں صرف اپنی دو ڈالر فیس کی پروا ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔ "سیدھے مُنہ بات بھی نہیں کرتے بدبخت، صرف اس لیے کہ ہم خیراتی مریض ہیں۔ عام مریضوں سے یہ اس طرح بات نہیں کرتا ہوگا۔"

نیلی کھانسنے لگی۔ "لیکن ہم لوگ کر بھی کیا سکتے ہیں۔" اس نے اکھڑتی سانسوں کے درمیان کہا۔ "کم از کم وہ آیا تو۔ ورنہ کچھ تو ایسے ہیں کہ آنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔"

"اس کا انداز ایسا تھا جیسے ہم انسان نہیں، کچرے کا ڈھیر ہوں۔" میرا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

نیلی بیڈ کی طرف گئی اور اس پر ڈھیر ہو گئی۔ "اب تم نے دیکھ لیا نا ڈینی کہ لوگ کیسے کیسے ہوتے ہیں۔"

اس کا تحمل دیکھ کر مجھے اپنے اشتعال پر شرمندگی ہونے لگی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر میں نے دنیا کو... اور لوگوں کو اب بھی نہیں سمجھا تو شاید کبھی نہیں سمجھ سکوں گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھاما۔ "لاؤ، نسخہ مجھے دو۔ میں ڈرگ اسٹور جا کر دوا بنوا لاؤں۔ میرا خیال ہے، آج مجھے چھٹی کرنی ہوگی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں ڈینی، تم بس دوا لا دو۔ کام پر جانا ضروری ہے۔ ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر نے تمہارے لیے بیڈ ریسٹ تجویز [illegible] وہ مسکرائی۔ "ڈاکٹر تو یہی کہتے ہیں۔ اب کوئی وجہ سے بستر تو نہیں پکڑ سکتا۔ تم کام پر جاؤ۔ تمہارے [illegible] تک ہم دونوں ٹھیک ہو چکے ہوں گے۔"

* * *

میں دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھا اور اپنے [illegible] کے سامنے رُکا۔ میں نے قفل میں چابی لگائی۔ اندر سے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے چابی گھمائی۔ دروازہ بند کر کے میں بیڈ روم کی طرف لپکا۔ "نیلی... [illegible] رہی ہو؟" میں نے اسے پکارا۔

میں دروازے پر ٹھٹک گیا۔ نیلی پنگھوڑے پر جھکی [illegible] اور اب سیدھی ہو رہی تھی۔ "ڈینی۔" اس کے مُنہ سے [illegible] بھری آواز نکلی۔

میں لپک کر اُس کے پاس پہنچا۔ "کیا بات ہے نیلی [illegible] اس نے میری جیکٹ تھام کر مجھے جھنجوڑ ڈالا۔ "[illegible] کرنا ہوگا ڈینی۔" وہ بری طرح کھانس رہی تھی۔ بات [illegible] کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ "وکی تو بخار میں بھُن رہی ہے [illegible]"

میں نے ہاتھ بڑھا کر پنگھوڑے میں لیٹی ہوئی اپنی [illegible] پیشانی کو چھوا۔ وہ واقعی انگارہ ہو رہی تھی۔

"ایک سو تین بخار ہے۔" نیلی کی آواز لرز رہی تھی۔

میں نیلی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اپنی کیفیت [illegible] اچھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی آواز کو پُرسکون رکھنے کی کوشش [illegible] "تم پریشان نہ ہو۔ بچوں کو تیز بخار بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے [illegible] ہے، تمہارا بخار بھی بڑھ گیا ہے۔"

"میری فکر مت کرو۔" اس کا لہجہ ہسٹیریائی تھا۔ "ہمیں [illegible] کے لیے کچھ کرنا ہے۔"

میں نے اس کے کندھے تھام کر کہا۔ "پُرسکون ہو جاؤ [illegible] نیچے جا کر ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔"

وہ رو رہی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے [illegible]

"جاؤ ڈینی، جلدی کرو۔ میری بچی دہک رہی ہے۔ جاؤ ڈینی [illegible]"

میں نے نیچے جا کر فون کیا۔ کئی گھنٹیاں بجیں، تب فون ریسیو کیا گیا۔ کسی نے نیند بھری آواز میں کہا۔ "یس [illegible]"

"ڈاکٹر ایڈمز؟"

"بات کر رہا ہوں۔"

"ڈاکٹر، میں ڈینی فشر بات کر رہا ہوں۔" میں نے جلدی کہا۔ "آج آپ میری بچی کو دیکھنے آئے تھے نا..."

[illegible] مجھے یاد ہے۔" ڈاکٹر نے چڑچڑے پن [illegible]

[illegible] میں ڈاکٹر۔ بچی کو اب 103 بخار ہے۔"

[illegible] ہے؟"

[illegible] لیکن اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور وہ پسینے میں [illegible] اس کی حالت اچھی نہیں ہے ڈاکٹر۔ اور میری بیوی [illegible] ہے۔"

[illegible] کی دوائیں دی تھیں؟"

[illegible] ڈاکٹر۔"

[illegible] پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر فشر۔ شدید [illegible] کے وقت بڑھ جاتا ہے۔ دونوں کو کوئی گرم [illegible] رکھو۔ صبح تک دونوں بہتر ہو جائیں گی۔ پھر [illegible]"

[illegible] ڈاکٹر..." میں نے احتجاج کرنے کی کوشش کی۔

[illegible] ہدایت پر عمل کرو مسٹر فشر۔" ڈاکٹر کے لہجے میں [illegible] پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

[illegible] ڈیڈ ریسیور کو گھورتا رہا۔ پھر میں نے اسے ہک [illegible]

[illegible] میں داخل ہوا تو نیلی نے مجھ سے پوچھا۔ "وہ آ رہا ہے؟"

[illegible]" میں نے سرسری لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ [illegible] پریشان تھی۔ میں اس کی پریشانی بڑھانا نہیں چاہتا [illegible] نے کہا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بخار تو رات کو [illegible] جاتا ہے۔" میں نے ڈاکٹر کی ہدایات دہرا دیں۔

[illegible] تمہارے خیال میں کوئی خطرہ تو نہیں؟" اس کے [illegible] تھی۔

[illegible] مسکرا کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ حالاں کہ [illegible] سے محروم تھا۔ "سب ٹھیک ہے جان۔ دیکھو نا، وہ [illegible] ہم سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس نے کہا ہے تو [illegible] ہوگا۔" میں اسے سہارا دے کر بیڈ کی طرف لے [illegible] لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔

[illegible] ٹھیک نہیں ہے۔"

[illegible] لیٹ گئی۔ "پہلے وکی کو فیڈر میں چائے [illegible]"

[illegible] بس اب تم کمبل اوڑھ کر لیٹ جاؤ۔"

[illegible] پیالی لے کر آیا اور بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ "اٹھو اور چائے پی لو۔ طبیعت بہتر ہو جائے گی۔"

وہ پیالی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر مُنہ تک لے گئی۔ ایک گھونٹ لینے کے بعد اس نے کہا۔ "اچھی ہے... بہت اچھی۔" میں مسکرایا۔ "اچھی کیوں نہ ہو۔ ڈینی فشر نے جو بنائی ہے۔"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اب ذرا وکی کو دیکھ لو۔ کیسی ہے وہ؟"

میں پنگھوڑے کی طرف گیا اور جھک کر اپنی بچی کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ "سکون سے سو رہی ہے۔" میں نے اعلان کیا۔

نیلی نے چائے کی پیالی خالی کر کے مجھے دی اور پھر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ "ارے... میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی۔ لیکن اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ "راتوں کو کام کرنے سے تمہاری نظر کمزور ہو گئی ہے ڈینی۔" اس نے مذاقاً کہا۔

میں نے لائٹ آف کر دی۔ "اب تم سو جاؤ بے بی۔" میں نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

کچن میں جا کر میں نے پیالیاں دھو کر رکھیں۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر پاؤں پھیلا لیے۔ تھکن سے میرا برا حال تھا۔ اچانک میرے کانوں میں بچی کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے سگریٹ بجھایا اور لپک کر بیڈ روم میں گیا۔ وکی کھانس رہی تھی... وہ گہری کھانسی تھی، سینے کو ہلا ڈالنے والی۔ میں نے کمبل میں لپٹی ہوئی اپنی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اسے تھپکنے لگا۔ یہاں تک کہ کھانسی تھم گئی۔

نیلی بے سُدھ سو رہی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وکی کی کھانسی سے اس کی نیند خراب نہیں ہوئی۔ میں نے بچی کے چہرے کو چھو کر دیکھا۔ وہ اب بھی تپ رہا تھا۔ اس کا ننھا سا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ مگر اب وہ سو رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے اسے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔

میں پھر کچن میں گیا۔ وہاں کی لائٹ آف کر کے میں بیڈ روم میں واپس آیا اور پنگھوڑے کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے اس کے ہاتھ کو چھوا۔ جبلی طور پر اس کی ننھی منی انگلیاں میری درمیانی انگلی سے لپٹ گئیں۔ میں اسی حالت میں بیٹھا رہا تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔

کھڑکی سے چاندنی نظر آ رہی تھی، جیسے وہ کوئی نئی نویلی رات ہو، جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا ہو... کھڑکی سے اُبھرا پھر وہ [illegible]

نے حرکت کی۔ میں نے پنگھوڑے میں دیکھا۔ اب وہ کروٹ سے لیٹی ہوئی تھی۔ 'میری بیٹی!' میں نے فخر سے سوچا۔ اس کی بیماری نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں پہلی بار میں نے جانا تھا کہ وہ میرے لیے کتنی قیمتی ہے۔ "میں تمہارے اس عرصے کی تلافی کروں گا وکی۔" میں بڑبڑایا۔ اپنی آواز نے مجھے خود بھی ڈرا دیا۔

میں نے گھبرا کر نیلی کی طرف دیکھا۔ مگر وہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے پھر پنگھوڑے میں جھانکا۔ مگر اس بار وہ بڑی محتاط سرگوشی تھی۔ "وکی بے بی، جلدی سے اچھی ہو جاؤ، اپنے ڈیڈی کی خاطر۔ باہر بہت بڑی دنیا تمہاری منتظر ہے، جو تمہارا ڈیڈی تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔"

اس نے پھر حرکت کی، اور میں نے پھر پنگھوڑے میں جھانکا۔ میں نے سوچا 'میں کتنا بے خبر، کتنا نادان ہوں۔ سمجھ ہی نہیں سکا کہ میری بچی نے مجھے کتنا دولت مند بنا دیا ہے۔' میں نے چھت کی طرف مُنہ اٹھا کر دعا کی۔ "پلیز گاڈ... پلیز گاڈ... اسے صحت عطا کر دو۔"

نیلی سوتے میں کھانسنے لگی۔ پھر اس نے کروٹ بدلی۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا اور جا کر اسے دیکھا۔ کمبل اس کے جسم سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے کمبل اُڑھایا اور اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

وہ رات شاید بہت طویل بھی تھی اور ساکت بھی۔ مجھے اونگھ آنے لگی۔ کئی بار میں نے سر جھٹکا اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر کوشش ناکام رہی۔ پریشانی نے تھکن کو اور بڑھا دیا تھا۔

* * *

میرے کانوں میں دُور سے... بہت دُور سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ میری پلکیں تھرتھرائیں تو مجھے اُجالے کا احساس ہُوا۔ میں نے ایک دم سے آنکھیں کھولیں اور پنگھوڑے میں دیکھا۔ وکی بری طرح کھانس رہی تھی... جھٹکے لے رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور تھپکنے لگا۔ لیکن اس بار اس کی کھانسی رُکی نہیں۔ اس کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں اور پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے، میرے ہاتھوں میں اس کے جسم میں کھنچاؤ سا آیا... اکڑن سی پیدا ہوئی، اور اس کے چہرے کی رنگت نیلی ہو گئی۔

میں نے گھبرا کر اُس کے مُنہ سے اپنا مُنہ ملایا اور اسے سانس دینے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے دونوں ننھے منے پہلوؤں پر ہتھیلیوں سے ہلکا سا دباؤ ڈالا اور دوبارہ اسے سانس دی جاننا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس دکھ کی شدت سے مجھے ا بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

میں اس کے پھیپھڑوں کو اپنی سانس، اس کے جسم کو زندگی دینے کی پیہم کوشش کرتا رہا، اس کے باوجود کہ میں تھا، سب کچھ بے سود ہے۔ اب میں یا کوئی اور... کوئی بھی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا... کبھی نہیں!

میں اسے گود میں لیے ساکت کھڑا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی اس کے ننھے سے وجود کو ٹھٹھرا رہی تھی۔ یہ... یہ میری بیٹی میں سوچ رہا تھا۔ آنکھوں سے بہنے والے آنسو میرے مُنہ اُتر رہے تھے۔ زبان پر نمک کا ذائقہ تھا۔

"ڈیڈی!" نیلی نے خوف زدہ لہجے میں مجھے پکارا۔

آہستہ سے میں اس کی طرف پلٹا۔ دیر تک میں اسے رہا۔ ان لمحوں میں بغیر کچھ کہے میں نے ہزاروں باتیں اسے دیں، اور اس نے سماعت کے بغیر وہ سب کچھ سُن بھی لیا۔ جان گئی۔ بلکہ وہ پہلے سے جانتی تھی... نہ جانے کیسے؟ اسی وہ خوف زدہ تھی۔ اس نے وکی کی طرف باہیں پھیلا دیں۔ دھیرے دھیرے چلتا میں اس کی طرف گیا اور بچی کو سونپ دیا۔ وہ ہماری بچی تھی!

* * *

ہم چڑھ رہے تھے اور چوبی سیڑھیاں ہمارے بوجھ چرچرا رہی تھیں۔ کب سے وہ ہمارے لیے جانی پہچانی تھی۔ لیکن آج اس میں ہمارے لیے کوئی خوشی نہیں تھی۔ وہ جو تقریباً ساڑھے تین سال پہلے یہی سیڑھیاں چڑھتے ہو ہم نے محسوس کی تھی۔

تب ہم خوش تھے، جوان تھے اور زندگی ایک روشن دن طرح تھی... امکانات سے روشن دن کی طرح! ہم ہنس ر تھے۔ ہماری رگوں میں خون کی جگہ ہیجان دوڑتا تھا۔

میرے ذہن کے کسی تہ خانے میں ایک یاد تھی کہ کیسے نے اسے گود میں اٹھا کر چوکھٹ پار کرائی تھی۔ لیکن وہ بہ پرانی، دھندلائی ہوئی یاد تھی... صدیوں پرانی یاد!

وہ مجھ سے ایک قدم آگے تھی۔ میں اس کی پیٹھ دیکھ رہا تھا سیدھی اور سخت کمر۔ وہ مضبوط تھی... ہمیشہ مضبوط رہی تھی۔ کی آنکھوں میں آنسو تھے، نہ ہونٹوں پر سسکیاں، نہ اپنے دکھ کوئی گلہ۔ بس اس کی سیاہ آنکھوں میں اس کا دل نظر آ رہا تھا۔

یہ وہ دن تھا جسے بھلانے کی کوشش کی جاتی ہے، جسے

کے کسی نہاں خانے میں دفن کر دیا جاتا ہے، تا کہ آپ کو اپنا کبھی یاد نہ آئے۔ آپ کے کانوں میں تدفین کے موقع پر جانے والی دعائیں نہ گونجیں۔ تا کہ آپ قربان گاہ پر روشن کو بھول جائیں۔ آپ کو تابوت کا رنگ یاد نہ رہے۔ میں قبر بنانے والے کدال اور بیلچے کی دھاتی آوازیں کو نہ ستائیں۔ اور تابوت پر گرتی ہوئی مٹی کی آواز دل پر کی طرح نہ گرے۔

بھول جاؤ! بھول جاؤ! بھول جاؤ!

لیکن کوئی کیسے بھول سکتا ہے؟ اپنے پڑوسیوں کی غم گساری، کی ہم دردی اور مہربانی؟ آپ ان کے دروازے پر دستک ہیں۔ آپ کے پاس اپنے بچے کی تدفین کے لیے کچھ بھی وہ مدد نہ کریں تو آپ اپنے بچے کو خود ہی گڑھا کھود کر دفنانے پر مجبور ہو جائیں۔ کوئی پانچ ڈالر دے، کسی کے صرف دو ڈالر ہوں، کوئی دس دے اور کوئی چھ۔ یوں 70 اکٹھے ہو جائیں۔ آپ کے اپنے وجود کے ایک حصے کی کے لیے جو کبھی تھا... اور اب نہیں رہا۔ اس کا تابوت، کے لیے دعا اور گز بھر زمین کہ اسے ایک گھر مل جائے۔ 70 جنھوں نے اپنی ضرورتوں کا گلا گھونٹ کر، اپنی عسرت زدہ سے نچوڑ کر آپ کو دیے کہ آپ کے بے پناہ دکھ میں اک پناہ دکھ کا اضافہ نہ ہو جائے۔

کوئی انسان ہو کر یہ سب کیسے بھول سکتا ہے!

آپ بھولنا چاہتے ہیں... لیکن نہیں بھول سکتے۔ آپ کے آپ کو چھوڑ بیٹھے، جو آپ کی طرف سے ایک اور چوٹ ڈرتے ہیں۔ اور وہ غیر جنھوں نے اپنا پیٹ کاٹ کی تلخی کو زہر بننے سے بچا لیا۔ یہ کیسے بھول سکتے ہیں ہاں، کسی دن آپ کے وجود کے اندر گرتی وقت کی ریت یہ سب دفن ہو جائے گا۔ لیکن مٹے گا نہیں، بھلایا نہیں اس بچی کی طرح... میری بیٹی کی طرح!

میں نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے بے رحمی سے مسل دیا۔ "تمھیں اب لیٹ جانا چاہیے۔ تمھیں کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

وہ آہستہ سے میری طرف مڑی۔ "مجھے بالکل تھکن نہیں ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ برف ہو رہا تھا۔ "بہتر یہی لیٹ جاؤ۔"

کی آنکھیں بیڈ روم کے دروازے کی طرف اٹھیں۔ پھر اس کی نگاہوں میں تنہائی تھی۔ "ڈیڈی، میں بیڈ روم میں نہیں جا سکتی۔ وہاں اس کا پنگھوڑا ہے، اس کے کھلونے ہیں..." اس کی آواز ڈوب گئی۔

اس کے محسوسات مجھ پر روشن تھے۔ میں اسے سمجھ رہا تھا۔ "جو ہونا تھا، ہو گیا بے بی۔ اب ہمیں آگے بڑھنا ہے، زندہ رہنا ہے۔ زندگی تسلسل کا نام ہے۔ اس میں توقف تو ممکن ہی نہیں۔" میں نے اسے سمجھایا۔

اس نے میرے ہاتھ سختی سے تھام لیے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اُمڈ رہی تھی۔ "ایسا کیوں ڈیڈی... کیوں؟"

مجھے جواب نہیں معلوم تھا لیکن جواب دینا ضروری تھا۔ "کیوں کہ انسان مجبور محض ہے۔ کیوں کہ ہمارے جینے میں ہی ہماری بچی کی خوشی ہے۔"

"وہ میری بے بی تھی... میری ننھی سی بچی..." وہ پہلی بار رو دی۔ "وہ میری ننھی بچی کیا چاہتی تھی... بس جینا۔ لیکن میں ناکام رہی..."

میں نے اسے لپٹا لیا۔ بچے سے محروم ہونے والی ماں کو تسلی دینا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن مجھے کوشش کرنی تھی۔ "اس میں تمھارا کیا قصور نیلی؟ کسی کا بھی قصور نہیں۔ یہ سب تو خدا کے اختیار میں ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں ڈیڈی۔ میرا قصور تھا۔ شروع ہی سے میرا قصور تھا۔ میں نے ایک گناہ کیا اور اس میں اسے حصے دار بنا لیا۔ اور اس کی سزا مجھے نہیں، اسے ملی۔ میں نے یہ سمجھنے کی غلطی کی کہ میں خدا سے زیادہ، خدا سے بہتر جانتی ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں ایسی دہکتی ہوئی دیوانگی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"میں نے گناہ کیا اور میں حالتِ گناہ میں رہتی رہی۔" اس نے منجمد لہجے میں کہا۔ "میں نے اپنی شادی، اپنی ازدواجی زندگی کے لیے کبھی خدا سے تائید نہیں چاہی۔ میرے لیے انسانی تائید کافی تھی۔ تو پھر میں اپنی بچی کے لیے خدا سے رحمت کی توقع کیسے رکھ سکتی ہوں۔ فادر برینن نے شروع ہی میں بتا دیا تھا مجھے۔"

"فادر برینن نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "آج چرچ میں بھی انھوں نے یہی کہا کہ خدا ہماری بچی کو خوش آمدید کہے گا۔" میں نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، اب بھی کرتے ہیں۔ بس خدا کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ اور کچھ نہیں کہتا ہم سے۔"

اس نے اداس نظروں سے مجھے دیکھا اور نرمی سے میرے چہرے کو چھوا۔ "میرا ڈیئی بے چارہ... کچھ بھی تو نہیں سمجھتا۔"

میں نے جواباً اسے دیکھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے نزدیک تو دو افراد کے درمیان محبت ہی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ اگر وہ محبت سچی تھی تو یہ خدا کا کرم تھا، نعمت تھی۔ "آئی لو یو!"

وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تم سمجھتے ہو کہ تمھاری محبت ہی سب کچھ ہے۔ اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم نہیں سمجھتے کہ خدا کے نزدیک یہ ناکافی ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ کو بوسا دیا۔ "ہمارے لیے ہمیشہ ہماری محبت ہی کافی رہی ہے۔"

اس کی نگاہیں بہت دُور کہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہی غلطی تو کرتے رہے ہیں ہم۔ لیکن اب میں نے جان لیا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ہمیں صرف اپنے ساتھ، اپنے لیے نہیں جینا ہوتا۔ ہمیں خدا کے ساتھ، خدا کے لیے بھی جینا ہوتا ہے۔"

پھر وہ بیڈ روم میں چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا۔ بستر کی چرچراہٹ سے اندازہ ہُوا کہ وہ لیٹ گئی ہے۔ پھر اندر خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک اَور سگریٹ سلگائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ یہ وہ دن تھا جسے بھول جانے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔

خاموشی میری ہڈیوں تک میں اُتری جا رہی تھی!

* * *

مجھے اپنا جسم سن ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ عجیب سی کیفیت تھی... نیم خوابی اور نیم بیداری۔ شاید ایسا تھا کہ میرا جسم سو رہا تھا اور میرا دماغ جاگ رہا تھا۔ میرے پاس سوچوں اور خیالات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خیالات بھی نامکمل اور بکھرے بکھرے۔ اور لنگڑی لولی، نامکمل یادیں جو دماغ میں چکرا رہی تھیں، اذیت دے رہی تھیں، لیکن جسم اس اذیت سے بے خبر تھا۔

شاید اسی لیے پہلی بار میں بزر کی آواز نہیں سن سکا۔ نہیں، یہ غلط ہے۔ آواز میں نے سنی لیکن اسے پہچان نہیں سکا۔ مگر دوسری بار بزر کی آواز میں ایک پیہم اصرار تھا۔ تب مجھے خیال آیا کہ کوئی میرے گھر کے دروازے پر کھڑا ہے۔

تیسری گھنٹی نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔ میں اچھل کر کرسی سے اٹھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور حیران ہُوا کہ صرف تین بجے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ صبح کے بعد اب تک ایک سال گزر چکا ہے۔

میں نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک اجنبی کھڑا تھا۔ "کیا با ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے اپنا والٹ نکال کر مجھے اپنا بیج دکھایا۔ "میں ویل انویسٹی گیٹر ہوں، مسٹر فشر۔"

میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"میرا نام جان مورگن ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ چند منٹ دے سکیں گے؟ مجھے آپ سے کچھ سوال کرنے ہیں۔"

میں اسے گھورنے لگا۔ وہ کسی بھی طرح کی جواب د کے لیے مناسب وقت نہیں تھا۔ "آپ پھر کسی وقت آجا گا مسٹر مورگن۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، بات اسی وقت ہوگی" اس کا لہجہ کچھ ناخوش گوار ہوگیا۔ "مسز اسنائیڈر نے آپ کیس کے بارے میں کچھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں جن فوری تصدیق ضروری ہے۔ اس میں آپ ہی کا بھلا ہے۔"

مجھے اس کا لہجہ، اس کا انداز بہت برا لگا۔ ویلفیئر ڈیپارٹمن کا بیج آدمی کو خدا تو نہیں بنا دیتا۔ میں دروازے پر پھیل کر ک ہوگیا۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں آپ ہر سوال کا جواب دوں گا۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ لیکن اسے اندازہ ہوگیا کہ میں اسے گھر میں بٹھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس جیب سے چھوٹی سی ایک نوٹ بک نکالی اور اس کی ورق گرد کرنے لگا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "آج آپ اپنی بیٹی کی تدفین کی ہے۔"

میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ سرد لہجے میں، بے حد غیر جذباتی انداز میں شروع ہوگ اس نے نوٹ بک میں کچھ لکھا۔ میں جانتا تھا، تمام انویسٹی گ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان سے ان کی نوٹ بک چھین لو تو بولنے کے قابل ہی نہیں رہیں گے۔

"سروس اور تابوت پر 40 ڈالر خرچ ہوئے۔ قبرستان فیس 20 ڈالر تھی۔ کیا یہ درست ہے؟"

"نہیں۔ تم کچھ بھول گئے ہو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا؟" اس نے تیز نظروں سے مجھے گھورا۔

"ہم نے چرچ میں دس ڈالر کا عطیہ بھی دیا تھا۔ یہ کل ملا ہوئے 70 ڈالر۔"

اس نے یہ اضافہ بھی پنسل کی مدد سے نوٹ بک کے سپرد کردیا۔ "آپ کے پاس یہ رقم کہاں سے آئی مسٹر فشر؟"

"اس کا تم سے کیا سروکار؟"

اس کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ مچلی۔ "ہم سے زیادہ اور کسے حق ہے پوچھ گچھ کا۔ دیکھیں مسٹر فشر، آپ ریلیف پر ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ قلاش ہیں۔ یعنی آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اسی لیے تو ہم آپ کی مدد کر رہے ہیں۔ اب ایسے میں آپ 70 ڈالر کی فضول خرچی کریں گے تو پوچھ گچھ تو ہوگی۔ آپ کو ہمیں بتانا ہوگا کہ یہ رقم آپ کے پاس کہاں سے آئی۔"

میری نگاہیں جھک گئیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انھیں آپ پر فوقیت حاصل ہے۔ آپ کو جواب دینا ہے، نہیں تو آپ کی امداد ختم۔ مجھے بتانا چاہیے تھا۔ لیکن میری عزتِ نفس، میری غیرت نے مجھے روک دیا۔ میں اسے کیسے بتا سکتا تھا۔ یہ بات تو ی اور اس کے والدین کے درمیان تھی۔ کوئی کسی سے پوچھے کہ تمھارے پاس اپنی بیٹی کی تدفین کے لیے رقم کہاں سے آئی تو یہ تو ظلم ہے۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اس رقم کے ہوتے ہوئے تم نے اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا! تمھاری بیٹی رات بھر طبی امداد سے کیوں محروم رہی!

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

"ممکن ہے، تم ہم سے چھپ کر راتوں کو نوکری کرتے رہے ہو۔" اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "تم ہمیں دھوکا دیتے رہے ہو مسٹر فشر۔"

میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسے یہ کیسے معلوم ہوا؟ "اس معاملے سے اس کا کیا تعلق؟" میں نے کہا۔

وہ اب بڑے تفخر سے مسکرا رہا تھا۔ "ہمارے اپنے ذرائع ہیں معلومات کے۔" اس نے لہجے میں پُراسراریت سموتے ہوئے کہا۔ "تمھیں شاید پتا نہیں۔ ہمیں بے وقوف بنانا بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ یہ نیویارک شہر کے ساتھ فراڈ ہے۔ تم جیل بھی جا سکتے ہو۔"

اب مجھے غصہ آرہا تھا اور میری برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس دن کی اب تک کی اذیتیں اتنی تھیں کہ پتھر بھی جاتے۔ اس پر مستزاد یہ سفاک آدمی۔ "کوئی کام کرنا چاہے تو اسے جیل جانا پڑتا ہے۔ یہ تم مجھے کیا پڑھانے کی کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں مسٹر فشر، کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے بے حد رسان سے کہا۔ "میں تو صرف حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تو سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ماہانہ 72 ڈالر میں تین افراد کا گزارہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے نتیجے میں کبھی کبھی وہ تین سے دو ہو جاتے ہیں۔ 72 ڈالر میں آدمی کو جڑ والے آلو کھانے پڑتے ہیں۔ بھوکا مرنے سے بچنے کے لیے آدمی ہاتھ پاؤں بھی نہ مارے۔"

جعفر از بنگال

انگریز مؤرخوں کا یہ دعویٰ کہ کلائیو نے تین ہزار فوج کی مدد سے نواب سراج الدولہ کی لاتعداد فوج پر فتح پائی، قرینِ عقل نہیں ہوسکتا، کیوں کہ 50 ہزار میں سے ہر ایک کے حصے میں تین ہزار کی بوٹی تک نہیں آسکتی۔ دراصل خود نواب کی فوج کا بیش تر حصہ اپنے گھر کو آگ لگا رہا تھا۔ یہ میر جعفر جیسے شخص کی غداری تھی جس کے باعث بنگال میں اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس پر بھی اگر نواب سراج الدولہ کا سپہ سالار نہ مرتا تو نتیجہ کچھ اَور ہوتا۔ سپہ سالار کو جو میر جعفر کے ساتھ شریک نہ تھا، میر جعفر ہی کے آدمیوں نے قتل کر ڈالا۔ کلائیو کے صرف 20 آدمیوں کا مارا جانا اور 50 کا زخمی ہونا تعجب خیز نہیں تھا، کیوں کہ توپ خانہ پہلے ہی خرید لیا گیا تھا اور توپوں میں پانی ڈلوا دیا گیا تھا۔

لڑائی کے بعد کلائیو مرشد آباد پہنچا۔ وہ کٹھ پتلی شاہِ دہلی سے پہلے ہی میر جعفر کی تقرری کا فرمان حاصل کر چکا تھا، چناں چہ 29 جون 1757ء کو کرنل کلائیو نے میر جعفر کو گدی پر بٹھا دیا۔ میر جعفر کو انگریزوں کی مفروضہ امداد کے سلسلے میں تمام خزانہ اور ذاتی زر و جواہر کلائیو کی نذر کرنے پڑے، جن میں سے ہر انگریز افسر کو معقول حصہ دیا گیا۔ صرف کلائیو کا حصہ 35 لاکھ 10 ہزار رُپے تھا۔ اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک کروڑ روپے کلکتے کے نقصان کے عوض دیے گئے، اس کے علاوہ بنگال میں 24 پرگنے کا زرخیز علاقہ بھی کمپنی کی نذر ہوا۔ 1759ء میں شاہ عالم نے اس تمام علاقے کا محاصل جو چار لاکھ 50 ہزار روپے ہوتا تھا، کلائیو کو بخش دیا اور اس طرح تقریباً سارا بنگال انگریزوں کے زیرِ تسلط آگیا۔

[illegible] ایاز گوندل کا مطالعہ

”تو تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم ہم پر خود کو بے روزگار ظاہر کرتے رہے، جب کہ اسی دوران تم راتوں کو چھپ کر ملازمت کرتے رہے؟“

”میں نے ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا۔“

”تو پھر بچی کی تدفین کے لیے 70 ڈالر کہاں سے آئے تمھارے پاس؟“

میرے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔ ”ہاں، میری بیٹی مر گئی۔ میں نے اس کی تدفین کی۔ اور کیا کر سکتا تھا۔ اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو اس کا علاج نہ کراتا۔ رات بھر تمھارے منحوس امدادی ڈاکٹر کی آمد کا انتظار نہ کرتا۔ میرے پاس پیسے ہوتے تو اپنی بچی کو ڈاکٹرز کے پاس لے جاتا، اور اس وقت وہ زندہ ہوتی۔“

وہ مجھے سرد نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی اسے دیکھ کر کہ کوئی انسان اتنا غیر حساس بھی ہو سکتا ہے۔

”تو تم راتوں کو کام کرتے رہے ہو؟“ اس نے دہرایا۔

اچانک تمام تلخیاں، تمام اذیتیں اور دلی تکلیفیں میرے وجود میں یک جا ہو گئیں۔ میں نے اسے ٹائی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کی تھوتھنی اپنے چہرے کے قریب لے آیا۔ ”ہاں... میں راتوں کو جاگتا اور محنت کرتا تھا۔“ میں نے اسے جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ میری گرفت میں پھڑ پھڑانے لگا۔ ”مجھے چھوڑ دو مسٹر فشر۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”یہ سب کچھ کرنا تمھارے لیے اور نقصان دہ ہوگا۔ تم پہلے ہی بڑی مشکل میں پھنسے ہوئے ہو۔“

وہ نہیں جانتا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔ نقصان تو اب ہونا ہی تھا، تو کیوں نہ دل خوش کر لیا جائے۔ میں نے اس کے مُنہ پر اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی ناک پر خون کا دھبا نمودار ہو گیا تھا۔

اب اس کی نگاہوں میں خوف تھا۔ وہ ہال وے کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ پھر وہ دیوار سے چپکے چپکے زینے کی طرف کھسکنے لگا۔ زینے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ پھر وہ ہسٹیریائی انداز میں چلایا۔ ”تم اس کا نتیجہ بھگتو گے۔ تمھاری امداد بند ہو جائے گی۔ میں تمھیں اس حال کو پہنچا دوں گا کہ تم بھوکوں مرو گے۔“

میں نے جارحانہ انداز میں اس کی طرف قدم بڑھایا تو وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ میں نے ریلنگ سے نیچے دیکھتے ہوئے اسے للکارا۔ ”تم واپس آئے یہاں تو میں تمھیں جان سے مار دوں گا۔ مجھ سے دور رہنے میں ہی تمھاری بھلائی ہے۔“

وہ اگلی لینڈنگ پر پہنچ گیا تھا۔ میں اپنے اپارٹمنٹ میں واپس چلا آیا۔ مگر میری طبیعت بگڑ رہی تھی۔ اب میں اپنے آپ سے شرم سار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے عمل سے اس دن کے دامن کو داغ دار کر دیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا... کم از کم آج کے دن نہیں۔

نیلی بیڈ روم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ ”کون تھا ڈینی؟“

”ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کا ایک بندر۔“ میں نے اپنے لہجے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”عقل مند بن رہا تھا۔ میں نے بھگا دیا اسے۔“

”کس لیے آیا تھا؟“

اس روز اس وقت تک جو کچھ ہو چکا تھا، وہی اس کے لیے کم نہیں تھا۔ اس میں اضافہ کرنا زیادتی ہوتی۔ ”کچھ نہیں۔ بس کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ تم جاؤ میری جان۔ کچھ دیر آرام کر لو۔“

”انھیں تمھاری نائٹ جاب کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے نا؟“ اس کے لہجے میں یاس تھی۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ شاید اس نے سب سن لیا تھا۔

”تم کچھ دیر سو جاؤ نا۔ کوشش تو کرو۔“ میں نے موضوع بدلا۔

وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی۔ ”جھوٹ مت بولو ڈینی یہی بات ہے نا؟“

”اگر ایسا ہے تو بھی کیا۔“ میں نے ظاہری بے پروائی سے کہا۔ ”اس کی اہمیت ہی کیا ہے۔ میری جاب پر گزارہ ہو سکتا ہے۔ باس نے وعدہ کیا ہے کہ جلد ہی میری تنخواہ بڑھا دے گا۔“

وہ کھڑی مجھے تکتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں اس کی طرف بڑھا اور میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہمارے لیے کچھ بھی اچھا نہیں ہوگا ڈینی۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ”ہم ہمیشہ پریشانیوں میں گھرے رہیں گے۔ اب آج کے دن کو ہی دیکھ لو۔ جو کچھ ہو چکا تھا، وہ کم تو نہیں تھا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ ابھی اور بہت کچھ ہونا ہے۔“

”ایسا نہیں ہے بی بی۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”اب حالات بہتر ہوتے جائیں گے۔ دیکھ لینا۔“

”نہیں ڈینی، کچھ نہیں بدلے گا۔ کبھی نہیں بدلے گا۔ میں اپنے ساتھ تمھارے لیے صرف بدقسمتی لائی ہوں۔“

”یہ بات اپنے دل سے نکال دو۔ آدمی کو ہمیشہ بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔“

”امید! کیسی امید؟ تمھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تمھاری ہے یا وہ بھی چھن گئی۔ چار دن سے چھٹی کر رہے ہو تم اور تم وہاں فون بھی نہیں کیا۔“

”میں اس طرف سے فکر مند نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ سچ نہیں تھا۔ مجھے پریشانیوں میں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ کو فون کر کے بتا دوں۔ ”جب جیک کو صورت حال کا علم وہ سمجھ جائے گا۔“

لیکن نیلی کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔ اور وہ بے یقینی مجھے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

* * *

میں اسٹور میں داخل ہوا تو جیک نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ کی نگاہوں میں کوئی خیر مقدمی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کاؤنٹر طرف دیکھا۔ وہاں میری جگہ ایک اور شخص کام کر رہا تھا۔

”ہیلو جیک۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہیلو ڈینی۔“ اس کے لہجے میں بے مہری تھی۔

منتظر تھا کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھے گا۔ مگر وہ تو خاموش تھا۔ اندازہ ہو گیا کہ وہ غصے میں ہے اور مجھے ہی پہل کرنی پڑے ”ایک ایسی بات ہو گئی تھی جیک کہ میرا آنا ممکن ہی نہیں “ میں نے کہا۔

”اور پانچ دنوں میں تمھارے لیے ایک فون کرنا بھی ممکن رہا تھا۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس پر کی ہے جیک۔“ میں نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ جانتا ہوں کہ مجھے فون کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میری ذہنی ایسی تھی کہ مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں تو سب کچھ گیا تھا۔“

”دو راتوں تک میں یہاں اپنی کمر توڑتا رہا... تمھارا کرتا رہا۔ امید تھی کہ تم آؤ گے۔ لیکن تم نے تو فون تک کیا۔“

”میں مجبور تھا جیک۔ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔“

”کہ دن میں ایک فون کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ تو سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔“

دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سادگی سے کہا۔ ”میری [illegible]“

لمحہ خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ ”مذاق تو نہیں کر رہے ہو ڈینی؟“

”یہ تو مذاق میں سوچنا بھی ممکن نہیں تھا میرے لیے۔“

اس کی نظریں جھک گئیں۔ ”آئی ایم سوری ڈینی، ریئلی سوری۔“

میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ میرا متبادل کن انکھیوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو میں دل چسپی ہی نہ ہو۔ لیکن درحقیقت وہ اپنی نوکری کے لیے فکر مند تھا۔

”تو تم نے دوسرا آدمی رکھ لیا؟“ میں نے جیک سے کہا۔

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ کہا کچھ نہیں۔

”میرے لیے کوئی جگہ نہیں تمھارے پاس؟“ میں نے کہا۔ بھوک کا عفریت میرے سامنے مُنہ کھولے کھڑا تھا۔

اس نے لمحاتی توقف کے بعد جواب دیا۔ ”فی الحال تو نہیں ہے۔ آئی ایم سوری ڈینی!“

اس کے لہجے میں جو ہم دردی تھی، میں اس کے لیے شکر گزاری محسوس کر رہا تھا۔

”جیسے ہی کوئی امکان نکلا، میں تمھیں فون کر دوں گا ڈینی۔“ اس نے کہا۔ ”اگر تم مجھے فون کر دیتے تو...“

”اگر کے ساتھ تو بہت سے جملے بولے جا سکتے ہیں جیک۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تمھیں فون نہیں کر سکا۔ کچھ یاد کرنے کی فرصت ملتی تو میں تمھیں فون کرنا بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ بہ ہر حال، تمھارا شکریہ۔“

باہر نکل کر میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی ساڑھے چھ نہیں بجے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیلی کو کیا بتاؤں گا... اور کیسے بتاؤں گا۔ جب کہ اس نے تو پہلے ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا۔

میں نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ فاصلہ کم نہیں تھا لیکن جو صورت حال تھی، اس میں ایک نکل کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔

مجھے تین گھنٹے پیدل چلنا پڑا۔ لیکن مجھے برا نہیں لگا۔ اتنی دیر میں نیلی کا سامنا کرنے سے بچا جو رہا۔

ساڑھے نو بجے میں گھر پہنچا۔ رات خنک ہو گئی تھی۔ لیکن میں پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میں ہال وے میں کھڑا رہا۔ دروازہ کھولنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ نیلی کو کیا بتاؤں گا میں؟

بالآخر میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ پارلر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لیکن اپارٹمنٹ میں خاموشی تھی۔ ”نیلی...“ میں نے

اسے پکارا اور اپنی جیکٹ اتار کر الماری میں لٹکانے لگا۔

قدموں کی چاپ ابھری اور ایک مردانہ آواز نے کہا۔ ”یہی ہے وہ۔“

میں نے گھوم کر دیکھا۔ پارلر کے دروازے پر نیلی دو مردوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور ستا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے میں نے دونوں مردوں میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کا وہ انویسٹی گیٹر تھا جسے دوپہر کو میں نے مار بھگایا تھا۔

اس کی ناک پر ایک بینڈیج چپکی ہوئی تھی، ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی، اور اس کے نیچے نیل تھا۔

دوسرا آدمی میری طرف بڑھا۔ اس نے مجھے پولیس کا بیج دکھایا۔ ”تم ڈینی فشر ہو؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مسٹر مورگن نے تم پر مار پیٹ اور تشدد کا الزام عائد کیا ہے۔ مجھے تمھیں حراست میں لینا ہے۔“

میرا جسم تن گیا۔ واقعی... اس دن میں نہ جانے اور کیا کچھ ہونا تھا۔ وہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ پھر میں نے نیلی کو دیکھا اور میرے جسم کا سارا تناؤ یک لخت دُور ہو گیا۔ ”میں اپنی بیوی سے چند منٹ بات کرسکتا ہوں؟“

اس نے ایک پل سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور پھر سر ہلا دیا۔ ”ضرور۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہم باہر تمھارا انتظار کریں گے۔“ یہ کہہ کر اُس نے مورگن کا ہاتھ تھاما اور اسے دھکیلتا ہوا اپارٹمنٹ سے باہر لے گیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ”زیادہ دیر نہ لگانا بیٹے۔“

میں نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

نیلی خاموش کھڑی اپنی نظروں سے میرے چہرے کو ٹٹول رہی تھی۔ پھر وہ میری بانہوں میں سما گئی اور میرے کندھے پر سر ٹکا کر سسکنے لگی۔ ”ڈینی... میرے ڈینی، اب کیا ہوگا؟ اب ہم کیا کریں گے؟“

میں نے نرمی سے اس کے بالوں کو تھپتھپایا۔ کیا کہوں، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہوگا، اور ہم کیا کریں گے۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ چاروں دیواریں ہمیں گھیرے میں لیے آگے بڑھی آ رہی ہیں۔ ذرا دیر میں ہم ان کے درمیان گھٹ جائیں گے۔

”یہ لوگ تمھارے ساتھ کیا کریں گے؟“ نیلی نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

میں نے کندھے جھٹک دیے۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے کہا۔ مجھے کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ ایک عجیب سی بے میرے وجود میں پھیل گئی تھی۔ ”شاید مجھ پر کیس بنے گا اور سماعت تک کے لیے مجھے رہا کر دیا جائے گا۔“

”لیکن اگر انھوں نے تمھیں حوالات میں بند کر دیا تو؟“

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”ایسا نہیں ہوگا۔“ میں صرف اسے نہیں، خود کو بھی بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”ا اتنی اہمیت نہ دو۔ میں بس چند گھنٹوں میں واپس آ جاؤں گا۔

”لیکن مسٹر مورگن بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ کہہ رہے کہ تمھیں جیل میں سڑوا دیں گے۔“

”وہ ذلیل آدمی، وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ جب میں حقی بتاؤں گا تو وہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔“

”میں تمھارے لیے منحوس ثابت ہو رہی ہوں ڈینی۔ کا تم واپس ہی نہ آئے ہوتے۔“

”اگر میں واپس نہ آتا تو اس وقت دنیا کی سب سے نعمت سے محروم ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”جو کچھ ہو رہا ہے، اس نہ تمھارا کوئی قصور ہے نہ میرا۔ یہ تو قسمت کی بات ہے، الحال ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔

”میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔“ میں نے پکارا اور پھر کی طرف دیکھا۔ ”تم لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔ میں چند گھ میں واپس آ جاؤں گا۔“

اس نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”سچ رہے ہو؟“

”ہاں، تمھیں میری غیر موجودگی کا احساس تک نہیں پائے گا اور میں واپس آ چکا ہوں گا۔“ میں نے الماری میں جیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

میں ان دونوں کے ساتھ باہر سڑک پر آیا تو مورگن فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا زہریلے لہجے میں بولا۔

میں خاموش رہا۔

پولیس والا ہمارے درمیان تھا۔ اُس نے اسے جھڑک ”شٹ اپ مورگن، یہ لڑکا پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ تم ستاؤ نہیں۔“

میں نے کن انکھیوں سے پولیس والے کو دیکھا۔ ظاہر تھا کہ وہ مورگن کو پسند نہیں کرتا ہے۔ آنکھوں سے ج آدمی لگتا تھا۔

ہم نے دو بلاک کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ میں نے پولیس الے سے پوچھا۔ ”عام طور پر اس طرح کے معاملات میں کیا ہے؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”ہم پرچا کاٹیں گے، اور پھر انت ہوگی۔“

”تو سماعت تک تو میں آزاد رہوں گا؟“

”بشرطے کہ تمھارے پاس ضمانت ہو۔“ پولیس والے کے لہجے میں ہم دردی تھی۔

”ضمانت!“ میں اپنی حیرت چھپا نہ سکا۔ ”کتنے کی انت؟“

”500 ڈالر کی تو ہوگی۔“

”اور کسی کے پاس اتنی رقم نہ ہو تو؟“

”تم تو سماعت تک جیل میں سڑتے رہو گے۔“ مورگن نے ت تیزی سے جواب دیا۔

میں چلتے چلتے رُکا اور میں نے پولیس والے کی طرف دیکھا۔ ”لیکن میری بیوی بیمار ہے، اور آج وہ بے چاری کتنے صدموں سے گزری ہے۔ آج ہی تو ہم نے اپنی بچی کو دفنایا ہے۔ آج رات میں اسے اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“

اس نے ہم دردی سے مجھے دیکھا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا۔ را کام تو تمھیں پولیس اسٹیشن پہنچانا ہے۔“

”لیکن نیلی... میری بیوی... وہ اکیلی کیسے رہے گی۔ وہ بچی یاد کرے گی... اور وہ بیمار بھی ہے۔“

”کیا کر سکتے ہیں۔ تم بس چلتے رہو۔“

میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ میرے ہاتھ پر اس کی گرفت ہو گئی تھی۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ کبھی تو پہلی میں بھی کئی ہفتے لگ جاتے ہیں۔ میں نے مورگن کی دیکھا۔ وہ پولیس والے کے اُس طرف تھا۔ اس کے ر طمانیت اور مسرت تھی۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ حالات بدتر تو تھے ہی، لیکن اس نے انھیں بدترین کے پہنچا دیا تھا۔

نے سوچا' مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ پہلی سماعت تک حوالات سے بچانا ہے۔ میں اتنے دن نیلی کو اکیلا نہیں ۔ کچھ نہیں معلوم کہ وہ اس دوران کیا کر بیٹھے۔' لیکن تھا کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔

سگنل کی روشنی تبدیل ہوئی۔ ہمارے سامنے سے گاڑیاں گزرنے لگیں۔ اسی لمحے دانستہ یا نادانستہ، پولیس والے نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جبلی طور پر میں نے آگے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ایک گاڑی کے بریک چلائے۔ کوئی مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ مگر میں تیر کی طرح سڑک پار کر گیا۔ حیرت ہے کہ میں کسی گاڑی کی لپیٹ میں نہیں آیا۔ ”پکڑو... پکڑو... رُک جاؤ۔“ مورگن چلا رہا تھا۔ پھر پولیس والے کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ مگر اس وقت تک میں اگلے کارنر پر پہنچ چکا تھا۔

وہاں پہنچ کر میں رُکا اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مورگن فٹ پاتھ پر گرا ہوا تھا اور پولیس والا تن کر کھڑا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ہاتھ ہلایا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چمکتی ہوئی دھاتی چیز تھی۔ وہ چیخ چیخ کر مجھے رُکنے کو کہہ رہا تھا لیکن ہاتھ سے مجھے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔

میں نے جان لیا کہ روئے ارض پر انسانیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی!

* * *

میں لمبا چکر کاٹ کر اپنے گھر گیا۔ اس سے ملنا، اسے سمجھانا بہت ضروری تھا۔ اس سے کہنا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ مگر جب میں وہاں پہنچا تو پولیس کی گشتی گاڑی بلڈنگ کے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے سڑک پار کی اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ میرے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا دس بجے رہے تھے۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ میں نے بھاگ کر حماقت کی۔ اب خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ یونہی بھاگتا رہا تو زندگی اسی طرح بھاگتے ہوئے تمام ہو جائے گی۔ واپس آنا ممکن ہی نہیں رہے گا۔

یہ سوچ کر میں گھر کی طرف پلٹا۔ مگر مجھے یاد آیا کہ میں یہ معلوم کرنے کے بعد بھاگا تھا کہ ضمانت مجھے حوالات سے بچا سکتی ہے۔ میں رک گیا اور سوچنے لگا۔ کہیں نہ کہیں سے مجھے رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ نیلی کے گھر والے اگر چاہتے بھی تو میری مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اتنی بڑی رقم کا تو ان کے پاس تصور بھی نہیں تھا۔ میرے جاننے والوں میں ایک ہی ایسا شخص تھا، جو یہ رقم دینے کی اہلیت رکھتا تھا... اور وہ تھا سام۔

مجھے وہ گفتگو یاد آئی جو آخری بار ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے سوچا' بعض اتفاقات ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی نے

سوچ سمجھ کر انھیں ترتیب دیا ہو۔ پچھلی بار سام سے رابطہ میں نے وکی کی پیدائش کے بعد کیا تھا۔ اور سام سمجھا تھا کہ میں اسے چونا لگانے آیا ہوں۔ اس وقت میں نے قسم کھائی تھی کہ اب کبھی اس سے مدد نہیں مانگوں گا۔ لیکن اس وقت میں بہت بڑی پریشانی میں تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا، سوائے اس کے کہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں یا پھر جیل جانا قبول کرلوں۔ اب بھاگنے کے نتیجے میں تو میرا جرم اور سنگین ہوگیا تھا۔

میں کارنر والے کینڈی اسٹور میں گیا، ڈائریکٹری میں سے اس کا نمبر تلاش کیا اور ڈائل کیا۔

”ہیلو؟“ ایک نسوانی آواز نے کہا۔

”مسز گورڈن موجود ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”مسز گورڈن تو شہر میں موجود نہیں ہیں۔ اور مسٹر گورڈن ابھی اپنے دفتر میں ہی ہیں۔“

”مجھے ان کے دفتر کا نمبر چاہیے۔“

اس نے مجھے نمبر لکھوادیا۔ میں نے اپنی جیب ٹٹولی۔ لیکن اب وہ خالی تھی۔ فون کرنے کے لیے ایک سکہ بھی نہیں تھا۔

اب مجھے پیدل ہی امپائر اسٹیٹ بلڈنگ جانا تھا۔ میں تیز قدموں سے چلنے لگا۔ وہ کم از کم چالیس منٹ کی مسافت تھی۔ میں دعا ہی کرسکتا تھا کہ وہ اس وقت تک دفتر سے نہ نکل جائے۔

میں وہاں پہنچا اور نائٹ ایلی ویٹرز کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود دربان نے مجھے روک لیا۔ ”کہاں جارہے ہو؟“ اس نے مشکوک نظروں سے مجھے گھورا۔

”بائیس ویں منزل۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”مسٹر گورڈن سے میری ملاقات پہلے سے طے ہے۔“

اس نے رجسٹر کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”اوکے۔ مسٹر گورڈن موجود ہیں۔ ڈنر کے بعد وہ آئے تھے اور اس کے بعد دفتر سے نہیں نکلے ہیں۔ یہاں دستخط کردو۔“ اس نے میری طرف [illegible] بڑھا دی۔

[illegible] کرتے ہوئے اس صفحے کا جائزہ [illegible] تھے۔ اس سے چار سطر [illegible] اور ان کے آگے ایک [illegible]

[illegible] ماڈل؟“ میں نے [illegible]

اس [illegible] ”ان کی سیکریٹری ان کے ساتھ ہی آئی تھی۔“

میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ دربان کی اس مسکراہٹ نے سب کچھ بتادیا تھا۔ میں بغیر دیکھے کہہ سکتا تھا کہ سام کی سیکریٹری بہت حسین ہوگی۔ یعنی سام بالکل نہیں بدلا تھا۔ اب بھی پہلے جیسا ہی تھا۔

میں ایلی ویٹر سے نکلا اور سام کے آفس کی طرف بڑھا۔ شیشے کے دروازے پر اس کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا تھا۔ دروازے کے باہر استقبالیہ کمرا نظر آرہا تھا۔ وہاں روشنی بہت تھی۔ اور دروازے لاک نہیں تھے۔

استقبالیہ کی ڈیسک کے ساتھ آراستہ ویٹنگ روم تھا۔ وہاں ایک اور دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ وہ ایک بڑا آفس تھا۔ وہاں بیس کے قریب میزیں ہوں گی۔ اس آفس کے اُس طرف ایک اور دروازہ تھا۔ میں اس کی طرف بڑھ گیا۔

اس دروازے پر بھی سنہری دھاتی حروف میں اس کا نام تھا۔ میں نے ناب گھمائی۔ دروازہ بغیر آواز کے کھل گیا۔ اندھیرا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ بورڈ ٹٹولا اور سوئچ آن کیا۔ کمرا اچانک ہی روشنی سے بھر گیا۔ ایک مدھم بڑبڑاہٹ ابھری۔ میں بھی پلکیں جھپکاتا رہ گیا۔ پھر ایک عورت کی ڈری ڈری چیخ سنائی دی، اور اچانک ہی وہ مجھے نظر آئی۔ وہ جس حال میں تھی، اس میں اس کے چہرے کی تمتماہٹ فطری تھی۔

میں نے سام کو دیکھا۔ وہ کسی بھی اعتبار سے نہیں بدلا تھا۔ پہلے جیسا ہی تھا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھا اور باہر چلا گیا۔ باہر ایک کرسی پر بیٹھ کر میں نے سگریٹ سلگالی اور انتظار کرنے لگا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد دروازہ کھلا لڑکی باہر آئی۔ اب اسے دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ پندرہ منٹ پہلے میں نے اندر سام کے ساتھ جس لڑکی کو دیکھا تھا، یہ وہی لڑکی ہے۔ بہ ہر حال، مجھے مایوسی ہوئی۔ کیوں کہ میں سام کے باہر آنے کی توقع کررہا تھا۔

لڑکی نے مجھے دیکھا اور بے حد شائستگی سے کہا۔ ”اب آپ مسٹر گورڈن سے مل سکتے ہیں۔“ وہ خالص سیکریٹریوں والا لہجہ تھا۔

”شکریہ۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور دروازہ کھول کر اندر گیا۔ باہر ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ شروع ہوگئی تھی۔

سام اپنی میز کے عقب میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔

”تم نے اچھی ترکیب نکالی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کام شروع کرنے سے پہلے انھیں سکون فراہم کیا جائے۔ اس طرح کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔“

اس نے اپنا سگار سلگاتے ہوئے بے مہری سے مجھے دیکھا۔

”کیا چاہتے ہو؟“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

میں دل میں اس کا احترام کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بہت جان تھا۔ جس حال میں ذرا دیر پہلے میں نے اسے دیکھا تھا، اس کے بعد یہ لب ولہجہ۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اس سخت گرمی میں موم بتی کی سی کیفیت میں ہوتا۔ ایسے آدمی سے تو سیدھی بات ہی کی جاسکتی ہے۔ میں اس کی میز کی طرف بڑھا۔ ”مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں بڑی مصیبت میں ہوں۔“

اس کی نگاہوں میں سختی جھلکنے لگی۔ ”تو میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

”اور کوئی ایسا نہیں جو میری مدد کرسکے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”تم یہاں سے نکل جاؤ لفنگے۔ میں ایسے لوگوں کو خیرات نہیں دیتا۔ اور نہ ہی اب تم مجھے بے وقوف بنا سکتے ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں سام۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔ ”میں بڑی مصیبت میں ہوں اور مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“ میں اپنے لہجے کے برعکس میں ڈٹ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس بار وہ مجھے ہلا نہیں سکتا تھا۔

وہ میز کے گرد گھوم کر جارحانہ تیوروں کے ساتھ میری طرف بڑھا۔ ”نکل جاؤ یہاں سے۔“ وہ پھنکارا۔

”خدا کے لیے سام، میری بات سنو۔“ میں نے التجا کی۔ ”میرے حالات بہت بگڑ گئے ہیں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے اور...“

”تم ہو ہی اسی قابل۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”تم کبھی اچھے نہیں تھے اور نہ کبھی اچھے بنو گے۔ میں نے تمہارے لیے بہت کچھ کیا۔ اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینکنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

اس ایک لمحے نے مجھے اندر سے تبدیل کرکے رکھ دیا۔ میں اندر سے سخت اور سرد تھا... کسی دھات کی طرح۔ یہ شخص انسانیت کی زبان سمجھنے والا نہیں تھا۔ اس سے اُس کی اپنی زبان میں بات کرنا ضروری تھا۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اتنی احمقانہ بات کبھی نہ کرتا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر رکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم جسمانی طور پر بہت دُور ہو چکے ہو۔“

”میں ابھی تمہیں دکھاتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ گھمایا۔

میں نے اس کا پنچ اپنی کلائی سے بلاک کیا۔ ”تمہیں اپنا سبق یاد ہے سام؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”بیلے ڈانسر کی طرح مٹکو نہیں۔ جم کر سوار کرو۔“ یہ کہہ کر میں اس پر وار کرنے کے بجائے تھرکتا ہوا اس سے دُور ہوگیا۔

وہ دونوں ہاتھ جھلاتا ہوا میرے پیچھے آیا۔ لیکن اس کے قدموں میں بھاری پن تھا۔ میں بڑی آسانی سے اس سے بچ نکلا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ فاقہ کشی کے اپنے کچھ فائدے بھی ہیں۔ آدمی پر چربی نہیں چڑھتی۔ کم زور ہو جانے کے باوجود وہ پھرتیلا رہتا ہے۔

چند منٹ میں اسے دوڑاتا رہا اور وہ جوش میں دوڑتا رہا۔ پھر وہ ریل کے انجن کی طرح ہانپنے لگا۔ اس کی پُرشور سانسوں کی آواز یقیناً کمرے سے باہر جارہی ہوگی، اور اس کی سیکریٹری جانے کیسی کیسی بدگمانیوں میں مبتلا ہو رہی ہوگی۔

بالآخر وہ اپنی کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ مجھے چھو بھی نہیں سکا، اور میں اسے چھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔

میں اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ”اب تم میری بات سننا پسند کرو گے سام؟“

اس نے ایش ٹرے پر رکھا سگار اٹھالیا جو بجھ چکا تھا۔ ”تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

”میں کہیں جانے کے قابل نہیں ہوں۔ تمہیں میری مدد کرنی ہوگی۔“

”میں سب کچھ کرچکا ہوں تمہارے لیے۔“ اس نے معاندانہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پہلے تم نے سیل کے معاملے میں مجھ سے دغا کی۔ پھر گلووز کے دنوں میں تم نے میکسی فیلڈز سے ساز باز کرکے مجھے لوٹا۔ آخر میں کتنی بار ڈسا جاؤں تم سے؟“

اس کے پاس ہاتھی جیسی یادداشت تھی۔ وہ بھولتا کچھ بھی نہیں تھا۔ ”اس بار تمہیں کوئی مالی نقصان نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”مجھے بس تھوڑی مدد کی ضرورت ہے... اور ایک جاب کی، یہاں تک کہ حالات سدھر جائیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جاب میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ تمہیں آتا ہی کیا ہے۔“

”میں اب بھی فائٹ کرسکتا ہوں۔“

”نہیں۔ اس کے لیے اب تمہاری عمر زیادہ ہو چکی ہے۔ کئی برس سے رنگ سے دُور ہو تم۔ تم تو ایک ڈالر بھی نہیں کما سکتے فائٹ سے۔“

میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ 23 سال کی عمر اور

چھ سال سے رنگ سے دور... میرے لیے کوئی چانس نہیں تھا۔" "تو کیا ہوا۔ یہ اتنا بڑا آفس ہے تمہارا۔ مجھے یہاں کوئی جاب دے دو۔"

"نہیں، ہرگز نہیں۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج رات یہاں جو نظارہ دیکھا ہے، اس کے بارے میں میمی کو کبھی نہیں بتاؤں گا۔"

اس کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ناک آؤٹ پنچ تھا۔ یہی ایک زبان تھی جو وہ سمجھ سکتا تھا۔ میں نے شرافت سے بات کی۔ التجا کی۔ بھیک مانگنے والا انداز اختیار کیا۔ عجز سے پیش آیا مگر اس دنیا میں آگے بڑھنے کا، اپنے لیے راستہ بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یہ کہ جو چاہیے، ہاتھ بڑھا کر لے لو، نہ ملے تو چھین لو۔ سام کا اپنا بھی یہی طریقہ تھا۔ اور اگر یہ اس کے لیے جائز تھا تو میرے لیے ناجائز کیوں ہوتا۔

"تم اب بھی ویسے ہی ہو ڈینی۔" اس نے کہا۔ "جیسے دنیا پر لازم ہے کہ تمہاری ہر ضرورت پوری کرے؟"

"نہیں، اب میں وہ نہیں ہوں سام۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "جو اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ہے یہ ایک نیا ڈینی فشر ہے۔ مجھ پر جو کچھ گزر رہی ہے، اس کے بعد میں بدلے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ڈیڑھ سال میں ریلیف پر رہا ہوں۔ صرف اپنا اور متعلقہ لوگوں کا پیٹ بھرنے کے لیے میں حقیر کیڑوں کی طرح رینگ رینگ کر جیا ہوں۔ آج میں نے ایک ریلیف انویسٹی گیٹر پر صرف اس لیے ہاتھ اٹھایا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اپنی بچی کی تدفین کے لیے میرے پاس رقم کہاں سے آئی، اور میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میرے غریب پڑوسیوں نے میری مدد کی تھی۔ اب وہ انویسٹی گیٹر پولیس لے کر آ گیا۔ میں ان سے جان چھڑا کر بھاگا ہوں۔ بیوی میری بیمار ہے اور اب میرے لیے فکر مند بھی ہو گی۔ اب بتاؤ، اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آدمی بھلا پہلے جیسا رہ سکتا ہے؟ نہیں سام، اب میں کبھی پہلے جیسا..."

اس نے شاکڈ لہجے میں میری بات کاٹ دی۔ "اتنا کچھ ڈینی۔ اتنا کچھ!"

"تم نے سن تو لیا سب۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور سرد نظروں سے اسے گھورا۔ "اب میں کبھی پہلے جیسا نہیں ہوں گا... ہونا چاہوں گا بھی نہیں۔ اب تم بتاؤ، میری مدد کرو گے یا میں تمہاری عظیم الشان سرگرمیوں کے بارے میں میمی کو مطلع کروں۔"

اس کی نظریں جھک گئیں۔ چند لمحے وہ میز کو تکتا اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ "او کے کڈ۔ تم کر لیا۔" اس کے لہجے میں عجیب سی نرمی تھی۔

"میں تمہارا احسان مند ہوں۔" میں نے کہا۔ "زند ہر موڑ پر زندگی گزارنے کے، اس دنیا میں جینے کے تمھی نے مجھے سکھائے ہیں۔"

* * *

میں جیسے ہی اندر داخل ہوا، استقبالیہ کلرک نے ہوئے کہا۔ "صبح بہ خیر ڈینی۔" وہ چیونگم چبا رہی تھی۔ تمہیں یاد کر رہا ہے۔"

"شکریہ بے بی۔" میں بھی مسکرایا۔

میں بڑے آفس ہال میں داخل ہوا۔ وہاں سب کاموں میں مصروف تھے۔ میں کارنر میں کھڑکی کے اپنی ڈیسک کی طرف بڑھا۔ کرسی پر بیٹھ کر میں نے باسکٹ میں سلیقے سے رکھے کاغذات کو دیکھا۔

مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ میز پر ا سا نظر آیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"ڈینی..." کیٹ نے بات شروع کی۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "میں جانتا ہو بی۔ باس مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور میں یہاں موجود ہوں۔"

"تو انتظار کس بات کا ہے؟" وہ زہریلے لہجے میں "نقشین حروف میں چھپے دعوت نامے کا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی ڈیسک کی طرف چلی گئی۔

کیٹ کو میں چھیڑتا اور ستاتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اچھی لڑکی تھی۔ نہ تو وہ دنیا کی پہلی سیکریٹری تھی اور نہ آخ اپنے باس کی سواری تھی۔ لیکن ہماری پہلی ملاقات صورت حال میں ہوئی تھی، اس کے تحت میرے لیے ناپسندیدگی فطری تھی۔

میں اس رات کو یاد کر کے مسکرایا۔ اس رات کو ساڑھے سال ہو چکے تھے۔ اس کے بعد سے اب تک بہت کچھ تھا۔ جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ بہت لوگ جنگ پر تھے۔ میں ایک ایسے جسمانی عیب کی وجہ سے مسترد کر جس سے میں خود بھی بے خبر تھا اور جو پیدائشی تھا۔

میں نے ضروری کاغذات سمیٹے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی

بجی اور میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

کی اور لانگ آئی لینڈ کے وار پلانٹ سے فون کر رہی ہاں وہ کام کرتی تھی۔ "میں تمہیں لانڈری کے بارے بھول گئی تھی ڈیئر۔" اس نے کہا۔

مجھے یاد ہے ہنی۔" میں نے کہا۔ "اور سناؤ، تمہاری حال ہے؟"

گرمی ہے ڈیئر۔ پلانٹ میں ٹمپریچر 90 درجہ ہے۔"

چھوڑ دو نا جاب۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں۔ میں کما رہا ہوں۔"

اس پر پہلے بھی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ اور میرے پاس ہے بھی کیا۔ پورے دن گھر پر اکیلی رہوں تو پاگل گی۔ میرے لیے مصروفیت ضروری ہے۔"

جانتا تھا کہ بحث کا کچھ حاصل نہیں۔ وکی کی موت کے ہو گئی تھی۔ وہ خاموش رہنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کی جگمگاہٹ بھی کسی قدر ماند پڑ گئی تھی۔ "رات کا کھانا ائیں گے یا باہر؟" میں نے پوچھا۔

کھائیں گے۔"

۔ میں گھر سے تمہیں پک کر لوں گا... چھ بجے۔"

نے سام کے دفتر کا دروازہ کھولا تو کیٹ نے میرا منہ اپنے ٹائپ رائٹر پر جھک گئی۔ میں مسکراتے ہوئے دفتر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ کیٹ مجھے پسند کرتی ہے۔

ام نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "تو بالآخر تم مجھ تک پہنچنے ب ہو ہی گئے۔" وہ غرایا۔

اس کی کچھ ایسی پروا نہیں تھی۔ یہاں کے چند برسوں بہت کچھ کمایا تھا۔ اب میری بات کا کچھ وزن ان کاروبار نہیں تھا۔ لیکن میرے لیے بہت کچھ سوچوں، کچھ آئیڈیوں پر مشتمل تھا جسے چند تھے۔ وہی ان سوچوں اور آئیڈیوں سے تھے۔ مجھ جیسے اور سام جیسے لوگ۔ اور یہ جانتا تھا۔

کا لالچ نہ ہوتا تو میں آتا ہی نہیں۔" میں نے کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتے کہ تم

ایک اٹھا۔ ایسے میں وہ بالکل اچھا نہیں لگتا بہت بڑھ گیا تھا۔ تھوڑی ایک کی جگہ دو نظر

آنے لگی تھیں۔ اب وہ سینٹرل پارک ساؤتھ کے علاقے میں رہنے والا تین بیٹوں کا باپ تھا۔ تیسرے کا گاڈ فادر میں تھا۔

"اور ہاں، میمی نے کہا ہے کہ میں آج رات تمہیں اور نیلی کو ڈنر پر مدعو کر لوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایسی کیا آفت آ گئی؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم سلاٹ مشین کے کچرے کو بھول جاؤ۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیوں بھئی؟ میرا تو خیال تھا کہ تم اس پر بری طرح فدا ہو۔"

"میں نے ارادہ بدل دیا۔" وہ بولا۔ "ان پر اخراجات بہت ہوں گے۔ اور جب وہ خراب ہوں گی تو سب ختم۔ جنگ کی وجہ سے نہ تو ان کے پارٹس دست یاب ہوں گے، نہ ہی متبادل مشینیں مل سکیں گی۔"

"بس یہی وجہ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "یا یہ اس لیے ہے کہ میکسی فیلڈز بھی ان میں دل چسپی لے رہا ہے۔"

اس کا چہرہ پھر تمتمایا۔ مجھے تو لگا کہ وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بن گیا ہے۔ وہ عمر کے خطرناک حصے میں تھا۔ "مجھے میکسی فیلڈز سے کیا۔" اس نے کہا۔ "بس مجھے یہ کام اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ کسی ہوٹل کا، نائٹ کلب کا ٹھیکا میرے لیے زیادہ موزوں ہے۔ مجھے لوگوں میں دل چسپی ہے۔ میں انھیں سمجھتا ہوں، ان کو خوشی فراہم کرنے کے ذرائع تخلیق کر سکتا ہوں۔ لیکن مشینیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، نہ ہی مجھے ان سے دل چسپی ہے۔"

"لیکن میں نے اس سیٹ اپ کے لیے ایک ہفتہ مغز ماری کی ہے۔ اور صرف پندرہ ہزار ڈالر میں یہ نہایت منفعت بخش سرمایہ کاری ہے۔"

"تو یہ میکسی فیلڈز کو مبارک ہو۔ مجھے اس میں کوئی دل چسپی نہیں۔ میں ان جانی فیلڈ میں نہیں گھسنا چاہتا۔ پندرہ ہزار ڈالر کوئی معمولی رقم نہیں۔"

میں آگے کی طرف جھکا۔ میری دانست میں وہ ایک بڑا موقع گنوا رہا تھا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس سے اختلاف کر رہا تھا۔ "تم بہت اچھا موقع گنوا رہے ہو سام! میں اس پورے سیٹ اپ کا جائزہ لے چکا ہوں سام۔ یہ مشینیں بہت آگے جانے والی چیز ہیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد دیکھنا، گرم کافی سے لے کر آئس کریم تک ہر چیز ان مشینوں سے ہی ملا کرے گی۔"

"ہوتا رہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ طے تھا کہ وہ

اپنے طور پر فیصلہ کر چکا ہے۔" ابھی تو وہ صرف سگریٹ اور کوکا کولا کے کام آ رہی ہیں۔ اور مجھے ان کی ضرورت نہیں۔" اس نے میز پر رکھے ہوئے کاغذات اِدھر اُدھر کیے اور جائزہ لیا۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک اَور کام ہے۔ اٹلانٹک سٹی میں ہماری کچھ تفریح گاہیں بلاک ہو رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں جا کر چیک کرو۔"

میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ "ان وینڈنگ مشینوں کے بارے میں تمہارا فیصلہ حتمی ہے؟"

"کتنی بار کہوں۔ اب تم اسے بھول جاؤ اور..."

"مگر مجھے ان میں دلچسپی ہے سام۔"

"ہوگی۔ لیکن پیسا تو میرا لگ رہا ہے۔ حتمی فیصلہ بھی میں ہی کروں گا۔"

"میں انھیں خریدنا چاہوں گا سام۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "مال ہے تمہارے پاس؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ بہ خوبی واقف تھا کہ میرے پاس مال نہیں ہے۔ "تم جانتے ہو۔ تم مجھے 75 ڈالر فی ہفتہ تنخواہ دیتے ہو۔ میرے پاس اتنی بڑی رقم ہو ہی نہیں سکتی۔"

وہ طمانیت سے ہنس دیا۔ "لیکن شہر سے باہر جاتے ہو تو اخراجات کی مد میں تم تگڑی رقم وصول کرتے ہو۔ جب کہ وہاں گھٹیا ہوٹلوں میں ٹھیرتے ہو۔ تم سمجھتے ہو، مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔"

میں مسکرایا۔ "تم جانتے ہو کہ تکلیف اٹھا کر چند ڈالر بچاتا ہوں میں۔ تم بھی تگڑا سفر خرچ دیتے ہی نہیں ہو مجھے۔"

"تو پھر اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی تمہارے پاس؟"

"میرے پاس پندرہ سو ڈالر ہیں۔ آدھی رقم بینک سے مل سکتی ہے۔ باقی آدھی رقم میں تم سے لے لوں گا۔"

سام اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "مجھ سے؟" وہ دہاڑا۔ "تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ تمھیں رقم دے دوں تو قیامت تک واپس نہیں ملے گی مجھے۔"

"میں تمھیں ایک ایک پینس لوٹا دوں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا۔" میں نے پُر سکون لہجے میں کہا۔

"ایک بار تمہاری زبان پر میں اپنے پانچ ہزار ڈالر ڈبو چکا ہوں۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم سمجھتے ہو، دوبارہ مجھے بے وقوف بنا لو گے۔"

"اس وقت تم نے ایک لڑکا خریدا تھا سام۔ وہ میں نہیں تھا۔ تم ماضی میں جس چیز سے محروم ہوئے تھے، اسے لڑکے کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔" میں نے لہجے میں کہا۔ "اور جن پانچ ہزار ڈالر کی تم بات کر رہے ہو میں نے تو ان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ کیا مجھے دیے تھے تم نے وہ پانچ ہزار ڈالر۔ میرے حصے میں تو صرف پنچ، ہک اور انڈر کٹ آئے تھے۔"

اس کا چہرہ پھر تمتما اٹھا۔ "تم کچھ بھی کہو، میں وہ مشینیں نہیں خریدوں گا۔"

میں بھی اب فیصلہ کر چکا تھا۔ "لیکن میں خرید رہا ہوں۔ اس میں تم میری مدد کرو گے۔"

"اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو تم؟"

"بھول گئے کہ یہاں جاب کیسے حاصل کی تھی میں نے۔ اس وقت تو میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا تمہارے بارے میں۔ پچھلے ساڑھے تین برسوں میں تمہاری فتوحات کی کافی تفصیل ہے میرے پاس۔ خوب صورت عورتوں کو پھنسانے کے معاملے میں تمھیں کمال حاصل ہے۔ ابھی پچھلے دنوں میری اس بھورے بالوں والی ڈانسر سے ملاقات ہوئی جسے تم نے ایک ہوٹل میں ٹھیرایا ہوا تھا۔ وہ بھی تمہارے گن گا رہی تھی..."

اس بار اس کا چہرہ اودا ہو گیا۔ "تمھیں اس کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"اب میں لڑکا نہیں رہا، بڑا ہو گیا ہوں سام۔ سب دیکھتا، جانتا اور سمجھتا ہوں۔"

اس نے کھنکھار کر جیسے اپنا گلا صاف کیا پھر پنسل ہاتھ میں تھام کر اسے مضطربانہ انداز میں نچاتا رہا۔ "تب تو تم سمجھ سکتے ہو کنڈ۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ وہ نروس ہو رہا تھا۔ "میں تمہاری بہن کا دیوانہ ہوں۔ جب بھی میں اس کے قریب جاتا ہوں، وہ ڈھیر ہو جاتی ہے۔ اب آدمی کیا کر سکتا ہے؟"

"میں تم پر تنقید نہیں کر رہا ہوں سام۔" میں نے دردانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن میمی اس بات کو کبھی برداشت نہیں کرے گی۔ وہ بڑی سربلند لڑکی ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو سام۔"

سام مجھے مسلسل گھور رہا تھا!

زندگی کے چند اور گھونٹ چکھنے کے لیے
اگلے شمارے کا انتظار کیجیے

رکھشا بندھن

اشتیاق فاطمہ عظمی

بہن کی رکھشا پر مامور ایک بھائی کا فیصلہ...
راکھی بندھن کے تقاضے اس کے لیے پریم بندھن سے زیادہ اہم تھے

"سنو!" اویناش کی تیز سرگوشی گونجی۔ "بس ذرا سی ہائے۔"

"ہوجی! تمہاری اِس ذرا سی دیر کو میں خوب جانتی" پاروتی نے نخرے بھری آواز میں جواب دیا۔

"تم نہیں آئیں تو میں آ جاؤں گا؟"

اویناش کے ذرا سے اٹھتے ہی چارپائی زور سے چرچرائی۔

"ہائے نہیں! اِتنی دھینگا مشتی کرتے ہو، چھنگی جاگ پڑے گی۔" گھبرائے ہوئے لہجے میں اور ہنستی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھو، بس آ جاؤ... من بہت بے کل ہو رہا ہے۔" اس کی بوجھل آواز میں التجا شامل تھی۔

"ہٹو جی! تمہارا من تو ہمیشہ ہی بے کل رہتا ہے..." پاروتی چھنگی کو کروٹ دلا کر نخرے سے اٹھی۔ "رام قسم، بہت ستاتے ہو۔"

وہ اپنی مسہری سے کھسک کر اویناش کی پٹی پر آ ٹکی۔

"تمہاری قسم بہت ترساتی ہو۔" اویناش نے اُسی کے انداز میں کہا، پھر اُس کی کلائی پکڑ کر جھٹکے سے اُسے آغوش میں گرا لیا۔

"تمھیں بھی تو بس... ہر رات..." پاروتی کی شرمیلی کسمساتی سرگوشی گونجی۔

"رات تو کیا... میرا بس چلے تو... دن میں بھی..." اگلے ہی لمحے کمرے کی، سرگوشیوں سے مہکتی فضا تیز سانسوں اور بے تاب دھڑکنوں سے گونجنے لگی۔

دروازے سے لگی رسونتی کی سانسیں بھی بکھرنے لگی تھیں۔

وہ پانی پینے گھڑونچی کے پاس گئی تھی۔ واپسی میں وہ پاروتی اور اویناش کے کمرے کے سامنے سے گذری تو اُن کے کمرے سے آنے والی میٹھی میٹھی آوازوں نے اُس کے قدم جکڑ لیے۔ بڑی مشکل سے وہ اپنی منتشر دھڑکنوں کو یک جا کر کے دالان میں بچھے اپنے بستر تک آئی تھی۔ انگ انگ میں ایک سنسناہٹ سی جاگ اٹھی تھی۔ نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی اور بستر پر جیسے کانٹے اُگ آئے تھے۔

باقی رات وہ انگڑائیاں لیتی اور کروٹیں بدلتی رہی، انگاروں پر لوٹتی رہی۔ ایسے میں بالکل اچانک ہی اُس کے من میں یہ خیال جاگا کہ اِس وقت اندر کمرے میں اویناش کی بانہوں میں پاروتی کی جگہ اگر وہ ہوتی تو؟

رسونتی، اویناش کے پتا، وشواس ٹھاکر کے بچپن کے دوست اور اُن کی پتنی رجنی کے مُنہ بولے بھائی ارجن ورما کی بیٹی تھی۔

ارجن ورما اور اُن کی پتنی ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسے تھے، اور مرتے وقت وہ اپنی اکلوتی بیٹی رسونتی کو وشواس ٹھاکر اور رجنی کے حوالے کر گئے تھے۔ اُس وقت رسونتی صرف پانچ برس کی تھی۔ تب سے وشواس ٹھاکر اور رجنی نے اُسے اپنے بچّوں اویناش اور سروپ کی طرح ہی پیار سے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔

جہاں تک گھر کے اکیلے لڑکے اویناش کا تعلق تھا تو وہ اسکول کے زمانے سے ہی دہلی میں پڑھتا تھا اور وہیں ہوسٹل میں رہتا تھا۔ سال چھ مہینے میں کہیں ہفتے دس دن کے لیے گھر آتا تو بھی اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا۔ رسونتی کی طرف تو کبھی اُس نے بھولے سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ عمر میں خاصا بڑا تھا، اِس لیے گھر کے چھوٹے بچّوں سے لیے دیے رہنے میں ہی بڑا اپن سمجھتا تھا۔

دوسرے، بچپن سے ہی گھر والوں سے دُور رہنے کی وجہ سے سب کے لیے اُس کے دل میں ایک غیر محسوس سی دُوری اور لاتعلقی سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی سگی بہن سروپ سے بھی کم ہی بات کرتا تھا۔ رسونتی تو پھر اُس کے ماتا پتا کی مُنہ بولی بیٹی تھی۔ رسونتی اُس کے لیے گھر میں کام کرنے والی گنگا بائی یا اُس کے نوعمر پوتے رامو کی طرح کی ہی کوئی ہستی تھی۔

البتہ سروپ کو رسونتی سے چھوٹی بہن کا سا پیار تھا۔ رجنی نے بھی کبھی سروپ اور اُس میں کوئی فرق نہ سمجھا تھا۔ اُسے رسونتی بھی سروپ کی طرح ہی عزیز تھی۔

سروپ رسونتی سے عمر میں خاصی بڑی تھی۔ اُس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ مرد اور عورت کے اِس انوکھے اور اَن جانے تعلق کے بارے میں پہلی پہلی بار رسونتی کو اُس وقت معلوم ہوا تھا جب سروپ دیدی بیاہ کے بعد پہلی بار میکے لوٹی تھی... ہفتے بھر رہنے کے لیے... اور دو دن بعد ہی ان کے دولھا راجا ہاتھوں میں دل تھامے اُنھیں واپس لے جانے کے لیے آ موجود ہوئے تھے

"رسونتی! ذرا سُن تو..." جیجا جی نے موقع دیکھ کر سا سالہ رسونتی کو قریب بلایا تھا۔ جب سے وہ آئے تھے، اب تک دیدی کا مکھڑا بھی نہ دیکھا تھا۔ کھلانے پلانے اور آؤ بھگت کے بعد اُنھیں وہیں باہر کے کمرے میں ٹھہرا دیا گیا تھا۔ اُن کی بے کلی دیکھنے کے قابل تھی۔ تبھی اُنھوں نے آنگن میں پہل دوج کھیلتی رسونتی کو پاس بلایا تھا۔

"ذرا اپنی دیدی کو تو بلا۔" اُنھوں نے دھیمی آواز میں بنتی کی تھی۔

"دیدی کو... یہاں!" اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں حیرانی سے پھیلائیں۔

"ارے تو یہاں آنے میں کیا حرج ہے؟" جیجا جی کلس کر بولے۔ "جاؤ شاباس! تجھے چونی دوں گا۔"

اور چونی کے لالچ میں وہ دیدی کو بلانے چل دی تھی۔ سروپ دیدی بھی جیسے اِس بلاوے کی راہ تک رہی تھی۔ بھری دوپہر میں سب کی نظروں سے بچتی بچاتی، دالان کی چھتوں کی اوٹ لیتی، لپک جھپک جیجا جی کے کمرے میں جا پہنچی۔

جیجا جی اُنھیں دیکھتے ہی دیوانوں کی طرح اُن کی طرف لپکے تھے اور اُنھیں بے تابانہ اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

"ہش! کیا کرتے ہو جی!" سروپ دیدی نے کسمسا کر اُن کی بانہوں سے نکلتے ہوئے شرمیلی نگاہوں سے رسونتی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ارے ہاں!" جیجا جی کو یاد آیا، جیب میں ہاتھ ڈال چونی نکالی۔ "لو رسونتی! جاؤ تم چٹ پٹا کھالو۔" اُنھوں نے جلدی سے چونی رسونتی کی طرف پھینکی۔

رسونتی نے چونی پکڑ تو لی تھی، مگر وہ ابھی وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ سروپ دیدی کو جیجا جی کا یوں بانہوں میں جکڑ لینا اُسے بڑا عجیب لگا تھا... اور بہت دل چسپ بھی۔

"چلو جاؤ، شاباش!" جیجا جی کے اصرار پر وہ باہر کی طرف چلی گئی تھی، مگر کچھ دُور جا کر وہ واپس لوٹ آئی تھی۔ اِتنی دیر میں یہاں کمرے کے کواڑ بند ہو چکے تھے، اور بند کواڑ کے پیچھے سے دھیمی دھیمی سرگوشیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"ہٹو جی! سب مُنہ دیکھے کی باتیں ہیں۔" سروپ دی بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔

"سچ کہتا ہوں سروپ!" جیجا جی کی میٹھی سی سرگوشی میں [illegible] میں بتائے گئے لمحوں کی کسک اور بے کلی بھی شامل تھی۔ "تمھاری ایسی عادت ہو گئی ہے کہ تمھارے بنا دو دن بھی رہ نہ [illegible] دیکھو... پاگلوں کی طرح دوڑا چلا آیا..."

"ہٹو جی! کیا کرتے ہو؟" سروپ دیدی کی کسمساتی ہوئی [illegible] ابھری۔

"تمھاری قسم سروپ، منع مت کرنا... ورنہ ابھی کے ابھی [illegible] گا۔" جیجا جی جذبات سے بوجھل آواز میں بولے۔

"پر اِس وقت... نہیں بابا!" دیدی کے انکار میں بڑی رضامندی شامل تھی۔ "رات تو ہو لینے دو۔"

"تمھی بتاؤ، رات تک صبر کہاں سے لاؤں؟" جیجا جی کی [illegible] میں بھیگی نشیلی سی بوجھل آواز ابھری اور رسونتی نے زمین [illegible] کواڑ کی درز سے آنکھیں لگا دیں۔

"ہائے رام!" اُس نے جو دیکھا، اُس کا ننھا سا دل [illegible] رہ گیا۔

سب کچھ جو اُس کے سامنے ہو رہا تھا، اُس کی سمجھ سے [illegible] دل چسپ! وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسلسل دیکھے گئی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ، اُس سمجھ میں نہ آنے والے [illegible] کے داؤ پیچ اور معنی و مفہوم آپ ہی آپ اُس کے دل و [illegible] ہوتے چلے گئے۔

[illegible] سے ہی موجوں پر بہتے، جانے کیسے کیسے ان جانے سپنے آپ ہی آپ اُس کی پلکوں کی باڑھ [illegible] تے۔ کیسے کیسے جذبات اور خیالات اُس کے دل [illegible] اونچی دیواروں کے بھیتر کیسا کیسا اودھم مچائے [illegible] میں جوالا مکھی اُبلنے کو بے قرار رہتا، اور تن [illegible] ان جانی سوچوں کی امڈتی مُنہ زور موجیں کیسا [illegible]۔ وہ اپنی دہکتی سانسیں اور مچلتی دھڑکنیں سنبھالتے بے حال ہو جاتی۔

[illegible] کے ہاتھوں ایک نیا مشغلہ لگ گیا تھا۔ وہ اکثر رات [illegible] جا کر اویناش اور اُس کی پتنی پاروتی کے کمرے کے [illegible] لگ کر جا کھڑی ہوتی۔ اویناش کی میٹھی میٹھی سرگوشیاں اور [illegible] سانسیں سُن کر اُس کے کنوارے، اَن چھوئے دل [illegible] طلب اور شوق کی سوندھی خوش بُو اٹھتی اور نس نس [illegible] انگڑائیاں لیتے لیتے اُس کا بدن چور ہو جاتا۔

[illegible] اب اویناش نہا دھو کر خوب تیار ہو کر کچہری کے لیے نکلتا تو وہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر کر اُسے دیکھے جاتی۔

اونچا لمبا گورا چٹا اویناش مردانہ وجاہت کا ایک مکمل اور بھرپور نمونہ تھا۔ اُس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں بڑا خمار تھا اور گھنی مونچھوں تلے اُس کے نم اور گلابی ہونٹ جب مسکراتے تو اُس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے اور وہ اِن گڑھوں میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔

مگر پاروتی جیسی رس بھری پتنی کے ہوتے اویناش بھلا اُس چودہ پندرہ سال کی دُبلی پتلی سی چھوکری کی طرف کیوں دیکھتا! وہ اُس کی بے اعتنائی اور بے توجہی پر دل مسوس کر رہ جاتی۔

اویناش جب وکالت کی تعلیم پوری کر کے دلّی سے گھر لوٹا

نمک پارے

- ...نعمت کا نامناسب جگہ خرچ کیا جانا، کفرانِ نعمت ہے۔
- ...عمدہ لباس زیب تن کرنے والے کو کفن کے بارے میں بھی سوچتے رہنا چاہیے۔
- ...زبان قابو میں رکھنا بہت بڑی عبادت ہے۔
- ...سچائی کی مشعل جہاں بھی دکھائی دے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ نہ دیکھو کہ مشعل بردار کون ہے۔
- ...زمانہ، کتابوں سے بہترین معلم ہے۔
- ...مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس نصیحت کے لیے الفاظ نہیں اعمال ہوتے ہیں۔
- ...مجھے اس انسان کی آزادی، بے فکری اور خوشی پر رشک آتا ہے جو نہ سر رکھتا ہے نہ زمین۔
- ...اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھ لینا جہالت ہے۔ ہر آدمی کو اپنے سے بہتر سمجھنا چاہیے۔
- ...دولت مند بیوہ کے آنسو بہت جلد خشک ہو جاتے ہیں اور اس کا نصف سہاگ قائم رہتا ہے۔
- ...دولت مند ہونے سے آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور دولت نہ ہونے سے لوگ اس کو بھول جاتے ہیں۔
- ...دولت موت کے سوا تمام دکھوں کے لیے چارۂ کار اور سب کو مطیع کرنے کے لیے مددگار ہے۔
- ...موت ایک بے خبر ساتھی ہے۔

ابن حسن عثمان آبادی کے قلم سے

تھا تو قصبے کی کچہری میں اُسے سرکاری وکیل کی نوکری مل گئی تھی۔ تبھی سے اُس کی ماں رجنی کو اُس کے بیاہ کی چنتا لگ گئی تھی اور اِس سلسلے میں اُنھوں نے قصبے کے ایک کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے گھرانے کی لڑکی پاروتی کا انتخاب کر لیا تھا۔

بھرے بھرے گداز جسم کی، گدرائے ہوئے امرود کی سی سانولی سلونی بھولی بھالی پاروتی اوِیناش کو بھی بے حد بھائی تھی۔

پاروتی کا اکلوتا بڑا بھائی آکاش میڈیکل کے فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔ سنجیدہ، باوقار اور کم گو سا۔ آکاش، رجنی کو رسونتی کے لیے بہت اچھا لگا تھا۔ آخر برس دو برس میں رسونتی بھی بیاہ کے لائق ہونے والی تھی، اور رجنی، سروپ اور اوِیناش کی طرح رسونتی کا بیاہ بھی، اپنے سامنے اپنے ہاتھوں سے کر دینے کی خواہش مند تھی، مگر اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

پاروتی کے بہو بن کر گھر آنے کے تین مہینے کے اندر اندر اپنے پتی وشواس ٹھاکر کے بعد وہ بھی پرلوک سدھار گئی۔

اُس نے اپنی زندگی میں ہی پاروتی کے ذریعے رسونتی کے لیے آکاش کا رشتہ مانگا تھا۔

پاروتی اور اُس کی ماں کو اِس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر خود آکاش نے بڑے سلیقے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اپنی کلاس فیلو شانتی اوبرائے کو پسند کرتا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے ایک ساتھ پڑھ رہے تھے، ایک دوسرے سے ملتے ہی اُن کے من میں پریم کی جو کونپل پھوٹی تھی، اب وہ ایک چھتنار درخت بن چکی تھی۔

رجنی مرتے سے رسونتی کا ہاتھ پاروتی کے ہاتھ میں دے گئی تھی۔ سروپ تو سہارن پور میں بیاہی تھی، یہاں رسونتی کے سر پر تو صرف پاروتی ہی تھی۔

پاروتی اچھے دل کی نیک عورت تھی۔ اُسے رسونتی سے بہنوں جیسا پیار تھا۔ اپنی سورگ باسی ساس کی خواہش کے پیشِ نظر، اُس کے دل میں بھی رسونتی کو اپنے لاکھوں میں ایک بھائی کی دولھن بنانے کی آرزو تھی۔ وہ اِسی کوشش میں لگی تھی کہ کسی طرح اپنے بھائی آکاش کو اِس رشتے پر راضی کر لے، مگر آکاش تو صرف اور صرف شانتی اوبرائے کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔

سمے کا پنچھی مخصوص رفتار سے اپنی اُڑان بھرتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار برس بیت گئے۔

ان چار برس میں خاصا کچھ بدل گیا تھا۔ کام والی بوڑھی گنگا بائی کے انتقال کے بعد رسونتی نے رسوئی سنبھال لی تھی۔ پاروتی ایک کے بعد ایک چار بیٹیوں کی ماں بن گئی تھی۔ ہر رات پتی کا بستر گرم کرتے اور سال کے سال بچے جنتے، د
دیکھتے اُس کا جوبن ڈھل گیا تھا۔ تنا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گی
نازک کمر پھیل کر کمرا ہو گئی تھی۔ کولھے بھاری اور پیٹ
تھا۔ چہرے اور گردن پر بھی خوب گوشت چڑھ آیا تھا، ا
رَس سے بھری، نوعمر چھوکری کی بجائے ایک پکی عمر کی تھکی عورت لگنے لگی تھی۔

اب رات کو اُن کے کمرے میں چارپائی کی چرچراہٹ، تیز سانسوں اور دھیمی سرگوشیوں کے بجائے
اور خراٹوں کی صدائیں گونجتیں، یا پھر بیٹیوں میں سے
رونے اور ٹھنکنے کی آواز سنائی دیتی۔

"اوں ہوں!" اوِیناش کی بے زار تنبیہہ اُبھرتی اور
تھکن سے چُور، نیند میں ڈوبی بچّی کو سلانے میں جُت جاتی۔

اب بھی اوِیناش صبح سویرے نہا دھو کر خوب تیار
کچہری کے لیے نکلتا تو وہ رسوئی گھر کی کھڑکی سے اُسے د
جاتی۔ اُس میں ذرّہ بھر فرق نہ آیا تھا۔ وہ آج بھی پہلے کی
سندر اور چھبیلا لگتا۔ وہ اُس کے سینے اور کلائیوں کے سیاہ
بالوں کو دیکھتی تو جانے کیوں اُس کے دل میں میٹھی میٹھی
کسمساہٹ جاگتی۔ اب وہ چودہ پندرہ برس کی دبلی پتلی
چھوکری نہیں رہی تھی، بل کہ اٹھارہ انیس برس کی بھرپور ج
کے رَس میں ڈوبی نوخیز اور دل آویز حسینہ بن چکی تھی۔

اوِیناش اب بھی اپنی سابقہ روش پر برقرار تھا۔ وہ اب
کبھی اُس کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھتا تھا۔ وہ گھر میں ہوتا
سارا وقت پتنگے کی طرح اُس کے آس پاس منڈلاتی رہتی
اُسے، اس کی موجودگی کی خبر تک نہ ہوتی۔

"آئے ہائے، پارو! یہ تُو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی
برسوں بعد پاروتی کی موسی اجمیر سے آئی تو اُس سے ملنے
کے گھر بھی آئی اور پاروتی کی حالت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔

"بس کیا بتاؤں موسی، اوپر تلے کی چار بیٹیاں پیدا کر
پالنا کوئی آسان ہے؟" پاروتی نے الٹا سوال کیا۔

"تو یہ رسونتی کس مرض کی دوا ہے۔ اپنی کچھ ذمے دار
تو اُس کے سر لگا۔" موسی نے پھولوں سے بھری شاخ کی
لچکتی رسونتی کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھا۔

"ہائے نہیں موسی! گھر کا سارا کام تو وہی سنبھالتی
اب میں بچیوں کا بوجھ بھی اِس پر ڈال دوں!" پاروتی رسو
پیار سے دیکھ کر ممتا بھرے لہجے میں بولی۔

"اس چھوری کے لچھن کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔" موسی

اُسے شک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پاروتی کے کان میں سرگوشی کی۔

"اے نوج موسی!" پاروتی نے بُرا مانتے ہوئے کہا، "رسونتی تو بچپن سے ہی اِس گھر میں پلی بڑھی ہے۔"

"مگر پارو!" موسی نے رسونتی کی آنکھوں سے جھانکتی بھاوناؤں کو بھانپ لیا تھا "ایسی چھوری کہ جس کی جوانی مُنہ سے بولتی ہو... جوان پتی کے ہوتے گھر میں رہے تو..."

"ارے موسی! اوبناش تو اُسے سروپ دیدی سمان چھوٹی بہن مانتے ہیں" پاروتی نے بھرپور اعتبار سے کہا۔

"ماننے سے کیا ہوتا ہے..." موسی ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھی "رشتہ تو نہیں ہے نا؟"

"رشتہ ہی تو بنانے کے جتن میں لگی ہوں۔" پاروتی دھیمی آواز میں مسکرا کر بولی۔ "ہماری ساسو ماں کی اِچھا تھی کہ رسونتی کا بیاہ آکاش بھیا سے ہو جائے۔ ماں کو بھی رسونتی پسند ہے، مگر آکاش بھیا ذرا آنا کانی کر رہے ہیں۔"

"اچھا!" موسی کو اب قدرے اطمینان ہوا۔ "ایسا ہے تو بُرا نہیں۔ دِکھنے میں بھی اچھی ہے اور کام کاج میں بھی خوب پھرتیلی ہے۔"

"اور دل کی بھی بہت اچھی ہے۔" پاروتی نے دُور رسوئی کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی رسونتی کی طرف ممتا بھری نظروں سے دیکھا۔ "سچ! آکاش بھیا کے ساتھ تو اُس کی چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔"

"سو تو ہے۔" موسی نے تصور میں رسونتی اور آکاش کو ساتھ ساتھ رکھ کر سوچا اور خود بھی مسکرا دی۔

"اب کے راکھی باندھنے میکے جاؤں گی، تو بھیا سے دو ٹوک بات کروں گی۔" پاروتی نے پُرعزم لہجے میں کہا اور چھٹکی کو گود میں بھر کر دودھ پلانے لگی۔

* * *

وہ چھٹی کا دن تھا۔ اوبناش اپنے بستر پر نیم دراز، وکالت کی ایک موٹی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس کی مسہری کے قریب ہی زمین پر بیٹھی چھٹکی ریں ریں کیے جا رہی تھی۔

"پاروتی! اِسے دیکھو بھئی..." اُس نے عاجز آ کر پتنی کو آواز دی۔ "یہ کیا مانگ رہی ہے؟"

"پانی مانگ رہی ہے۔" پاروتی گود والی کی کلوٹ بدل رہی تھی۔ اُس نے رسونتی سے کہا۔ "ہے رسونتی، ذرا چھٹکی کو پانی پلا دے بہنا۔"

اُس نے رسونتی سے بنتی بھرے لہجے میں کہا، اور رسونتی جھٹ پانی کا کٹورا بھر چھٹکی کے پاس جا پہنچی۔

چھٹکی ماں کے بجائے اُسے سامنے پا کر چڑ گئی اور پانی سے بھرا کٹورا اُسی پر لوٹ دیا۔

نئے نکور گھڑے کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی گلے سے لے کر پیٹ تک قمیص بھگوتا چلا گیا۔

"ہائے رام!" رسونتی نے گھبرائے ہوئے انداز میں چُنری کھینچ کر الگ کی، اُس کی وائل کی باریک قمیص سینے سے پیٹ تک چپک کر رہ گئی تھی۔ اُس کی "ہائے رام" پر اچانک ہی اوبناش نے اُس کی جانب دیکھا تھا۔

پھر تو جیسے وہ نظریں ہٹانا ہی بھول گیا تھا۔ رسونتی کو اُس کے روم روم میں چبھتی اُس کی نظریں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ برسوں بعد آج تو یہ شبھ گھڑی آئی تھی کہ اُس نے اپنی ذات کے حصار سے نکل کر اُس کی طرف نظر بھر کر دیکھا تھا۔

رسونتی نے ذرا جھک کر قمیص کو جھٹکنے کی کوشش کی، تا کہ بچا کھچا پانی نکل جائے، وہاں پانی ہوتا تو نکلتا، وہاں تو ایک ہیجان جاگا، ایسی ہلچل اٹھی کہ اوبناش کی آنکھوں میں نشہ اترنے لگا۔ اُس نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بڑی مشکل سے نظریں دوبارہ کتاب پر مرکوز کیں۔

"بڑی ضدن ہو گئی ہے یہ بھی۔" پاروتی نے قریب آ کر چھٹکی کے گال پر چٹاخ سے ایک ہاتھ جمایا۔

"ہائے کیا کرتی ہو، دیدی!" رسونتی نے لہجے میں مصری گھول کر کہا، اور جلدی سے چھٹکی کو گود میں بھر لیا اور مٹکتی ہوئی باہر کو چل دی۔ وہ جانتی تھی کہ اوبناش اُسے کتاب کی اوٹ سے جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

چنگاری سلگ اٹھی تھی، وہ بڑی ہوشیاری سے چنگاری کو ہوا دیے جاتی۔ اوبناش کے سامنے وہ کبھی آنچل ڈھلکا دیتی کبھی کمر سے دامن کھسکا کر کمر کھجانے لگتی۔ اُس کے بدن کا قیامت خیز گداز اور کمر کا نازک سحر انگیز خم اوبناش کو دیوانہ بنا دیتا۔ اُس کا خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا۔

لاوا پک چکا تھا۔ کسی بھی لمحے جوالا مکھی پھٹنے کے لیے بے کل تھا۔ اوبناش راغب تھا تو رسونتی تن من سے ملتفت تھی، مگر ملن کی وہ گھڑی جانے کتنی مجبوریوں کی اوٹ میں چھپی تھی کہ آ ہی نہ چکتی تھی۔

پاروتی کے گھر میں موجود ہوتے ملن کیونکر ممکن تھا؟ پاروتی تو جیسے گھر سے نکلنا ہی نہیں جانتی تھی۔

شادی کے شروع کے دنوں میں وہ اکثر میکے جایا کرتی تھی۔ کبھی اوبناش کچہری جاتے ہوئے اُسے اُس کی ماں کے ہاں چھوڑ دیتا تھا تو کبھی پاروتی کا بھائی آکاش کالج سے لوٹتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لیے جاتا۔ لیکن اب چار چھوٹی چھوٹی [illegible] سمیت روز روز میکے جانا ممکن نہ تھا۔ ساس کے مرنے کے بعد سارے گھر کی ذمے داری بھی اُسی پر آپڑی تھی، اِس لیے کئی مہینوں بیت جاتے اور وہ میکے جانے کا نام تک نہ لیتی۔

رکشا بندھن کے تہوار پر پاروتی، بھائی کو راکھی باندھنے جانے والی تھی۔ پہلے تو پاروتی نے رسونتی کو اپنے ساتھ ہی لے جانے کی ٹھانی تھی، پھر اُسے خیال آیا تھا کہ آج وہ اوبناش ساتھ، رسونتی کے بیاہ کی بات کرنے والی ہے، اِس لیے اسے ساتھ لے جانا کچھ مناسب نہیں۔ چناں چہ اُس نے اکیلے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

بچیوں کو تیار کرتے سمیٹتے، سامان دھرتے اٹھاتے دوپہر ہو گئی تھی، تب کہیں جا کر وہ کام والے چھوکرے رامو کے ساتھ میکے کے لیے روانہ ہوئی۔

اُس کے جاتے ہی اوبناش نے سارے جہاں کی پیاس آنکھوں میں سمیٹ کر رسونتی کی طرف دیکھا۔

"ہائے رام، بڑی گرمی ہے۔" رسونتی نے چنریا کھینچ ہاتھ [illegible] پنکھے کی طرح جھلنا شروع کیا۔ اُس کے نوخیز گداز بدن اوبناش کو دیوانہ کر گئی... اُس نے آن کی آن میں بڑھ کر اُسے اپنی آہنی بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔

"باہر کا دروازہ کھلا ہے۔" رسونتی نے کسمسا کر نخرے سے اسے دھکیل دیا۔ وہ بستر پر جا ٹکا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی نازک کلائی تھام لی۔ اُس کی نبض تیز تیز چل رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے اُسے اپنے قریب، بستر پر گرا لیا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اوبناش کی آنکھیں بوجھل تھیں۔ نشہ سا اتر آیا تھا۔

وہ [illegible] بہنے کی طرح اُس کی پلکوں میں سماتا جا رہا تھا، [illegible] سگندھ کی طرح اُس کی سانسوں میں بستا جا رہا تھا، [illegible] دوڑتے لہو میں شامل ہو کر تن من میں اترتا جا رہا تھا، [illegible] اپنے من میں ہلچل مچاتے ہزاروں اَن جانے سوالوں کے جواب مل رہے تھے۔

دونوں دنیا مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں ڈوبے ڈوب کر ابھر رہے تھے، ابھر کر ڈوب رہے تھے۔

[illegible] باہر سے دروازہ کھول کر پاروتی کا بھائی، ڈاکٹر آکاش کمرے میں داخل ہوا۔ گھنٹے بھر پہلے جب وہ اسپتال سے نکلنے لگا تھا تو اُس نے اپنے گھر فون کر کے پاروتی کا پوچھا تھا۔ تب اُس کی ماں نے بتایا تھا کہ پاروتی اب تک میکے نہیں پہنچی... تو اُس نے سوچا کہ پاروتی کو ساتھ لیتا ہوا گھر چلا جائے گا۔ سو وہ پاروتی کو لینے یہاں چلا آیا تھا۔

باہر کا دروازہ بند تھا، مگر کنڈی نہیں لگی تھی۔ ہاتھ لگاتے ہی کواڑ کھلتے چلے گئے تھے اور وہ سیدھا اندر چلا آیا۔ سامنے کے کمرے کے بھڑے ہوئے کواڑ کھول کر جوں ہی وہ اندر داخل ہوا تو سامنے ہی اوبناش اور رسونتی ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے نظر آ گئے۔

لمحہ بھر ٹھہر کر اگلے ہی لمحے وہ واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

اوبناش رسونتی کو دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔

جذبات کا طوفان اتر چکا تھا، مگر اوبناش آنے والے طوفان کے خوف سے لرزہ براندام تھا۔ شام کو اُسے پاروتی کو لینے جانا تھا۔ سے بیتنے کے ساتھ ہی وہاں سے بلاوے پر بلاوا آ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا، کس مُنہ سے جائے؟ آکاش سے سامنا کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی، مگر جانا تو تھا۔ حالات کا سامنا کرنا تو تھا۔

نہا دھو کر تیار ہو کر وہ سسرال کے لیے روانہ ہوا، اور ڈرتے ڈرتے قدموں سے گھر میں داخل ہوا۔

تب ہی پاروتی، خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ اُس کی جانب لپکی تھی۔

"بدھائی ہو جی! آکاش بھیا نے رسونتی کے ساتھ بیاہ کے لیے ہاں کر دی۔" پاروتی نے مسرت سے لبریز لہجے میں بتاتے ہوئے اُس کے حیرت سے کھلے مُنہ میں لڈو ٹھونسا۔

اوبناش نے بے یقین نظروں سے آکاش کی طرف دیکھا۔

مگر آکاش اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اُس کی محبت لٹاتی نگاہیں اپنی چہیتی بہن کے خوشی سے دمکتے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں اور ایک ہاتھ سے وہ، دوسرے ہاتھ پر بندھی راکھی کو سہلا رہا تھا، جو کچھ دیر پہلے اُس کی لاڈلی بہن پاروتی نے باندھی تھی۔

بہن کی خوشیوں کی رکھشا کے اُس بندھن میں بندھا، وہ پاروتی کی سندور سے بھری مانگ، بندی سے سجا ماتھا اور کانچ کی چوڑیوں سے بھری سہاگن کلائیوں کو پورے یقین سے دیکھ رہا تھا۔

شاہ نظر

یاور

مُغلیہ سلطنت کے آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے "نظر" کا ماجرا
اولاد ہونے اور اولاد کھونے کے احساسات کا اندازہ کچھ اُسے بھی تھا

یہ دنیا شطرنج کی ایک بساط کے مانند ہے جس پر وقت اپنی شاطرانہ چال چلتا رہتا ہے۔ کبھی دنیا کو ہنساتا اور کبھی ہنستے کو رُلا دیتا۔ کسی کو موت کے مُنہ سے نکال کر زندگی کی طرف لے جاتا تو کبھی زندگی سے بھرپور ہستی کو موت کی گہری نیند سلا دیتا۔ وقت کا یہ کھیل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

وقت کبھی نہیں تھکتا' کبھی نہیں رُکتا۔ نہ ہی وقت کو مٹھیوں میں جکڑا جاسکتا ہے۔ وقت کی چال میں کبھی یکسانیت نہیں ہوتی۔ کبھی اس کے مزاج میں طوفان کی سی تیزی آجاتی ہے اور کبھی وہ دبے پاؤں اس طرح گزر جاتا ہے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلتا۔ وقت ہمیشہ جاگتا رہتا ہے' وقت کو نیند کبھی نہیں آتی۔

وقت کو اپنے تیور بدلتے ذرا دیر بھی نہیں لگتی' اس کی محض ایک جنبشِ' چشم زدن میں' دنیا بھر میں ان گنت اچھے برے واقعات اور خوف ناک حادثات کو جنم دیتی ہے۔ وقت کی کروٹیں کبھی تھک کر دم لینا نہیں جانتیں۔ اس کی ہر کروٹ سے جنم لینے والے واقعات اور حادثات تاریخ کے صفحات پر درج ہوجاتے ہیں۔ وقت کی طرح تاریخ بھی کبھی نہیں تھکتی۔ اس کے صفحات بھی وقت کے پیدا کردہ ہر اچھے برے واقعات کو اپنے اندر سمیٹتے ہی رہتے ہیں۔

وقت اور تاریخ کی یہ کارستانیاں اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک یہ دنیا قائم و دائم ہے۔ وقت نے تاریخ کے صفحات پر بے شمار داستانیں رقم کر رکھی ہیں۔ ان داستانوں کو رنگین بنانے کے لیے کہیں ان پر خون کے چھینٹے ڈالے گئے تو کبھی محبت کے رنگ بکھیرے گئے۔ وقت کی یہ ادا بھی بڑی عجیب ہے۔

اب سے تقریباً پونے دو صدی قبل' دہلی کی سرزمین پر شاہی محلات کی اونچی اونچی دیواروں کے درمیان میں جب دبی دبی آوازوں میں ایک کنیز کا ذکر ہونا شروع ہُوا تھا تو اس وقت بھی وقت کی چال یہی تھی۔

ایسے ہی' کوئی پونے دو سو سال قبل' 1857ء سے بھی بیس برس پہلے' وقت نے ایک ایسی کروٹ بدلی کہ زمانہ دنگ رہ گیا۔ دہلی کی ایک چھوٹی سی سرائے کے دروازے پر لٹکا ہُوا کا بوسیدہ سا پردہ ہٹا کر' وقت اچانک ہی اندر داخل ہوا تھا۔ کسی کی بھرپور جوانی کو دیکھنے کے اشتیاق میں... کسی کی خوب صو آنکھوں کے اشاروں کا مفہوم بھانپنے!

سرائے کے ایک نیم تاریک چھوٹے سے کمرے عقل و دانش کا ایک مجسمہ گم نامی کی حالت میں پڑا تھا لیکن اب دلوں سے اس کے چرچوں کی بازگشت' شاہی محل کی دیواروں میں سنائی دینے لگی تھی۔ شاید یہ بات درست ہے کہ جوانی کی آنکھوں اشارے' وقت کی چال میں بھی ٹھیراؤ پیدا کردیتے ہیں۔

دہلی کے ایک پس ماندہ علاقے کی اُس معمولی سے کے سامنے جب شاہی پالکی آ کر رُکی تو یوں لگتا تھا کہ جیسے زمانہ ہی اس سرائے کے دروازے پر آکر ٹھیر گیا ہو اور وقت کروٹیں جیسے سانس لینے کے لیے ستانے لگی ہوں۔

وہ شاہی پالکی خالی تھی۔ اس میں کوئی شاہی سوار نہیں تھی۔ لیکن اس کے ساتھ شاہی محافظ اور چوب موجود تھے۔ خالی پالکی کو جب سرائے کے دروازے سامنے رکھ دیا گیا تو محافظوں نے اگلے حکم کے لیے چوب دار کی طرف دیکھا۔

اس سرائے کے ایک کمرے میں کوئی ادھیڑ عمر عورت ٹھیر ہوئی تھی... ایک عام سی معمولی عورت جس کے ساتھ ایک جو اور بے حد حسین لڑکی بھی تھی۔ حُسن کا یہ مرقّع' اس کی بیٹی تھی آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی شرم اس نوجوان دوشیزہ آنکھوں میں گھر کرنے کے لیے تڑپ رہی تھی اور سورج کی کر پھیلنے سے پہلے کھلتے ہوئے پھولوں کی تازگی اس کے جسم کی ملا جلد کے پاس آتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔

سرائے کے باہر کھڑے ہوئے لوگ حیرت بھری نظر سے شاہی پالکی اور شاہی محافظوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان سے کسی کی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ شاہی محافظوں سے

پوچھے۔ شاہی چوب دار نے لوگوں کی بڑھتی ہوئی بھیڑ پر ایک نظر ڈالی اور پھر ہاتھ کے اشارے سے انھیں دُور ہٹ جانے کا اشارہ کرتا ہُوا اپنی دھیمی اور بارعب چال سے سرائے کے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ اندر داخل ہونے کے بعد وہ اس چھوٹے سے کمرے کے باہر رُک گیا جس پر ٹاٹ کا ایک میلا کچیلا پردہ لٹک رہا تھا۔ آہٹ پا کر، کمرے میں مقیم ادھیڑ عمر عورت نے اپنا سر باہر نکالا تو چوب دار نے کہا۔

”خاتون... بادشاہ سلامت کے وزیر محبوب علی خاں نے آپ کے لیے پالکی بھیجی ہے۔ انھوں نے آپ کو اپنی بیٹی کے ہمراہ یاد فرمایا ہے۔“

ادھیڑ عمر عورت کا نام نوبہار بیگم تھا۔ جس قبیلے کی عورتیں مردوں کو پہچاننے اور انھیں بے وقوف بنانے میں ماہر ہوتی ہیں، نوبہار بیگم کا تعلق بھی عورتوں کے اسی قبیلے سے تھا۔ وہ لاہور کی ایک مشہور طوائف، رقاصہ اور مغنیہ تھی۔ نوبہار بیگم کی جوانی اور اس کی سُریلی آواز کا جادو پورے لاہور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ایک عرصے تک سر چڑھ کر بولتا رہا تھا۔ لیکن وقت کی رفتار کبھی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ وقت کروٹیں بدلتا رہا، یہاں تک کہ نوبہار بیگم کے حُسن اور آواز کا سورج دھیرے دھیرے ڈھلنے لگا۔ تعریفی جملے اور واہ.. واہ کے ڈونگے دھیرے دھیرے خالی ہوتے گئے۔ وقت نے حُسن اور آواز کے سارے طلسم کو توڑ ڈالے اور نوبہار بیگم کے عروج کو زوال آ گیا۔

جہاں دیدہ اور وقت شناس نوبہار بیگم بہت پہلے سے یہ بات جانتی تھی کہ ہر عروج کو زوال ہے۔ گھر کو روشنی دینے والا چراغ اسی وقت تک جل سکتا ہے جس وقت تک اس میں تیل باقی رہے۔ اور اسی حقیقت کے پیشِ نظر، اپنے کوٹھے کی روشنی اور رونق برقرار رکھنے کے لیے اس نے ایک نئے چراغ کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ اُس کے اس نئے چراغ کا نام تھا۔ ماہ نور!

نوبہار بیگم نے اپنی بیٹی کی پرورش پر بھرپور توجہ دی تھی۔ اس نے ماہ نور کو اپنے فن کے زُمرے میں آنے والے، تمام تر ہنر سکھا کر گویا کیل کانٹے سے پوری طرح لیس کر دیا تھا۔ نوبہار بیگم نے ماہ نور کی تعلیم و تربیت کے علاوہ اس کی جوانی کو سجانے سنوارنے کے لیے بھی اپنی تمام تر صلاحیتوں سے کام لیا تھا۔ اپنے لہجے کی مٹھاس اور اپنی آواز کے جادو کو اس نے ماہ نور کو منتقل کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ اپنے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی جھنکار وہ اسے پہلے ہی سونپ چکی تھی۔ یہی نہیں، اس نے ماہ نور کو تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اب وہ رقص و موسیقی کے فن میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور دینی تعلیم سے بھی آراستہ تھی۔ ایک مولوی صاحب پورے سات برس تک ماہ نور کو مذہبی تعلیم دینے کے لیے آتے رہے تھے۔

اپنی بیٹی کی قابلیت جہاں دیدہ نوبہار بیگم اس کے بچپن میں ہی بھانپ گئی تھی۔ اسی لیے ضروری تعلیم دلوانے کے ساتھ ساتھ اس نے ماہ نور کو اپنے پیشے کے اسرار و رموز سے بھی خوب اچھی طرح رُوشناس کرا دیا تھا۔ سارے ناز نخرے، ساری ادائیں اور چرتر اس نے گویا گھول کر ماہ نور کو پلا دیے تھے۔ اسے سماج میں رہ کر زندگی گزارنے کے طور طریقے بھی سکھائے تھے اور مذہب کی گہرائی اور اس کی حدود سے بھی خوب اچھی طرح واقف کرا رکھا تھا۔

...اور وہی ماہ نور...! اس کی اکلوتی وارث اس وقت اس کے ساتھ دہلی کے اس چھوٹی سی سرائے میں موجود تھی جس کے دروازے پر، اُن ماں بیٹی کو لے جانے کے لیے شاہی پالکی موجود تھی۔

شاہی محل کے اندر جس وقت ماہ نور کے حُسن و جوانی کے چرچے دبی دبی آوازوں میں ہو رہے تھے تو اس وقت ہندوستان کے تخت پر مغلیہ سلطنت کا آخری تاج دار، بہادر شاہ ظفر براجمان تھا۔ شاہی محل کی دیواروں میں ہونے والی، ماہ نور کی قابلیت اور حاضر جوابی کے تذکروں کی بازگشت اس نے بھی سنی تھی۔ اسی وجہ سے ایک دن بہادر شاہ ظفر نے اپنے وزیر محبوب علی خاں کو حکم دیا کہ ان ماں بیٹی کو اُس کے رُوبہ رُو پیش کیا جائے۔ بادشاہ سلامت کے اس حکم کے بعد ہی دہلی کے اس معمولی سرائے کے دروازے پر شاہی پالکی پہنچی تھی۔

نوبہار بیگم کو بھی اپنے پیشے کی تربیت ورثے میں ملی تھی۔ وہ اپنے حلقے کی بہت اونچی طوائف تھی۔

اُس نے پالکی لانے والے چوب دار کی بات سنی اور پل بھر میں ہی اس کا جواب سوچ لیا۔ اس نے چوب دار سے کہا۔ ”ہماری طرف سے وزیر محبوب علی خاں کی خدمت میں سلام پیش کیجیے گا اور ان کی خدمت میں یہ عرض کیجیے گا کہ نوبہار بیگم نے آج ہی لاہور جانے کی تیاری کر رکھی ہے۔ جب وہ واپس آئے گی تو فوراً ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گی۔“

دراصل نوبہار بیگم اصل معاملہ بھانپ گئی تھی۔ وہ وزیر محبوب ...کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی۔ اور اسی وجہ سے اس نے ...کا بہانہ ڈھونڈ لیا تھا۔

...ب دار نوبہار بیگم کا جواب سُن کر تھوڑی دیر تک تو ...ے پر ہی کھڑا رہا پھر لوٹ گیا۔ نوبہار بیگم دروازے پر ...کھڑی خالی پالکی کو دُور جاتے دیکھتی رہی پھر پلٹ کر ...پیچھے کھڑی ہوئی، ماہ نور سے بولی۔ ”بیٹی! میں نے انھیں ...کے لیے ہی لاہور جانے کا بہانہ کیا تھا۔ لیکن سچی بات تو ...اب ہمارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں جلد سے جلد ...سے چلا جانا چاہیے۔“

”مگر کیوں ماں...؟“ ماہ نور نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہمیں ...سے کہیں اور جانے کی ضرورت کیا ہے؟“

”ضرورت ہے بیٹی...“ نوبہار بیگم نے کہا۔ ”اس سے ...کہ ہم بادشاہ اور وزیر کے چنگل میں پھنسیں، ہمیں دہلی ...نکل جانا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو میری اور تمھاری ...کی برباد ہو جائے گی اور ہمیں یہاں داسی اور غلام بن ...رہنا ہوگا۔“

”لیکن ہمارا قصور کیا ہے ماں...؟“ ماہ نور نے کہا۔ ”کیوں ...ہمیں داسی اور غلام بن کر رہنا ہوگا۔ آخر بادشاہ سلامت ...ے ساتھ ایسا سلوک کیوں کریں گے؟“

”زیادہ سوال جواب مت کرو۔ تم نہیں جانتیں کہ آزادی ...بڑی نعمت ہے...“ نوبہار نے ماہ نور کو سمجھانے کی کوشش ...ے ہوئے آگے کہا۔ ”ہم اگر یہاں غلام بن کر رہ گئے تو پھر ...ہمیں آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع نہیں ملے گا۔ ...ہمیں لاہور واپس جانا ہوگا۔ وہاں اور کچھ نہیں تو کم سے کم ...ے تو رہ سکیں گے۔“

...ماہ نور کو لاہور واپس جانے کی بات ذرا بھی پسند نہیں ...وہ تو دہلی میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ...ے کہا۔ ”ماں! لاہور میں ہم بہت سال رہ چکے ہیں۔ ...اں کا شہر ہے۔ مجھے تو یہاں رہنے میں کوئی حرج ...آتا۔“

”...تم ابھی بچی ہو...“ نوبہار بیگم نے کہا۔ ”ان وزیروں ...اہوں کی نبض میں خوب پہچانتی ہوں۔“

...کر نوبہار بیگم نے سرائے کے ایک ملازم کو بلا کر اسے ...سامان باندھنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کسی ...الے سے بھی بات کر لے، ہمیں رات کے وقت یہاں ...ہو جانا ہے۔

لیکن جب سارا سامان باندھ لیا گیا اور ایک گاڑی والے سے لاہور جانے کے لیے بات بھی طے ہو گئی تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہی شاہی چوب دار اپنے ساتھ پانچ سپاہیوں کو لے کر پہنچ گیا اور نوبہار بیگم سے بولا۔ ”فی الحال آپ لاہور نہیں جاسکتیں، آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔ وزیر محبوب علی خاں کا یہی حکم ہے۔“

”لیکن ہمارا تو سارا سامان بھی بندھ گیا ہے...“ نوبہار بیگم نے چوب دار سے کہا۔ ”اور میں نے سرائے کے مالک سے بھی کہہ دیا ہے۔“

”اس کی آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...“ شاہی چوب دار نے کہا۔ ”وزیر صاحب نے بادشاہ سلامت کو یہ بتا دیا ہے کہ آپ کی بیٹی علم کی دولت سے مالا مال ہے۔ بادشاہ سلامت اس کی قابلیت کا سُن کر بہت متاثر ہوئے ہیں اور خود اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے مجھے دوسری بار آپ لوگوں کو لینے کے لیے آنا پڑا ہے۔“

”لیکن ہم تو...“ نوبہار بیگم نے پس و پیش کرنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ شاہی چوب دار درمیان میں ہی بول پڑا۔ ”وزیر محبوب علی خاں کی معرفت یہ بادشاہ سلامت کا حکم ہے اور بادشاہ سلامت کے حکم کی نافرمانی جرم ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہی پڑے گا۔“

بادشاہ سلامت کی حکم عدولی نوبہار بیگم کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ حکم سنتے ہی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ لیکن ماہ نور اپنی تعریف سُن کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور اسے اپنے آپ پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے شاہی محل اور شاہی دربار کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ آج تک وہ کبھی شاہی محل کے اندر نہیں گئی تھی۔ آج تک نہ تو اس نے کسی وزیر کو دیکھا تھا اور نہ ہی بادشاہ سلامت کو۔ البتہ اس نے بادشاہوں کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے قصے بہت سنے تھے اور ان کے بارے میں کتابوں میں پڑھا بھی تھا۔

نوبہار بیگم نے چوب دار اور سپاہیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن چوب دار نے اس کی ایک نہ سنی۔ اتنے میں شاہی پالکی بھی وہاں آ گئی۔ نوبہار بیگم کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا، اس لیے مجبوراً اسے اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر شاہی پالکی میں سوار ہونا پڑا۔

پالکی میں بیٹھے بیٹھے ماہ نور دہلی شہر کی گلیاں اور راستوں کو دیکھتی رہی۔ طرح طرح کے چھوٹے بڑے مکانات اسے

نظر آتے رہے۔ کہیں کہیں تو ٹوٹے پھوٹے' چھوٹے چھوٹے مکانات تھے اور کہیں کہیں بڑی بڑی شان دار حویلیوں کو وہ گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وزیر محبوب علی خاں کی شان دار حویلی بھی آ پہنچی۔ پالکی کو کندھوں پر اٹھائے چاروں کہار ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے پالکی کو اندر تک لے آئے۔

دونوں ماں بیٹی پالکی سے باہر نکلیں تو انھیں بڑے عزت و احترام سے حویلی کے اندر لے جایا گیا۔ دیوان خانے کی سجاوٹ اور چمک دمک دیکھ کر ماہ نور کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ سوچنے لگی کہ جب ایک وزیر کی حویلی اور اس کا دیوان خانہ اس قدر شان دار ہے تو بادشاہ سلامت کے محل اور شاہی دربار کی شان و شوکت کیسی ہوگی؟ لیکن اس کی سوچ کا سلسلہ جلد ہی ٹوٹ گیا کیوں کہ ایک دروازے سے وزیر محبوب علی خاں دیوان خانے کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ ماہ نور نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور اپنے گلابی ہونٹوں پر ایک دل کش مسکراہٹ سجا کر محبوب علی خاں کو جھک کر آداب کیا۔

محبوب علی خاں نے بھرپور نظروں سے ماہ نور کو دیکھا اور سلام کے جواب میں دھیرے سے اپنی گردن ہلا دی۔ لیکن اس کی آنکھیں تو ماہ نور کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر بعد محبوب علی خاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے فارسی کے مشہور شاعر حافظ کے ایک شعر کا مصرع پڑھا' اس مصرعے میں حُسن کی تفسیر بیان کی گئی تھی۔ ماہ نور کے حُسن کی تعریف کے لیے شاید محبوب علی خاں کو کوئی الفاظ نہیں ملے تھے اور اسی لیے اس کے مُنہ سے بے اختیار حافظ کا یہ مصرع نکل گیا تھا جسے سُن کر ماہ نور کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ محبوب علی خاں کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔

ماہ نور حافظ کا وہ مصرع سُن کر مسکراتی رہی۔ پھر اچانک شرم سے اس کی پلکیں جھک گئیں۔ حافظ کی جس غزل کا وہ مصرع تھا' وہ پوری غزل ماہ نور کو زبانی یاد تھی۔ آخر وہ نو بہار بیگم جیسی تجربہ کار اور جہاں دیدہ طوائف کے سائے میں اور اس کی خاص نگرانی میں جوان ہوئی تھی۔ جس نے ایسی عورت کی باہنوں میں سانس لی ہو وہ گئی گزری لڑکی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اس نے بڑی خود اعتمادی اور جرات کے ساتھ اس ادھورے شعر کا دوسرا مصرع سنا کر شعر مکمل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اسی غزل کا دوسرا شعر پڑھا جو محبوب علی خاں کے اس مصرعے کا جواب تھا۔ شعر کا ایک ایک لفظ ماہ نور کی زبان سے اس طرح ادا ہو رہا تھا جیسے پھول کی ناز پنکھڑیوں پر سے شبنم کی ننھی ننھی بوندیں ٹپکتی ہیں۔

محبوب علی خاں کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی اور کے چہرے پر لہو کی سرخی دوڑ گئی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس مُنہ سے ماشاء اللہ' سبحان اللہ اور واہ وا کے الفاظ نکل پڑے۔ پھر اچانک ہی اس نے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ سازند پیش کیا جائے۔ یہ حکم دینے کے بعد اس نے ماہ نور کی جانب دیکھ کر کہا۔ "ماہ نور' تم نے ایک شعر سنا کر میری پیاس بہت بڑھا دی ہے۔ کلام کی ادائیگی کا ہنر بھی تمھیں خوب آتا ہے۔ اس لیے تم سازندوں کی سنگت میں مجھے یہ غزل سناؤ... یوں سمجھ لو میں تمھارا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ تمھارا نام تو بادشاہ سلامت کے کانوں تک پہنچ چکا ہے اور بادشاہ سلامت نے تمھاری قابلیت دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور میں نے بادشاہ سلامت سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں تم سے مایوسی نہیں ہوگی۔ اس لیے میرے وعدے اور میری زبان کی آبرو رہنی ہی چاہیے۔"

"انشاء اللہ آپ کے وعدے کی آبرو رہے گی اور میں بھی بادشاہ سلامت کے حضور سُرخ رُو ہوں گی۔" ماہ نور نے ادب سے جواب دیا اور پھر سازندوں کے درمیان بیٹھ کر اُس موسیقی کے دل کش سُروں میں اپنی سحر انگیز آواز شامل کر کے حافظ کی خوب صورت غزل چھیڑ دی۔

ساز اور آواز کے سنگم نے ماحول پر ایک عجیب سی نشہ آ کیفیت طاری کر دی۔ وزیر محبوب علی خاں کو زندگی میں پہلی بار ساز اور آواز کے جادو کا تجربہ ہو رہا تھا۔ ماہ نور کے ہونٹو سے ادا ہونے والا فارسی کلام جیسے محبوب علی خاں کے دل میں ترازو ہوا جا رہا تھا اور وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ اس خوب صورت آواز کو قیامت تک محفوظ کر لینے کی کوئی ترکیب ڈھونڈ چاہیے۔ کیوں کہ اگر یہ آواز کبھی موت کی ابدی نیند سو گئی اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی مٹھاس کی بھی موت ہو جا گی۔ محبوب علی خاں سوچتا رہا اور ایک ایک شعر پر جھومتا رہا۔ جب ساز اور آواز کا سنگم ایک جگہ ٹھہر گیا تو اچانک محبوب علی خاں کا ایک ہاتھ اپنی گردن کی جانب اٹھ گیا۔ اس کے گلے میں نادر ہیروں کی ایک بیش قیمت مالا تھی جسے اس نے گردن سے اتارا اور ماہ نور کے آگے رکھ دیا۔

کچھ درباری اور خدمت گار جو اس وقت آس پاس کھڑے تھے وہ سب یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے کیوں کہ اس مالا سے ایک تاریخی حقیقت وابستہ تھی اور یہ سب لوگ اس حقیقت سے واقف تھے۔ اس ہار کو حاصل کرنے کے لیے محبوب علی خاں نے خطرناک جنگ لڑی تھی۔ پھر اپنی جان کی بازی لگا کر وہ دشمن کے دانت کھٹے کرنے کے بعد اس ہار کو حاصل کرنے میں کام یاب ہوا تھا۔

اب وہی بیش قیمت ہیروں کی مالا ایک طوائف زادی کے وں میں کتنی آسانی سے آ کر بچھ گئی تھی۔ ماہ نور نے دھیرے ے ہاتھ بڑھا کر اس مالا کو اٹھا کر چوم لیا۔ محبوب علی خاں یر تک تو اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "بہت خوب ماہ نور! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ بادشاہ سلامت کے سامنے ہم دونوں ہی مندہ نہیں ہوں گے..."

دوسرے دن صبح کے وقت جب شاہی دربار میں بادشاہ سلامت کے روبرو ماہ نور اور نو بہار بیگم کو پیش کیا گیا تو اس ان کے لباس نئے تھے' ان کے جسم کی خوش بو نئی تھی اور ان کے انداز و اطوار میں بھی نیا پن تھا۔ محبوب علی خاں نے انھیں ہی دربار کے آداب بھی اچھی طرح سمجھا دیے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی ماہ نور نے شاہی دربار کی سانسیں کر لیں۔ دوسری طرف شاہی دربار کے جاہ و جلال نے ماہ کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ شاہی دربار کی چمک دمک' اس کی شان و شوکت اور اس کے رعب و دبدبے کو وہ دیکھتی رہ گئی۔ اس آج پہلی بار کسی بادشاہِ وقت کو جیتا جاگتا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی خواہش ایسے پوری ہو جائے گی۔ اسے بادشاہ سلامت کی پر بھی رشک آ رہا تھا اور اس کا دماغ تخت و تاج اور دربار کی آب و تاب کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

شاہی دربار میں دائیں جانب ذرا اونچائی پر محرابی جھروکے ایک بڑا سا باریک ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پیچھے شاہی بیگمات اور شاہی خانوادے کی خواتین بیٹھی تھیں۔ کنیزیں او یہاں ان خواتین کے دونوں جانب کھڑی خس کے خوش دار پنکھے جھل رہی تھیں۔ چند لمحوں تک تو دربار میں ایک ایسی خاموشی چھائی رہی جیسے وہاں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔ درباریوں' وزیروں اور مشیروں کی نگاہیں ماہ نور کے چاند سے چہرے کو ہی تک رہی تھیں۔

پیر اجان بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر ایک خاص انداز سے اپنے وزیر محبوب علی خاں کی طرف دیکھا۔ محبوب علی خاں ان آنکھوں کا اشارہ سمجھ کر فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور ماہ نور کو مخاطب کر کے بولا۔

"ماہ نور' جہاں پناہ کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ عربی اور فارسی زبانوں پر تمھیں عبور حاصل ہے' تمھیں شعر و شاعری اور ادب سے بھی کافی لگاؤ ہے اور دنیا کے دیگر تمام موضوعات پر بھی تمھارا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ ادب اور شاعری پر جہاں پناہ کا مطالعہ بھی بے حد وسیع ہے کیوں کہ جہاں پناہ خود بھی شاعر ہیں..."

"جی ہاں' میں جانتی ہوں..." محبوب علی خاں ذرا رکا تو ماہ نور نے دھیمے لہجے میں ادب سے کہا۔ "اس ناچیز کو معلوم ہے کہ جہاں پناہ بہت عظیم شاعر ہیں۔ اس ناچیز اور کم عقل ماہ نور کو جہاں پناہ کی کئی غزلیں اور اشعار زبانی یاد ہیں۔"

"بہت خوب...!" محبوب علی خاں نے کہا۔ "تب تو تمھیں یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ مذہبی علما' بڑے بڑے پنڈتوں... ادیبوں' شاعروں اور دانش وروں کو دربار میں بحث و مباحثے کے لیے بلانا جہاں پناہ کا شوق ہے اور وہ دل سے ایسی تمام عظیم شخصیات کی قدر کرتے ہیں؟"

"جی ہاں' مجھے یہ بات بھی معلوم ہے..." ماہ نور نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ "اور میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہی ہوں کہ میں ایک بادشاہ کے روپ میں ایک عظیم شاعر اور بے حد ادب نواز شخص کے سامنے کھڑی ہوں۔ اور یہ جہاں پناہ کی ذرہ نوازی ہے' ورنہ میں اس قابل نہیں تھی۔"

"جہاں پناہ کے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ تمھیں مذہبی معاملات میں بھی بڑی سوجھ بوجھ ہے۔ کیا یہ بات غلط ہے؟"

محبوب علی خاں نے پوچھا تو ماہ نور ایک پل کے لیے سٹپٹا گئی لیکن دوسرے ہی پل اس نے اپنا سر جھکا دیا اور دھیمی سی آواز میں بولی۔ "ناچیز میں اتنی بڑی بڑی خوبیاں نہیں ہیں۔ لیکن جو تھوڑی بہت سمجھ بوجھ ہے وہ ساری قدرت کی دین ہے۔ اور بادشاہ سلامت کی نوازش ہے جو مجھے کسی قابل سمجھتے ہیں' ورنہ میں تو ایک بہت ہی معمولی لڑکی ہوں۔"

ماہ نور کی خوبیوں' خامیوں اور اس کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھرے دربار میں ایک ایسی بات کہہ دی جس کی سچائی کو تسلیم کرنے کے لیے ماہ نور تیار نہیں تھی۔ اس پر دونوں جانب سے بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بادشاہ سلامت نے اپنی بات کے حق میں دلائل دیے اور ماہ نور نے اس کے خلاف اپنی دلیلیں پیش کیں۔ دربار میں موجود تمام علمائے دین' وزرا اور دیگر معزز حضرات ماہ نور کے مُنہ سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو اپنے علم کے ترازو میں تول رہے تھے۔ انھیں حیرت ہو رہی تھی کہ ایک کم عمر لڑکی میں [illegible]

سمجھ بوجھ کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے؟ انھوں نے ذرا دیر میں ہی سمجھ لیا کہ ماہ نور کے دلائل میں کافی وزن ہے۔ خود بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی ماہ نور کی بے خوفی، ہمت اور خود اعتمادی پر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ لیکن اپنی شکست کے باوجود بادشاہ سلامت کو اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ اسے ایک مدت کے بعد ایک ایسا گوہر نایاب ہاتھ لگا ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے وہ کم ہے۔ آخر میں بادشاہ سلامت کا اشارہ پا کر وزیر محبوب علی خاں نے اٹھ کر کہا۔ "ماہ نور، تم نے حاضرین دربار کے دل جیت لیے ہیں۔ جہاں پناہ بھی تمھاری سوجھ بوجھ، دور اندیشی اور تمھاری قابلیت پر خوش ہیں اور تمھاری صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ تم جیسے گوہر نایاب کو شاہی ملکیت میں شامل ہونا چاہیے اور شاہی محل کا فخر ہونا چاہیے۔"

"تاج دار ہندوستان، ہم ناچیز تو آپ کی رعایا ہیں..." ماہ نور نے اپنی ریشمی پلکیں اٹھا کر ایک نظر بادشاہ سلامت کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر آگے بولی۔ "رعایا ہونے کے ناتے میں اور میری ماں دونوں ہی آپ کی ملکیت ہیں۔ ہم تو شاہی محل کی کنیزوں اور باندیوں کی طرح ہیں جن سے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا جاتا، بلکہ انھیں حکم دیا جاتا ہے، عالم پناہ!"

"لیکن، ہم تمھیں شاہی محل کی ایک ادنیٰ کنیز بنا کر تمھاری حق تلفی اور تمھارے رُتبے کی توہین کرنا نہیں چاہتے..." بہادر شاہ ظفر نے کہا۔ "بلکہ ہم تو تمھیں اپنا دوست، اپنا ہمدرد اور اپنا صلاح کار بنا کر محل میں رکھنا چاہتے ہیں... تاکہ امورِ سلطنت چلانے میں تم ہمیں مفید مشورے دیتی رہو، ہمیں نیک و بد سے آگاہ کرتی رہو۔"

"جہاں پناہ! یہ ناچیز اپنے آپ کو اس عظیم منصب کے قابل تو نہیں سمجھتی لیکن میری یہ کوشش ہوگی کہ آپ کے معیار اور نگاہِ انتخاب پر پورا اتر سکوں۔"

نوبہار بیگم یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اور وہ شاہی محل کی چار دیواری کے اندر اپنی زندگی کے دن گزاریں۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی بھی اس کی طرح آزاد اور کھلی فضاؤں میں سانس لے۔ وہ ماہ نور کا جواب سُن کر خوش نہیں ہوئی اسی لیے اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھ کر مؤدبانہ لہجے میں بولی۔ "جہاں پناہ آپ ہمارے اَن داتا ہیں، ہمارے مالک ہیں اور یہ درست بھی ہے کہ ہم آپ کی رعایا ہیں۔ لیکن میں ایک ماں ہوں اور ماہ نور میری اکلوتی بیٹی ہے۔ میں نے مصیبتوں کے بڑے بڑے بوجھ اپنے سر پر رکھ کر اس کی پرورش کی ہے، پال پوس ک قابل بنانے کی پوری کوشش کی ہے کہ سماج میں اسے ایک ع دار اور اعلیٰ مقام ملے۔ اسی لیے میں نے اسے اچھی سے ا تعلیم دلوائی۔ میں ماں ہوں جہاں پناہ... میرے دل میں ارمان ہیں اور اب تو میں اپنی بیٹی کا گھر آباد دیکھنا چاہتی ہوں بس یہی میری آخری خواہش ہے۔"

بہار بیگم کی بات سُن کر وزیر محبوب علی خاں نے باد سلامت کی طرف دیکھا اور پھر نوبہار بیگم سے مخاطب ہو کر بو "خاتون اس میں آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہ ہے۔ جہاں پناہ آپ کی بیٹی کی شادی آپ کی پسند اور آپ اجازت سے خود کرائیں گے اور جہاں پناہ یہ بھی چاہتے ہیں آپ اور آپ کی بیٹی محل میں ہی رہیں تاکہ ماہ نور جہاں پناہ کے علمی و ادبی ذوق میں معاون و مددگار ثابت ہو سکے۔"

محبوب علی خاں کی یہ بات سُن کر نوبہار بیگم زیادہ ضد نہیں کر سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ ماہ نور خو بھی محل میں ہی رہنا چاہتی ہے اور یہی سوچ کر وہ چپ ہو گئی۔

اس کے بعد نوبہار بیگم کو دس ہزار روپے کی ایک تھیلی دی گ اور ہر ماہ دو سو روپے کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا گیا۔ لال قلعے کے اندر ہی ان کے رہنے کا انتظام کر دیا گیا۔ نوبہار بیگم کو اب کوئی شکایت نہیں تھی اور ماہ نور بھی بہت خوش تھی۔ اسے ہر روز بادشاہ سلامت کے سامنے سلامی کے لیے حاضر ہونا پڑتا تھا۔

کبھی کبھی جب بادشاہ سلامت کو ماہ نور کے ساتھ کسی موضوع پر بات کرنے کا موقع اور وقت مل جاتا تو بحث کا سلسلہ دیر تک چلتا رہتا۔ کبھی کبھی بہادر شاہ ظفر اسے اپنی کوئی تازہ غزل اور اشعار وغیرہ بھی سنا کر اس کی رائے پوچھ لیتا تھا اور کبھی کبھی تو فرمائش کر کے ترنم سے ماہ نور کی سحر انگیز آواز میں اپنی غزل بھی سنا کرتا تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے بہادر شاہ ظفر کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ماہ نور سے کہہ دیا۔ "اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے ماہ نور کہ تم بے شک نور کا ایک مجسمہ ہو لیکن ہمیں تمھارا یہ نام پسند نہیں ہے۔"

"یہ بھی آپ کی ذرّہ نوازی ہے جہاں پناہ!" ماہ نور نے مسکرا کر کہا۔

"ہم کوئی الگ تھلگ نام چاہتے ہیں تمھارا..." بہادر شاہ ظفر نے کہا۔ "اس لیے تم ہی بتاؤ، تمھارا کیا نام رکھا جائے؟"

"یہ تو جہاں پناہ کی نظرِ کرم پر منحصر ہے..." ماہ نور نے ادب

اب دیا۔ "کنیز کو تو جہاں پناہ کی خوشی اپنی جان سے زیادہ

"

کن ہم تم پر زبردستی اپنی مرضی مسلط کرنا نہیں "بہادر شاہ ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نام تم بتاؤ م کریں گے۔"

جہاں پناہ! شاہی نظر میرا جو بھی نام پسند کرے گی، اسے اور باعثِ فخر سمجھنا میرا فرض ہوگا۔" ماہ نور نے یہ کہا ہی بہادر شاہ ظفر اچانک ہی اچھل پڑا اور بولا۔ "واہ... بہت خوب! تمھارے اس جواب کا بھی جواب نہیں۔ ے اس جواب سے ہی ہمیں تمھارا نیا نام مل گیا۔" بہادر ظفر یہ کہہ کر ذرا رُکا اور مسکراتی نظروں سے ماہ نور کے ے کو دیکھتا رہا پھر آگے بولا۔ "آج سے ہم تمھیں 'شاہ نظر' نام سے پکاریں گے... شاہ نظر..."

آپ کی پسند اور آپ کا دیا ہوا یہ نام سچ مچ مجھے بھی بہت ہے جہاں پناہ۔" ماہ نور نے کہا اور اپنی گردن جھکا دی۔

* * *

بہار بیگم اور ماہ نور کو لال قلعے میں آئے ہوئے چند ماہ تھے۔ ماہ نور بہت خوش تھی، علم و ادب کا جو ماحول اسے تھا وہ اسے بہادر شاہ ظفر اور دیگر ادیبوں اور شاعروں کی محفلوں میں مل رہا تھا۔ لیکن بہادر شاہ ظفر ماہ نور کو اپنی نظر (شاہ نظر) قرار دینے کے بعد بھی اپنے اس وعدے سے غافل ہیں تھا جو اس نے نوبہار بیگم سے کیا تھا۔ اس نے شروع ہی وزیر محبوب علی خاں کو یہ ذمے داری دے دی تھی کہ وہ ماہ نور کے لیے کوئی اچھا رشتہ تلاش کرے۔

بالآخر کار وہ دن آ گیا جب محبوب علی خاں نے بادشاہ سلامت کی اجازت سے نوبہار بیگم کو اس نوجوان سے ملوایا تاکہ وہ نوجوان کو دیکھ کر اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں آگاہ کر دے۔

نوبہار بیگم نے جب اس نوجوان کو دیکھا اور اس سے باتیں کیں تو وہ اس کی شخصیت اور اس کی شرافت سے بہت متاثر ہوئی۔ نوجوان برسرِ روزگار تھا، جوان اور خوب صورت تھا اور دربار میں ہی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ نوبہار بیگم نے محبوب علی خاں کی پسند اور اس کی کوششوں کی تعریف کی اور شکریہ ادا کیا۔

چند دنوں بعد ہی بہادر شاہ ظفر کے حکم کے مطابق ماہ نور کی شادی اس نوجوان سے کر دی گئی۔ اس طرح ماہ نور نے شاہ نظر بن کر زندگی کی سب سے بڑی اور سچی خوشی پالی۔

ماہ نور کی شادی کے کچھ عرصے بعد ہی نوبہار بیگم بیمار بیمار سی رہنے لگی تھی۔ اُس کے سر سے بیٹی کی شادی کا بھاری بوجھ اتر گیا تھا جس کے لیے اس نے خدا کی شکر گزار تھی اور بہادر شاہ ظفر کے احسانوں کے بدلے اسے دعائیں بھی دیتی رہتی۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک اپنی بیٹی کی خوشیاں نہ دیکھ سکی اور ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہو گئی۔

* * *

گرچہ ماہ نور عرف شاہ نظر شاہی دربار کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی بیگم بن چکی تھی لیکن اس کے باوجود وہ خود کو بادشاہ سلامت کی کنیز ہی سمجھتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر اب بھی اس کی پہلے کی طرح عزت کرتا تھا۔ ایک دن بہادر شاہ ظفر نے مذاق کے ترنگ میں آ کر شاہ نظر کو چھیڑنے کے لیے یوں ہی کہہ دیا۔ "شاہ نظر، ہمارا خیال ہے کہ ایک بڑے عہدے دار کی بیگم بننے کے بعد تم کچھ مغرور ہو گئی ہو لیکن تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم اب بھی ہماری کنیز ہو۔"

یہ بات سن کر شاہ نظر فوراً ہی اس بات کی تہہ تک پہنچ گئی اور اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ بادشاہ سلامت آج اس سے آقا اور غلام کے موضوع پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے بڑے ادب و احترام سے کہا۔ "آپ نے بالکل درست فرمایا

اہلِ مرو کے موزے استعمال کرنے کا طریقہ

ابو سعید سجادہ کا کہنا ہے کہ اہلِ مرو میں سے کچھ لوگ موزے پہننے کے موسم میں چھ ماہ موزے پہنتے ہیں اور کسی وقت بھی موزے نہیں اُتارتے۔ وہ تین ماہ تک تو پنجوں کے بل چلتے ہیں اور باقی تین ماہ اپنی ایڑیوں کے بل چلتے ہیں۔ چھ ماہ پہننے کے باوجود ان کے موزے ایسے لگتے ہیں کہ گویا انھوں نے صرف تین ماہ پہنے ہیں۔ پنجوں اور ایڑیوں کے بل چلنے کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں موزوں کے تلے گھس نہ جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ پورا قدم لگانے کی صورت میں موزے گھس جائیں گے۔ اس طرح وہ اپنے جسم کو اذیت دے کر موزوں کی عمر بڑھا جاتے ہیں۔

کتاب: "بخیلوں کے انوکھے واقعات" از: ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ۔ ترجمہ عبدالرزاق ✿ تعاون۔ مصطفیٰ ارباب

ہے جہاں پناہ! لیکن اگر گستاخی معاف ہو تو میں کچھ عرض کرنا چاہوں گی۔“

”کچھ کہنے کے لیے تمھیں ہم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے...“ بہادر شاہ ظفر نے کہا۔ ”تمھیں جو کہنا ہے، کہہ سکتی ہو۔ ہمیں یقین ہے تمھاری طرف سے کوئی گستاخی ہو ہی نہیں سکتی۔“

”جہاں پناہ! آپ تو مذہب اور مذہب کے تمام قاعدے قوانین سے واقف ہیں...“ شاہ نظر نے کہا۔ ”آج جس طرح کی کنیزیں، داسیاں اور غلام عام گھرانوں میں موجود ہوتے ہیں، اسے اگر مذہب اور مذہبی قانون کی نظر سے دیکھا جائے تو انھیں کنیز، غلام یا داسی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ملازم کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ جنگ میں پکڑے ہوئے جنگی قیدی نہیں ہوتے۔ جب جنگ چھڑ جائے اور اس جنگ کے نتیجے میں شکست خوردہ مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے انھیں جنگی قیدیوں کی حیثیت دے دی جاتی ہے تو یہی مرد اور عورتیں، داسیاں اور غلام بن سکتے ہیں۔ اس لیے آپ کی یہ ادنیٰ کنیز حقیقت میں آپ کی کنیز اور داسی نہیں بلکہ آپ کی ملازمہ ہے۔ اور ایک ملازمہ کی حیثیت سے ہی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں کیوں کہ اپنے مالک کا حکم ماننا اور خدمت کرنا ایک ملازمہ کا فرض ہے۔ مجھے آپ نے کسی جنگ میں پکڑ کر قیدی نہیں بنایا ہے اور نہ ہی میں آپ کی زرخرید غلام یا داسی ہوں۔“ یہ سخت بات بہت ہی میٹھے اور دھیمے لہجے میں کہہ کر شاہ نظر نے اپنا سر جھکا لیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر چپ چاپ اسی جگہ کھڑی رہی۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کافی دیر تک ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مگر شاہ نظر نے اپنی گردن نہیں اٹھائی۔ اس کے دونوں ہاتھ ابھی تک معافی کے انداز میں اس کے سینے پر جڑے ہوئے تھے۔

اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اچانک ہی بہادر شاہ ظفر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کی نگاہیں اب بھی شاہ نظر کے جھکے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اصل میں وہ چاہتا تھا کہ شاہ نظر اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھے۔ لیکن شاہ نظر تو سر جھکائے ہی کھڑی رہی۔ اس نے تو اپنی پلکیں بھی نہیں اٹھائی تھیں مگر تھوڑی دیر بعد اس کے بند ہونٹوں میں لرزش ہوئی اور پھر اس کی کپکپاتی ہوئی مدھر آواز بہادر شاہ ظفر کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”جہاں پناہ! آپ کے رُو بہ رُو میں نے جس طرح کے گستاخانہ الفاظ کہے ہیں، ان کی وجہ سے مجھ اتنی ہمت اور طاقت نہیں رہی کہ میں اپنا سر بھی خود سکوں۔ آپ کے پاکیزہ اور شفقت بھرے ہاتھ اٹھائیں گے تبھی میری جھکی ہوئی نظر اوپر اٹھے گی۔“

بہادر شاہ ظفر کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ ذ بعد وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور اپنے ہاتھ میں رومال تھا دھیرے دھیرے شاہ نظر کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے شاہ نظر کی ٹھو اٹھائی، جھکی ہوئی گردن ذرا اوپر تو اٹھ گئی مگر شاہ نظر کی پ پلکیں بہ دستور جھکی رہیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر آنکھوں کے کناروں پر آنسوؤں کے دو موتی ٹھہرے ہو تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنی انگلی سے ٹھہرے ہو آنسوؤں کے قطروں کو گرنے سے پہلے ہی تھام لیا اور انھ اپنے رومال میں جذب کر لیا۔

ہمدردی، قدر دانی، محبت، خلوص اور پدرانہ شفقت کے انداز نے شاہ نظر کو اس قدر حیران کر دیا کہ اس کے مُنہ سے ا لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ تشکر کے اظہار میں بے اختیار باد سلامت کے قدموں میں جھکتی چلی گئی۔ بہادر شاہ ظفر نے شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

* * *

دن اپنی رفتار سے گزرتے رہے۔ اندھیرا اور اجالا ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔ وقت اپنے حساب کروٹیں بدل رہا تھا... اور پھر ایک ایسی کروٹ اس نے بدلی دہلی شہر میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ پورے شہر میں پھوٹ پڑا ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستا سپاہیوں اور ہندوستانی عوام کا بلوہ۔ حالات روز بہ روز خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ انگریزوں کے لیے پور ہندوستان میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

اسی خطرناک ماحول میں شاہ نظر نے ایک بچی کو جنم دیا۔ بچی صحت مند اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھی لیکن شاہ نظر کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ حکیم اور وید اس کا علاج کر رہے تھے مگر وہ روز بہ روز زور ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی دوا اور کوئی دعا کام نہیں آ رہی تھی۔ دوسری طرف ہر جانب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ قتلِ عام شروع ہو گیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ حالات روز بہ روز گمبھیر ہوتے جا رہے تھے۔

لال قلعے کے ایک کمرے میں شاہ نظر اپنے بستر پر پڑی

اس کی بیماری میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

ہار مہینوں تک دہلی کے حالات خراب رہے۔ پھر وں کے لیے مدد آ پہنچی۔ انگریز فوجیوں کے آ جانے سے اری کا ہو گیا تھا، اس لیے ان کے قتلِ عام کا سلسلہ کم ۔ پھر چالاک انگریزوں نے دھیرے دھیرے اپنی میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور ایک دن انھوں نے شاہی پر حملہ کر کے چند پر قبضہ بھی کر لیا۔

اس کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ ہندوستان کے آخری تاج بہادر شاہ ظفر کو بھی اپنی جان بچانے کے لیے دہلی سے فرار ا۔ شاہی بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کو سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں جا کر چھپنا پڑا... ب تک؟ ایک مردہ بادشاہ جو اپنی قبر کی گہرائی میں لیٹا تھا، وہ لوگوں کو پناہ دینے کے لیے کیا کر سکتا تھا!

ہمایوں کے مقبرے میں آ کر چھپنے سے پہلے بہادر شاہ ظفر چند وفادار ساتھیوں نے اسے لکھنؤ لے جانے کی کوشش کی جہاں اس وقت انگریز اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ لیکن کے سانپوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ان غداروں نے پر وہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے، یہ کہہ کر بادشاہ کو دہلی میں روک لیا کہ آپ اگر لکھنؤ چلے گئے تو ستان کے تخت پر انگریز قابض ہو جائیں گے اور ہندوستان ایک بار پھر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دی جائے گی۔ اس وقت بہادر شاہ ظفر اپنے وفادار ساتھیوں کی بات مان لیتا اس کی زندگی کا انجام کچھ مختلف ہوتا۔

ہمایوں کے مقبرے میں بہادر شاہ ظفر اور اس کے خاندان پوشیدگی کی اطلاع بھی انھی غداروں نے انگریزوں کو دی تھی نے اسے لکھنؤ جانے نہیں دیا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ طرح بہادر شاہ ظفر کو جلد سے جلد گرفتار کر لیا جائے تا کہ کے وفاداروں کے حوصلے پست ہو جائیں اور جنگِ آزادی ہو جائے... اور ہوا بھی یہی۔ ہمایوں کے مقبرے میں کی موجودگی کی اطلاع ملتے ہی انگریزوں نے رات کی میں ہمایوں کے مقبرے کو گھیرے میں لیا اور بہادر شاہ بیگمات اور شہزادوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ اپنا قیدی کے بعد انگریزوں نے اس کے ساتھ بے حد ذلت آمیز کیا اور بعد میں اس پر کئی جھوٹے مقدمات بھی قائم جن میں بغاوت کا مقدمہ سرِ فہرست تھا۔ آخر کار بہادر قید کی سزا سنا کر رنگون روانہ کر دیا گیا جہاں اسے بے یار و مددگاری کے عالم میں مجبوری، مفلسی اور بے بسی کی زندگی گزارنی تھی۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے آخری ایام اس جیسے نیک دل، شریف النفس، خداترس اور پرہیزگار بادشاہ کے شایانِ شان ہرگز نہیں تھے۔ اس کی بے بسی کا اس سے بڑا حوالہ اور کیا ہو گا کہ اس کی موت کے بعد انگریزوں نے آخری تاجدارِ ہند کو، ہند کی مٹی میں دفن کرنے کی بھی اجازت نہیں دی۔

ادھر لال قلعے کے ایک کمرے میں شاہ نظر اپنے بہ دستور بیمار پڑی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اس سے اٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ اسی بیماری کی حالت میں اسے بہادر شاہ ظفر کے بارے میں کچھ اڑتی اڑتی خبریں مل جاتی تھیں۔ جان بچانے کے لیے بہادر شاہ کا محل سے فرار، ہمایوں کے مقبرے میں روپوشی، پھر وہیں سے اس کی گرفتاری، اس کے بعد مقدمات اور پھر جلاوطنی... یہ ساری خبریں اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی سنی تھیں اور ظاہر ہے، ان تکلیف دہ خبروں نے اس کی بیماری پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ یہ سارے صدمات برداشت کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔

وقت نے ایسی کروٹ لی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے سرسبز دھرتی، ریگستان میں تبدیل ہو گئی۔ کوئی کسی کو پوچھنے والا بھی نہ رہا۔ شاہ نظر کا خاوند ہی تن تنہا دن رات اس کی تیمارداری کرتا۔ اپنی بیوی اور اپنی ننھی سی بچی کی دیکھ بھال کے لیے وہ اکیلا ہی بچا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ اس افراتفری میں اپنی جان کے خوف سے محل کے نوکر چاکر، داسیاں اور کنیزیں سب کے سب بھاگ چکے تھے۔ لال قلعے میں شاہ نظر، اس کے خاوند اور ان کی ننھی سی بچی کے سوا اور کوئی چوتھا شخص نہیں تھا۔ شاہ نظر اور اس کے خاوند نے اپنے آپ کو اللہ کے اور قسمت کے بھروسے پر چھوڑ رکھا تھا۔ اور اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں، مصائب کی اِس تاریکی میں، اُمید کی کوئی کرن کب نمودار ہوتی ہے!

یہ بلوہ، یہ لڑائی، یہ خون ریزی اور یہ جنگ سب سیاسی چالیں ہی تھیں۔ لیکن لوٹ مار کرنے والوں اور پیشہ ور چور ڈاکوؤں کو تو ایسے موقعوں کا انتظار ہی رہتا ہے۔ اس بار بھی لٹیروں نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور انھوں نے شہر بھر میں خوب لوٹ مار کی۔ لٹیروں کا ایک گروہ مال و دولت کی لالچ میں، خالی پڑے ہوئے لال قلعے میں بھی گھس آیا تھا۔ جب وہ لٹیرے شاہ نظر کے کمرے میں داخل ہوئے تو شاہ نظر کے خاوند نے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کئی لوگ تھے جنھوں نے فوراً ہی ایک اکیلے آدمی کو دبوچ لیا اور اس سے روپے پیسے، سونا چاندی اور

زیورات وغیرہ طلب کرنے لگے۔ اجنبی اور بدمعاش چہرے والے لوگوں کو دیکھ کر شاہ نظر ڈر گئی۔ اس نے جھٹ اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا اور اپنی بچی کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ وہ بے حد خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی تھی۔

شاہ نظر کے خاوند نے جان بچ جانے کی امید میں لکڑی کے ایک صندوق کی جانب اشارہ کر کے ان لٹیروں سے کہا۔ ”اس صندوق میں نقد رقم اور زیورات ہیں۔ آپ لوگوں کو جو چاہیے لے لیں لیکن ہماری جان نہ لیں۔ ہماری بیٹی بہت چھوٹی ہے۔ آپ کو جو کچھ لینا ہے لے کر چپ چاپ چلے جائیں... بس ہمیں پریشان نہ کریں۔“

صندوق کھول لیا گیا۔ ان لٹیروں کے ہاتھ جو مال لگا، وہ انھوں نے لوٹ لیا۔ اس کے علاوہ انھیں وہاں جو بھی قیمتی چیز نظر آئی اُسے بھی اپنے تھیلے میں ٹھونس لیا۔ تب اچانک ہی لٹیروں کے بوڑھے سردار نے اچانک جھپٹا مار کر شاہ نظر کی چادر کھینچ لی۔ شاہ نظر اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔

اس بوڑھے سردار کو یہ شک گزرا تھا کہ اس عورت نے اپنی چادر کے نیچے کوئی قیمتی چیز چھپا رکھی ہے۔ اسی چیز کو دیکھنے کے لیے اس نے شاہ نظر کی چادر ہٹائی تھی۔ بوڑھے کی اس حرکت پر شاہ نظر کے شوہر کو غصہ آ گیا اور وہ چیخ کر بولا۔ ”بے ہودہ بوڑھے، تجھے شرم نہیں آتی! یہ میری بیوی ہے۔ یہ بیمار ہے، اس کی گود میں ننھی سی بچی ہے اس کا تو کچھ خیال کر۔“

”بند کرو اپنی یہ بکواس...!“ بوڑھے سردار کو بھی غصہ آ گیا اور وہ چیخا۔ ”میرا کس نے خیال کیا ہے جو میں ہر کسی کا خیال کرتا پھروں۔“ یہ کہہ کر اس نے شاہ نظر کے شوہر کے سینے پر ایک زوردار گھونسا مارا۔ جواباً اُس نے بوڑھے پر چھلانگ لگا دی۔ بوڑھا بھی کم زور نہیں تھا۔ اس نے بھی لاتوں گھونسوں کا جواب لاتوں گھونسوں سے ہی دینا شروع کر دیا جب کہ اس کے دوسرے ساتھی اس لڑائی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زور زور سے ہنس رہے تھے اور اپنے سردار کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

لڑتے لڑتے دونوں نے خود سے دُور ہٹانے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دیے جس کے نتیجے میں شاہ نظر کے خاوند کا پاؤں پیچھے ہٹتے ہوئے کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ دروازے کے قریب جا گرا اور دوسری طرف بوڑھا سردار بھی اس زوردار دھکے کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔ اس کے قدم بری طرح سے ڈگمگائے اس نے فرش پر گرتے گرتے سہارے کے لیے پاس کھڑی ہوئی شاہ نظر کے کندھے کو پکڑنے کی کوشش کی مگر اس کی لڑکھڑاہٹ نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور اس کا ہاتھ شاہ نظر کے کندھے سے پھسلتا ہوا اس کی گود میں پڑی ہوئی بچی کی گردن پر پڑا جس کی وجہ سے اس ننھی سی بچی کی گردن دب گئی۔ شاہ نظر کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل گئی۔ شاہ نظر کے خاوند کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ وہ شاہ نظر کی چیخ سن کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر اٹھنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت اس کی نظر اپنی بندوق پر پڑی جو دروازے کے پاس ہی رکھی تھی۔ بندوق پر نظر پڑتے ہی اس میں ایک نئی طاقت آ گئی۔ اس نے جھپٹ کر بندوق اٹھا لی۔ جب بندوق کی نال ان لٹیروں کی جانب اٹھی تو وہ دروازے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کے دو چاقو اور دو خنجر بندوق سے نکلنے والی گولیوں کو نہیں روک سکتے۔ بھاگتے وقت ان لٹیروں نے بوڑھے سردار کی بھی پروا نہیں کی تھی۔

شاہ نظر کا شوہر جب بندوق تان کر اس بوڑھے لٹیرے کی جانب مڑا تو اس نے دیکھا کہ شاہ نظر چپ چاپ بے حرکت کھڑی ہے اور اس کے کندھے سے لگی ہوئی بچی کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی ہے۔ اُس کے قریب کھڑا بوڑھا اپنے دونوں ہاتھ جوڑے، دھیمی اور سسکتی ہوئی آواز میں کہہ رہا ہے۔ ”مجھے معاف کر دو بیٹی... میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“ بولتے بولتے وہ شاہ نظر کے پیروں پر گر گیا اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی... میں سچ کہتا ہوں... قسم کھاتا ہوں بیٹی، میں نے جان بوجھ کر تمھاری بچی کو نہیں مارا... میری اس معصوم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے بیٹی؟ میرا ہاتھ اتفاق سے اس کی گردن پر پڑ گیا تھا... بیٹی، مجھے معلوم ہے کہ ماں باپ کو اپنی اولاد کتنی پیاری ہوتی ہے۔“ بوڑھا شاہ نظر کے قدموں میں پڑا گڑگڑا رہا تھا لیکن شاہ نظر اس طرح ساکت کھڑی تھی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو۔ اچانک شاہ نظر کے خاوند نے آگے بڑھ کر بندوق کی نال بوڑھے لٹیرے کی پیٹھ سے لگا دی اور چیخ کر بولا۔ ”اٹھ بڈھے خبیث... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا... چل اٹھ!“

بندوق کی نال دوسری بار جب بوڑھے کی پیٹھ میں چبھی تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے کپکپاتے ہاتھ اب بھی معافی مانگنے کے انداز میں جڑے ہوئے تھے۔ وہ شاہ نظر کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

”بوڑھے شیطان! اب مرنے کے لیے تیار ہو جا۔“ شاہ نظر کے شوہر نے گرج دار آواز میں کہا۔ ”میں نے تجھ سے درخواست کی تھی کہ سارا مال اسباب لے جا مگر اس بیمار عورت اور معصوم بچی کا خیال کر لیکن تو نے تو اس معصوم بچی کی جان ہی لے لی اور ساتھ اس کی بیمار ماں کو بھی بچی کی جدائی کی آگ میں جھونک دیا... اب میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔“

”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ مجھے معافی نہ ملے...“ بوڑھے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں ساری زندگی مر مر کر لیا ہوں۔ میری اس زندگی سے موت ہی بہتر ہے۔ میں تم لوگوں سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا... میں تیار ہوں... بے شک مجھے گولی مار دو مگر میری ایک آخری بات سن لو تاکہ مرنے سے پہلے میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔“ اتنا کہہ کر بوڑھے نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس کی سسکیوں کی آواز نے سکتے کی حالت میں کھڑی ہوئی شاہ نظر کو جیسے جھنجوڑ دیا۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی بھیگی آنکھوں کا رُخ موڑ کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ بوڑھے نے اپنی گردن اٹھائی اور شاہ نظر کے خاوند کی جانب منہ کر کے بولا۔ ”میں ایک بہت ہی بدنصیب شخص ہوں۔ اس ظالم دنیا نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میرا گھر، میری بیوی اور میری پھول سی معصوم بچی! جانے وہ کیسے درندے تھے جو میری اکلوتی بچی کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کی جدائی کے غم میں اس کی ماں مر گئی۔ میرا گھر برباد ہو گیا اور میں پاگلوں کی طرح جگہ جگہ بچی کو ڈھونڈتا پھرتا رہا۔ اگر میری بچی میری آنکھوں کے سامنے مر گئی ہوتی تو مجھے سکون آ جاتا۔ مگر آج میری بے سکونی کو اٹھارہ سال گزر گئے ہیں۔ یہ اٹھارہ سال میں نے اٹھارہ صدیوں کی طرح روتے روتے گزارے ہیں۔ اس وقت میری بچی نو دس برس کی تھی جب وہ کھیت میں کھیلتے کھیلتے غائب ہو گئی تھی...“ بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شاہ نظر نے اپنی بے جان بچی کی لاش کو بستر پر لٹا دیا اور پھر بوڑھے کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی۔ اسے بوڑھے شخص کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے دماغ پر زور ڈالا تو وقت نے اسے بہت پیچھے دھکیل دیا اور تب یکا یک ہی اٹھارہ سال پہلے کا ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

اٹھارہ سال قبل وہ شاہ نظر نہیں تھی۔ ماہ نور بھی نہیں تھی، بلکہ وہ نو دس برس کی ایک بچی تھی اور اس کا نام شیرازی تھا۔ اور وہ پنجاب کے ایک غریب محنت کش کسان کی بیٹی تھی۔ اس وقت شاہ نظر کی آنکھوں کے آگے وہی نو دس برس کی بچی شیرازی آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور شاہ نظر کی آنکھوں میں ماضی کا وہ منظر ایک فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔

شیرازی دھان کے سرسبز کھیت میں ایک رنگ برنگی خوب صورت تتلی کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت اس کا بابا اس سے ذرا دُور بیٹھا فصل کاٹ رہا تھا۔ پھر اچانک نہ جانے کہاں سے دو ڈاکو آئے اور شیرازی کا منہ دبا کر اسے اٹھا لے گئے۔ اس وقت ننھی شیرازی کے منہ سے چیخ بھی نہیں نکل سکی تھی۔ کیوں کہ وہ تو منہ بند ہوتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔

جب شیرازی کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک پلنگ پر لیٹا ہوا پایا۔ ایک خوب صورت جوان عورت اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ کون سے شہر میں، کس کے پاس تھی، اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ بس کھیت کھلیان اور ماں باپ کی یاد اس کے ننھے سے دماغ میں ٹھہر کر رہ گئی تھی۔

اس دن کے بعد سے اس کے دن طوائف کے کوٹھے پر گزرنے لگے تھے۔ اس طوائف کا نام تھا نوبہار بیگم...! نوبہار بیگم نے شیرازی کو دینی اور دنیوی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا اور اسے شیرازی سے ماہ نور اور پھر شاہ نظر بنا دیا۔

ماضی کے یہ سارے مناظر ایک ایک کر کے آتے رہے اور جاتے رہے۔ اب شاہ نظر کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سامنے بوڑھے شخص کا چہرہ تھا اور وہ اس چہرے میں کسی کا چہرہ ڈھونڈ رہی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں پر آ کر ٹھہر گئے تھے۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی مگر حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کا خاوند بندوق تھامے بڑی حیرت سے شاہ نظر کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر بعد شاہ نظر کے ہونٹ دھیرے دھیرے تھرتھرائے۔

”ابا... جان...“ دو ٹوٹے ہوئے الفاظ اس کے منہ سے نکلے اور پھر وہ سسکتی ہوئی اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ بے چین باپ کی بے تاب بانہوں نے اسے بھینچ لیا...

”شیرازی... میری بچی! میری جان!“ بوڑھا باپ اسے اپنے سینے سے لگائے بولتا رہا۔ لیکن اب اس کی کسی بھی بات کا جواب دینے کے لیے نہ وہاں شیرازی موجود تھی، نہ ماہ نور... اور نہ ہی شاہ نظر موجود تھی۔ وقت کی کروٹ نے اپنا کام دکھا دیا تھا اور اب وہ مزید کروٹیں بدلنے کے لیے آگے بڑھ گیا تھا!

امنگوں حوصلوں آنسوؤں اور آہوں کی داستان

بازیگر

سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

بابر زمان، ایک سرکش، سرزور نوجوان کا فسانۂ زندگی

وہ تحریر جس کا انتظار کیا جاتا ہے

شہر گیا کے ہونہار لڑکے بابر زماں خاں نے بدھ مت کے سالانہ میلے میں ایک بوڑھے شخص کے ساتھ حُسن و جمال میں یک تا و یگانہ دو
لڑکی دیکھی تھی۔ اُس پری پیکر کی صورت بابر کی آنکھوں میں نقش ہوگئی۔ تعاقب کرتے کرتے وہ اُن کی کٹیا تک پہنچ گیا۔ لڑکی کا نام کورا
بوڑھے بھکشو کا انجین۔ رفتہ رفتہ کورا اور بابر ایسے گھل مل گئے جیسے اُن میں کبھی کوئی دوری ہی نہ تھی۔ انجین بھی بابر سے خاصا مانوس ہوگیا تھ
کورا کا آں جہانی باپ تبت کے جانگ قبیلے کا سردار تھا۔ باپ کی موت کے بعد چچا نے سرداری غصب کرلی۔ وہ کورا کو راستے سے ہٹا
چاہتا تھا کہ کورا کا اتالیق جہاں دیدہ عالم انجین خود کو داؤ پر لگا کر اُسے مقتل سے نکال لایا۔ قبیلے کے کچھ خفیہ نقشے اور متبرک دستاویزیں بھ
ساتھ لے آیا تھا۔ چچا کے آدمی ہر طرف کورا کو تلاش کر رہے تھے۔ کورا سے زیادہ اُنھیں متبرک دستاویزوں کی جستجو تھی۔ جیسے ہی موقع ملتا،
بدھ گیا کا رُخ کرتا۔ ایک روز وہ بہ اصرار انجین اور کورا کو اپنے گھر لے آیا۔ بابر کے والد صفدر زماں خاں کا شمار شہر کے شرفا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک
بڑا گھر تھا۔ اماں باپ، بابر کے علاوہ دو چھوٹے بھائی، اکبر، جہاں گیر، چار چھوٹی بہنیں، فہمیدہ، فرخ، فریال اور فاریہ۔ سبھی نے اِن دو اجنبیو
پذیرائی کی۔ انجین نے اُنھیں قیمتی تحائف پیش کیے۔ اس واقعے کے چند روز بعد ایک رات کورا اچانک بابر کے گھر پہنچ گئی، بکھرے ہوئے بال،
شکستہ لباس۔ اُس نے بتایا کہ جانگ قبیلے کے سرکش کھوجیوں نے آخر اُنھیں تلاش کرلیا۔ بوڑھا انجین مزاحمت کرتے ہوئے مارا گیا۔ کورا بچ
بچاتی یہاں تک پہنچ گئی۔ وہ نوادر کی پوٹلی اور متبرک کاغذات بھی بچا کے لائی تھی۔ بابر کے والد پولیس کو مطلع کرنا چاہتے تھے لیکن بابر کو یہ گوارا
ہوا۔ وہ کورا کو ساتھ لے کر چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ دونوں چھپتے چھپاتے کلکتے جانے والی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ایک مہربان شخص مولوی
شفیق سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اُنھیں اپنے حجرے میں لے گئے۔ بابر نے اُنھیں کچھ اور ہی کہانی سنائی تھی۔ اُسے خوف تھا کہ سچ کب تک چھپ سکتا
ہے۔ چناں چہ ایک روز وہ وہاں سے بھی فرار ہوگئے۔ ہوٹل میں ٹھہر کے بابر نے ملازمت ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ گھر سے کچھ رقم اور چا
لے کر آیا تھا۔ صرف چاقو باقی رہ گیا۔ دربہ در ٹھوکریں کھانے کے بعد اُنھیں دوبارہ مولوی صاحب کے حجرے ہی میں پناہ ملی۔ بابر نے اِس بار
کچھ جھوٹ، کچھ سچ پر مشتمل ایک دوسری داستان اُنھیں سنائی۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اپنے کاموں سے نمٹ کے چند دن بعد وہ اُنھیں اپنے
آبائی شہر لے جائیں گے۔ ایک شام وہ اُن دونوں کی دل بستگی کے لیے اُنھیں دریا کی سیر کرانے لے گئے تھے کہ چند مسلح آدمیوں نے حملہ کردیا۔
بدنگاہوں کو کورا مطلوب تھی۔ حملہ آوروں سے بابر کے گتھم گتھا ہوجانے کی وجہ سے مولوی صاحب کورا کو دُور رکھنے اور بھاگ جانے میں کام یاب
رہے۔ بابر کو سات سال کی سزا ہوگئی۔ مولوی صاحب نے پھر اُس سے کوئی رابطہ کیا نہ اُس لے مناسب سمجھا۔ جیل میں کلکتے کا نامی گرامی اُستاد
بٹھل، بابر کی سرکش معصومیت اور چہرے سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں سے ایسا متاثر ہوا کہ ایک طرح سے وہ بابر کا مربی اور نگراں بن گیا۔ جیل میں
اُستاد بٹھل اور اُس کے شاگردوں کی آمدورفت ایک معمول تھی۔ بٹھل نہ ہوتا تو جیل میں اُس کے اڈّے کے کارندے بابر کا بہت خیال رکھتے۔
انھوں نے چاقو زنی کے کرتب، بلم، لاٹھی کے گر اور جسمی داؤ پیچ اُسے سکھائے۔ بٹھل کی تحریک پر بابر نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور امتیازی
نمبروں سے ایم اے کرلیا۔ بابر نے سات سال کے روز و شب گن گن کے کاٹے تھے۔ رہا ہوکر اُسے اپنے مشفق و محسن بٹھل کے اڈّے پر پہنچنا
چاہیے تھا، لیکن وہ کورا کی تلاش میں نکل گیا۔ کلکتے کے مدرسے میں مولوی شفیق سات سال سے نہیں پلٹے تھے۔ مولوی صاحب کے آبائی شہر میں
بھی کسی کو اُن کا کوئی علم نہیں تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہوکے بابر نے اپنے شہر گیا کا رُخ کیا۔ وہاں اُسے بتایا گیا کہ اُس کی ماں، بیٹے کے غم میں
گھل گھل کر مرگئی۔ عرصہ ہوا باپ، جائداد زمین وغیرہ بیچ کے اور بچوں کو ساتھ لے کے شہر سے چلے گئے ہیں۔ کسی کو اُن کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اب
کلکتہ ہی بابر کی منزل ہوسکتی تھی جہاں بٹھل اُس کے لیے بہت پریشان تھا۔ بابر کی آمد سے اڈّے پر بہار آگئی۔ بٹھل نے زرّیں کو بھی باپ کے

مانند شفقت دی جو راستے سے بابر کے ساتھ ہوگئی تھی۔ زرّیں کی چتاسن کے چنچل نے اڈّے کے چند خاص آدمیوں کو بابر اور زرّیں کے آباد روانہ کیا۔ اُن دنوں شہر میں نیلم جان نامی مغنیہ کی بڑی دھوم تھی۔ ایک شام اُستاد جامو بابر کو نیلم جان کے بالاخانے لے گیا۔ جب اندر سے برآمد ہوئی تو بابر کو سکتہ سا ہوگیا۔ نیلم جان کی حالت بھی غیر ہوگئی۔ یکایک وہ کھڑکی کی طرف لپکی اور سڑک پر کود گئی۔ بابر دیوانہ کی جانب دوڑ پڑا۔ نیلم جان نے اُس کے زانوؤں پر دم توڑ دیا۔ یہ اُس کی بہن فہمیدہ تھی، اُس کی ممی۔ بابر اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ تا چنچل بھی کلکتے سے آگیا۔ سبھی بابر کی اشک شوئی میں مصروف تھے، مگر اُس کی دیوانگی بڑھتی ہی گئی اور ایک رات کسی کو کچھ بتائے بغیر وہ گھر نکل کھڑا ہوا۔ اُسے فہمیدہ کو نیلم جان بنانے والی نائکہ چمپابائی کا سراغ لگانا تھا۔ تلاشِ بسیار کے بعد وہ اُسے آگرے میں کہیں مل پائی۔ سے معلوم ہوا کہ فہمیدہ کو بمبئی سے لایا گیا تھا۔ چمپابائی کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بابر کے منشا کے مطابق اُس کے ساتھ بمبئی کا سفر کر چمپابائی پر نگاہ رکھنے کے لیے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا مناسب تھا۔ سفر کے دوران رات کو ایک ہم سفر پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ عین وقت پر بابر پر حاوی ہوگیا۔ وہ بمبئی میں تعینات ایک بہت بڑا پولیس افسر راج کرشنا تھا۔ سو بابر کے لیے کرشنا کا التفات فراواں تھا۔ بمبئی پہنچ کے چمپا نشاں دہی پر بابر اُس عمارت تک پہنچ گیا جہاں اُس کے باپ اور بہن بھائیوں کا قیام رہا تھا۔ ایک دردمند پڑوسی مولوی اکرم نے اُسے فہمیدہ کی گم شدگی کے بعد اُس کے باپ پھر یہاں نہ رہ سکے۔ قریبی مراسم کے باوجود اُنھوں نے اپنا پتا مولوی اکرم کو بھی نہیں بتایا تھا۔ بیش تر میں بند رہتے تھے۔ کتابوں کا ڈھیر لگا ہے، جب دیکھو، کسی نامعلوم زبان میں تحریر شدہ کاغذات پر جھکے خاکے کھینچتے رہتے۔ یہ وہی کاغذات تھے جو کورا اجنتا سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ بابر کی ہمت جواب دے گئی۔ ایک دن کرشنا نے اُسے دیکھ لیا۔ کرشنا نے بھائی کی طرح اُس کی خیر کی۔ بابر جولین سے دکھاوے کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ چمپابائی بھی وہیں موجود تھی۔ کرشنا کو قتل کر دیا گیا۔ وہ اپنی تمام جائداد، نقدی وغیرہ نام کر گیا تھا، مگر بابر پر خون سوار تھا۔ بابر کی دیوانگی سے خوف زدہ ہو کے چمپا بیگم نے کلکتے میں چنچل کو مطلع کر دیا۔ چنچل کو کرشنا کے قاتلوں پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ بابر کے سینے کی آگ بجھی تو اُس نے کورا کی تلاش میں نکل جانا چاہا۔ چنچل اُس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ دونوں ساتھ پر روانہ ہوئے اور شہر شہر بھٹکتے رہے۔ نہ مولوی صاحب ملے نہ بابر کے والد، البتہ حیدرآباد میں بابر کو اپنا چھوٹا بھائی جہاں گیر مل گیا۔ چنچل جہاں گیر کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تو خانم بہت دل گیر ہوئی۔ چند روز فیض آباد ٹھیر کے چنچل اور بابر پھر در در کی خاک چھان کھڑے ہوئے اور جیسلمیر شہر میں خدا خدا کر کے انھیں مولوی شفیق کا کچھ سراغ ملا۔ ایک رات مولوی صاحب اور کورا پُراسرار طور پر غا ہوگئے۔ کرشنا نے اپنی زندگی میں سارے ہندوستان کی پولیس کو ایک خط روانہ کیا تھا کہ بابر کے والد کے حلیے کا کوئی شخص نظر آئے تو مط کیا جائے۔ فیض آباد میں بابر کو کرشنا کے دستِ راست ایس پی شکلا کا خط ملا کہ بابر کے والد جیسا ایک شخص آسام میں دیکھا گیا ہے۔ چنچل اور تبت پہنچ گئے اور کورا کے دیس میں سفر کی ساری اذیتوں کا ازالہ ہوگیا۔ بدھ بھکشو کے روپ میں بابر کے والد جانگ قبیلے کی خانقاہوں میں مو تھے۔ اُنھوں نے کورا کے لائے ہوئے کاغذات کے اسرار دریافت کرنے میں ایک عمر صرف کر دی تھی۔ گھر بار سبھی کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کاغذا میں صدیوں پرانے دفینوں کے نقشے بھی تھے۔ صفدر زماں آخرِ کار دفینے تک پہنچ گئے تھے، لیکن اِدھر ایک اور گم شدہ خزانہ خود اُن کے پاس پہنچ اپنے بیٹے بابر کو دیکھ کے اُن کی کمر سیدھی ہوگئی، تاہم وہ مدفون خزانے کے بغیر واپس جانے پر رضامند نہیں تھے۔ سب نے اُن کا ساتھ دیا اور خانے چند روز میں کھود ڈالے جن کے لیے اکیلے صفدر زماں کو جانے کتنی مدت لگ جاتی۔ واپسی کے سفر میں اُن کے پاس زر و جواہر سے بھرے صندوق تھے۔ اس دولت کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔ واپسی کا سفر آسان نہیں تھا، جانگ قبیلے کے لوگ راستے کی دیوار بن گئے۔ وہ اُن سے لڑتے بھڑتے، سنگ لاخ پہاڑی راستے عبور کرتے ہوئے ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوگئے۔ اِس سفر میں کئی آدمی کام آگئے۔ کلکتے میں ایک روز قیام کے بعد وہ سب فیض آباد آگئے۔ زرّیں کی حویلی میں میلا سا لگ گیا۔ بابر کے والد کے لیے یہ حیرت آمیز خوشی مستزاد تھی کہ حویلی میں اُن کا دوسرا بیٹا جہاں گیر بھی موجود ہے۔ خزانے سے لدے ہوئے صندوق زرّیں کی حویلی کے تہ خانے میں محفوظ کر کے وہ بمبئی روانہ ہوئے۔ بمبئی آ کے یہ قافلہ ایک سہ منزلہ مکان کے سامنے ٹھیرا۔ دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے بابر کا دل دھڑک رہا تھا۔ مدتوں کے بچھڑے ہوئے بھائی بہن مولوی اکرم نامی ایک بزرگ کی نگرانی میں وہاں رہتے تھے۔ وہ منظر سب کے لیے دیدنی تھا۔ فرخ، فریال، فارہہ اپنے کڑیل بھائی کو چھو چھو کے دیکھتی تھیں اور آنسو بہاتی تھیں۔ چھوٹے بھائی اکبر کا بھی یہی حال تھا۔ گھر کے سارے افراد امرا کی بستی میں بابر کے والد کی خریدی ہوئی محل جیسی کوٹھی میں منتقل ہوگئے۔ اُدھر حیدرآباد سے نواب ثروت کے خط نے بابر کو مضطرب کر دیا۔ نواب نے لکھا تھا کہ مولوی محمد شفیق حیدرآباد واپس آگئے ہیں۔ چنچل نے حیدرآباد روانگی کا اعلان کر دیا۔ اُس نے جمرو اور زورا کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ حیدرآباد پہنچ کر وہ نواب ثروت کی طرف روانہ ہوئے۔ صرف چنچل اور بابر کوٹھی میں داخل ہوئے۔ نواب کی پذیرائی اندھیرے میں روشنی کے مترادف تھی۔ جھجکتے ہوئے آخر اُس

لوی صاحب کی حیدرآباد میں موجودگی کا اقرار کرتے ہوئے بتایا کہ مولوی صاحب شہر سے دور اُس کی زمینوں والے مکان میں ٹھیرے ہیں۔ رات ہو چکی تھی۔ نواب نے دوسرے دن صبح روانگی کا ارادہ ظاہر کیا۔ دوسرے دن صبح مقررہ وقت پر وہ نواب کے ہاں پہنچ گئے۔ جمرو کو ہدایت کی گئی کہ وہ نواب کو تعاقب کا احساس دلائے بغیر موٹر میں پیچھے پیچھے چلتے رہیں۔ آدھی رات کو مسلح آدمیوں نے یلغار کی اور اُن کو گھیر لیا۔ نواب ثروت یار کو معلوم نہیں تھا کہ چنچل اور بابر کے دست و بازو میں کیسا زور ہے۔ وہ حملہ آوروں پر غالب آگئے اور نواب اپنے ہوئے حملہ آوروں کی زد پر آ کے بُری طرح زخمی ہوگیا۔ چنچل اور بابر اُسے شہر واپس لے آئے اور شکستہ حالت میں اُس کے خاندانی ڈاکٹر کر کے اپنے ہوٹل لوٹ آئے۔ تیسرے دن نواب اپنے آپ سے ہار گیا۔ دمِ واپسیں اُسے کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تھا کہ اُس نے ڈاکٹر اعتراف کیا کہ اُسے اپنی بدطینتی کی سزا ملی ہے۔ اُسے یقین دلایا گیا تھا کہ بابر زماں کی موت ہی کورا کے دل سے اُس کا نقش مٹا سکتی ہے، سو یہ بہیمانہ طور اختیار کرنے کی ٹھانی۔ وہ کورا کو بہ ہر قیمت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے دن رات کو چنچل اور بابر نواب کی خیر خیریت لینے لیے ڈاکٹر کے گھر پہنچے تو وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نواب کی لاش اُس کے گھر لے جائی جا چکی تھی۔ چنچل کی ہدایت پر زورا نواب ثروت کے گھر اُس کے ڈرائیور کو پکڑ لایا۔ اُس سے معلوم ہوا کہ وہ از خود مولوی صاحب کے گھر گیا تھا۔ مولوی صاحب نے کرید کرید کے سارا واقعہ ڈرائیور نے نواب ثروت کے ساتھ جانے والے دو آدمیوں کا ذکر بھی اُن سے کیا تھا۔ اُسے توقع تھی مولوی صاحب اپنے مربی نواب کی پرسش کے لیے دوڑے دوڑے آئیں گے۔ وہ نہیں آئے۔ وہ آتے بھی کیسے۔ اُنھوں نے تو نواب کے ساتھ بابر اور چنچل کی موجودگی سنتے ہی اسباب باندھ لیا ہوگا۔ چنچل اور بابر نگریا سادات آگئے اور ایک اوسط درجے کی حویلی کے دروازے پر دستک دی۔ حویلی کے مالک عبدالخالق نے دو ٹوک لفظوں میں مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا، مگر چنچل اور بابر کی وحشت، اُن کا عزم دیکھ کے آخر زبان کھولنی پڑی۔ بابر اور چنچل اُسی رات وہاں سے چل پڑے۔ لیکن ابھی اور حادثے اُن کے منتظر تھے اور وہ پولیس کو مطلوب ہوگئے پولیس نے کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے گو انھیں آزاد رکھا تھا، لیکن فیض آباد سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ بیس بائیس روز بعد یہ کہیں ختم ہوئی، پھر حویلی کے مکینوں کو اُداس چھوڑ کے مولوی شفیق اور کورا کی تلاش میں وہ سفر پر روانہ ہوگئے۔ گاڑی ابھی چالیس میل دُور آئی تھی اور اکبر پور جنکشن رکنے والی تھی کہ انجن کی خرابی سے جھٹکے لینے لگی۔ بہت سے مسافر زخمی ہوگئے۔ خوابیدہ چنچل کا سر بھی جھٹکوں سے کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ اُس کی حالت بہ تدریج خراب ہوتی گئی اور سفر ملتوی کر کے انھیں پٹنا شہر رُکنا پڑا۔ پہلے ایک ہوٹل میں اُنھوں نے کمرا لیا، پھر اسپتال کا رُخ کیا۔ اسپتال میں چنچل کی حالت اور خراب ہوگئی۔ نرس نے بتایا کہ چنچل کے سر کی جلد بری طرح حاکر ہوئی ہے، وہیں دمن ہے اور سر کھولنے کی ضرورت نہیں۔ دو دن بعد آخر ڈاکٹر نے چنچل کو گھر جانے کی نوید سنا دی۔ پولیس کی نگرانی میں انھیں اسٹیشن لایا گیا جب تک گاڑی چل نہ پڑی، پولیس اُن کے آس پاس منڈلاتی رہی۔ عیادت کے لیے صبح و شام اسپتال آتے آتے میدا کے اچانک غائب جانے کا عذر چنچل نے بہ اکراہ تسلیم کر لیا تھا اور چپ رہا تھا، لیکن اب روانگی کے وقت بھی میدا کی غیر حاضری، دو دن سے اڈّے جانے کے بجائے اسپتال میں قیام، آئی جی کی طرف سے گل دستہ، سڑکوں کا سناٹا، جگہ جگہ پولیس کا گشت، یہ سارے مظاہر چنچل کے لیے تشویش کا باعث چاہیے تھے۔ زورا، جامو اور بابر کو اِس کا احساس تھا، مگر گاڑی کے حرکت میں آ جانے کے بعد ہی اُنھوں نے زبان کھولی اور چنچل کی بیماری کے دوران پیش آنے والے سانحوں سے آگاہ کیا تو چنچل بہت حیران ہوا، پشیمان اور آزردہ بھی۔ اُس نے بابر کو بانہوں میں بھینچ کے اڈّے کا قیام نہایت مختصر تھا، دو راتیں، ایک دن۔ زورا اور جامو کو کلکتے چھوڑ کے بابر اور چنچل مشرقی اور مغربی بنگال کی مختلف بستیوں کی خاک چھانتے ہوئے ڈھاکے پہنچ گئے، اور کسی جگہ شہر کے اڈّے کے ایک آدمی سے اُن کا آمنا سامنا ہوگیا۔ وہ شابے تھا، چنچل کا شابے ضد کر کے انھیں اڈّے پر لے آیا۔ یہاں ملہاری نامی ایک شخص عرصے سے چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بنیادی طور پر ساز و آہنگ سے اُس تھا۔ چنچل نے ایک پختہ کار کے مشورے سے شابے کو چوکی پر بٹھایا اور ملہاری کی ساز و آہنگ کی دنیا میں واپسی کا اعلان کر دیا۔ بالاخانے لڑکیاں چمپا اور چندا مچل گئیں۔ اُن کا اصرار تھا کہ ملہاری ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ ملہاری نے دو کی یکجائی پر اعتراض کیا۔ لیکن اور چمپا نے اُسے آپس کے ایثار کا یقین دلوایا۔ چنچل کی ایما پر چندا اور چمپا کو بھی ملہاری کے ہمراہ کر دیا گیا۔ ہم وہاں سے کلکتے پہنچ گئے۔ کے آنے کی اطلاع ملتے ہی اڈّے پر کہرام مچ گیا۔ حاضری کے لیے ہجوم اُمڈ پڑا۔ میں نے نصیب میاں سے اُن کے خاص پانوں کا تذکرہ وہ مجھے لے کے سوناگاچھی پہنچ گئے، جمرو اور زورا بھی ہمراہ تھے۔ وہاں ہمارا سامنا ایک خود عبارت دیوانے سے ہوا۔ اُس کے بارے میں تھا کہ وہ کسی کو در خورِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ شخص مرتعش ہوگیا۔ مجھے سینے سے لگایا، میرے ہاتھوں کو مس کیا اور بوسہ دیا۔ نصیب نے اُس کا یہ عمل دیکھ کے میری مراد بر آنے کا مژدہ سنایا۔ راہ چلتے ہم گلاب بانو کے بالاخانے پر چڑھ گئے۔ بالاخانہ اُس رات کلکتے میں

نو وارد ساہوکاروں کے لیے وقف تھا۔ زورا گلاب بانو سے اڑ گیا۔ وہ مجبوراً ہمیں اندر لے گئی۔ ہمیں دیکھ کے ایک نوجوان ساہوکار بپھر اٹھا نے تمنچہ نکال لیا۔ میں نے بمشکل بات سنبھالی اور ان تینوں سمیت اڈے پر واپس آ گیا۔ ساہوکاروں کو ہمارے متعلق علم ہوا تو وہ گھبرا گئے اور کے دیرینہ واقف کار سابق پولیس افسر کے ہمراہ اڈے پر معافی کے خواستگار ہوئے۔ بٹھل تمام معاملے سے بے خبر تھا۔ گلاب بانو بھی سر پیٹتی گئی۔ بٹھل نے وہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔ چند روز کلکتے میں قیام کے بعد بٹھل ہمیں لے کے نکل کھڑا ہوا۔ زورا اور جمرو بہ اصرار ہمارے ساتھ ہو گئے۔ ہم لکھنؤ، گورکھ پور، فرخ آباد، ہردوئی کے شہروں میں گھومتے رہے۔ مختلف شہروں اور بستیوں کی خاک چھانتے پچیس روز میں دلی آ پہنچے۔ دلی کے اطراف میں گنجان آباد شہروں اور قصبوں کو کھنگالتے ہوئے ہم جودھ پور اور باڑمیر کے علاقے میر پور خاص آ گئے۔ وہاں حیدرآباد، ٹھٹھہ اور سجاول ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ کراچی سے ہم بمبئی کے لیے بحری جہاز پر سوار ہو گئے۔ جہاز انگلستان سے آ رہا تھا۔ جہاز میں ہماری ملاقات انگریز تحقیق دان پروفیسر تھامسن سے ہوئی۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کی کمزور پڑتی گرفت کے اسباب جاننے نکلے تھے۔ ہمیں انگریزوں کے لیے مخصوص ریستوران میں لے گئے، وہاں ہماری ملاقات حسین و جمیل مایا سے ہوئی۔ مایا کی ماں ہندوستانی تھی اور باپ انگریز تھا۔ وہ اپنے شوہر میجر برنارڈ کے ساتھ بمبئی جا رہی تھی۔ پروفیسر تھامسن بابر سے گفتگو کر کے مرعوب ہو گیا تھا۔ مایا بھی بابر سے بے حد متاثر ہوئی وہ ریستوران میں کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک مایا کا شوہر میجر برنارڈ وہاں آ موجود ہوا۔ وہ ریستوران میں ہندوستانی لوگوں کو دیکھ کے سخت مشتعل ہو گیا اور پروفیسر تھامسن سے ہندوستانیوں کو فی الفور باہر نکالنے کا کہا۔ مایا اور پروفیسر تھامسن نے اُسے سمجھانا چاہا، لیکن بابر نے جھگڑے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور از خود وہاں سے اُٹھ کے چلا آیا۔ زورا اور جمرو طیش میں آ گئے تھے۔ بابر طیش میں بھرا ہوا عرشے پر پہنچا وہاں بٹھل طمانیت اور خوش اطواری سے بیٹھا تھا۔ بابر نے اندازہ لگایا کہ اُسے بمبئی والے گھر پہنچنے کے خیال سے شاداں تھا۔ بابر نے میجر برنارڈ سے الجھنے کا خیال ترک کر دیا۔ رات کے خاموش پہر میں مایا بابر سے معذرت کرنے چلی آئی۔ وہ فرطِ جذبات سے بابر سے لپٹ گئی۔ اس دوران مایا کا شوہر میجر برنارڈ اپنے دوست کے ہم راہ وہاں آن پہنچا۔ برنارڈ نے طمنچے کی زد پر بابر کو جہاز سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ بٹھل بابر کی بے چینی سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کشمکش کے دوران وہ نزدیک ہی تھا۔ بٹھل نے میجر برنارڈ پر حملہ کر کے اُسے بے دست و پا کر دیا، لیکن ان کے لیے صورتِ حال انتہائی مخدوش ہو گئی تھی۔ انھیں جلد یا بدیر گرفتار ہی ہونا تھا۔ اسی اثنا میں کاٹھیاواڑ کے نام ور ڈاکو کرانتی کار باروٹیہ کے سیکڑوں مسلح افراد جہاز پر چڑھ آئے اور انھوں نے جہاز پر قبضہ کر لیا۔ باروٹیہ کے آدمیوں نے کمال انتظام سے جہاز کے سرکردہ انگریزوں کو باندھ کے کشتیوں میں ڈال لیا۔ جہاز پر موجود ایک مخبر نے غلط فہمی سے بابر کو انگریزوں کا گماشتہ بنا دیا جس پر باروٹیہ نے بابر کو بھی جہاز سے اتارنے کا حکم دے دیا۔ بٹھل کی مداخلت پر باروٹیہ نے اُسے بھی زورا اور جمرو سمیت جہاز سے اتار کے کشتیوں میں ڈلوا دیا۔ گھنٹا بھر مسافت کے بعد کشتیاں ساحل سے جا لگیں وہاں بابر، بٹھل، زورا، جمرو سمیت سو کے لگ بھگ انگریز مغویوں کی مشکیں کس کے انھیں بوریوں میں ٹھونس دیا گیا۔ ان بوریوں سے لدا چالیس کے لگ بھگ چھکڑوں پر مشتمل قافلہ ساحل سے نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔ بابر بوری میں بنائے گئے جھروکے سے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ چھکڑے جنگل سے نکل کر ایک قصبے کی بیرونی سڑک سے گزرے۔ وہاں مسافر لاری پر سوار ہو رہے تھے، اسی لمحے بابر نے اپنی زندگی کا حاصل منظر دیکھا۔ مولوی شفیق، کورا کے ہم راہ لاری میں سوار ہو رہے تھے۔ بابر کے ساتھ لدی ہوئی بوری میں وائسرائے ہند کا معتمد خاص لیونارڈ جکڑا پڑا تھا۔ بابر نے اُس کی مدد سے رسیاں کاٹنے کی جدوجہد شروع کر دی، جو بالآخر ایک صبر آزما کشمکش کے بعد کام یاب ہوئی، تاہم بابر کے تلوے پر گہرا زخم آ گیا۔ بابر لیونارڈ کے ہم راہ چھکڑے سے گھنے جنگل میں کود گیا، لیکن زخم سے مسلسل بہتے خون کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ لیونارڈ نے وفاداری کا تقاضا بہ خوبی نبھایا۔ بابر کو جب ہوش آیا تو وہ درخت کے تنے سے لگا بیٹھا تھا اور لیونارڈ جنگلی پھلوں کا رس اُس کے مُنہ میں ٹپکا رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایک شیر ببر نے لیونارڈ پر حملہ کر دیا۔ بابر کا چاقو آنکھ کو چیرتا ہوا شیر کے دماغ تک جا گھسا، جس سے موذی مارا گیا۔ کئی روز تک چلتے گھسٹتے ایک بستی میں پہنچ گئے جہاں چھلیا نامی ایک بدمعاش نے بابر کو گھیر لیا۔ وہ باروٹیہ کا خیر خواہ تھا، اور پورے کاٹھیاواڑ کا نامی گرامی ناقابلِ شکست چاقو باز۔ بابر نے چھلیا کو معمولی مقابلے کے بعد بے دست و پا کر دیا۔ جس پر چھلیا اُس کا بے دام غلام ہو گیا۔ چھلیا نے بابر کو بتایا کہ بابر کی موت کی اطلاع پر اُس کا ساتھی بٹھل مشتعل ہو گیا۔ بٹھل باروٹیہ کو ہلاک کر کے جنگل میں روپوش ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک انگریز خاتون مایا اور اُس کا ایک ساتھی ہے جب کہ جمرو ہلاک ہو چکا ہے۔ تمام انگریز مغوی ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ چھلیا بٹھل کی کھوج میں نکل پڑا۔ بابر لنگو اور دھیارا کے ہم راہ بستی کا جائزہ لینے نکلا۔ بھوا مہاجن نامی ایک ساہوکار نے اُسے اپنی دکان میں بصد اصرار بلا لیا۔ اُس کی دکان ہمہ قسم کے ساز و سامان سے بھری ہوئی تھی۔ وہاں بابر کو شیشے کے ایک نمائشی صندوق میں ایک نادر و نایاب موتی نظر آیا۔ یہ موتی ہو بہو کورا کی دی ہوئی مالا میں پروئے موتیوں جیسا تھا۔ بابر موتی دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اُس نے بھوا سے موتی کی بابت دریافت

بھوا نے بابر کو بتایا کہ یہ موتی اُس نے دلواڑا شہر میں ایک مولوی صاحب سے خریدا ہے۔ بابر کی مزید کرید پر بھوا مہاجن محتاط ہو گیا اور مزید پہلو تہی کرنے لگا۔ بابر طیش میں آ گیا اور بھوا کو مار مار کر اُس کا برا حال کر دیا۔ بھوا کی دکان سے باہر بستی والوں کا ہجوم پڑ گیا۔ آخر بھوا نے ہار مان لی اور اُس نے بابر کو بتایا کہ مولوی صاحب دلواڑا کے تاجر شاکر بھائی کے ہاں مقیم ہیں۔ بھوا مزید گفتگو کے لیے بابر کو دکان کے عقبی گودام میں لے گیا۔ بھوا نے بابر کو بتایا کہ دلواڑا میں وہ اپنے دوست حسین والا کی دکان میں بیٹھا تھا، مولوی صاحب حسین والا کے شاکر بھائی کی وساطت سے آئے۔ انھوں نے یہ موتی انتہائی ارزاں داموں میں فروخت کیا تو بھوا چونک گیا۔ بھوا نے حسین والا سے منت کر کے موتی خرید لیا اور سیدھا شاکر بھائی کے پاس جا پہنچا۔ موتیوں کی بابت سن کے شاکر بھائی کے منہ میں پانی آ گیا۔ اسے اس بارے علم نہ تھا۔ شاکر بھائی دوڑا دوڑا مولوی صاحب کے حجرے پر پہنچا تو وہ اپنی صاحب زادی کو دوا دلوانے کے لیے نکل رہے تھے، جو خاصی بھوا نے فوراً اپنی موٹر پیش کر دی۔ راستے میں دو ایک مرتبہ اُس نے مولوی صاحب کی صاحب زادی کا چہرہ کیا دیکھا دیوانہ ہو گیا اور بھول گیا۔ شاکر بھائی نے بھوا کو دھمکی دی کہ وہ دوبارہ مولوی صاحب کی طرف نظر نہ آئے، لیکن جب بھوا دیوانگی کے ہاتھوں مجبور آتا رہا اور ایک دن جب بھوا مولوی صاحب سے مزید موتیوں کا سودا کر رہا تھا تو شاکر بھائی آن پہنچا اور غنڈوں کی مدد سے اسے خانے میں بند کر دیا۔ اور بھوا کو پیش کش کی کہ وہ مسلمان ہو جائے تو اُس کی شادی مولوی صاحب کی صاحب زادی سے کروائی جا سکتی بھوا کچھ دن کی سوچ بچار کے بعد مسلمان ہونے پر تیار ہو گیا، لیکن اُسی دن مولوی صاحب کہیں چلے گئے۔ بھوا کو شک تھا کہ شاکر بھائی نے کہیں چھپایا ہے۔ بھوا نے بابر کو بتایا کہ اُس نے بابر کو اسی لیے بلایا تھا۔ اگر بابر شاکر بھائی سے مولوی صاحب کو برآمد تو منہ مانگے دام دے گا۔ بابر کے جوابی رویے سے بھوا نے وہ کچھ سمجھ لیا جو بابر کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ بھوا نے اسی وقت خود کو چھرا گھونپ اسی وقت وہاں پولیس پہنچ گئی۔ انسپکٹر اجیت نے بابر کو بھوا کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ کئی روز تک بابر بھوکا پیاسا تھانے میں بند ان پولیس کے بڑے افسر نے اُسے بلوایا اور کہا کہ اسے دلی سرکار کی سفارش پر رہا کیا جا رہا ہے، تاہم پولیس کو بٹھل کی تلاش ہے۔ بھوا ہوئے اپنا کل مال و متاع بابر کو سونپ گیا ہے۔ اگر بابر دلی سرکار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ان کی ریاست کے لیے کچھ آسانیاں سکتا ہے تو بٹھل کو جانے دیا جائے گا، بہ صورتِ دیگر بٹھل ریاست سے نہیں نکل سکتا۔ بابر رہا ہو کر باہر نکلا تو چھلیا، رگھو، لنگو اور دھیارا وغیرہ استقبال کیا۔ رگھو کے ڈیرے پر بٹھل کو دیکھ کے بابر کے درد کا گویا مداوا ہو گیا۔ بٹھل نے اُسے بے طرح مارا پیٹا۔ پھر بابر کو گلے لگا کے ہو گیا۔ رات بابر رگھو کے کمرے میں اس کی بپتا سن رہا تھا کہ شور مچ گیا۔ پولیس نے اڈے کو گھیرے میں لے کر چھاپا مارا تھا۔ چھلیا کے چور راستے سے باہر نکل گیا۔ پولیس نے انسپکٹر اجیت کی سرکردگی میں چھاپا مارا تھا۔ اڈے کا دروازہ کھلتے ہی پولیس اڈے میں لے کر پل پڑی۔ اڈے کے آدمیوں پر بہیمانہ تشدد کیا گیا۔ پورے اڈے کی تلاشی لی گئی۔ بٹھل کو غائب پا کر انسپکٹر اجیت سیخ پا ہو گیا۔ باہر سے اطلاع آئی کہ بٹھل چھلیا اور دیگر افراد کو فرار ہوتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ بابر زماں نے انسپکٹر اجیت کی گردن پر چاقو بٹھل کے اندر بلوانے کا مطالبہ کر دیا۔ اور تمام سپاہیوں کو غیر مسلح کر دیا۔ بٹھل جب اندر آیا تو بابر طیش میں آ گیا۔ اس نے اس اقدام کو قرار دیا۔ بٹھل کے کہنے پر بابر نے اجیت کو چھوڑ دیا اور سپاہیوں کی بندوقیں لوٹا دی گئیں۔ انسپکٹر اجیت نے بٹھل کو دیکھا تو شپٹا اس کی ترشی یک دم نرم خوئی میں تبدیل ہو گئی۔ انسپکٹر اجیت نے بٹھل کی ہتھکڑی کھلوا دی اور اسے تھانے لے آیا۔ تھانے میں اس نے کہ وہ بچپن میں بٹھل کو چاچا کہتا رہا ہے اور بٹھل کے استادوں میں سے ایک استاد شرلی رام کا بیٹا ہے۔ شرلی رام برسوں پہلے کلکتے کی سے دل ہار بیٹھا تھا۔ وہ استانی اسے اڈوں کی دنیا سے دور یہاں دلواڑے میں لے آئی تھی۔ اجیت نے بٹھل کو گھر لے جانے پر اصرار بٹھل نے انکار کر دیا کہ وہ اس کی ماں کے چہرے پر تردد نہیں دیکھنا چاہتا۔ اجیت مہربان ہوا تو بابر اور بٹھل پر دلواڑا میں تمام راستے آسان بابر اگلی صبح شاکر بھائی کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اسے پتا چلا شاکر بھائی بمبئی جا چکا ہے اور اپنے دوست راج پٹیل کے بنگلے میں مقیم راج پٹیل کو کھوجتا ہوا اس کی مل تک پہنچا اور وہاں سے اس کے گھر۔ راج پٹیل لکشمی کا باپ تھا، وہی لکشمی جو رگھو کو مطلوب تھی۔ لکشمی بابر کو دل فرشِ راہ کے مصداق ہو گئی۔ لکشمی نے بابر کو اپنی ماں سے ملوایا اور اپنا وعدہ یاد دلوایا۔ بابر لکشمی کو اڈے پر لے آیا اور رگھو کو مقابلے ارا۔ اڈے میں سبھی ہڑبڑا اٹھے۔ اڈے سے ایک معمر شخص بارو دادا طیش میں مقابلے پر آ گیا۔ اسے گمان تھا کہ چھلیا، بٹھل اور بابر کر رہا ہے۔ بارو دادا نے بابر کے بجائے بٹھل کو مقابلے کے لیے للکارا۔ چھلیا بپھر گیا، تاہم بٹھل کے بھڑکنے پر چپ سادھ لی۔ بٹھل دادا کے تمام وار نہایت آسانی سے خطا کر دیے اور دانستہ بارو دادا کو ضرب پہنچانے سے گریز کیا۔ بٹھل نے جب چاقو کے بغیر لڑنے کا تو بارو دادا شرم سار ہو کے بٹھل کے پاؤں پڑ گیا۔ اس کے بعد رگھو نے پھر بابر کو للکارا۔ عین مقابلے کے دوران بابر پر انکشاف ہوا کہ

رگھو جان بوجھ کے اس کے چاقو کا نشانہ بننا چاہتا ہے۔ بابر نے رگھو کو گلے سے لگا لیا۔ جھمل اب تک اس تمام معاملے سے لاعلم تھا۔ وہ رگھو کی فروشی سے متاثر ہوا اور لکشمی کا رشتہ مانگنے سیٹھ راج پٹیل کے گھر پہنچ گیا۔ خاصی گفتگو اور جرح کے بعد سیٹھ راج پٹیل لکشمی کا رشتہ رگھو کو دینے پر آمادہ ہوگیا۔ اس خوش خبری کے ساتھ یہ لوگ اڈّے پر واپس پہنچے تو شان دار جشن منایا گیا۔ مٹھائی تقسیم کی گئی۔ بابر رگھو کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھا جب یہ اطلاع ملی کہ لکشمی اٹیچی کیس کے ہمراہ گھر سے بھاگ کے اڈّے پر آگئی ہے۔ بابر باہر آیا تو لکشمی کھڑی بلک رہی تھی۔ اس پر سراسیمگی طاری تھی۔ جھمل نے اسے تسلی دی۔ استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کے بھائیوں نے رشتہ ماننے سے انکار کر دیا تھا اور رگھو سے نمٹنے کے لیے کسی اجرتی قاتل سے مدد لینے کی کوشش کی تھی۔ جھمل نے اسے سمجھانا چاہا کہ وہ ماں باپ اور بھائیوں کی بات مان لے مگر وہ دوبارہ گھر نہ جانے کا تہیہ کر کے آئی تھی۔ دیپک اس کے لیے راکھشس سمان تھا اور وہ اسی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی تھی۔ جھمل نے لکشمی کے پتا سے آخری بات کرنے کا فیصلہ کیا اور چھلیا سے موٹر لانے کو کہا۔ سب سیٹھ راج پٹیل کی کوٹھی پہنچے تو پہرے داروں اور کتوں نے ان کا استقبال کیا۔ ایک پہرے دار نے لکشمی کو چھوڑ کر، باقی لوگوں کو واپس جانے کو کہا مگر جھمل کی درشتی نے اسے خاموش کر دیا۔ گفتگو شروع ہوئی تو سیٹھ نے بیٹوں کے آگے اپنی بے بسی کا رونا رویا۔ جھمل نے سیٹھ کو علیحدہ لے جا کر حقیقت بتائی۔ وہ واپس آئے تو جھمل کے چہرے پر اطمینان تھا جبکہ سیٹھ کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ آتے ہی جھمل نے تیزی سے مختلف احکامات جاری کرنا شروع کر دیے۔ مجھے شری رام کے ساتھ جانا تھا۔ شری رام مجھے لے کر اجیت کے گھر پہنچے۔ وہاں سے اجیت ہمیں لے کر اپنی ماں کے گھر گیا۔ اس دوران میں میری حرارت، تیز بخار میں بدل چکی تھی۔ میں سونے جاگنے کے عالم میں لکشمی کی شادی کے معاملات طے ہوتے اور آگے بڑھتے دیکھتا سنتا رہا۔ بالآخر اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا، دوسرا دن چڑھ چکا ہے۔ دھیارا میرا سر دبا رہا تھا۔ مجھے ہشاش بشاش دیکھ کر سب کے چہروں پر رونق آگئی۔ معلوم ہوا کہ سب کچھ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا ہے اور اب جھمل آمادۂ روانگی تھا۔ سب نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ میرا سفر کورا کے تصور میں کٹا کہ کاش، میں گھر پہنچوں تو وہ موجود ملے۔ حویلی پہنچے تو اندازہ ہوا کہ اباجان نے خاصے شاہانہ ٹھاٹ باٹ اپنا لیے تھے۔ سب روایتی محبت اور اپنائیت سے ملے۔ اگلے روز کھانے کے بعد اباجان مجھے باہر لے آئے جہاں بکرا منڈی کا سا سماں تھا۔ وہ بکرے صدقے کے لیے لائے گئے تھے۔ ایک مولوی صاحب بھی موجود تھے۔ اباجان نے ان سے میرا تعارف کرایا اور ہمیں چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ مولوی صاحب نے اباجان کو یہ باور کرایا تھا کہ مجھ پر بد اثرات کا سایہ ہے۔ مولوی صاحب نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ میں طرح دیتا رہا۔ لیکن جب اس نے کورا کی شان میں گستاخی کی تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اپنے اندر مچلنے والی اس خواہش پر کہ گل دان اس پر دے ماروں، عمل کر بیٹھا!

میں نے ہاتھ ہلکا رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مولوی صاحب کے لیے وہ بھی بہت کافی ثابت ہوا۔ انھیں اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ میں اپنے بستر پر سوچوں میں غلطاں پڑا تھا۔ اباجان نے اسپتال سے واپسی پر مجھے بھی عیادت کے لیے اسپتال جانے کی تاکید کی۔ مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ مولوی نے اباجان کو اپنے چنگل میں لیا ہوا ہے۔ میں انھیں اس کے چنگل سے نکالنے کے طریقوں پر غور کر رہا تھا۔ اسی دوران میں دو مرتبہ بلاوا آچکا تھا کہ اندر سب لوگ مجھے یاد کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں جگنو اکیلا واپس آگیا۔ جھمل، زوروا اور جمرد کے بارے میں استفسار پر اس نے بتایا کہ جھمل کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ میں جگنو کو لے کر فوری طور پر گھر سے نکلا۔ راستے میں ایس پی شکلا مل گیا۔ وہ میرے گھر سے ہو کر ہی آرہا تھا۔ اس نے مجھے فوراً گھر لوٹنے کو کہا اور وعدہ کیا کہ جھمل کو رہا کرانا اس کی ذمے داری ہے۔ میری بھلائی کی خاطر اس نے مجھے فوری طور پر فیض آباد جانے کا مشورہ دیا۔ بعد میں جھمل کو بھی وہیں پہنچنا تھا۔ میں زوروا اور جمرد کی معیت میں فیض آباد روانہ ہوا۔ تمام راستے آنکھوں میں کورا مچلتی رہی۔ فیض آباد میں سب ہی چشم براہ تھے۔ ایس پی شکلا نے مجھے تاکید کی تھی کہ فیض آباد کے ڈی ایس پی سریندر کپور سے ضرور ملوں۔ وہ بہت کام کا آدمی ہے۔ میں اس سے ملا۔ وہ واقعی بہت نڈر اور بے باک آدمی لگا۔ اس نے مجھے اپنے نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ کوئی بھی کام ہو، بلا ہچکچاہٹ اس سے رابطہ کروں۔ جھمل فیض آباد پہنچا تو اس کے ساتھ ایس پی شکلا کا ایک خاص آدمی بنرجی بھی تھا۔ اس دبلے پتلے آدمی کے بارے میں شکلا جی نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے۔ اگلے روز شکلا جی نے فون کر کے بتایا کہ بلم پور میں کورا اور مولوی صاحب کو دیکھا گیا تھا۔ جھمل نے مجھ سے کہا کہ کہو تو ابھی نکل پڑیں۔ لیکن میں بھیڑ بھاڑ سے بچنا چاہتا تھا۔ اس لیے رات کی تاریکی میں، کسی کو کچھ بتائے بغیر تنہا ہی نکل پڑا۔ بلم پور میں بلوری سے ملاقات ہوئی جس نے رقم کے عوض مولوی کے ٹھکانے کی نشاندہی کر دی۔ میں وہاں پہنچا تو مولوی ایک لاش کی صورت ملا۔ جانگ قبیلے کا کوئی فرد کورا کو لے کر جا چکا تھا۔ شکلا کے آدمیوں کے روکنے کے باوجود میں نے وہاں سے نکلنا چاہا۔ اسی وقت مجھے اپنے بازو میں سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے سوئی نکال پھینک دی۔ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود میں زمین پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

میرے وجود میں صرف کورا کا خیال گونج رہا تھا۔ سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی وہ نازک اور حسین گڑیا جس کے رُخساروں کی سرخی دیکھ کر شفق بھی شرما جاتی، ادھ کھلی کلیاں اُس کی مسکراہٹ کے آگے سر جھکاتیں۔ اس کے تراشیدہ ہونٹ، جھیل جیسی گہری' خمار آلود آنکھیں جو دیکھنے والے پر ستم ڈھائیں۔ قیامت سی رفتاریں جن کے آگے گردشِ مہ و سال لڑکھڑانے لگے۔ دراز پلکیں... کہ بے اختیار جن کے سائے میں عمر تمام کرنے کی تمنا دل میں مچلے۔ ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ جو دل آزمانے پر مجبور کر دے۔ اس کا مخمور وجود جس پر جام و مے کی مستیاں بھی رضا و رغبت سے نچھاور ہونا اپنے لیے اعزاز سمجھیں... وہ غارت گرِ سکون اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے تھی۔ اور جانے کیوں وہ اس وقت بڑی مضمحل اداس اداس نظر آ رہی تھی، کسی خوف سے لرزیدہ وجود... میرا دل اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

کورا کا وہ بدلا ہوا انداز دھوپ کی تپش سے کملایا ہوا چہرہ میرے قلب پر برچھیاں چلا رہا تھا۔ وہ میری زندگی کی سب سے خوب صورت اور جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ پھر میرے ہوتے اسے کس بات کی فکر لاحق تھی؟ کون سے اندیشے اس کے معصوم دل کی نازک دھڑکنوں کو سہا رہے تھے؟ اس کا مرجھایا مرجھایا چہرہ دیکھ کر میرے دل پر بجلیاں کوندنے لگیں... میں قدم مارتا اس کے قریب چلا گیا۔ اتنے قریب کہ اس کے سانسوں کی مہکار میرے ہست و بود کو گرمانے لگی۔

'کیا بات ہے میری زندگی؟ تم اس قدر غمگین اور اداس ہو؟'

میری آواز سُن کر اُس نے مجھے پلٹ کر دیکھا، نازک سی انگلی ہونٹوں پر جما کر مدھم آواز میں بولی۔ 'واپس پلٹ جاؤ بابر، انھوں نے تمھیں دیکھ لیا تو تمھاری جان کے بھی دشمن بن جائیں گے۔ تم بھی میری طرح ان کے عتاب کا نشانہ کیوں بنو! تمھیں ختم کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیں گے۔'

'تم...!' میری آنکھیں ریت سی بھرنے لگی۔ 'کورا... تم کس کی بات کر رہی ہو؟'

'وہی جو میری اور تمھاری جان کے دشمن ہیں۔' اس کی مترنم آواز حلق میں گھٹنے لگی۔ 'تمھارے جاں نثار ساتھیوں کے سبب، ابھی تک وہ دُور دُور رہ کر میرا تعاقب کرتے رہے۔ لیکن... آج ان کا داؤ چل گیا۔'

کورا کی پلکوں پر تھمے تھمے آنسوؤں کے قطروں نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ 'کس کی موت آئی ہے، کون ہے وہ بدبخت جس کی زندگی کے دن پورے ہونے والے ہیں؟' میرے لہجے میں وحشت اور جنون ابھرنے لگے۔

'اپنی کورا کا کہنا مان جاؤ بابر۔' اس کے لبوں پر التجا تڑپ اٹھی۔ 'وہ کوئی غیر نہیں، اپنے ہی ہیں۔ اپنے نہ ہوتے تو دشمنی کیوں کرتے؟'

میرے اندر کا وحشی یک لخت جاگ اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کورا کا کہنا زیادہ غلط بھی نہیں۔ جانگ قبیلے کا ایک شخص کورا پر بُری نظریں جمائے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ خاصا قوی الجثہ تھا۔ کورا جیسی معصوم گڑیا، اُس سے خوف زدہ ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ وہ مجھے کیوں نظر انداز کر رہا تھا؟ ممکن ہے کہ حد سے زیادہ اعتماد اور احساسِ برتری کے سبب اس نے مجھے خاطر میں لانے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی ہو۔ میرا جنون اور فزوں ہوگیا۔ میں نے اس کا گریبان تھام کر اُسے اس بات کا احساس دلانا ضروری سمجھا کہ بابر زماں کون ہے؟ کورا کی خاطر میں پہلے بھی تین قتل کر چکا تھا... اس جرم کی پاداش میں طویل سزا بھی کاٹ چکا تھا... اور اب بھی کسی بھی حد تک جانے سے دریغ کرنے والا نہیں تھا۔

'تم جس کو بے یار و مددگار سمجھ رہے ہو اس کا ایک حمایتی ابھی زندہ ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس لڑکی کے تعاقب سے باز آجاؤ ورنہ میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'

''مسٹر بابر... آنکھیں کھولیں، مسٹر بابر!'' بہت دور سے کوئی آواز آتی محسوس ہوئی۔ ''آپ کو میری آواز آ رہی ہے مسٹر بابر؟'' کسی نے شفیق لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ''میں ڈاکٹر احسان ہوں۔''

یکا یک میں شعور کی سطح پر آ گیا اور میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں

کھول دیں۔ تو گویا وہ محض خواب تھا۔ ڈاکٹر کا گریبان ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے جلدی سے چھوڑ دیا اور اُس کی طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا۔

فوراً ہی میرے ذہن میں گزرے واقعات تازہ ہو گئے۔ گزری باتوں کا ہول ناک تصور میرے وجود کو ڈسنے لگا۔ یہ بھی یاد آ گیا کہ کورا کی تلاش میں بلم پور کے علاقے میں میرے کسی دشمن نے بلوئنگ پائپ کے ذریعے زہریلی سوئی سے میری جان لینے کی کوشش کی تھی۔ ایس پی شکلا کے آدمی نے فائرنگ کی آواز سننے کے بعد کہا تھا، اس کے کسی ساتھی نے خطرے کا سگنل دیا تھا، اس نے کہنے یا شاید میں نے عمل کرنے میں کچھ تاخیر کر دی تھی۔ انجام کار میں اس وقت کسی اسپتال میں پڑا تھا۔ وہ یقیناً جانگ قبیلے ہی کا آدمی رہا ہوگا جس نے میرا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکال پھینکنے کی ٹھان لی ہوگی۔ ایک زمانے تک میں اُن کے اور کورا کے درمیان رکاوٹ بنا رہا۔ میری وجہ سے وہ کورا کے قریب نہیں پہنچ سکے تھے۔ جانگ قبیلے کے ایک شخص کی لاش بھی میں مولوی شفیق کے برابر زمین پر بے گور و کفن دیکھ چکا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم ہوش میں آ گئے۔" ابا جان کی آواز سُن کر میں نے نگاہوں کا زاویہ تبدیل کیا۔ وہ سیورین کے ساتھ کھڑے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں کتنے دنوں سے یہاں ہوں؟" میں نے کم زور لہجے میں سوال کیا۔

"اب پچھلا حساب کتاب لگانے سے کیا حاصل؟" ابا جان نے مجھے ٹالنا چاہا۔ "جب تم اسپتال لائے گئے تو ڈاکٹروں نے بھی مایوسی کا اظہار کر دیا تھا، لیکن میں نا امید نہیں ہُوا۔ ہر لمحہ، ہر پل تمھارے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ میں نے بے شمار منتیں مان رکھی ہیں، تم اسپتال سے فارغ ہو جاؤ، پھر سب مل کر تمھاری صحت مندی کا جشن منائیں گے۔"

میں نے آنکھیں موند لیں۔ ابا جان کے مُنہ سے جشن منانے کی بات سُن کر مجھے کسی خوشی کا احساس نہیں ہُوا۔ کوئی اور ہوتا میری جگہ تو نئی زندگی ملنے کی مسرتیں اسے بے حال کر دیتیں لیکن ... میری زندگی کا ایک سب سے قیمتی جزو کورا بھی تھی جو میرے ہاتھ آتے آتے نکل گئی۔ میں نے جلد بازی سے کام نہ لیا ہوتا تو شاید کورا کے قاتل اس جال میں پھنس جاتے جو شکلا کے تجربہ کار آدمیوں نے پہلے سے بچھا رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بھی ایک ایک کر کے زہریلی سوئیوں کا شکار ہو جاتے۔ کیا ہوتا، کیا نہ ہوتا۔ اب ان باتوں کے سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں

تھا۔ جانگ قبیلے کے لالچ اور ہوس کے مارے لوگ بالآ
مقصد میں کام یاب ہو چکے تھے۔ جانگ قبیلے میں کورا کی
کا خواہاں کوئی غیر نہیں، خود اس کا چچا تھا جو کورا کے والد کی آ
بند ہوتے ہی سردار کی گدی پر براجمان ہو گیا تھا۔ وہ فوری
پر کورا کو درمیان سے ہٹانے کا خواہاں تھا۔

اقتدار کی بھوک، روٹی کی بھوک سے زیادہ تباہ کن
ہے۔ اس بھوک کو مٹانے کی خاطر انسان خونی رشتوں
شناخت کو بھی یک سر نظر انداز کر جاتا ہے۔ وقت کے
ساتھ تبدیل ہونے والے عہد اور تاریخ کے اوراق بھی شاہد
کہ کبھی باپ نے تخت کی خاطر اولاد کے خون سے ہاتھ رنگ
لیے، کبھی بیٹے کی ہوس جاگی تو اس نے باپ کی آنکھوں م
دہکتی سلاخیں پھروا کر زر و جواہر کی چمک دمک دیکھنے سے
محروم کر دیا، زمین دوز زندانوں میں پابندِ سلاسل کر دیا۔

جو زندہ رہا وہ سکندر، جو مر گیا وہ قصۂ پارینہ بن گیا۔ ابا جا
کو بھی خوشی تھی کہ میں موت کو شکست دے کر زندگی کی سم
واپس لوٹ رہا تھا۔ انھیں کورا کا خیال نہیں آیا جو میری خا
اپنی زندگی کی بچی کھچی سانسوں کو سمیٹنے کی امید پر در بدری کی زندگی
گزارنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ میں اس کی خاطر تین آدمیوں کو سر
آخرت پر روانہ کر کے جیل گیا۔ وہ مولوی شفیق کے رحم و کرم
ان کے ساتھ چلی گئی پھر ... مولوی شفیق بھی نوابوں کی محفلوں
چکا چوند دیکھ کر لالچی بن گیا۔ وہ اپنی سوچ کے مطابق ڈگڈگی
بجاتا رہا، کورا دل پر جبر کر کے ناچتی رہی، اسے تعاقب کرنے
والوں کا خطرہ لاحق نہ ہوتا تو یقیناً مولوی شفیق کو غچہ دے کر
میری تلاش میں نکل کھڑی ہوتی۔ ہم کسی نہ کسی موڑ پر ضرور
جاتے، ساری فکرِ امروز و فردا ختم ہو جاتی۔

"مسٹر بابر!" ڈاکٹر احسان جس کی کوششوں نے مجھے زہریلی سوئی کی مہلک پنجوں سے بچایا تھا' اس کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ "آپ کا تعاون میرے لیے ضروری ہے۔ پلیز، اپنے ذہن پر زور نہ دیں، کم زوری بڑھے، قوتِ مدافعت میں کمی واقع ہو تو صرف دوائیں یا انجکشن زیادہ موثر ثابت نہیں ہوتے۔ مریض کو آپریٹ کیا جائے تو حالات مخدوش ہو جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر کی باتیں مجھے فضول لگ رہی تھیں۔ وہ میری زندگی بچانے کے عوض یقیناً ابا جان کی جیب خاص سے بڑی بڑی رقمیں وصول کر چکا ہوگا۔ دولت کی ہوس تو وہ سراب ہے، جس کے تعاقب میں انسان تمام عمر دوڑتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر احسان بھی

کے حصول کی خاطر مجھ سے تعاون کی درخواست
تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ بابر زماں کی زندگی کورا کو پا لینے کی
ے مشروط تھی۔ وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تو
بھی زندہ رہ کر کیا کرتا! میرا بھی مر جانا بہتر ہوتا۔ ایک
سہارے آنکھ مچولی کھیلے چلے جانے کا لامتناہی سلسلہ
ہو جاتا۔ سارے جھگڑے تمام ہو جاتے۔

میرے جاننے والے، میری داستانِ حیات کی ورق گردانی
والے بھی گواہ ہوں گے کہ میرا اور کورا کا کیا رشتہ ہے۔
کی ہوس، زر و جواہرات کی چمک دمک میری نظروں کو کبھی
نہیں کر سکی۔ کرشنا جی نے بھی میری بے لوث خدمت
اپنی تمام جائیداد میرے نام کر دی تھی۔ کرشنا جی کا سب
امداح ایس پی شکلا نے جب مرنے والے کی جائیداد
ذات میرے حوالے کیے تھے، اس وقت بھی میں نے
پیر لیا تھا۔ شکلا نے گلوگیر آواز میں کہا تھا۔

کرشنا جی کی آتما تمھارے فیصلے سے خوش نہیں ہوگی۔
ی ہے کہ تم اسے سویکار کر لو۔ میں تمھیں مشورہ نہیں دوں
تم حکومت کی جانب سے دی جانے والی ان گراں قدر
ے انکار کرو۔ یہ تمھیں نہیں، سورگ باسی کرشنا جی کو ان
شان دار خدمات کے عوض دی گئی ہیں۔ تمھی اس کے مستحق
نے تمھی کو اپنا وارث قرار دیا ہے۔"

میں شکلا جی کے اصرار کے بعد بھی بار بار انکار ہی کرتا رہا...
ری ہوس ہوتی تو حکومت نے کرشنا جی کو درپیش مسائل
میں میری بیش بہا خدمات کو سراہتے ہوئے مجھے پولیس
عہدہ بھی تفویض کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں انکار
واپس چلا آیا تھا۔ اس وقت بھی کرشنا جی کی موت پر کسی
دکھ کا احساس نہیں ہُوا تھا... آج بھی میری زندگی بچ
کے بعد سب کے مرجھائے ہوئے چہرے دمک اٹھے۔
کورا کا دھیان نہیں آیا جو میری زندگی، میری روح، میرا
تھی۔ ابا جان نے بھی میری صحت کا جشن منانے کی
تھی۔ شاید انھیں بھی یاد نہیں ہوگا کہ زرین کی عالی شان
تہ خانے میں جو زر و جواہرات سے بھرے بڑے
وق سب کی نظروں سے چھپا کر محفوظ کیے گئے تھے،
تنی کثیر دولت موجود ہے، وہ کس کی ملکیت تھی؟ خود ابا
اقرار کیا تھا کہ فیض آباد، بمبئی اور دیگر علاقوں میں ان
شان دار حویلیاں موجود تھیں، وہ سب اسی بیش بہا
کی مرہونِ منت تھیں جو کورا کے دم سے انھیں حاصل

ہوئے ... میرے اندر طوفان مچل رہے تھے جب ابا جان کی آواز ابھری۔

"کس سوچ میں گم ہو بیٹے؟"

"مسٹر بابر۔" ابا جان کے خاموش ہوتے ہی ڈاکٹر احسان کی آواز سنائی دی۔ "آپ میرے ساتھ صرف دس دن تعاون کا وعدہ کریں، میں یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بعد آپ کو اسپتال سے رخصت مل جائے گی ..."

میں نے جھنجلا کر آنکھیں کھول دیں۔ "شمل کہاں ہے؟" میں نے سیورین کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"بابا خیریت سے ہیں۔" سیورین میرے قریب آ گئی۔ "برابر کے کمرے میں آرام کر رہے ہیں، رات بھر جاگتے رہے ہیں۔"

"جانتا ہوں، میری وجہ سے وہ بھی ضرور مضطرب ہوگا۔ صرف اپنے ہی اپنوں کی فکر میں پریشان ہوتے ہیں۔" میرے جواب میں زہر کی آمیزش تھی۔

"شمل صاحب نے تمھاری زندگی بچانے کی خاطر بہت خون دیا ہے۔" ابا جان نے نظریں جھکا کر کہا۔ "میں ان کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔"

"آپ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟" ڈاکٹر احسان کو غالباً اپنی فیس حلال کرنے کی پڑی تھی۔

"جس کی سانس چل رہی ہو، اسے زندہ ہی کہا جا سکتا ہے۔" میں نے اسے باور کرانے کی خاطر سرد و تلخ لہجہ اختیار کیا۔

"اتنی مایوسی کی باتیں مت کرو بیٹا ... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ابا جان کی آواز کپکپانے لگی۔

"مجھے بازو میں اب بھی ایک چبھن سی محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے ڈاکٹر سے کہا۔

"ہو رہی ہوگی۔" وہ تائید میں بولا۔ "اگر آپ کو ... بروقت طبی امداد فراہم نہ کی جاتی تو شاید زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا لیکن اب ..."

"مجھے یاد ہے ... ایک سوئی میرے بائیں بازو میں اتری تھی، میں نے بدحواسی میں اسے نکال دیا تھا۔"

"آپ کی وہی بدحواسی، آپ کی زندگی کی ضمانت بن گئی۔" ڈاکٹر نے اپنی قابلیت کے اظہار کا موقع ضائع نہیں جانے دیا۔ "کسی زمانے میں صرف وحشی اور جنگلی قبیلے لوگ بلوئنگ پائپ سے زہریلی سوئیاں پھونک کر اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کے فن

سے واقف تھے، اس کے بعد یہ فن چینیوں کے ذریعے...“

”بٹھل کے ساتھ جمرو، زورا اور جگنو بھی ہوں گے؟“ میں نے سیورین کی طرف دیکھا، ڈاکٹر منہ بنا کر رہ گیا۔

”اور بھی بہت سارے لوگ اسپتال کے لان پر موجود ہیں۔“

”لیکن فی الحال میں آپ کو کسی سے ملاقات کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ ڈاکٹر کی زبان پھر بے قابو ہوگئی۔ ”آپ کو ابھی کچھ دنوں صرف آرام اور مکمل سکون کی ضرورت ہے۔“

اس نے اپنا جملہ مکمل کر کے قریب کھڑی نرس کو اشارہ کیا، وہ انجکشن لیے پہلے ہی سے منتظر تھی۔

”ڈاکٹر...“ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ”کیا مجھے صرف بٹھل سے بات کرنے کی اجازت مل سکتی ہے؟“

”اس وقت بٹھل صاحب کو نیند سے بیدار کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”ڈاکٹر، آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“ میری آواز بھنے لگی۔

”ایسا نہیں ہے...“ سیورین نے میرا ہاتھ تھپ تھپا کر تسلی دی۔ اس کی نظریں گواہی دے رہی تھیں کہ بٹھل ٹھیک ٹھاک تھا۔

”تمہارے اوپر جو گزر گئی، ہم سب کو اس کا احساس ہے۔“ ابا جان مدھم لہجے میں گویا ہوئے۔ ”قسمت میں شاید یہی لکھا تھا۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں موند لیں، سیورین نے میری آستین اوپر کی، ڈاکٹر نے مجھے انجکشن لگا دیا۔ وہ شاید سکون بہم پہنچانے کی خاطر نیند کا کوئی انجکشن تھا جس کے محلول نے جسم میں داخل ہوتے ہی دماغ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا!

* * *

میری آنکھ بارہ گھنٹے بعد کھلی۔ سیورین میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ اس کی گلابی آنکھوں سے نیند کا خمار جھانک رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود نرس آرام کرسی پر سر ڈالے محوِ خواب تھی۔ سیورین کو جاگتا دیکھ کر میرے ہونٹ کپکپانے لگے، رات کے دو کا عمل تھا۔

”نرس کو میں نے ہی کچھ دیر آرام کرنے کو کہا تھا۔“ وہ میرے چہرے کے تاثرات بھانپ گئی۔ ”آپ کی تیمارداری تو میرے لیے بڑے نصیب کی بات ہے۔“

”اب نرس کو جگا کر تم...“

”مجھ سے میرا حق نہ چھینیں، پلیز!“ اس کی آواز زند
اس کے لہجے میں اپنائیت تھی، خلوص تھا۔

”بٹھل اب کیسا ہے...؟“ میں نے خلوص کا جو
خلوص سے دیا۔

”خون دینے کی وجہ سے کمزوری لاحق ہے۔ ایک
دن میں جاتی رہے گی۔“ اس نے بڑی خوب صورتی سے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”آپ کی بیماری کی خبر سن
بمبئی سے اور بھی کچھ لوگ آ گئے ہیں۔ سب کو آپ کی صحت
فکر لاحق ہے۔“

سیورین کا جواب سن کر میں نے کسی تاثر کا اظہار نہیں
کنپٹیاں پھر پھڑکنے لگیں۔ سب توازن کا مسئلہ ہے۔ معا
الجھ جائیں، توازن منتشر ہو جائے تو ساری مصلحتیں، ساری اندیشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وقت کی ڈگڈگی پر
اوقات انسان کو بھی بندروں کی طرح ناچنا پڑتا ہے۔ پلک
میں آدمی کیا سے کیا ہو جاتا ہے، بڑے سے بچہ بن جاتا
بچے اسے دیکھ کر تالیاں بجانے لگتے ہیں! آدمی مجبوری
دوسرا نام ہے، خوشیاں ساتھ رہیں تو بوڑھا آدمی بھی
ہو جاتا ہے۔ ایک ذرا دل کو ٹھیس لگے تو آدمی تڑپ اٹھتا
معذور ہو جاتا ہے۔ آدمی ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا، ہوا کا رُخ
جائے تو زندوں اور مردوں کی تفریق و جمع بھی کسی کام نہیں آتی
آدمی کا حالات پر اختیار نہ رہے، توازن ڈگمگانے لگے (تو)
آدمی بے بس ہو جاتا ہے۔ بیماری سے بڑا عذاب و کرب کو
نہیں۔ دانش ور کہتے ہیں کہ سب سے بڑی ذلت غربت
بیماری اور بستر پر اپاہجوں کی طرح پڑے رہنا، ڈاکٹر
مشورے پر کڑوی کسیلی دوائیں حلق سے نیچے اتارتے رہنا
کم ذلت نہیں۔ اور ایسی بیماری کہ آدمی بے دست و پا ہو
دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہے، آدمی کی اس سے زیادہ تو
اور کیا ہو سکتی ہے؟

میں بھی اسی ہست و بود کا شکار تھا۔ درمیان میں محض ایک دیوار حائل تھی، بٹھل دوسرے کمرے میں پڑا زندگی کی توانائی
منتظر تھا۔ ہم دونوں زندہ تھے، مگر بے بس۔ نہ بٹھل میرے پاس
آنے کی طاقت رکھتا تھا، نہ مجھے بستر سے نیچے اترنے
اجازت تھی۔ ڈاکٹر جھوٹ بولتے ہیں، دروغ گوئی کے
نئے انداز اختیار کر کے مریض کو پانی ملنے کی خوشی میں سرا
سے دوچار رکھتے ہیں۔ بٹھل یا میری بیماری سے دنیا اپنے
سے ذرا ادھر اُدھر نہیں ہوئی۔ نظام چلتا رہا، ٹس سے مس بھی

ادھورے کام جو آج پورے نہیں ہوئے، کل ہو جانے کی امید پر آدمی خود اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھتا ہے۔ زندگی کے سارے معاملات تن درستی سے مشروط ہیں۔ زندگی کا حساب کتاب لگانے والے بھی ہمیشہ ڈنڈی مارتے ہیں، نیند کے دورانیے کو بھی زندگی میں شمار کر لیتے ہیں۔ کیوں کرتے ہیں ایسا؟ نیند تو نصف موت ہوتی ہے۔ اگر سوتے ہی میں موت کا فرشتہ آ دبوچے تو سارا حساب کتاب، اعداد و شمار کی پرچیاں بھی بکھر جائیں گی۔ ریاضی دان بھی ٹاپتا رہے گا، کھوٹ ملانے کی بات اور ہے لیکن پورے وثوق اور اعتماد سے وہ بھی موت اور حیات کے لمحوں کی پرچیوں کو الگ الگ کرنے سے قاصر ہی رہے گا۔ آتی جاتی سانس کا نظام کب اوپر والے کی مرضی کے اشارے پر رُک گیا؟ کون وقت، گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کا حساب دے گا۔ کاغذ کی خانہ پُری کو پاون تولہ پاؤ رتی کا نام دینا محض فریب ہوگا۔ دھوکے بازی سے تعبیر کیا جائے گا۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ سیورین نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا تو جسم کا درجۂ حرارت کچھ اور فزوں ہو گیا۔ میں نے نظریں گھما کر سیورین کی سمت دیکھا۔ کبھی وہ بھی نرسوں کے لباس میں ملبوس، ایمی کے ساتھ بٹھل کی خاطر رات رات بھر جاگ کر گزار دیتی تھی۔ آج میرا ہاتھ تھامے میرا دل بہلانے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ کسے خبر تھی کہ وقت و حالات اسے ہمارے ساتھ زندگی کے گزرتے روز و شب کے ساتھ ایک ہی لڑی میں پرو دیں گے۔ گھریلو کپڑوں میں بھی پہلے کی طرح میری اور بٹھل کی تیمارداری کو اپنا حق سمجھ کر نبھا رہی تھی۔

”اب سوچنے کو باقی کیا رہ گیا؟“ میں نے توقف سے جواب دیا۔

”امیدوں کے چراغ ہمیشہ روشن رہتے ہیں۔“ وہ میری بجھی بجھی آواز کو محسوس کر کے جانے کس امید کے سہارے بولی۔ ”ہو سکتا ہے کہ آنے والا کل آپ کے دکھوں کو مندمل کر دے...“

توقعات! میرے وجود میں زہر اترنے لگا۔ توقعات ہی انسان کو زندہ رکھتی ہیں، توقعات دامن چھوڑ دیں تو آدمی کے پاس جینے کا بہانہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔ توقعات باقی رہیں تو غم کے بادل چھٹتے محسوس ہوتے ہیں۔ زمین سے سر نکالتی ننھی سی کونپل اور آدمی میں کیا فرق ہے؟ دونوں برابر ہیں، یکساں ہیں، دونوں توقعات پر... کل کا سورج طلوع ہونے کی امید پر زندہ ہیں۔ ابا جان نے بھی مجھ سے بڑی بڑی توقعات باندھ رکھی تھیں۔

بٹھل سے جیل میں ملاقات نے میری زندگی کے بہت سارے رُخ بدل دیے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے مجھے چاقو زنی کے کرتب، بلم لاٹھی کے گُر اور جسمانی داؤ پیچ سکھائے۔ ہر فن میں طاق کر دیا، بٹھل کی تحریک پر میں نے جیل ہی سے امتحان دے کر ایم اے بھی کر لیا۔ ابا جان میری تعلیمی قابلیت سے بھی مالی استفادہ حاصل کرنے کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر میں آمادہ ہوں تو وہ کئی ملیں لگوا دیں، میں یخ کمرے میں بیٹھا اپنے کارندوں پر حکم چلاتا رہوں، کمپنیوں کے کھاتے دار دو اور دو چار کرتے رہیں، دولت میں اضافہ ہوتا رہے، مختلف بینکوں میں ٹیکس چوری کرنے کی غرض سے مختلف ناموں سے علیحدہ علیحدہ اکاؤنٹ کھولے جائیں، دس بارہ کوٹھیاں، حویلیاں مختلف شہروں میں خرید کر، کرائے پر چڑھا دی جائیں تا کہ آمدنی کا گراف تیزی سے بڑھنے لگے۔

ارادہ آدمی کی متاع ہے۔ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں، میرا قصور میرا اپنا وجود ہے۔ میں نہ ہوتا تو ابا جان اپنی توقع کا اظہار کس سے کرتے؟ زندگی کے ہنگاموں میں لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ بھی جاتے ہیں، مگر کوئی رگِ جاں بھی ہوتا ہے، متاعِ جاں... جس کے بغیر آدمی خود کو ادھورا محسوس کرتا ہے۔ جسے زندگی کا مرکز و محور مان لیا جائے، اس کے بغیر زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ میں کورا کو فراموش کر دوں؟ نہیں، ایسی زندگی پر تو میرے جیسا سودائی ہزاروں زندگیاں قربان کر سکتا تھا۔ ایک دوسرے کی ضرورت، اس کی طلب اور بے چینی کا دوسرے اندازہ بھی نہیں لگا سکتے، وہ اپنی زبان بولتے ہیں، دوسرے کے دل میں ایک نظر جھانکنے کو وقت کا زیاں تصور کرتے ہیں، خود غرضی اور کسے کہتے ہیں؟

عزت، شہرت، دولت اور اقتدار کی ہوس میں دوڑتے دوڑتے آدمی کی صلاحیتیں کم زور ہوتی چلی جاتی ہیں، اسے احساس نہیں ہوتا کہ کیا کھویا، کیا پایا؟ ابا جان نے بھی کورا کے خزانے، زر و جواہرات سے بھرے ہوئے صندوق کے حصول کی خاطر زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ بچوں کو دربدری سے دوچار کر دیا تھا۔ جہاں گیر خانم کے ہاتھوں نہ لگا ہوتا تو تربیت کا تصور بھی نہ کر پاتا۔ کوئی بٹھل اسے مل جاتا تو وہ کسی اڈے پاڑے کا دادا کہلاتا... فہمیدہ، میری ممی، پیروں میں گھنگھرو باندھ کر کوٹھے تک جا پہنچی، نیلم جان بن گئی۔ اسی فیض آباد میں جہاں

میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔ نیلم جان نامی مغنیہ کی بھی بڑی دھوم تھی، ڈنکے بجتے تھے، میں خود تماش بین بن کر اُس کے کوٹھے تک پہنچ گیا۔ وہ بدنصیب کیل کانٹے سے لیس ہوکر' تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ' لہراتی بل کھاتی، چودھویں کے چاند کے مانند طلوع ہوئی تھی، محفل میں رنگ جمانے کی خاطر اس نے بھی نہ جانے کیا کیا توقعات باندھ رکھی ہوں گی، مجھ پر نظر پڑی تو... اس کی ساری شوخیاں، تمام رنگ یک لخت پھیکے پڑ گئے۔ توقعات کو ایسا دھچکا لگے گا، اس نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ مجھ بے غیرت پر نگاہ ڈالتے ہی اس کی غیرت جاگ اٹھی، بس ایک نظر اس نے مجھے جی بھر کر دیکھا' پھر غیرت آڑے آگئی۔ اس نے بالا خانے کی کھڑکی سے آن کی آن میں نیچے سڑک پر چھلانگ لگادی۔ اس کا وجود تماش بینوں کے دیکھتے ہی دیکھتے ہی چُرمرا کر رہ گیا۔ ابا جان کی' خزانے پالینے کی لگن پوری ہوگئی۔ اور اس وقت... سیورین مجھے توقعات پر زندہ رہنے کی آس دلا رہی تھی! میں نے جواب میں خامشی اختیار کی تو اس کے لبوں میں دوبارہ ارتعاش ہُوا۔

"میں آپ کو دلاسا نہیں دے رہی۔" اپنے ہاتھوں کے درمیان میرا ہاتھ بڑی اپنائیت سے دبا کر گویا ہوئی۔ "ابھی ایک امید باقی ہے..."

"وہ امید تمہاری جاگیر ہوگی۔" میں بلبلا اٹھا۔ "روایتی نرسوں والا سلوک کر کے میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔" میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "مریضوں کو زندگی کی امید دلانا بھی تمہارے پیشے کا اہم تقاضا تھا لیکن اس وقت..."

"اُس وقت بھی میں نے بشمل صاحب اور آپ کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنے میں کسی کوتاہی کا ثبوت نہیں دیا تھا، اِس وقت تو صرف اور صرف آپ لوگوں کے رحم و کرم پر زندہ ہوں۔" سیورین بھی کسی پتھر کا بے جان بت نہیں، گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا وجود تھی۔ اس کے سینے میں دل بھی تھا جو میرے تلخ لہجے کی کاری ضرب نہ جھیل سکا اور پھڑ پھڑا اٹھا۔ "میری اپنی کوئی جاگیر نہیں ہے۔ جو کچھ اثاثہ ہے' وہ آپ اور صرف آپ کے بزرگوں کی مہربانیاں، کرم نوازیاں ہیں۔ کل آپ کا کوئی خادم میرا ہاتھ تھام کر حویلی سے باہر کردے تو میں پھر اپنی اوقات پر..."

"چپ ہو جاؤ سیورین، بند کرلو اپنی زبان..." میں نے مچل کر کہا۔ "میں... میں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہوں، میری کوئی بات بری لگی ہو تو..."

"آگے کچھ نہ کہیے گا... ورنہ میرا مان ٹوٹ جائے گا" سسک اٹھی۔

اس کی آنکھوں کی طغیانی ذرا کم ہوئی تو میں نے مدھم زور لہجے میں اسے ٹٹولا۔ "تم کس امید کی بات کررہی تھیں"

"آپ ایک آدمی کو فراموش کررہے ہیں... وہ جو ہا ساتھ بمبئی سے آیا تھا۔"

"تم... تم بنرجی کی بات کررہی ہو؟"

"جی ہاں..."

"کیا ہوا اسے...؟"

"جس رات آپ حویلی سے گئے تھے، اسی رات بھی غائب ہے۔" سیورین نے محتاط انداز اختیار کیا۔ " ہے، وہ شکلاجی کی کسی خاص ہدایت پر' آپ اور بابا پر نظر ر پر مامور کیا گیا ہو۔ ممکن ہے، حویلی سے آپ کو تنہا نکلتے دیکھ بھی آپ کے تعاقب میں چل پڑا ہو۔"

"اب وہ کہاں ہے...؟" میری وحشت بڑھنے لگی۔

"یہی ایک سوال سب کے لیے پریشانی کا سبب ہے۔"

"تم کیا نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کررہی ہو؟"

"میں نے دو روز قبل آپ کے والد کو کسی آدمی سے با کرتے سنا تھا۔" سیورین بولی۔ "اس شخص کا بھی خیال کہ بنرجی بڑا زیرک اور تجربے کار آدمی ہے۔ اپنے دشمنو کی بُو دور ہی سے سونگھ لیتا ہے۔ ہوسکتا ہے، وہ دشمنوں کے تعاقب میں ہو۔"

"کون تھا وہ شخص؟" میرے اندر سنگ ریزے چبھنے لگے

"میں اس کا نام نہیں جانتی۔ البتہ گفتگو کے دوران میں ایک آدھ بار شکلاجی کا نام بھی درمیان میں آیا تھا۔"

"میں... میں اسپتال میں کب داخل کیا گیا؟" میر وحشتیں سِوا ہونے لگیں۔

"دو ہفتے ہوگئے..."

"کیا شکلاجی کو حالات کی بھنک مل گئی؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔"

سوکھتے، مرجھاتے ہوئے درخت کو نئی کھاد مٹی مل جائے پانی کا چھینٹا لگا دیا جائے تو وہ بھی جڑ پکڑنے لگتا ہے، میں ت ذی ہوش انسان ہوں۔ سیورین کی زبانی بنرجی کی اسی رات سے گم شدگی کی اطلاع سُن کر میری امید، میری توقعات جو دم توڑ چکی تھیں، ایک موہوم سی امید، ایک ٹمٹماتے چراغ کی مدھم... کم زوری لو کی طرح لرزہ براندام ہونے لگیں۔ جب تک

م کے افراد مولوی شفیق کو موت کے مُنہ میں جانے سے نہ کے تھے تو پھر کورا کے سلسلے میں بھی اُن سے کوئی تیر چلانے کی عبث ہی تھی! اگر ان کی کوئی خبر آئی ہوتی تو ات تھی... یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ کوئی نہ کوئی، اچھی یا اطلاع آئی ہو لیکن... مصلحتوں کی وجہ سے مجھ تک پہنچانا ب نہ سمجھا گیا ہو۔ بنرجی والی بات بھی مجھے پہلی بار سیورین انی معلوم ہوئی، ابا جان نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ کیا سچ تھا، کیا جھوٹ، مجھے اس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا۔ ال، بنرجی کی اس اطلاع نے ایک ڈوبتے کو تنکے کا سہارا دیا۔ سیورین نے زبان نہ کھولی ہوتی، دوسروں کی طرح وہ بان پر قفل ڈالے رہتی تو میں شاید اس اطلاع سے بھی رہتا۔ میں نے سیورین کی زبان پر امید کا لفظ سُن کر ے دیا تھا۔ وہ سہم گئی، آب دیدہ ہوگئی۔ میں اس سے مدردی کا اظہار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر ں راؤنڈ پر آتا دکھائی دیا۔ میں نے بہ عجلت کروٹ لے کر سیں موند لیں!

میرا ذہن جاگ رہا تھا۔ بنرجی کا نام میرے ذہن کے ے پر بار بار جل بجھ رہا تھا۔ بشمل کے سلسلے میں ایک دو روز اندر فیض آباد بھیجنے کے وعدے کے ساتھ ہی ایس پی نے سرسری طور پر بنرجی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ م کا آدمی ہے۔ ایک زمانے میں اسے کرشنا جی کا اعتماد بھی صل تھا لیکن اس کی سرکاری حیثیت کے بارے میں کوئی بات کی تھی۔ اسے اگر بشمل کے ساتھ راستے کی کسی متوقع اری کا سامنا کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا تو وہ... میرے ب میں کیوں نکل پڑا؟ مجھے یاد ہے، میں نے پوری احتیاط طرف نظر دوڑا کر یقین کرلیا تھا کہ میں حویلی سے نکلتے کسی کی نظروں میں نہیں آسکا ہوں۔ بشمل، زورا، جگنو یا جمرو ک بھی مل جاتی تو میں اپنی من مانی کبھی نہ کرپاتا۔ وہ سب است روک لیتے۔ جمرو اور زورا میرے قدموں سے لپٹ اور بشمل کی تیز' تجربہ کار اور سوالیہ نظریں میرے وجود کے ہو جاتیں، دل کی گہرائیوں تک اُتر جاتیں۔ وہ شکوہ لگتا۔ میں پہلے بہانے بازیاں تراشتا پھر جواز پیش کرنے کہ پہلے بھی بھیڑ بھاڑ نے ہمارا راستہ کھوٹا کردیا تھا۔ اسی میں نے تنہا نکلنے کی ٹھان لی تھی۔

شمل، جمرو، جگنو اور زورا کی بات اور تھی، ان کے کس بل موقعوں پر میرے آزمائے ہوئے تھے۔ وہ میرے اپنے تھے، میرے برے بھلے میں برابر کے شریک رہ چکے تھے۔ ان کی ذات سے 'ہزاروں بیتی باتیں وابستہ تھیں... لیکن بنرجی... وہ دُبلا پتلا، دراز قد ڈھیلا ڈھالا سا آدمی جسے دیکھ کر پہلی نظر میں کسی یرقان کے مریض کا گمان اُبھرتا ہو، وہ بھلا میرے تعاقب میں کیوں نکل پڑا تھا؟ اس کی نظروں میں ایک چمک ضرور تھی جو اس کی ذہانت اور تجربوں کی دلیل کہی جاسکتی تھی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ میں کس مہم پر روانہ ہورہا ہوں؟ کیا بشمل کے بہانے اسے میرے اوپر تعینات کیا گیا تھا... جو وہ ایک لمحے کو بھی مجھ سے بے خبر نہیں رہا۔ وہ میرا تعاقب کرتا رہا اور مجھے بھنک بھی نہ ملی، وہ مجھے ایک کم زور آدمی نظر آیا تھا، چھلاوہ سمجھا تھا میں نے اسے، لیکن سیورین کی زبان سے یہ سن کر کہ بنرجی بھی اسی رات سے حویلی سے غائب ہے جس وقت میں نکلا تھا، میرے ذہن میں سیکڑوں سوالات ابھر رہے تھے... کیا شکلا کے خاص آدمیوں کی ناکامی کے بعد وہ کسی کام آسکتا تھا؟ کیا اس نے سر پر سلیمانی ٹوپی اوڑھ رکھی ہوگی جو جانگ قبیلے کے ان سرفروش اور جفاکش' موت کے ہرکاروں سے روپوش ہوسکتا تھا جنھوں نے بھاگتے بھاگتے بھی میرے وجود کو خاک میں ملانے سے دریغ نہیں کیا تھا... وہ کورا کے تعاقب میں صرف ان مذہبی دستاویز کے سبب نکلے تھے جس کے بغیر سردار کا قدم

اذیت ناک شرافت

ایک نرس نے سرگوشی میں دوسری ہم راز نرس سے کہا، "ڈاکٹر اکرم بڑے شریف اور بھلے مانس ہیں۔"

دوسری نرس نے پوچھا، "وہ کیسے؟"

پہلی نے کہا، "کل اتفاق سے ہم دونوں سینما دیکھنے گئے اور اَپر کلاس کی گیلری میں ایک ساتھ اکھٹے بیٹھے رہے۔ ہمارے سِوا گیلری میں کوئی اَور نہ تھا لیکن اِس کے باوجود اُن تین گھنٹوں کے دوران اُنھوں نے مجھ سے کسی قسم کی غیر شریفانہ اور نامناسب بات نہ کی۔"

اِس پر دوسری نے بیزاری سے کہا، "اس طرح کی شرافت بھی کتنی اذیت ناک اور صبر آزما ہوتی ہے! اِس سے تو بہتر تھا کہ ڈاکٹر صاحب اکیلے ہی سینما چلے جاتے!"

تعاون ✿ عمر صدیقی، کراچی

جمانا مشکل ہوگیا تھا۔ ایک بار بوڑھے بھکشو اجین نے بھی کچھ ایسی ہی باتوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔ مذہبی کاغذات کا جانگ قبیلے کے کسی بھی سردار کی تحویل میں ہونا فرض سمجھا جاتا تھا، اسی لیے بوڑھا اجین ان کاغذات کو بطور خاص ساتھ لے آیا تھا۔ کورا جانگ قبیلے والوں کے لیے ایک بے معنی چیز تھی۔ اس کا چچا ہر حال میں اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے درپے تھا۔ جانگ قبیلے کے سرپھرے لوگوں کو بھی انھی متبرک مذہبی دستاویز کی تلاش تھی۔ کاغذات ان کے ہتھے لگ جاتے تو وہ کورا کو مارنے میں ایک پل کی دیر نہ کرتے۔ کیا یہ تمام کہانی بنرجی کو بھی معلوم تھی؟ کیا شکلا جی نے اسے میرے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا؟ اور اگر ایسا تھا تو بنرجی اس وقت کہاں ہوسکتا تھا...؟ دور دور رہ کر کورا کا تعاقب کررہا تھا یا کورا کے ساتھ ہی اسے بھی دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کردیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ دونوں کی بے گور و کفن لاشوں کو کہیں زمین میں دبا دیا گیا ہو!

میرے وجود میں طوفان ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ جب تک سیورین کی زبان بند رہی، میں مایوسیوں کا شکار رہا۔ لیکن بنرجی کی پُراسرار گم شدگی کی بات سُن کر میرے رگ و پے میں خون کی گردش پھر تیز ہوگئی... مجھے اپنوں سے بھی شکایتیں تھیں۔ ابھی تک بلم پور میں ہونے والی معرکہ آرائی کے سلسلے میں سبھی نے زبانوں پر قفل ڈال رکھے تھے... کیوں؟

مجھے بلم پور کی بے باک بلوری کی بے حجابانہ باتیں یاد آئیں۔ کسی کی پوٹلی کھولنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے مجھے مولوی شفیق اور کورا کے ٹھکانے سے آگاہ کرکے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ مجھے مل جاتی تو شاید کسی مصلحتوں کے بغیر سب کچھ ایک سانس میں اُگل دیتی۔ جب میں نے اس کا اعتماد خریدنے کے عوض اس کی توقع کے خلاف، نئے نوٹوں کی گڈی اس کے قدموں میں پھینکی تو وہ بھی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ جہاں دیدہ عورت تھی، اس نے اپنے ذہن میں میرا کچھ نہ کچھ وزن ضرور مقرر کرلیا ہوگا، کسی نہ کسی حیثیت کا تعین کیا ہوگا۔ وہ بکاؤ عورت تھی، میں اسے تلاش کرکے کچھ رقم کا لالچ اور دیتا تو اس کی زبان قینچی کی طرح چل پڑتی۔ ممکن ہے، مجھے مزید کارآمد اور مطلوبہ معلومات حاصل ہوجاتیں۔ میں کورا کی خاطر سب امکانات پر ذہن دوڑاتا رہا۔ شاید کوئی سرا ہاتھ آجاتا، کام کی کوئی ایسی بات معلوم ہوجاتی جو مجھے پھر متحرک کردیتی!

کسی کے قدموں کی آواز دروازے سے باہر جاتی سنی تو میں نے دوبارہ کروٹ لی۔ ڈاکٹر احسان جاچکا تھا۔ سیورین بدستور میرے بستر سے لگی کھڑی تھی، البتہ ڈیوٹی پر موجود نر... جو محوِ خواب تھی، ڈاکٹر کے راؤنڈ یا اس کے جوتوں کی مانوس دھمک پاکر بیدار ہوچکی تھی۔ اس کی موجودگی میں سیورین سے رازداری ممکن نہیں تھی۔ وہ ہاتھ میں دبے ایک چارٹ پر نظر جمائے کچھ دُور کھڑی تھی۔ شاید ڈاکٹر احسان راؤنڈ ختم کرنے کے بعد اسے کچھ خاص ہدایات دے گیا تھا۔ میں نے سیورین سے سرگوشی کی۔ "کیا تم اس مصیبت کو کچھ دیر کے لیے ٹال سکتی ہو؟"

سیورین کو زحمت نہیں کرنی پڑی۔ نرس چارٹ ہاتھ میں لیے شاید ڈاکٹر سے کسی اور وضاحت کی خاطر خود ہی تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔

"سیورین!" میں نے سلگتے لہجے میں عجلت سوال کیا۔ "کورا کے بارے میں گھر والوں کو حالات کا علم ہوچکا ہوگا۔ ان کے کیا تاثرات ہیں؟"

"میں غلط بیانی نہیں کروں گی۔" سبھی کو آپ کی حالت پر تشویش ہے۔ حویلی کی چہل پہل پہلی جیسی نہیں رہی، کونے کونے میں اُداسی مسلط ہے۔ سب آپ کی صحت یابی کی دعائیں مانگ رہے ہیں، بڑی بڑی منتیں مانگی جارہی ہیں۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں بکھرنے لگا۔

"جو افراد آپ کی ذات سے کسی بھی رشتے میں منسلک ہیں انھیں کورا کا خیال بھی ضرور ہوگا۔" سیورین کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔ "میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں، صرف نام سنا ہے لیکن وہ آپ کی ذات کا ایک حصہ ہے، اس لیے میں بھی دکھی ہوں۔ دوسروں کو بھی یہ احساس ضرور ہوگا۔"

"بمبئی سے کون کون آیا ہے...؟" میں نے سیورین کی توجہ ہٹا کر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"گیتا اور رانی بھابی کے علاوہ جولین بھی آئی ہے۔ وہ اسپتال آنے جانے والے ہر شخص سے آپ کی خیریت دریافت کرتی رہتی ہے۔"

جولین کا نام سُن کر میری رگوں میں دوڑتے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر اکثر میرا خون سنسنانے لگتا۔ وہ کورا کی حسین آنکھوں سے کسی قدر مشابہ تھیں۔ میرا ذہن پھر قلابازیاں کھانے لگا۔ گلاب کا پھول کانٹوں کے درمیان گھرا ہو تو اس کا سارا حسن، رعنائیاں، حتیٰ کہ خوش بو بھی گھٹن کے بوجھ تلے دب کر اپنی اصلیت، اپنی شناخت بدل دیتی ہے۔ کورا کی

لیے کسی مہکتے گلاب سے کم نہ تھی، اس کی خوش بو جو میرے مشامِ جاں کو معطر کیے رہتی، اسے پالینے کی تمنا اور موہوم امیدوں کے سہارے میں نے گویا بے چینی و کرب کے عالم میں گزاریں، اس کا اندازہ سکتا ہے... اتنی فرصت کس کے پاس تھی؟ جذبوں کی کو سمجھنے کی خاطر ان نظروں کی ضرورت ہوتی ہے جو دل والیوں میں اتر جانے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ ایک مخمل تھا کے جاں نثار وفادار ساتھی... جو نقدِ جاں ہتھیلی پر رکھ کر ساتھ ان جانے راستوں پر، گم نام منزلوں تک جانے کو آمادہ رہتے تھے۔ اس وقت بھی مخمل ہی نے اپنا خون کر میری زندگی کے ٹمٹماتے چراغ کو روشنی دی، لو دی۔ خود وہ دوسرے کمرے میں لٹیروں سے نبرد آزما سے شاکی بھی ہوگا، میں نے اسے کورا کے تعاقب میں کی اطلاع سے بے خبر کیوں رکھا؟ اس کا شکوہ اور میری میں سے جیت کس کی ہوگی؟ کون سرخ رُو ہوگا؟ کون ہو کر گردن ڈالے گا؟ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرسکتا میرا ذہن پھر کورا کے تعاقب میں پریشان خیالات کی آماج بن کر رہ گیا۔

سیورین کے منہ سے، بنرجی کا نام نکلا۔ اس نے ابا جان اور نامعلوم شخص کے درمیان ہوئی گفتگو کے چند لفظ میری سماعت میں انڈیلے تو دم توڑتی امیدوں کو ایک سہارا مل گیا۔ کی کرنیں میرے وجود کے تاریک صحرا میں اُجیارا بکھیرنے لگیں۔ دل کی وحشتوں کو قرار کی نوید ملی تو خیالات کی دم توڑتی سی سر اُبھارنے لگیں۔

"آپ کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔" سیورین نے لہجے میں مشورہ دیا۔ "ذہن پر زور دیں گے تو آپ کی خوش گوار اثرات مرتب ہونے میں دیر لگے گی۔"

"تم..." میں نے نظریں گھما کر اسے تیز نظروں سے گھورا الفاظ کھینچ لیے۔ جس نے گھپ اندھیرے میں جگنو بن کر نکل جانے کا ایک راستہ دکھایا... اس پر دل کا غبار نکالنا، سب تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ نرس تھی، اسے میری کیفیتوں ادراک مجھ سے بہتر ہوگا۔ اس کی نگاہوں میں اپنائیت تھی، نہیں تھا۔ نہ ہوتا تو وہ بھی یقیناً گریز سے کام لیتی... "تم شاید کہہ رہی ہو۔" میں نے اس کے مشورے سے اتفاق کیا۔ نیند کا انجکشن لگادو، اسی میں میری بھلائی ہے اور سنو... تمہارے درمیان بنرجی والی جو گفتگو ہوئی ہے..."

"میں اس کا تذکرہ کسی اور سے نہیں کروں گی۔" میرا جملہ اس کی زبان سے مکمل ہُوا۔ اس نے مجھے نیند کا انجکشن لگانے میں دیر نہیں کی۔ لمحوں کی بات تھی، میں پھر بے خبری کے عالم سے دوچار ہوگیا۔

آنکھیں کھلی ہوں تو انسان محدود ہوجاتا ہے۔ جو کچھ نظر کے سامنے ہو وہی دیکھتا ہے۔ ماحول، مناظر جو کھلی آنکھیں دیکھ سکیں وہی کُل کائنات ہوتی ہے۔ انسان کی قوتِ پرواز اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ حالات کی گردش اس دائرے تک تھم جاتی ہے جہاں تک بینائی اس کا ساتھ دے۔ آنکھیں بند ہوں تو یہی دائرے پھیل کر انسان کے تصور کا دائرہ وسیع کردیتے ہیں۔ محدود سے لامحدود کردیتے ہیں۔ نظروں کے سامنے ایک جہاں کھل جاتا ہے۔ خیالات کی پرواز کی حد نہیں رہتی۔ بند آنکھیں تو اور بینا ہوجاتی ہیں۔ اس وقت میں بھی کچھ ایسی کیفیتوں سے دوچار تھا۔ کورا کا تصوّر، دُھندلا دُھندلا عکس واضح ہورہا تھا۔ وہ میری دست رس میں آتے آتے نکل گئی تھی۔ جانگ قبیلے کے کھوجی جو ایک عرصے سے اس کی تلاش میں تھے، بالآخر کام یاب ہوگئے تھے۔ انھیں اپنے سردار کی سرداری کی تکمیل کے لیے ان متبرک کاغذات کی تلاش تھی۔ کیسی عجیب ریت ہے دنیا کی، کبھی انسان کی اہمیت سونے کے سکوں سے زیادہ ہوتی ہے، کبھی وہ قدموں کی دُھول بن جاتا ہے۔ سب قدرت کی نیرنگی ہے۔ جو تحریر لوحِ تقدیر پر کندہ کردی گئی، وہ اٹل ہوتی ہے، اس سے فرار انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ انسان اپنی بساط بھر، بہتر سے بہتر کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے، آنے جانے والی سانسیں اسے امید کے سراب میں مبتلا رکھتی ہیں۔ امید تو سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ امید نہ ہو تو انسان پھڑ پھڑا کر قفس کی تیلیوں کو توڑنے کی خاطر جدوجہد بھی نہ کرے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا زندگی کی علامت نہیں۔ مشین کے پرزے استعمال میں نہ ہوں تو وہ بھی زنگ پکڑنا شروع کردیتے ہیں، ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ صرف حرکت انھیں زندہ رکھتی ہے۔ میرا وجود بھی ایسی ہی متضاد کیفیتوں سے دوچار تھا۔

کام یابی اور ناکامی تو وقتی باتیں ہیں۔ نیا پودا لگا کر انسان اس سے بہت ساری امیدیں وابستہ کرلیتا ہے، اس کی دیکھ بھال میں کوشاں رہتا ہے۔ پتیاں مرجھانے لگیں تو اس کی امیدیں خاک ہونے لگتی ہیں۔ کونپلیں پھوٹنے لگیں تو نہال ہوجاتا ہے۔ وقت ڈگڈگی بجاتا ہے، انسان اس کی تال پر متحرک رہتا ہے، جب تک سانس جب تک آس... ازل

سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ آج کے خیال میں کل کی باتیں نظر انداز کردی جائیں تو پھر ہست و بود کا پہیہ جام ہوجاتا ہے۔ موت اور زندگی، جیت اور ہار کے دشوار گزار راستوں میں قدم قدم پر پیچ وخم آتے ہیں۔ لیکن انسان مایوس نہیں ہوتا۔ جو آج کھو گیا، وہ کل اچانک مل بھی سکتا ہے۔ جو آج ہاتھ آگیا' کل چھومنتر بھی ہوجاتا ہے۔

کورا میری زندگی، میرا سرمایۂ حیات تھی، اس کے حصول کی خاطر کیا کیا ہنگامے برپا نہیں ہوئے۔ جہاں بھی اس کے ملنے کی ایک موہوم سی امید نظر آتی، ہم تلاش میں نکل پڑتے۔ مولوی شفیق نے اس وقت میری مدد کی تھی جب میں کورا کو لے کر گھر سے نکلا تھا۔ اس کے مشورے میرے لیے مفید ثابت ہوتے رہے۔ اس نے ہم دونوں کو پناہ دی تھی۔ حالات کے پیچ وخم سے آگاہ کرنے کی خاطر ہم دونوں کو وقت کی نزاکتوں سے آگاہ کرتا رہا۔ لیکن ایک موڑ پر جانگ قبیلے کے کھوجی ہمارے آڑے آگئے۔ میں نے چاقو کھول کر انھیں للکارا، کورا کو بچانے کی خاطر میں نے اس کے تعاقب میں آنے والے تین آدمیوں کو قتل کردیا۔ یہ جنون نہیں تو اور کیا تھا، قتل کا ارتکاب کرنے والے مصلحتوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ میں بھی عقل وخرد سے بیگانہ ہوگیا۔ قانون کے محافظ مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر اپنے فرائض پورے کرنے لگے۔ مولوی شفیق کورا کو لے کر نکل گیا۔ وہ میری خاطر رُکتا تو خود بھی لپیٹ میں آجاتا... اس کے بعد سات سال کا وقفہ درمیان میں حائل ہوگیا۔ دوریاں بڑھ گئیں۔

جیل میں بٹھل نہ ملا ہوتا تو شاید اسی کے بندے مجھے ذلیل و خوار کرتے رہتے۔ کھلونے کی طرح کھیلتے رہتے۔ بھوک ستانے کی خاطر انسان حرام چیزوں پر بھی مُنہ مارنے سے گریز نہیں کرتا، میں ان کے لیے تر نوالہ بن جاتا۔ وہ اچھے لوگ نہیں تھے، اڈے پاڑے سے تعلق رکھتے تھے۔ جیل ان کے لیے مہمان خانہ تھا۔ پولیس خانہ پری کرنے کی خاطر کچھ دنوں انھیں مہمان بنالیتی تھی لیکن وہ سب اپنی مرضی کے مالک تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک بدمعاش تھا۔ وہ میری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا جاتے تو کس کی مجال تھی جو اُن سے باز پُرس کرتا۔ لیکن بٹھل زمانہ شناس تھا۔ اس کی نظروں نے مجھے شناخت کرلیا۔ میرا محسن بن گیا۔ میری نظروں کے سامنے بٹھل کا اولین عکس ابھرنے لگا۔ وہ بٹھل کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی آواز کی گھن گرج سُن کر پولیس والے بھی کنی کتراتے تھے۔ اس کے لب و لہجے کی کاٹ بڑے بڑے سورماؤں کا پتا پانی کردیتی۔ جیل کے افسران بھی اس کی خوش نودی حاصل کرنے کا بہانہ تلاش کرتے تھے کی بدولت اس کے آدمیوں نے بھی میری تربیت شروع مجھے کندن بنادیا!

...اور آج بھی اسی نے اپنا خون دے کر میری جان تھی۔ سیورین نے یہی بتایا تھا کہ اس نے میری خاطر کئی ب خون کی دی تھیں۔ ڈاکٹروں نے اسے روکا بھی لیکن پھر ا ضد کے آگے مجبور ہوگئے۔

میرے ذہن کے پردے پر ایک فلم سی متحرک تھی۔ اس مرکزی کردار بٹھل تھا لیکن کورا میری زندگی کا حاصل تھی۔ مرجاتا تو اور بات تھی لیکن جب تک آتی جاتی سانسوں کا قائم تھا' میں اس کی یاد سے غافل نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے ا تلاش کرنا تھا۔ وہ جہاں بھی تھی' جس حال میں بھی تھی، اگر تھی تو وہ بھی میرے خیال سے غافل نہیں ہوگی۔ مجھے تو آ سانس تک اسے تلاش کرنا تھا، ڈھونڈنا تھا۔ میرا دل کہتا تھ زندہ ہوگی، میری راہ تک رہی ہوگی۔ میں اسے فراموش کر اپنی نظروں سے بھی گر جاتا، سانس لینا دشوار ہوجاتا۔ سیو نے بنرجی کا نام لے کر میرے دل میں امید کی جو شمع رو تھی' وہ اس بیش بہا خزانے سے کہیں زیادہ قیمتی تھی جو ا نے بہت سینت کر، چھپا کر رکھا تھا۔

انسان بہ ظاہر تنہا جنم لیتا ہے لیکن اُس کے وجود کے سا اَن گنت کہانیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ ہر کہانی کا ایک الگ عنو ہوتا ہے، وقت کے ساتھ حالات ان کہانیوں میں رنگ بھ ہیں، کچھ خاکے ادھورے رہ جاتے ہیں، ان کی یاد فنا نہیں ہو کورا تو ایسا نقش تھا جو میرے ہوش وحواس پر کندہ ہوکر رہ گیا تھ اس کے رنگ کبھی پھیکے نہیں پڑ سکتے تھے۔ مجھے یقین تھا نہیں تو کل، کسی موڑ پر، کسی دوراہے پر ہم پھر ایک دوسر ضرور ملیں گے۔ یہ خوش فہمی نہیں، بڑے اعتماد کی بات تھی۔

اس نے کہا تھا کہ جانگ قبیلے کے سردار کے لیے ضر ہے کہ وہ مقدس مذہبی دستاویز کی حفاظت کرے۔ ان بغیر وہ نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ کورا کی زبان سے نکلی ہوئی با کی ایک ایک بات میرے ذہن پر نقش تھی۔ اگر بوڑھا اجین زندہ ہوتا تو وقت آنے پر کورا کے نازک ہاتھوں مہندی رچا دیتا اور پھر قبیلے کے رواج کے مطابق اس کے کو سرداری کے منصب سے دست بردار ہونا پڑتا۔ جو لو کورا کو جھپٹ لے گئے تھے' وہ بھی اپنے رسم ورواج ناواقف نہیں ہوں گے۔ اقتدار کی ہوس غلاموں کے د

ہی کہلاتی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جو لوگ اسے لے گئے ان میں کسی کے دل میں سردار کی کرسی پر براجمان لے کا نشہ سوار ہوجاتا۔ کورا کو زندگی کی ضمانت دے کر وہ لو دے شادی پر مجبور کردیتا تو کورا کے چچا کے' سرداری لے کے خواب' کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ کر بکھر ے۔ ایک نئی کہانی جنم لیتی تو بساط کا نقشہ بھی پلٹ جاتا۔ کچھ ممکن تھا، بہت سے امکانات روشن تھے جو میرے ہن میں کلبلا رہے تھے۔ وقت کے نشیب وفراز اور وقت کی میں پسنے کے بعد کورا نے بھی بہت سے گُر سیکھ لیے ہوں ۔ اس کے ذہن میں بھی ایک تلاطم برپا ہوگا۔ زندگی بھر کی بھی سانسوں کو سمیٹنے کی خاطر وہ بھی مختلف پہلوؤں پر ضرور رہی ہوگی۔ کون جانے کب بازی پلٹ جائے' حالات رخ اختیار کرلیں۔ شطرنج کی بساط پر چالیں سوچ سمجھ کر جاتی ہیں۔ کوئی فریق اپنی مرضی سے مات قبول نہیں ۔ آخری وقت تک جیت کی دیوی اُسے ترغیب دیتی ہے۔ ممکنہ جیت کا نشہ اسے سرشار کرتا رہتا ہے۔ پھر ادا غلطی ہوجائے تو سارے کا سارا نشہ اتر جاتا ہے۔ اور ہار بھی دھوپ چھاؤں ہوتے ہیں۔ ایک پل میں ے کچھ ہوجاتا ہے۔

یں اپنے خیالوں میں محو تھا، خوابوں میں اپنی فتح اور ے کی شکست کے تانے بانے بُن رہا تھا جب کسی کے وں کی آواز میرے قریب آکر تھم گئی۔ طویل نیند کے بعد خمار ٹوٹ رہا تھا جب ڈاکٹر احسان کی آواز میرے نوں میں گونجی۔

"کب سے سو رہا ہے؟"

"ر ہوگئی۔" سیورین کی مانوس آواز اُبھری۔ "میں نے یا وزدی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ دیر میں بیدار ہوجائیں۔"

"مھارے اور اس کے درمیان کیا رشتہ ہے؟" ڈاکٹر پوچھا۔

انسانیت کا رشتہ۔" سیورین نے اسے لاجواب کردیا۔ تربیت یافتہ نرس اور مریض کے درمیان اس سے زیادہ رشتہ اور کیا ہوسکتا ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم اپنے پیشے کے ساتھ مخلص ہو۔" نے سیورین کی خدمات کو سراہا۔ "تمھاری تیمارداری ہابر کے صحت مند ہونے میں اہم کردار کیا ہے۔ میرا ہے کہ اگر صورت حال ایسی ہی رہی تو ہم انھیں گھر بھی

منتقل کرسکتے ہیں۔"

"بابا کے بارے میں آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟" سیورین نے بٹھل کے بارے میں دریافت کیا۔

"اس کی حالت سنبھلنے میں کچھ وقت لگے لیکن ..." ڈاکٹر نے پُرتجسس انداز میں سوال کیا۔ "تم اس مریض کو بابا کیوں کہتی ہو؟"

"دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔" سیورین کی آواز بھرّا گئی۔ "انھوں نے مجھے باپ کا پیار دیا ہے۔"

"مسٹر ہابر سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

"دونوں لازم وملزوم ہیں۔" سیورین نے کہا پھر موضوع بدلنا چاہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، ڈاکٹر؟ بابا کے زخم زیادہ خطرناک تو نہیں؟"

میں آنکھیں بند کیے سیورین اور ڈاکٹر احسان کی باتیں سنتا رہا۔ میرا ذہن اس وقت اندیشوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا جو میرے اندر کے تجسس کو ہوا دے رہا تھا۔ ڈاکٹر جس انداز میں سیورین کو کرید رہا تھا وہ اُس کے پیشہ ورانہ تقاضوں کے منافی تھا۔ سیورین نے بٹھل کے زخم کے بارے میں سوال کرکے میرے وجود میں ایک ہلچل سی مچادی تھی۔ مختلف سوالات سر اُبھارنے لگے۔ وہ زخمی کیسے ہوگیا؟ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آگیا؟ کورا کی تلاش میں وہ میرے شانہ بشانہ رہتا تھا۔ یہ بات دشمنوں کے حلق سے نیچے نہیں اتری ہوگی۔ شاید انھوں نے جوابی کارروائی کی ٹھانتے وقت یہی مناسب خیال کیا ہو کہ راستے کی بڑی رکاوٹوں کو ایک ہی ہلّے میں دُور کردیا جائے تو ان کی دشواریوں میں کمی ہوجائے گی۔ ان کی جگہ میں اور بٹھل

ہوتے تو ہم بھی اسی انداز میں جوابی کارروائی کا فیصلہ کرتے۔ اگر میرے اندازے درست تھے تو پھر بلم پور میں جو کچھ ہوا اس ضمن میں بلوری بھی غچہ کھا گئی ہوگی۔ اس نے مولوی شفیق کے علاوہ تین اور اجنبیوں کا بھی ذکر کیا تھا۔ ممکن ہے، بعد میں اور بھی آگئے ہوں، بلوری انھیں دیکھ نہ پائی ہو۔ ایک میرے سامنے مولوی شفیق کے ساتھ ہی پڑا زندگی سے اپنا ناتا توڑ چکا تھا۔ دوسرے نے کورا کو اپنے ساتھیوں کے قبضے میں جانے کے بعد ہی مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی ہوگی۔

اگر سیورین کا بیان درست تھا کہ بنرجی میرے ساتھ ہی حویلی سے نکلا تھا تو پھر دشمن بھی اس سے غافل نہ رہے ہوں گے۔ کچھ ہمارے تعاقب میں لگے ہوں گے، ایک دو پیچھے رہ گئے ہوں گے جنھوں نے بعد میں آنے والوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہوگی ... کیا درست تھا کیا غلط، یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سیورین نے بھی پہلے یہی کہا تھا کہ بٹھل کی حالت مجھے زیادہ خون دینے کے سبب بگڑی تھی۔ جب کہ وہ خود خطرناک زخموں کے بارے میں ڈاکٹر احسان کو کرید رہی تھی۔

"اسپتال کے لان پر جو افراد جمع رہتے ہیں وہ بھی مجھے اچھے لوگ نہیں لگتے۔" ڈاکٹر نے بٹھل کے زخموں کی بات نظر انداز کرکے ایک نیا سوال کیا۔ "کیا تم انھیں بھی جانتی ہو ...؟ چوکی دار کا خیال ہے کہ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" سیورین نے ڈاکٹر کو خوب صورتی سے ٹال دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بٹھل کے جاں نثار ساتھی ہوں گے۔ انھیں بھی کسی نہ کسی طرح حالات کی تھوڑی بہت بھنک مل گئی ہوگی۔ بٹھل اڈے پاڑے کے لوگوں کے لیے بھی باپ کا درجہ رکھتا تھا۔ اسپتال میں اس کے داخلے کی اطلاع پاکر وہ بھی چین سے نہیں بیٹھے ہوں گے، اِدھر اُدھر سے سن گن لے رہے ہوں گے۔

"میں جانتا ہوں تم سند یافتہ اور تجربہ کار نرس ہو۔" ڈاکٹر احسان کا لہجہ سنسنی خیز ہوگیا۔ "لیکن کسی اسپتال کی ساکھ بھی اپنی جگہ بڑی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اسپتال کی بدنامی کسی صورت پسند نہیں کروں گا۔"

ڈاکٹر احسان کا وہ تلخ جملہ برچھی بن کر میرے دل میں اُتر گیا۔ اب آنکھیں بند رکھنا میرے لیے محال تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"پانی ..." میں نے سیورین سے کہا۔ وہ پانی کے لیے لپکی تو ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوگیا۔ "اب آپ کیسا محسوس کررہے ہیں؟" اُس کے لہجے میں یکلخت نرمی آگئی۔

"یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آئے گی ڈاکٹر۔" میر لہجے میں تلخی گھلنے لگی۔ "آٹھ روز آپ زندگی سے کنارہ کش ہ اسپتال کے بستر پر لیٹیں تو خود بھی اندازہ کرسکتے ہیں کہ سوئی، تنہائی اور بیماری کا احساس انسان کو اندر سے کھوکھلا رہتا ہے، ڈسنے لگتا ہے۔"

"ڈونٹ وری!" اس نے خوش مزاجی سے جواب د "آپ تیزی سے ریکور کررہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میں دو چا روز میں آپ کو گھر جانے کی اجازت دے دوں۔"

سیورین پانی کا گلاس لے آئی۔ میں نے دو گھونٹ حل کے نیچے اُتار کر گلاس اسے واپس کردیا۔

"بٹھل کی حالت اب کیسی ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

"انھیں ابھی کم زوری لاحق ہے۔ شاید ابھی انھیں ایک ڈیڑھ ہفتہ اور یہاں رُکنا پڑے۔"

"میں اس سے فوری ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے ا خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر کو باور کرانے کی کوشش ک کہ وہ میرا سب سے عزیز ساتھی ہے۔ "جو کسی کی زند بچانے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگادے، اسے آپ کی زبان میں کیا کہیں گے؟"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔" ڈاکٹر کاروباری اندا میں بولا۔ "ایسے لوگ قابلِ قدر ہوتے ہیں۔"

میں جواب میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اباجان کے آجانے کی وجہ سے خاموش ہوگیا۔ شاید میرے چہرے پر زندگی کی علامتیں واپس لوٹ آئی تھیں، اباجان لمبے لمبے قدم اٹھا میرے قریب آگئے۔

"خدا کا شکر ہے کہ آج تمہارے چہرے پر بیماری کا و اضمحلال نظر نہیں آتا جو کل تک موجود تھا۔"

"مجھے بھی خوشی ہے کہ مسٹر بابر اب خطرے سے باہر ہیں۔" ڈاکٹر احسان نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ میں دو چار دنوں میں ..."

"میں یہاں کی گھٹن سے اُکتا گیا ہوں۔" میں نے اباجان سے کہا۔ "شہر کے دو چار بڑے ڈاکٹروں اور تجربہ کار نرسوں کا انتظام گھر پر بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ..." اباجان نے بڑی شفقت سے میری پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ "میں آج ہی حویلی کے ایک حصے کو ٹھیک کرادوں گا، گھریلو ماحول میں تمہاری صحت پر زیادہ خوش گوار مرتب ہوں گے۔"

"سیورین ...!" میں نے سیورین کو مخاطب کیا۔ "میرے وہیل چیئر کا بندوبست کرو، میں اسی وقت بٹھل سے ملنا ہوں۔" سیورین میری بات سن کر تیزی سے باہر کی پکی۔

"ھنے کی کوشش کریں مسٹر بابر۔" ڈاکٹر احسان کے پیٹ روڑ شروع ہوگئی۔ "مسٹر بٹھل کو ہم ان کی مخدوش حالت ش نظر مسکن ادویہ کے زیر اثر رکھتے ہیں۔"

"فکرمند نہ ہوں، میں اسے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش نہیں وں گا۔"

سیورین وہیل چیئر لے آئی۔ وہ بھی تجربہ کار تھی، میری دلی ی کا اندازہ اسے بھی بہ خوبی ہوگا۔ بات اگر خطرے کی تو یقیناً وہ بھی میرے حکم کی تعمیل میں لیت ولعل سے کام اباجان اور ڈاکٹر احسان کی مدد سے مجھے بہ مشکل وہیل منتقل کیا گیا۔ ڈاکٹر احسان کچھ زیادہ ہی مضطرب نظر آرہا اس کے اضطراب کی وہ کیفیت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ ین نے پشت پر آکر وہیل چیئر سنبھالی تو ڈاکٹر احسان نے چباتے ہوئے کہا۔ "مسٹر بابر، پلیز، آپ بات کو سمجھنے کی ش کریں۔"

"کیا بات ہے مسٹر احسان۔" اباجان نے بھی ڈاکٹر کی ہٹ تاڑ لی۔

"جی ... وہ ... کچھ نہیں۔" ڈاکٹر احسان راستے سے ہٹ گیا۔ رین نے وہیل چیئر کمرے سے باہر نکالی۔ میرے دل کی حالت غیر ہونے لگی۔ ڈاکٹر کی تشویش اور بٹھل کے بارے موں کے مخدوش ہونے والے جملے میرے ذہن میں گڈمڈ نے لگے۔ دس قدم کے فاصلے پر دوسرا کمرا تھا۔ اباجان نے دروازہ کھول دیا۔ سیورین مجھے لے کر اندر داخل ہوئی تو پر نظر پڑتے ہی میں گنگ ہوگیا۔ ذہن پر سوالات کی یلغار تھی۔ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ بٹھل نے ڈاکٹر احسان کے منع کے باوجود مجھے کئی بوتل خون دیا تھا لیکن اس کے سر پر وہ صد بھی نہیں باندھی گئی ہوں گی، چہرے کی رنگت زرد تھی، کوئی بھید تو ہوگا؟

ری نظریں بٹھل کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اس وقت بے ہوشی کا غلبہ رہا ہوگا ورنہ وہ ایک آہٹ پر چونک لینے کا عادی تھا۔

"حوصلے سے کام لو بیٹے۔" اباجان نے بڑی شفقت سے کہا۔ "تمھیں یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ بٹھل صاحب تمہارے وجود کی سب سے معتبر اکائی ہیں۔ یہ پٹیاں اسی انمول جذبوں کی ترجمانی ہیں۔"

"کیا ہوگیا تھا بٹھل کو؟" میں نے دہکتی آواز میں سیورین سے سوال کیا۔

"بابا کو آپ سے شکایت ہے کہ اکیلے کیوں چلے گئے۔" سیورین دبی زبان میں بولی۔ "جب ڈاکٹر احسان نے اظہار کیا کہ آپ کے جسم میں زہر پھیل رہا ہے تو بابا پر دیوانگی طاری ہوگئی۔ دیواروں سے سر ٹکرانے لگے۔ ڈاکٹر کے علاوہ اسپتال کے دوسرے عملے کے افراد بھی بابا سے لپٹ گئے۔ بڑی مشکلوں سے اُن پر قابو پایا گیا۔ بے ہوشی کا انجکشن نہ دیا گیا ہوتا تو بات ہمارے قابو سے باہر بھی ہوسکتی تھی۔"

"لیکن ڈاکٹر احسان کا کہنا ہے کہ اب بات خطرے کی نہیں ہے، دو تین روز میں یہ پٹیاں کھول دی جائیں گی۔" اباجان نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔

میرے دل پر کیا گزر رہی تھی، کون اندازہ کرسکتا تھا۔ وہ شخص جو خود اپنی پرچھائیں سے بھی محتاط رہنے کا عادی تھا اس وقت عالمِ بے خبری سے دوچار تھا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا اور ایسی کوئی خبر مجھے ملی ہوتی تو شاید مجھ پر بھی اسی طرح دیوانگی طاری ہوجاتی۔ عشق جنون کی کیفیت اختیار کرلے تو پھر نتائج پر غور نہیں کیا جاتا۔ میں بھی اس وقت ایسی ذہنی کش مکش کا شکار ہو رہا تھا جب ڈاکٹر احسان بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔

"وہ ... وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے فون پر دھمکی ملی تھی ... اسے میں مذاق سمجھا تھا لیکن ..."

"کیا ہوا ڈاکٹر ...؟" اباجان نے ڈاکٹر کے چہرے کی رنگت متغیر محسوس کی تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔ "آپ کس دھمکی اور خطرے کی بات کررہے ہیں؟"

"وہ ... انھوں نے کہا تھا کہ میں مسٹر بابر اور بٹھل صاحب کے علاج میں زیادہ سرگرمی نہ دکھاؤں ورنہ ..."

"ورنہ کیا ...؟" میں نے ڈاکٹر سے براہِ راست سوال کیا۔ اس کے چہرے کی رنگت اس وقت بٹھل سے زیادہ زرد ہورہی تھی۔

"فون پر اکثر اس قسم کی فضول باتیں ہوتی ہیں، میں ان پر کبھی دھیان نہیں دیتا لیکن اس بار ... اس بار دھمکی دینے والوں نے جو کہا، وہ کر دکھایا۔" ڈاکٹر بری طرح نروس ہورہا تھا۔

"جانے کون بدبخت لوگ تھے، انھوں نے ہیڈ نرس کو مار دیا۔"

"آپ سیتا کی بات کر رہے ہیں؟" سیورین نے چونک کر پوچھا۔ "جو ہمارے کمروں پر تعینات تھی۔"

"ہاں..." ڈاکٹر احسان نے میری طرف غور سے دیکھا۔

"کیا آپ ان لوگوں سے واقف ہیں جنھوں نے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"نہیں..." میرا سارا وجود دھمکنے لگا۔ "کیا آپ نے سیتا کو بچانے کی کوشش نہیں کی؟"

"میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ زندگی کی سرحدوں کو پھلانگ چکی تھی۔"

"اب آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" میں نے بہ عجلت سوال کیا۔

"پولیس کو اطلاع دینی ضروری ہے۔" ڈاکٹر ہاتھ ملنے لگا۔ "اسپتال کی ریپوٹیشن کا بھی خیال ہے۔"

میرے ذہن میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ دو اور دو چار کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جو لوگ کورا کو لے گئے تھے، اب میرے اور بتھل کی جان لینے کے درپے تھے۔ کورا کو پالینے کے بعد ان کے حوصلے بڑھ چکے ہوں گے۔ ممکن ہے، سیتا کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پیشتر انھوں نے میرے کمرے میں بھی جھانکا ہو۔ کسی خطرے سے دوچار ہونے کا خوف ان کے راستے میں حائل ہو گیا۔ وہ سیتا کو لاش کی صورت دے کر ہمارے لیے موت کا پیغام چھوڑ کر رخصت ہو گئے ہوں۔ میں نے اس وقت بتھل کے کمرے میں آنے کی ضد نہ کی ہوتی تو شاید وہ بتھل پر وار کر کے نکل جاتے، اور میں تمام زندگی کف افسوس ملتا رہتا۔ ابا جان پر بھی اضطراری کیفیت طاری تھی۔

"ڈاکٹر احسان..." انھوں نے کچھ سوچ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "سیتا کو جو حادثہ پیش آچکا ہے اس میں میرے بیٹے یا بتھل صاحب کا نام درمیان میں نہیں آنا چاہیے..."

"لیکن..."

"میں، بابر اور بتھل صاحب تو بلا تاخیر یہاں سے جانا مناسب سمجھیں گے۔"

"مگر پولیس تو بال کی کھال نکالنے کی کوشش ضرور کرے گی۔" ڈاکٹر نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

"اس کے بارے میں آپ جو چاہیں بیان دیں۔" ابا جان نے اپنا اٹل فیصلہ سنا دیا۔ "آپ کے اسپتال کی ناقص سیکیورٹی بھی ہیڈ نرس کی موت کی ذمے دار ہے۔"

ڈاکٹر احسان تلملاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ سیو بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ میرے ذہن میں جانگ قبیلے لوگ گردش کرنے لگے۔ ایک کامیابی نے ان کے حوصلے بل کردیے تھے۔ شاید انھوں نے سارے کانٹے درمیان نکالنے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ بھی جانتے ہوں گے کہ مجھے او بتھل کو راستے سے ہٹانے کے بعد پھر کسی کو کورا کی ذات کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ اڈے پاڑے کے لوگ دو کی جگہ د ماریں گے۔ اشتعال کی آگ پھیلتی ہے تو اپنے اور پرائیوں تمیز نہیں کرتی۔ جانگ قبیلے کے سرپھرے اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد پہلی فرصت میں واپسی کی راہ اختیار کریں گے شبہے کی بنیاد پر اڈے کے سرپھرے ہنگامے سے باز نہیں آ گے۔ بہت سے مخالفین بھی بلاوجہ کام آجائیں گے، گیہوں ساتھ گھن بھی پیس دیے جائیں گے۔ صحیح یا غلط کا فیصلہ بعد ہوگا، محبت اور جنگ میں ازل سے یہی ہوتا آیا ہے!

میرے لیے ابا جان کی پریشانی بھی بے جا نہیں تھی۔ پولیس کچہری سے ہمیشہ دور رہنے کے عادی تھے۔ میں بھی رہا تھا کہ ڈاکٹر احسان ان کے حکم سے روگردانی کی غلطی کرے گا۔ سیتا کی موت کے دس جواز تلاش کرلے گا۔

ہم دونوں ہی اپنے خیالات میں گم تھے کہ سیورین وا آگئی۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ بمبئی کا استاد بناری فیض آباد کا جامو بھی تھا۔ اس وقت دونوں کے لباس دیکھ کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کس کینڈے سرپھرے افراد تھے۔ دونوں نے باری باری مجھے اور بتھل دیکھا۔ بناری مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ابا جان انھیں بولنے کا موقع نہیں دیا۔

"سیورین نے ذہانت کا ثبوت دیا جو آپ حضرات کو آئی۔ آپ دونوں ادھر ہی رہیں۔ میں ابھی بابر اور صاحب کو حویلی منتقل کرنے کے انتظامات کرتا ہوں۔"

"سب خیریت تو ہے، بڑے صاحب؟" جامو نے کھا کر پوچھا۔ "کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہو تو ہم سے بو کس کی موت نے آواز دی ہے؟"

"ہم آپ کے تابع دار ہیں۔" بناری بھی چپ نہ رہ "آپ خالی اشارہ کردو... باقی جھاڑو پھیرنے میں ہم نہیں کریں گے۔"

ابا جان نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے باہ گئے۔ سیورین نے دروازہ اندر سے بند کیا تو جامو کا ماتھا

"کیا بات ہے لاڈلے جانی...؟ یہ بڑے صاحب ہمارے ہوتے پریشان کیوں ہیں، اپن کو بول، کس حرام کے جنے کی موت نے دعوت دی ہے؟"

"یہاں نہیں..." میں نے انھیں ٹالنا مناسب سمجھا۔ "حویلی چل کر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

"پر بڑے صاحب نے اچانک ادھر سے ٹکٹ کٹانے کا فیصلہ کیوں کرلیا؟" بناری نے بتھل پر نظر ڈالی۔ "ابھی میرے کو استاد کی طبیعت ٹھیک نہیں دکھائی دیتی۔ اتنی جلدی کیا چیش آگئی؟"

"کہا نا... حویلی چل کر اطمینان سے بات ہوگی۔" میں نے بے رخی کا اظہار کیا تو دونوں خاموش ہو گئے۔

بتھل نیند میں کچھ بڑبڑایا۔ سیورین اس کے سرہانے بیٹھ کر سر سہلانے لگی۔ سب کی نظریں بتھل کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میرے وجود میں انتقام کی چنگاریاں شعلوں کا روپ اختیار کرنے لگیں...!

ابا جان کی کوششوں اور اثر رسوخ کے سبب میں اور بتھل دو گھنٹے کے اندر اندر اسپتال سے منتقل ہو کر حویلی آگئے۔ زرین نے اپنی نگرانی میں مہمان خانے کے دو کمروں کو خالی کرا کے اسے کسی اسپتال کے اسپیشل وارڈ جیسا بنا دیا تھا۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

سارے انتظامات مکمل کرلیے گئے تھے۔ ہم ایمبولینس کے ذریعے حویلی پہنچے تو باہر گھر والوں کا ہجوم ہمارا منتظر تھا۔ سب کے چہروں پر اضطراب تھا۔ بتھل کی بے ہوشی برقرار تھی، اسے اسٹریچر پر ڈال کر بستر تک پہنچایا گیا۔ جامو اور بناری مجھے سہارا دیے ہوئے تھے۔ میں نے بستر پر لیٹ کر سکون کا سانس لیا۔ گھر گھر ہی ہوتا ہے۔ اسپتال کے بوجھل ماحول میں مریض تو کیا، صحت مند آدمی کو بھی اپنی سانس گھٹتی محسوس ہوتی ہے۔ مریضوں کی کراہیں، تیمارداروں کی آمدورفت اور طرح طرح کی کہانیاں فضا اور ماحول کو سوگوار بنائے رکھتی ہیں۔ گھر پر انسان اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے، بادشاہ ہوتا ہے۔ وہاں صرف اس کا حکم چلتا ہے، دوسروں کی محتاجی نہیں ہوتی، ایک اشارے پر سارے کام خودکار انداز میں ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارے کمرے کے ساتھ ہی ایک کمرا ڈاکٹروں اور نرسوں کے لیے بطور آفس ریزرو کردیا گیا تھا۔ بارہ دری میں اڈے کے لوگوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ وہ سب جانے پہچانے تھے۔ کسی نے ان کی آمدورفت پر اعتراض نہیں کیا۔

ڈاکٹر احسان کے علاوہ ابا جان نے دو ماہرین اور رات دن کی ڈیوٹی کے لیے چار نرسوں کا انتظام کرلیا تھا۔ سیورین بھی ان کے ساتھ ساتھ لگی رہتی۔

ایک دن سکون سے گزر گیا۔ بتھل کی طبیعت کچھ بہتر ہو رہی تھی۔ مجھے سیورین کے ذریعے اس کی خبریں ملتی رہتیں۔ میں چاہتا تو وہیل چیئر پر بیٹھ کر اس کے کمرے میں بھی جاسکتا تھا لیکن میں خود بھی بتھل سے شرمندہ تھا۔ بیماری کی کیفیت میں اس کا سامنا کرنے سے گریز ہی مناسب تھا۔ ڈاکٹر تیمارداری کر کے نئی دوائیں تجویز کر کے چلے جاتے تو اڈے پاڑے کے لوگ باری باری ہماری خیریت دریافت کرنے آتے رہتے۔ اس وقت میرے پاس جمرد بیٹھا تھا۔ میری طبیعت کی بہتری کا اندازہ لگا لینے کے بعد بولا۔ "خاموشی سے کام نہیں چلے گا لاڈلے! اگر کسی حرام کے تخم نے اپن کا رستا کھوٹا کرنے کی کوشش کی ہے تو صرف اس کا نام بتا دے۔ اپن اسے پاتال سے بھی گھسیٹ لائے گا۔ اپن نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا تو استاد کے نام کو بٹا لگ جائے گا۔ اپن کا ایک فارمولا یاد رکھ جانی۔ جب تک کسی کی ماں کے ساتھ رشتے قائم نہیں ہوتا، سالا بیٹا بھی باپ نہیں بولنے کا۔"

"تھوڑا وقت اور گزر جانے دو، بتھل ٹھیک ہو جائے تو سر جوڑ کر کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"یہ سالا ماہرین لوگ کا ٹیم کیا بولتا استاد کے بارے میں؟"

نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر کاشف حسین غائر
کا پہلا شعری مجموعہ

شہرزاد
بی 155، بلاک 5، گلشن اقبال، کراچی
asiffarrukhi@hotmail.com ای میل

"ان کا خیال ہے کہ ایک دو دن میں سر کی پٹیاں کھل جائیں گی۔ اس کے بعد زخم پر منحصر ہے۔ اس کے بھرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

ہمارے درمیان بات ہو رہی تھی کہ بنارسی نے آواز دے کر جرو کو باہر بلا لیا۔ باہر سے دو تین گاڑیوں کے رُکنے کی آواز آئی۔ میں نے نظر گھما کر دیکھا، وہ سب پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ میں نے انسپکٹر بلرام کو جیپ سے اُترتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ فیض آباد میں ڈی آئی جی سریندر کپور کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ فیض آباد آنے سے پہلے وہ بمبئی میں اڈے کے علاقے کا تھانہ انچارج بھی رہ چکا تھا۔ دو تین گاڑیوں میں باوردی پولیس والے بھی ساتھ تھے۔ اس کے آنے کا کوئی خاص مقصد ضرور ہوگا۔ دوسری گاڑیوں سے دس بارہ پولیس والوں نے نیچے کود کر اس طرح پوزیشنیں سنبھال لیں جیسے پوری حویلی کو گھیرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ سیورین میرے پاس آ گئی۔ میں تکیے کے سہارے پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں انسپکٹر بلرام پر مرکوز تھیں۔ وہ بڑے طمطراق سے کڑک وردی پہنے میرے کمرے کی طرف آیا تھا۔ باہر جو ملازم موجود تھا وہ ابا جان کو خبر دینے دوڑا۔ بلرام قدم مارتا اندر آ گیا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ جس اسپتال میں تھے وہاں کی ہیڈ نرس کو کسی نے زہر دے کر مار دیا؟"

"انسان مرنے ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔" میرے لہجے میں تلخی گھلنے لگی۔ "جب وقت آ جاتا ہے تو بات انسان کے بس میں نہیں رہتی۔"

"بٹھل کہاں ہے؟" بلرام نے اگلا سوال کیا۔

میں اس کے آنے کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ بدستور کھردرے لہجے میں بولا۔ "وہ دوسرے کمرے میں ہے۔"

"سنا ہے وہ بھی کچھ زخمی ہے؟"

"آپ کس مقصد سے آئے ہیں؟" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔

بلرام کے جواب دینے سے پیش تر ابا جان بھی قدم مارتے اندر آ گئے۔ پولیس کی آمد کی اطلاع نے انھیں بھی حواس باختہ کر دیا تھا۔ "کیا بات ہے؟" انھوں نے بلرام پر اُچٹتی نظر ڈال کر مجھے مخاطب کیا۔

"پرانے واقف کار ہیں..." میں نے طنز کیا۔ "شاید میری اور بٹھل کی خیریت دریافت کرنے آئے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے بمبئی میں تعینات تھے۔"

"آپ کھڑے کیوں ہیں... تشریف رکھیے۔" ابا جان بلرام کی طرف گھوم گئے۔

"مسٹر بابر..." بلرام نے اچانک کینچلی بدلی۔ "آپ شاید کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔ پولیس اور جنتا کے درمیان غلط فہمی پیدا ہونا کوئی نئی بات بھی نہیں۔ لیکن اس وقت میں آن ڈیوٹی ہوں۔"

"کیا چاہتے ہیں؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"آپ نے اسپتال چھوڑنے کا فیصلہ اچانک کیوں کر لیا... ؟ کیا وہاں کوئی تکلیف تھی؟"

"میں سمجھا نہیں..." میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "کیا اسپتال کی تبدیلی کے لیے بھی اب پولیس کی اجازت ضروری ہو گئی ہے؟"

میرے سوال کی تلخی کا رنگ ایک لمحے کو بلرام کے چہرے پر نمایاں ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اٹینشن پوزیشن میں آ گیا۔ باہر پھر کسی گاڑی رُکنے کی آواز ابھری تو میری نظریں پھر دروازے کی طرف چلی گئیں۔ بلرام اور پولیس والوں کی پیشگی آمد کی وجہ سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ لمبی سی چمچماتی گاڑی کا دروازہ ایک پولیس والے نے کھولا پھر اس میں سے جو شخصیت نمودار ہوئی وہ ڈی آئی جی سریندر کپور کی تھی۔ میں نے اپنے انداز کو تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس وقت وہ تھری پیس سوٹ میں بھی خاصا بھاری بھرکم ہی نظر آ رہا تھا۔

سریندر کپور اپنے گھر پر جس انداز میں ملا تھا اس کا ایک ایک منظر میرے ذہن پر نقش تھا لیکن اس وقت وہ پورے ہوش حواس میں ایک مہذب اور ذمے دار آفیسر نظر آ رہا تھا۔ باہر کھڑے ہوئے پولیس والے اسے دھڑا دھڑ سیلیوٹ مار رہے تھے۔ انسپکٹر بلرام بھی اس کے استقبال کو تیزی سے آگے بڑھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں ابا جان کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ وہ بھی سنبھل گئے۔

سریندر کپور سیڑھیاں پھلانگتا میرے قریب آ گیا۔ میں نے ابا جان سے اس کا تعارف کرایا۔ سریندر کپور نے بڑے احترام سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا پھر میرے قریب ہی بستر پر بیٹھ گیا۔

"ینگ مین... اب کیسا فیل کر رہے ہو؟" اس کا انداز دوستانہ تھا۔ "مجھے کچھ دیر پہلے شکلا جی کا فون ملا تھا۔ زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ وہ جلدی میں تھا، ایک دو دن بعد آنے کو کہہ رہا بلرام کے ذریعے مجھے تمہارے اچانک اسپتال سے گھر نے کی اطلاع ملی تو سمجھ گیا کہ اس اچانک فیصلے کی کوئی خاص بھی ہوگی۔" وہ روانی سے بولتا رہا۔ "یہ بھی خبر مل چکی ہے کہ تال کی ایک ہیڈ نرس کو زہر دے کر مارا گیا ہے۔ تھانے کے تفتیش میں لگے ہیں، میں تمہاری خیریت دریافت کرنے یا، شکلا نے یہی درخواست کی تھی۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ انسپکٹر بلرام، ڈی آئی جی کا گفتگو سن کر کھڑے ہی کھڑے چرمرانے لگا۔

"آپ کی ذرہ نوازی ہے جو آپ نے زحمت کی۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں..."

"آپ میرے پتا سمان ہے جناب۔" سریندر کپور نے کھڑے ہو کر ابا جان سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔ "آپ کا نام کئی الوں تک آ چکا ہے۔ آج ملاقات بھی ہو گئی، اب آنا جانا ہے گا۔"

"لیکن یوں ہوا کے گھوڑے پر سوار آنا کچھ عجیب سا لگ ہے۔"

"نو فارمیلٹی..." سریندر کپور نے مسکرا کر کہا۔ "مسٹر کلا کے دوست ہیں، آپ جب بلائیں گے سر کے بل آ جاؤں گا۔"

"نوازش ہوگی..." ابا جان نے انکسار سے کہا۔

"ویل مسٹر بابر..." ڈی آئی جی پھر میری طرف گھوم گیا۔ خیال رکھنا، لائف ہیز نو اسپیر، انسان پوری طرح فٹ نہ پھر لائف انجوائے نہیں کر سکتا۔" آخری جملہ ادا کرتے شاید اس نے پہلی ملاقات کے حوالے سے زندگی انجوائے نے کی بات کی جانب اشارہ کیا تھا پھر جانے کے لیے پر لگا۔ "میں ایک ضروری میٹنگ میں جا رہا تھا، شکلا جی کا آیا تو سیدھا ادھر آ گیا۔ بائی دی وے، تمھیں اسپتال والوں کوئی شکایت تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں..."

"پھر تمھیں پوری طرح ریکور ہوئے بغیر گھر آنے کی کیا جلدی پڑ گئی...؟"

"وہاں کے ماحول سے اُکتا گیا تھا۔" میں نے بہانہ کچھ نہ کچھ جواب تو دینا تھا۔

"اچھا کیا..." سریندر کپور نے جاتے جاتے کہا۔ "کسی بھی ضرورت پڑے تو ہچکچانا مت، فون کر لینا۔"

وہ ابا جان کے ساتھ گفتگو کرتا، واپس جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ پولیس کی گاڑیاں بھی حویلی کے احاطے سے نکل گئیں۔ انسپکٹر بلرام بھی چلا گیا۔ جیپ روانہ ہوتے وقت اس نے بھی میری سمت دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔ سریندر کپور کے آنے کے بعد شاید اسے بھی میری حیثیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ دنیا بھی کیا عجیب مقام ہے۔ یہاں انسان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں، اسے مختلف حوالوں سے شناخت کیا جاتا ہے، تعلقات کی بنیاد پر اس کے چھوٹے یا بڑے ہونے کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

سریندر کپور کا ابا جان کی حویلی آنا ہم سب کے لیے نیک شگون تھا۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی شخصیت کا مالک نہیں تھا۔ فیض آباد کا ڈی آئی جی تھا، بادشاہ تھا۔ اس نے گھر سے نکلتے وقت یہی کہا ہوگا کہ کسی اہم میٹنگ میں جانا ہے، اس کی حیثیت کے مطابق پولیس کے باوردی اسلحہ بردار سپاہی بھی بغیر کسی توقف کے پورے کیل کانٹے سے لیس ہو کر جیپوں میں بیٹھ گئے ہوں گے۔ انسپکٹر بلرام جو اس کا رابطہ افسر تھا، وہ بھی بڑے طمطراق سے دُم چھلے کی طرح ساتھ لگ گیا ہوگا۔

راستے میں سریندر کپور نے میری حویلی کا ذکر کیا تو شاید اس کی باچھیں کھل گئی ہوں گی۔ یہی سوچا ہوگا کہ شاید ڈی آئی جی کو بھی بمبئی میں بٹھل کے ہاتھوں گوتم کے قتل اور وہاں کے معاملات کے بارے میں بھنک مل گئی ہو۔ یہ بھی پتا چلا ہوگا کہ میں بٹھل کا دست راست فیض آباد آ گیا ہوں۔ سریندر کپور کے بارے میں ایس پی شکلا نے مجھے ہی باور کرایا تھا کہ اس کے نجی معاملات اور ذاتی حیثیت میں کارکردگی کے جوہر دکھانے میں زمین و آسماں کا فرق ہے۔ جو کوئی دوسرا آفیسر نہیں کر سکتا، وہ سریندر کپور بے دھڑک کر گزرتا تھا۔

میں اس کی تلاش میں کوتوالی پہنچا تو مجھے دیکھ کر خود انسپکٹر بلرام کی نگاہوں میں چکاچوند ہوئی تھی۔ اس نے بڑی رعونت سے مجھے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا، آج سریندر کپور کی وجہ سے مجھے آپ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ حویلی میں اپنے افسر کے رویے کو دیکھ کر اس کی چھاتی پر سانپ ضرور لوٹے ہوں گے۔ یہ بھی جان گیا ہوگا کہ سریندر کپور ایک دوست، واقف کار کی حیثیت سے میری خیریت دریافت کرنے آیا تھا، بار بار ایس پی شکلا کا نام بھی درمیان میں آیا تھا جس نے بلرام کی دُم بھی سیدھی کر دی ہوگی۔ وہ جاتے جاتے، نگاہوں نگاہوں میں مجھے دوستی کا پیغام بھی دینا نہیں بھولا تھا۔

سریندر کپور سے پہلی ملاقات میں میں نے اس کے ذاتی

کردار کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اُس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں محض ایک دھوتی میں تھا۔ دھوتی بھی برائے نام اس کے جسم کی ستر پوشی کررہی تھی۔ وہ ایک بدیسی حسینہ کے ساتھ موج میلے میں مگن تھا۔ ڈرپوک آفیسر ہوتا تو مجھے اس رنگین ماحول میں کبھی نہ بلاتا، غیر ملکی پھلجڑی مجھ پر ریشہ خطمی ہونے لگی تھی۔ اس نے مجھے پینے پلانے کی دعوت دی تھی۔ سریندر کپور نے بھی پیش کش کی تھی۔ میں ایک دو لمبے پیگ حلق کے نیچے اتار لیتا تو شاید اُس حمام میں ایک اور ننگے کا اضافہ ہوجاتا۔ مجھے سریندر کپور کی موجودگی میں کھل کھیلنے کا موقع نہ ملتا۔ وہ یقینی طور پر مل بانٹ کر عیاشی پر کبھی آمادہ نہ ہوگا۔ محتاط افسر نہ ہوتا تو اس نے ولایتی مال کا انتخاب نہ کیا ہوتا۔ تجربہ کار تھا، جانتا ہوگا کہ دیسی کنجریاں پورے لباس میں آنے کے بعد ساری رازداری کی باتوں کو طشت ازبام کردیتی ہیں۔ امپورٹڈ ساحرائیں ان باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ وہ ذاتی تعلقات میں کسی کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتیں۔ انسانی قدروں اور اپنی اپنی تہذیب کی روایتیں ہیں۔ مشرق میں باپ کی موجودگی میں بیوی شوہر کی طرف ایک شوخ نظر اٹھانے کو بھی بے حیائی سمجھتی ہے۔ مغرب میں شوہر کی موجودگی میں بھی کسی غیر مرد سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوجانے کو تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے نجی معاملات کے بارے میں بھی چھان پھٹک نہیں کرتے۔

بہرحال، سریندر کپور سے میری ملاقات جس ماحول میں ہوئی تھی اسے سریندر کپور بھی کبھی فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ اسے شکلا کی زبانی اسپتال میں سیتا کے پُراسرار قتل کی تفصیل بھی معلوم ہوگئی ہوگی۔ اسی وجہ سے اس نے صرف مجھی سے پوچھنے پر اکتفا کی تھی کہ پوری طرح صحت یاب ہوئے بغیر میں بہ عجلت حویلی کیوں آگیا؟ سیتا کی موت کا اس نے جان بوجھ کر ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ کوئی اور ہوتا تو میری مزاج پرسی کے بہانے بال کی کھال نکالنے کی کرید میں لگ جاتا۔ سریندر کپور نے ایسا کچھ نہیں کیا، سب سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ جاتے جاتے یہ بھی کہہ گیا کہ اب آنا جانا لگا رہے گا۔

میں اپنے خیالات میں محو تھا کہ ابا جان دوبارہ آگئے۔ سیورین میرے قریب ہی تھی۔

"میں ابھی تک یہی محسوس کررہا ہوں کہ میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

"جی... میں سمجھا نہیں؟"

"سب تمہارے شکلا جی کی مہربانی ہے ورنہ میں اتنے عرصے سے فیض آباد میں ہوں، سارے بڑے افسران معززین سے کسی نہ کسی طور واقف ہوں لیکن سریندر کپور بارے میں صرف ایک ہی بات سب کی زبان سے سنی ہے کہ وہ تنک چڑھا اور بددماغ ہونے کے علاوہ اپنی مرضی مالک ہے۔ شاید بہت دُور تک اس نے اپنی جڑیں مضبوط رکھی ہیں۔ آئی جی اور ہوم منسٹر کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ بھی اس سے کوئی کام کہتے ہوئے کتراتے ہیں۔" ابا جا کچھ توقف سے گویا ہوئے۔ "اس کا اس طرح حویلی آنا تمہاری عیادت کرنا اور مجھ سے یہ کہنا کہ میں اس کے سمان ہوں، بڑی بات ہے۔"

ابا جان بڑی دیر تک سریندر کپور کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کرتے رہے۔ زرین نے بھی پہلی بار میری زبان سے سریندر کپور کا نام سُن کر کسی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا، دبی زبان میں گریز کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت ابا جان اسی کے گُن گا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ انسان بھی کتنا خود غرض ہوتا ہے، مطلب پرست اور وقت کا پجاری۔ گرگٹ سے زیادہ برق رفتاری سے رنگ بدلنا ہی اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ کورا کے نقشے سے جانگ قبیلے کے خزانے تک پہنچنے کی خاطر وہ صرف اپنی ضرورت اور ذات سے منتی ہوگئے۔ دربدر ہوگئے، بیش بہا خزانہ ہاتھ آیا تو ان کی حیثیت رکھ رکھاؤ، گفتگو کا انداز، اٹھنا بیٹھنا، رہن سہن، طور طریق، سب کچھ بدل گیا۔ حیثیت بھی بڑھ گئی، عزت و وقار کا گراف بھی بلند ہوگیا۔ اس وقت سریندر کپور کے ساتھ ایک بار گرم جوشی سے ہاتھ ملانے کے بعد ان کے خون کی گردش پھر تیز ہوگئی۔ کہیں وہ اسی سریندر کپور کو ایک غیر ملکی حسینہ کے پہلو میں تن کا درجۂ حرارت تیز کرتا دیکھ لیتے تو ناک بھوں چڑھانے لگتے۔

"تم سے ایک ضروری بات اَور کرنی ہے۔" ابا جان نے سریندر کپور کا قصیدہ ختم کرنے کے بعد کہا۔ "میں نے تم سے مشورہ کیے بغیر ہی اڈے پاڑے کے افراد کو عقبی دروازے سے وقتی طور پر سامنے سے ہٹادیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر سب ہی کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ بٹھل صاحب ہوش میں ہوتے تو میں انھیں وقتی مصلحت سے ضرور آگاہ کردیتا۔"

"آپ نے جو اقدام کیا' وہی مناسب بھی تھا۔ میں جامو اور بناری کو سمجھادوں گا کہ وہ بھی خیال رکھیں، ایک وقت میں دو چار آدمیوں سے زیادہ جمع نہ ہوں۔ حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، آج سریندر کپور اپنی مرضی سے فیض آباد چھوڑ کر بمبئی یا بنگلور چلا جائے تو نچلے افسران پھر ہاتھ پیر لانا شروع کردیں گے۔"

"یہی نکتہ میرے پیشِ نظر تھا۔" ابا جان جملہ مکمل کرکے لمحہ خاموش رہے پھر سنجیدگی سے بولے۔ "اصل حالات کیا یں اس کا اندازہ شکلا جی کے آنے کے بعد ہی ہوگا۔"

"کوئی خاص بات...؟" میرے وجود میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔

"ہاں... اسپتال میں تم سے بات کا موقع نہیں مل سکا۔ میں ہی تشویش میں مبتلا ہوں۔ کورا جتنی تمہیں عزیز ہے اس سے زادہ مجھے بھی عزیز ہے۔ میرا دل بھی گواہی دیتا ہے کہ میں اپنی دگی میں تمہارے سر پر سہرا ضرور دیکھوں گا، میری بہو میری اور تمہاری مشترکہ پسند سے وہی ہوگی۔"

"شکلا جی نے کیا کہا تھا...؟" میں مضطرب ہوگیا۔

"تفصیل نہیں بتائی۔ البتہ یقین دلا رہے تھے کہ انھیں بی کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے۔ اس دُبلے پتلے، سوکھے اور بظاہر مجہول نظر آنے والے بنگالی نے تمہارے کرشنا جی کو بھی سی موقع پر بے حد متاثر کیا تھا۔"

"ہوسکتا ہے انھوں نے اسے بھی کورا کے ساتھ ..."

"ایسا مت کہو بیٹے..." ابا نے بے چینی کا اظہار کیا "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہماری بیٹی جہاں بھی ہوگی، زندہ و سلامت ہوگی۔"

"بوڑھے اجین کے علاوہ خود کورا نے بھی کہا تھا کہ نئے سردار کو کسی اور کی نہیں، صرف اور صرف ان متبرک کاغذات کی ضرورت ہے جس کا جانگ قبیلے کے سردار کی تحویل میں ہونا ری سمجھا جاتا ہے۔ کاغذات ملنے سے پہلے کورا کو راستے سے ہٹا دینا ان کے لیے سودمند نہیں ہوگا۔"

"تم ڈاکٹر احسان کی بات کیوں فراموش کررہے ہو؟" ابا جان نے پھر مجھے تسلی دی۔ "تمہارا وجود بھی ان منحوس حملہ آوروں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ زہریلی سوئی اگر تمہارے جسم میں بس ایک پل اور رہ جاتی، غیر اختیاری طور پر تم نے بے ہوشی سے قبل اسے جسم سے کھینچ کر علیحدہ نہ کیا ہوتا..." ابا جان کا لہجہ بھیگنے لگا۔ جملہ مکمل نہ کرسکے۔

صرف انسان کی زندگی ہی پانی کا بلبلہ نہیں ہوتی، حیات کا ایک لمحہ بدلتی ساعتوں کا دست نگر ہوتا ہے۔ ایک پل میں، پلک جھپکتے ہی حالات بدل جاتے ہیں، کچھ کا کچھ ہوجاتا۔ میں بھی اسی کیفیت کا شکار تھا۔ ایک لمحہ قبل مجھے ابا جان سے شکوہ تھا کہ وہ کورا کی جانب سے بے پروا تھے۔ اب ان کی وابستگی اور وارفتگی کا عالم دیکھ کر میرا سارا شکوہ، تمام شکایتیں دُور ہوگئیں۔ حالات اور انسان کے درمیان آنکھ مچولی کا رشتہ ازل سے قائم ہے۔ میں اس سے مبرا کیوں کر ہوسکتا تھا۔ سانحے اور حادثات اچانک رونما ہوتے ہیں۔ انسان کا بس نہیں چلتا۔

کاٹھیاواڑ کے نام ور ڈاکو کرانتی کار اور اس کے سیکڑوں ساتھیوں نے جس وقت سمندری جہاز پر حملہ کرکے انگریزوں کے ساتھ ہمیں بھی ان کا نمائندہ سمجھ کر یرغمال بنالیا تھا' اس سے چند لمحے پیش تر ہم نے کسی ایسے حادثے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ہم بیٹھے پروفیسر تھامپسن کے ساتھ ہندوستانی تہذیب، تاریخ اور ثقافت کی باتیں کررہے تھے جب ولایتی شراب کی خوش بو اور تیزی نے دیسی ٹھرّے کی ایسی تیسی کردی تھی۔ ٹونی کی فرمائش پر جب چھچھاتی بوتل کا کارک اُڑایا گیا تو زورا اور جمرد بھی فاقہ زدوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ دو تین پیگ غٹاغٹ حلق سے معدے میں منتقل کرنے کے بعد ہی ٹونی ترنگ میں لہراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ نشے کی کیفیت میں چھوٹے بڑوں، اچھے اور برے کی تمیز بھی مٹ جاتی ہے۔ ٹونی بھی میجر برنارڈ کی بیوی مایا کو رقص کی دعوت دے بیٹھا۔ ٹونی کی جگہ کوئی ولایتی ہوتا تو میجر کی پیشانی کبھی شکن آلود نہ ہوتی لیکن مایا کو ایک ہندوستانی

جدید لغت

بڑھاپا:... ردی کی نوکری یا نوکری کی ردی

بڈھا:... چلتا پھرتا اسپتال

مچھر:... گانا گاکر آپ کا خون چوسنے والا۔

ہارٹ اٹیک:... آخرت کے لیے شارٹ کٹ۔

موت:... ہر غم کا خاتمہ

شادی:... ہر خوشی کا خاتمہ

سونا:... مردوں کے لیے آرام... عورتوں کے لیے زیور

زبان:... اچھی چیز ہے بشرطیکہ عورت کی نہ ہو۔

سیاست دان:... وہ گرگٹ جو ہر وقت رنگ بدل سکتا ہے۔

لیڈر:... جو ہر گٹھلی کو آم ثابت کرسکے۔

اسمبلی:... وہ حمام جس میں سب ننگے اکٹھا شور مچاتے ہیں۔

ابن حسن عثمان آبادی کے قلم سے

کے ساتھ رقص کرتا دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا، کم ظرفی پر اُتر آیا۔ پروفیسر کے احتجاج کے باوجود ہمیں اس حصے سے نکال باہر کیا جو صرف خاص اور اونچے طبقے کے لیے وقف تھا۔ میرا بھی خون کھول کر رہ گیا۔ بٹھل کی موجودگی میں ہم خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بٹھل کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ٹونی، جمرو اور زورا آپے سے باہر ہو گئے۔ جمرو نے ریلنگ کے پاس آ کر لڑکھڑائی آواز میں کہا۔ ''تُو نے ٹھیک ہی مشورہ دیا تھا لاڈلے جانی۔ میرا مستک پھر جاتا تو استاد اپن کو بھی معاف نہ کرتا مگر... ماں کسم، اپن اس حرامی لال بندر کو چھوڑنے کا نئیں۔ بھتیا کا 'کلف لگے کپڑے کی طرح اکڑ رہا تھا۔ اپن نے اس کا سارا ماڑ دوسرے راستے سے نہ نکال دیا تو نام بدل دینا۔''

جمرو کی دیکھا دیکھی ٹونی کی اصلیت بھی جاگ گئی۔ وہ بھی بل کھانے لگا۔ ''تو ایسا کر لاڈلے، استاد کے باجو میں جا کر کلٹی ہو جا، اسے تھپکی دے۔ میں اور جمرو اس لال کتیا کے جنے کو ایک دم خامشی سے کاٹ پیٹ کر ایدری سمندر میں لڑھکا دیں گے، سالی مچھلیاں بھی اپن کو تھینک یو بولیں گی... کیا؟''

''بعد میں بٹھل کو بھنک مل گئی تو بات بگڑ جائے گی۔'' میں نے انھیں مصلحتوں سے کام لینے کا مشورہ دیا۔

''پھر... تم کیا بولتا؟'' جمرو نے مجھے گھورا۔ ''تمھاری کھوپڑیا میں کیا ہے...؟''

''پروفیسر نے بتایا تھا کہ وہ بمبئی پہنچ کر کولابا میں مقیم ہوگا۔ اس کے بنگلے تک پہنچ کر ہم برنارڈ کا پتا بھی معلوم کر لیں گے۔''

لیکن... اس کی نوبت ہی نہیں آئی، درمیان میں ایک نئی کہانی نے جنم لے لیا جو زیادہ دل چسپ نہیں مگر ایڈونچرس ضرور تھی۔ ہم گھوم پھر کر پھر پرانی ڈگر پر آ گئے۔ ان کے بعد کورا کے ساتھ جو سانحہ بلم پور میں پیش آیا اس نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایک کڑی درمیان سے گم ہو گئی تو جیسے زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' ابا جان نے گم سم دیکھ کر مجھے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''بٹھل کی کیفیت اب کیسی ہے؟'' میں نے مفر سے کام لیا۔

''بٹھل صاحب کی حالت اب تشویش ناک نہیں ہے۔ صبح جو ڈاکٹر آیا تھا اس نے ٹیپ کھول دیں، کہیں کہیں پلاسٹر لگا دیا ہے، صبح کے ناشتے کے وقت ہوش میں بھی تھے لیکن...''

''لیکن کیا؟'' ابا جان کی خاموشی میرے اندر دھمک کرنے لگی۔

''تم سے ان کی ناراضی بے جا نہیں ہے۔'' ابا جان میری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر تلقین کی۔ ''تم کل بٹھل صا سے مل سکتے ہو مگر میرا مشورہ ہے کہ انھوں نے جو قربانیاں د ہیں' ان کا احترام کرنا۔ کوئی ایسی بات نہ کہنا جو اُن کی صحت اثر انداز ہو۔''

ابا جان مجھے مشورے دے کر واپس چلے گئے۔ مجھے بٹھل کی ناراضی کا احساس تھا۔ اس کی صحت یابی کی خبر ملی تو مجھے ایسا جیسے گاڑی کا وہ اہم پہیا جو جام ہو گیا تھا' اس کے متحرک ہونے سے ہر شے چل پڑی ہو۔ میں نے اسی وقت بٹھل سے ملنے خواہش کا اظہار کیا۔ سیورین دوسرے کمرے میں گئی، واپس آ کر اطلاع دی کہ وہ محو خواب ہے۔ میں نے اسے نیند سے جگ مناسب نہیں سمجھا، خود بھی آنکھیں موند کر پھر کورا کے خیال م ڈوبنے ابھرنے لگا۔ شکلا جی نے کورا کی زندگی کی موہوم امیدوں کو بنرجی کی ذات سے وابستہ کر رکھا تھا۔ وہ تجربے کار تھے، جہاں دیدہ تھے۔ ممکن ہے، انھوں نے جو توقع بنرجی سابقہ خدمات، تجربات اور کارگزاریوں کی بنیاد پر لگائی ہو، و درست ہو، مگر گزرتے وقت اور ساعتوں کا ایک ایک لمحہ میرے اندیشوں کو سوا کر رہا تھا۔ جانگ قبیلے کے لوگ اسے لے گئے تھے تو اسے اتنی دُور، کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنے کا منصوبہ بھی پیش نظر ضرور ہوگا۔ ان کا اختیار، عمل دخل زیادہ ہو، میری رسائی ممکن ہو، میری توجہ ہٹانے کی خاطر انھوں نے سیتا کو بے قصور حالات کی صلیب پر چڑھا دیا تھا۔ وہ اسپتال تک آنے کی جرأت کر سکتے تھے تو مجھے ہلاک کرنے کی خاطر حویلی میں بھ گھسنے کی جسارت کر سکتے تھے۔ اور بھی ان گنت اندیشے تھے جو بعید از امکان نہیں تھے۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ وقت کے ساتھ یقیناً کورا اور میرے درمیان فاصلے بھی اپنی پیمائش بڑھا رہے ہوں گے۔ کورا جانکنی کی کیفیتوں سے دوچار ہو گی، اس کی سہمی سہمی بے چین نظریں مجھے اِدھر اُدھر تلاش کر رہی ہوں گی، کسی دوست کی متلاشی ہو گی۔ وہ دشمنوں سے کسی دوستانہ سلوک کی توقع کر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ایک تنہا بنرجی اپنی ذات سے اس نازک سی کلی کو خزاں کے بدترین موسموں سے کس طرح بچا سکتا تھا۔ کیا دشمن اتنے غافل رہے ہوں گے کہ بنرجی کے تعاقب کو انھوں نے یکسر نظر انداز کر دیا ہوگا۔ اہم ترین سوال یہ تھا کہ جانگ قبیلے کے سردار کے لیے کورا کی زندگی

اہمیت ہو سکتی تھی؟ متبرک کاغذات کے حصول کے بعد ہات میں کورا کا قتل سر فہرست رہا ہوگا۔ بوڑھا اجین پر کورا کے ساتھ ان کاغذات کو بھی ساتھ لایا تھا۔ وہ مارے رسم و رواج اور دستور سے واقف تھا۔ کورا بالغ کے بعد شادی کر لیتی تو سردار کی گدی پر بیٹھے اس کے راز ور ٹوٹ جاتا، سارا طنطنہ دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ کے لوگ رواج کے مطابق خود اس کی ٹانگ گھسیٹ کر ے اتار دیتے۔ اس کی جگہ کورا کی حاکمیت تسلیم کر لی ب اس کی پلکوں کی ایک ایک جنبش کے تابع ے۔ کیا شکلا جی کو ان باتوں کی خبر نہیں ہو گی؟ کیا وہ حقائق ل تھے، محض بنرجی کی ذات سے امیدیں وابستہ کیے سی خوش خبری کا خواب دیکھ رہے تھے؟ انھیں مجھ پر قاتلانہ بھی ضرور ملی ہو گی۔ سیتا کی موت کے بعد ہی انھیں دی سنگینی کا احساس بھی شدت سے ہوا ہو گا جس کے نتیجے در کپور حویلی تک چلا آیا تھا۔ بہت سے سوال وضاحت اور میرے وجود میں کانٹے بن کر چبھ رہے تھے۔ شکلا کہاں تھے؟ بنرجی سے اگر انھوں نے توقعات وابستہ کی تھیں تو اس کا سبب کیا تھا؟ اور... میری کائنات، میری کا حاصل، میری زندگی کا اہم ترین سرمایہ، میری انمول ی معصوم سی گڑیا... میری کورا کہاں تھی؟ کس حال میں تھی بھی یا نہیں؟ میرا جنون پھر فزوں ہونے لگا۔

''وا پی لیں، وقت ہو گیا ہے۔'' سیورین کے ساتھ بیٹھی نے قریب آ کر کہا۔

ذہن منتشر ہو گیا۔ خیالات کا شیرازہ بکھر جائے تو آدمی سکتا ہے، زندگی کا شیرازہ بکھر جائے تو بات اپنے ں نہیں رہتی۔ دوسروں کی محتاجی انسان کو بے بسی کا شکار ہے۔ میں نرس کو گھورنے لگا۔ وہ زیادہ خوب صورت ی۔ اس کی عمر بھی زیادہ نہ تھی لیکن اس کی آنکھوں کے یرانوں کا ڈیرا تھا۔ جانے کس بات کا دکھ لاحق تھا اسے؟ کی نگاہوں کے عقب میں جھانکنے لگا۔ بس یونہی، کوئی ی، ایک لمحہ پہلے میرے ذہن پر کورا چھائی ہوئی تھی، کے کسی دکھ کا احساس مجھے ڈسنے لگا۔ ابا جان نے لیے اس کی خدمات خرید لی تھیں۔ وہ بکاؤ مال نہیں تھی کے لیے ایندھن کا حصول اُسے اس پیشے میں لے آیا اور حالات انسان کے پیروں کی بیڑیاں بن جاتے ہوئے بھی وہ اپنی مرضی کے خلاف بہت کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تنگ دستی حد سے گزر جائے تو پھر غلامی کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

''کیا بات ہے...؟'' سرہانے سے سیورین کی آواز اُبھری۔ وہ بڑی دیر سے قریب بیٹھی اپنی نازک انگلیوں سے میری پیشانی سہلا رہی تھی۔ مجھے ڈیوٹی نرس کو گھورتے دیکھ کر چپ نہ رہ سکی۔ ''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں...'' میرے لہجے میں تلخی اُتر آئی۔

''دوا پی لیں۔'' نرس نے دوبارہ درخواست کی۔ وہ میرے گھر پر پرائیویٹ ڈیوٹی انجام دے رہی تھی۔ سرکاری اسپتال میں ہوتی تو ایک بار دوا کی درخواست کرنے کے بعد دوبارہ نہ کرتی، کسی دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو جاتی۔

''میں نے ابھی تک تمھارا نام نہیں پوچھا۔''

''ہمارا کوئی نام نہیں ہوتا۔'' وہ دکھی انداز میں مسکرائی۔ ''سفید لباس پہن لینے کے بعد سبھی نرس کے نام سے پکارتے ہیں۔''

''شادی ہو چکی ہے تمھاری؟''

میرا سوال سن کر وہ کسمسانے لگی۔ شاید اس نے میری بات کا برا مانا تھا۔ مجھے اس کی زندگی کے درون خانے میں جھانکنے کا حق نہیں تھا۔ اس کی خدمات صرف تیمارداری کے لیے مستعار لی گئی تھیں، ذاتی معاملات میں وہ خود مختار تھی، اپنی مرضی کی مالک تھی۔ کوئی مجبوری اس کے پاؤں کی زنجیر نہ ہوتی تو شاید وہ میرا سوال سُن کر خاموش نہ رہتی، پھٹ پڑتی، برا مان جاتی، دوا میرے مُنہ پر مار کر کمرے سے چلی جاتی لیکن... وہ خاموش کھڑی رہی۔ میرا سوال سُن کر اُس کی آنکھوں کی سرخی گہری ہونے لگی۔ ہونٹوں میں ارتعاش جاگ اٹھا۔ مجبور نہ ہوتی تو بھڑک اٹھتی، بھویں تن جاتیں، پیشانی پر آڑی ترچھی لکیریں اُبھر آتیں۔ تڑخ کر پوچھتی۔

''کون ہوتے ہو تم میری ذاتی زندگی کے بارے میں کریدنے والے؟ کس نے تمھیں یہ اختیار دیا ہے کہ بلاتعلق کسی کی زندگی کے بارے میں نجی سوالات کرو۔ میں تمھاری نرس ہوں، تمھارے باپ نے آٹھ گھنٹے کے لیے میری خدمات خریدی ہیں۔ میں تمھارا خیال رکھنے کی پابند ہوں، تمھاری تیمارداری میرے فرائض میں شامل ہے، وقت پر دوا دارو دینا، ڈیوٹی چارٹ میں کیفیتوں کا اندراج کرنا، ڈاکٹر کے مشوروں پر عمل کرنا... میں ان سب کاموں کی پابند ہوں لیکن ذاتی زندگی پر صرف میرا اپنا اختیار ہے، تم کون ہوتے

ہو حالات کو کھنگالنے والے؟"

...لیکن وہ خاموش کھڑی رہی۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا۔

"آپ نے وقت پر دوا نہ پی تو میں ڈاکٹر سے شکایت کروں گی۔" سیورین سمجھ دار تھی۔ نرس کے ہاتھوں سے دوا لے کر خود میرے قریب آگئی۔ ایک ہاتھ سے سہارا دے کر اس نے کڑوی کسیلی دوا میرے حلق کے اندر انڈیل دی۔ نرس خاموشی سے دوسرے کاموں میں مشغول ہوگئی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، میں نے دوا پی کر دوسری طرف کروٹ بدلی، آنکھ موندیں تو کورا کا بے بس تصور پھر نظروں کے سامنے ابھر آیا۔ سیورین دوبارہ سرہانے بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی!

ایک دن، ایک رات اور زندگی کے کھاتے سے منہا ہوگئے۔

* * *

دوسری صبح میں ناشتے سے فارغ ہوا تو ابا جان آگئے۔ انھوں نے سیورین اور نرس کو اشارہ کیا، وہ لپک کر وہیل چیئر لے آئیں۔ میں نے ابا جان کے چہرے پر نظر ڈالی پھر ان کا اشارہ دیکھ کر اپنے وجود کو وہیل چیئر پر منتقل کردیا۔ سیورین نے پیچھے آکر وہیل چیئر کو آہستہ سے آگے بڑھایا۔ نرس نے وہ دروازہ کھول دیا جو میرے اور بٹھل کے کمرے کے درمیان تھا۔ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ بٹھل مجھ سے ناراض ہوگا۔ اس کی خفگی اس کی محبت کی دلیل تھی۔ وہ میرا محسن تھا، میرا اتالیق تھا، میرا استاد تھا، میری اساس تھا۔ اسی کی تراش خراش نے مجھے نئی زندگی عطا کی تھی ورنہ جیل میں کم عمری میں سزا بھگتنا میرے لیے عذاب بن جاتا۔ لیکن بٹھل نے مجھے بیٹوں کی طرح اپنالیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اپنے استاد کی محبت محسوس کرکے میری دل جوئی میں لگ گئے۔ میں دربدر ہونے سے بچ گیا۔ کوئی اور ہوتا میری جگہ تو جیل کی چار دیواری میں ہی سسک سسک کر مر جاتا۔ باہر آتا تو دائمی مریض بن کر سڑکوں پر گھسٹتا پھرتا لیکن میں بٹھل کی وجہ سے ایم اے کرکے جیل سے باہر آیا تھا۔ اس کی مہربانی میری زندگی کا سرمایہ تھی۔ اس نے مجھے مٹی سے کندن بنادیا تھا۔

میرے ذہن میں ماضی کی داستان کسی فلم کی طرح چلتی رہی۔ پھر میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو بٹھل کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ وہ کئی تکیوں کے سہارے آدھا لیٹا آدھا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اس کی نظروں میں ایسے نشتر تھے میں جن کی تاب نہ لاسکا، خجل ہوکر میں نے نظر جھکالیں۔ کمرے میں اس وقت جامو اور بناری بھی موجود سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کس کی جرأت تھی جو میرے بٹھل کے معاملے میں زبان کو جنبش دیتا۔

بٹھل کی نگاہوں میں شکوہ تھا، شکایتیں تھیں۔ میر پاس ان کا کوئی موثر جواب نہیں تھا۔ تادیر کمرے گھمبیر سناٹا طاری رہا پھر سیورین نے ہمت کی، وہ کے قریب چلی گئی۔

"اب کیسے ہو بابا...؟" سیورین کی آواز سے سناٹا چھٹنے لگا۔

"زندہ ہوں۔" بٹھل نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔

"میں سیورین ہوں بابا..." وہ لاڈ کرنے لگی۔ "تم مجھے بیٹی کہا تھا۔ یاد ہے؟"

"سب یاد ہے رے..." بٹھل نے مجھے سنانے کو "بھول جاتا تو یہ حال نہ ہوتا۔"

"تم ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے... ڈاکٹر یہی کہہ رہا تھا۔"

"ہاں... میں اوپر سے ٹھیک ہوجاؤں گا۔" بٹھل نے گہرا طنز کیا۔ "اندر کے حال کی کسے پروا ہے رے...؟"

"مجھ سے بھی خفا ہو بابا...؟" سیورین نے اس کشادہ سینے پر سر رکھ دیا۔ "میں نے تو تمھاری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔"

"تُو تو میری گجریا ہے، میری لاڈلی ہے۔" بٹھل شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "تجھ سے کون ناراض ہو ہے رے۔"

"تم نے دیکھا بابا..." سیورین اصل موضوع کی طرف آگئی۔ "کون آیا ہے تمھیں دیکھنے؟"

"دیکھ رہا ہوں..." وہ ابلتی ہوئی آواز میں بولا۔ "دیکھ بھی رہا ہوں اور سمجھ بھی رہا ہوں۔"

"کیا سمجھ رہے ہو...؟" میں برداشت نہ کرسکا۔ نظر اٹھا کر اسے گھورنے لگا۔ میرے اندر بھی شعلے لپک رہے تھے

"اب اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہوں رے... کہ بڑ صاحب کا شہزادہ میرا حال پوچھنے کو آیا ہے۔" بٹھل کا لہجہ او ہوگیا۔ "بڑی کرپا... بڑی مہربانی!"

"اپنے لاڈلے کو لعنت ملامت کررہے ہو؟" میں سلگ اٹ

"آپ ہی بولو بڑے صاحب۔" بٹھل نے ابا جان

دیکھا۔ "میں کیا جواب دوں؟"

"کو اپنے کیے پر شرمندگی کا احساس ہے۔" ابا جان حالات کا تناؤ کم کرنے کی کوشش کی۔ "جہاں اپنائیت، محبت اور جذبوں کی فراوانی ہو، وہاں سوئی بھی بھالا جاتی ہے۔"

"آپ بھی بڑے آدمی ہیں۔ آپ کا راجا بھی سولہ جماعتیں چکا ہے۔" بٹھل کے اندر آتش فشاں جاگ اٹھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کی باتیں ہیں... اپن تو انگوٹھا چھاپ کون جانے موٹی موٹی کتابوں میں کیا لکھا ہے؟"

"تم میرے جنوں کے سب سے مستند گواہ ہو۔" میں اُلجھنے "میری وحشتیں، میری صحرا نوردی تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بھی دل جلانے کی باتیں کررہے ہو؟"

"کوئی غلطی، کوئی بھول ہوگئی ہو تو معافی دے دے رے۔" کے لہجے میں کرب گھلنے لگا۔ "ذرا ہاتھ پاؤں میں جان تو پٹنہ واپس چلا جاؤں گا۔ اُدھری پان بیڑی کی دکان لوں گا... ایک تنہا آدمی کا کیا ہے؟ دو وقت بھوکا رہ کر بھی سکتا ہے۔"

"کوئی اور گالی باقی رہ گئی ہو تو وہ بھی دے ڈالو۔ کوئی دل میں باقی نہ رہے۔" میں بھی ہوش وحواس سے بیگانہ لگا۔ "کڑوی کسیلی باتیں کرنے کے بجائے میرے منہ پر کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے۔"

"ے صاحب...؟" بٹھل نے ابا جان کی طرف "یہ آپ کا شہزادہ کیا کہہ رہا ہے رے؟ اپنے پلے کچھ

"ب میں ہڈی آجائے تو بات نہیں بنتی۔" ابا جان "میں جارہا ہوں، آپ دونوں خود ہی صلح صفائی اور کرتے رہیں۔"

جان کے جانے کے بعد بٹھل کسمسانے لگا۔ میری پر جمی ہوئی تھیں۔ ابا جان کے اشارے پر سیورین سے باہر چلی گئی۔

"تمھیں حالات کا علم نہیں ہے؟" میں نے سنبھل کر کی کوشش کی۔ "میں بڑی عجلت میں نکلا تھا۔"

"موت کی نیند سو گیا تھا جو جگانا مشکل تھا؟"

"ہے۔" میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ "آئندہ تمھیں نہیں ملے گا۔"

"ارہ ایسا ہوا تو...؟" بٹھل کے چہرے کا کھنچاؤ کم ہونے لگا۔

"نہیں ہوگا..."

"پھر... یہ دُوری کیسی ہے رے۔" بٹھل کی نگاہوں میں جگنو چمکنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک عود کر آئی تو یکلخت بھلا چنگا نظر آنے لگا۔

نرس نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں وہیل چیئر سے گرتا پڑتا اُتر کر بٹھل کے سینے کی کشادگی میں گم ہوگیا۔ بٹھل نے بے اختیار مجھے اس طرح بازوؤں میں بھینچ لیا جیسے برسوں کے بچھڑے اچانک ملے ہوں۔ کبھی وہ والہانہ انداز میں میری پیشانی چومنے لگتا، کبھی ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے اسے میرے ہونے پر یقین نہ آرہا ہو۔ جذبے سچے ہوں، ان میں کھوٹ اور ملاوٹ نہ ہو تو وارفتگی اور شوق کا عالم بھی دیدنی ہوتا ہے۔ میں بھی بچوں کی طرح سسکنے لگا۔ ایسے موقعوں پر زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا، دل کی دھڑکنیں زبان بن جاتی ہیں۔ ہم دونوں تادیر انھی کیفیتوں سے دوچار رہے۔ پھر بٹھل نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ "تجھے کچھ ہوجاتا نا لاڈلے... تو بٹھل بھی رام پوری چاقو اپنے گلے پر پھیر لیتا رے۔"

بہت دیر تک گلے شکوے ہوتے رہے۔ نرس بٹھل کے اشارے پر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اسے پوری تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ بٹھل کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک جارہا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار کسی خیال سے چمک اٹھتیں۔ میں نے وجہ نہیں پوچھی، میں جانتا تھا، میری طرح وہ بھی کچھ نہ کچھ اندازے ضرور قائم کررہا ہوگا۔ جامو اور بناری بھی خاموش بیٹھے ساری روداد سنتے رہے۔ بٹھل بار بار پہلو بدل رہا تھا، ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کی ذہنی مشینری پوری طرح فعال نظر آرہی تھی۔ میں خاموش

حکایت زمانہ

ایک اندازے کے مطابق انسانی جسم کے اجزائے ترکیبی یعنی پانی، چربی، فاسفورس، آئرن، سوڈا، نشاستہ، شکر وغیرہ کو ان کی حقیقی حالت میں فروخت کیا جائے تو اس کی مجموعی قیمت چند روپے سے زیادہ نہیں... لیکن ان چند روپوں نے کتنا کہرام مچا رکھا ہے۔

تعاون ✿ مصطفیٰ ارباب

بشمل نے جامو کی طرف دیکھا۔

"سن لیا رے تُو نے... اب چُوڑے چمار بھی سر چڑھنے کی سوچ رہے ہیں۔ کل تک اُن کی میا بغلی قبر میں مری پڑی تھی۔"

"اپن کے لیے کیا حکم ہے...؟" استاد جامو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "ابھی تک اپنے تمھارے اور لاڈلے کی بیماری کی وجہ سے خاموش تھے۔"

"ٹھگنے قد کے نکٹے چپٹے تپتی جہاں بھی نظر آئیں، گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دو رے حرام کے پلّوں کو۔" بشمل کی آواز میں گھن گرج جاگ اٹھی۔ "سنگی ساتھیوں کو بھی ہوشیار کر دینا۔ میں بے خبری برداشت نہیں کروں گا۔"

"تم فکر ہی نہ کرو استاد۔" بنارسی آگے آ گیا۔ "انھوں نے اپنے لاڈلے پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان حرام کے جنوں کو ان کی میا کے پیٹ سے نکال نکال کر ماریں گے۔"

"دو چار خاص بندے حویلی کی نگرانی پر لگا دو۔" بشمل نے کہا۔ "ایدری آدمی کم پڑیں تو بمبئی اور کلکتہ سے کام کے آدمی منگاؤ۔ ابھی لفنٹ کا جواب پتھر سے دینے کا ہے رے۔"

"ٹھیک ہے استاد..." جامو نے تائید کی۔ "ابھی نفری تو بڑھانی پڑے گی۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد میں بشمل سے تنہائی میں ملا۔

"تم نے کیا سوچا ہے... اپنے شکلا جی تو بنرجی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔"

"ویسے وہ چھپکلی ہی لگتا ہے پر اس کی آنکھوں میں گرگٹ جیسی چمک بھی دیکھی ہے میں نے۔ آدمی کام کا دِکھتا ہے۔"

"کیا کورا کو لے جانے والے اس کی طرف سے چوکنے نہیں ہوں گے؟"

"اصیل پہلوان اور گھوڑے کی کھری کھوٹی نسل کی پہچان میدان میں ہوتی ہے رے۔" بشمل نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "بمبئی سے فیض آباد کے سفر میں وہ میرے ساتھ سائے کی طرح چپکا رہا۔ تیرے شکلا جی نے اُدھری بمبئی میں اس کے کان میں ضرور کچھ پھونک دیا ہوگا۔ اکھا راستے میں اسے ٹٹولتا رہا۔ پہلے اپنے بھی سوچتا رہا کہ شکلا جی نے اپنا دل رکھنے کی خاطر کھلواڑ کیا ہے۔ پر ابھی ایسا نہیں لگتا رے۔ دکھنے میں وہ سر سے پاؤں تک مردار کینچوا لگتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں چمک ہے رے... شکاری عقاب کی آنکھوں جیسی۔ شکلا جی جیسے گھاگ اور تجربے کار افسر تھا رے۔ اس نے اسے چُنا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی چنا ہوگا۔ تو نے جو کرشنا جی پر احسان وہ بھی انھیں ضرور یاد ہوگا۔"

"جو لوگ مجھے مارنے کے لیے بھرے اسپتال تک ہمت کر چکے ہیں، ان کے لیے تنہا بنرجی کی کیا اہمیت ہوگی"

"ایسا مت بول لاڈلے جانی... تو بھی اڑے باز سو کھے مرے بندوں کی چنگ منگ دیکھ چکا ہے۔ دشمن ہو تو حوصلہ اور جواں مردی کام آتی ہے رے۔ نظریں ا ہوں... بھول چوک ہو جائے تو تخت کا تختہ سمجھو۔ جیت ہتھیلی پر رکھنے والے کی ہوتی ہے رے۔ موٹا پتلا آدمی بس کا ہوتا ہے۔ بنرجی کو دیکھ کر اپن کو ایک پرانا بندہ یاد آ ر بات بہت پرانی ہے، اس وقت اپنی عمریا بھی بالی تھی۔" بشمل نظریں ماضی میں اُترنے لگیں۔ "وہ بہار کا تھا، پٹنہ میں کسی ملنے آیا تھا، بھلا سا نام تھا... ہاں، یاد آیا... جیون داس، ذا ہندو تھا... وہ بھی بنرجی کی طرح موٹھی تہنی جیسا دِکھتا تھا... کے اندر بجلی بھری تھی۔ پٹنہ میں اس کے کچھ پرانے دشمن جیون داس کو اکیلے دیکھ پانچ چھ ہٹے کٹے بندوں نے گھیر ہیجڑے کی اولاد! مرد ہوتے تو ایک ایک کر کے مقا آتے۔ پل بھر کو جیون داس بھی گھبرا گیا۔ میں قریب ہی تھا... جانتا ہے پھر کیا ہوا؟ جیون داس نے جان ہاتھو دھری، اس کی کھوپڑی میں ایک ہی بات آئی ہوگی۔ زند موت، مقابلہ کرنا یا کتوں کی طرح دُم دبا کر نو دو گیارہ ہو بازار میں تماش بینوں نے گھیرا ڈال لیا، کھٹا کھٹ سات چاقو کھل گئے۔ کسی نے اُس کی مدد نہیں کی۔ پھر... حرامیوں کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ تین لاشیں زمین پر او منہ گریں تو بھگدڑ مچ گئی۔ جیون داس کی نظریں دشمنوں تھیں۔ پھر جیسے بجلی چمک اٹھی، جیون داس نے پھرتی اُلٹی ٹانگ کے بل پر بیٹھ کر پھرکی کی طرح گھوما تو ایک لڑکھڑا گیا۔ جیون داس نے اس کا چاقو جھپٹ لیا، اٹھتے اس نے نپا تُلا ہاتھ چلایا تو ایک دشمن کم ہو گیا۔ دوسرا رام رام ست ہوا تو دشمنوں کی میا مر گئی۔ چوتھا زخمی ہوا ماں کے... بھاگ لیے۔ تماش بینوں میں جانے کتنو دھوتیاں گیلی ہو گئیں۔ وہ مرد کا بچہ جیون داس سینہ تانے بھگوڑوں کو للکارتا رہا۔ پھر وہ بھی پولیس کے ڈر سے ایک سے پھوٹنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا، دُور سے ٹھکانا دیکھ کر واپس آ گیا۔"

بشمل کے سامنے جیسے پرانی فلم چل رہی تھی۔ سانس لے لا۔ "دو روز بعد میں اس کے گھر پہنچ گیا... چاقو کے گُر اور داؤ کھنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ جیون داس کو پولیس کی پڑی ی۔ وہ پہلی گاڑی پکڑ کر پٹنہ سے پھوٹنے کی سوچ رہا تھا۔ میں بھی کے ساتھ نکل پڑا۔ بہار پہنچنے کے بعد بھی میں نے اس کا پیچھا چھوڑا۔ تھک ہار کر وہ مجھے شاگردی میں لینے پر تیار ہو گیا۔ میں اس سے بہت کچھ سیکھا ہے لاڈلے۔ اسی کے داؤ پیچ آج تک م آ رہے ہیں... ہو سکتا ہے، تیرے شکلا جی کا بنرجی بھی دوسرا ن داس ثابت ہو۔" بشمل نے مجھے تسلی دی۔ "میں ہوں نا رے ے ساتھ۔ تو جب بولے نکل لیں ان کے پیچھے۔"

"ایک دن اور شکلا جی کا انتظار کر لو پھر..."

"اوپر والے سے امید رکھ میرے لاڈلے۔ وہ مہربانی ے گا۔"

رسیں واپس آ گئیں تو بشمل نے میرے اشارے پر ہلو بدل دیا۔ جامو اور بنارسی اس کے کہنے کے مطابق نکلنے وں کے سلسلے میں ضروری بندوبست کرنے چلے گئے تھے۔ اس وقت خاصا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ میرے گلے لگ لے کے بعد جیسے اس کی آدھے سے زیادہ بیماری دور ہو گئی ی۔ میرے ذہن کی دھند بھی چھٹنے لگی، البتہ کورا کی جدائی کا میرے وجود سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے فراموش کرنا گی سے منہ موڑ لینے کے مترادف تھا۔

"تو اب آرام کر لاڈلے... اللہ کی ذات پر بھروسا رکھ۔ وہ کرے گا۔"

میں کچھ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ نرسوں نے مجھے وہیل ر پہ لے جانے کی پیش کش کی۔ میں نے ان کا کہا نہیں اپنے قدموں پر اٹھ کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ نے جیون داس کی جو داستان سنائی تھی، وہ امید کی کرن ٹمٹمانے لگی۔ میں آنکھیں بند کر کے خیالوں میں گم ا۔ کیا ممکن ہے کیا ناممکن، اس کا علم انسان کو نہیں ہوتا۔ تو خودغرض ہوتا ہے۔ اس کی مرادیں بر آئیں تو ڈگمگاتا بھی سنبھل جاتا ہے، نتائج اس کی خواہشوں کے خلاف منافقت کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ جنت اور دوزخ اپنی جیت اور ہار سے جوڑتا رہتا ہے۔ پلڑوں کا کبھی یکساں نہیں ہوتا۔ کبھی ایک پلڑا اوپر ہو جائے تو خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے، معاملہ برعکس تو امیدیں نا کو ہوا دینے لگتی ہیں۔ کل کیا ہونے والا تھا، کیا ہوگا؟ یا نہیں؟ امیدوں کے سہارے وقت کی صلیب پر کب تک دم سادھا جا سکتا ہے۔ کب سانسوں کا تسلسل ٹوٹ جائے، کب خوشیاں ہمکنا شروع کر دیں، یہ سب حالات پر منحصر ہے۔ انسان ہمیشہ یقین اور غیر یقینی کی کیفیات میں کسی مجرم کی طرح جکڑا رہتا ہے۔ غیب کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ بشمل نے بھی کورا کے حوالے سے اسی سے رشتہ جوڑے رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ نیند بھی اختیاری نہیں ہوتی، سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو جائیں تو انسان غنودگی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ کوئی گرہ الجھ جائے تو اسے سلجھانے میں نیند اُچاٹ ہو جاتی ہے، روٹھ جاتی ہے۔ اسے منانے کی خاطر لاکھوں جتن کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی تفکرات کا بوجھ نیند کا جواز بن جاتا ہے، کبھی خوشیاں بھی نیند اُچاٹ کر دیتی ہیں۔ زندگی انھی ریشہ دوانیوں کا نام ہے۔

شام کو بیدار ہوا تو جولین میرے کمرے میں موجود تھی۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟" اس نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"سانسوں کی آمد و رفت جب تک جاری رہے، انسان زندہ رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔" میرے جواب میں دہشتوں کی تلچھٹ آ گئی۔

"سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔" اس نے میری ذہنی کیفیتوں کو محسوس کر کے محتاط لہجہ اختیار کیا۔ "ابا جان نے پہلے جشن منانے کا اہتمام کیا تھا مگر بعد میں اپنا ارادہ تبدیل کر کے پچاس دیگیں غربا اور مساکین میں تقسیم کرا دیں۔ خانم نے بھی آپ کی مرادیں بر آنے کی خاطر پچاس کونڈے بھرنے کی منت مان رکھی ہے۔"

"سنا ہے خانم اور کچھ دوسرے لوگ بھی تمھارے ساتھ بمبئی سے آئے ہیں۔"

"جی ہاں... گھر میں آپ کی کمی کا احساس بھی سب کو ہے۔ خدا آپ کو جلد صحت یاب کرے اور آپ کی خوشیاں برقرار رہیں۔"

"کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔" میری آواز پھر گھٹنے لگی۔

"میں آپ کی بات سے متفق ہوں لیکن دھوپ اور چھاؤں کا کھیل بہ ہر حال، جاری رہتا ہے۔"

"دھوپ کے بعد چھاؤں کی امید پوری ہو جاتی ہے۔" میرے لہجے میں ٹھنڈی آ گئی۔ "ایک دن نہ سہی تو دوسرے دن لیکن امیدیں دم توڑنے لگیں تو دلاسے کسی کام نہیں آتے۔"

"مجھے آپ سے اتفاق ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ..."

"کوئی گواہی اور شہادت نہ دو۔" میں بکھرنے لگا۔ "اب کوئی بات دل کو بھلی نہیں لگتی۔ سانسیں گنتے رہنے کی بات اور ہے۔"

"میں درخواست کروں گی۔" جولین نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "اتنی جلدی کوئی آخری فیصلہ نہ کریں۔"

"پھر... کیا کروں؟" میری وحشت اَور فزوں ہوگئی۔

"آپ تنہا نہیں ہیں۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اپنے اپنے طور پر سبھی نے منتیں مان رکھی ہیں، وہ کسی کی تو سُنے گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش رہا۔ امید، توقع اور منتیں اپنی جگہ، میری وحشتیں ان خوب صورت بہلاووں سے کہیں زیادہ تھیں۔ میرے دشمن جانگ قبیلے کے ظالم لوگ میری زندگی کی کل کائنات چوری کر کے لے گئے تھے۔ ان کی بھی اپنی توقعات ہوں گی، اپنی امید اور خوشیاں ہوں گی۔ کون جیتے گا، کسے مات ہوگی، کون کہہ سکتا تھا۔ سب نے ہوا اور طوفان کی زد پر امیدوں کے چراغ جلا رکھے تھے۔ بپھرے ہوئے سمندر کے کنارے ریت کے تاج محل تعمیر کر رہے تھے۔ میں کس کی سنتا، کسے سمجھاتا۔ سب دل کے بہلاوے تھے، سب اپنے اپنے راگ الاپ رہے تھے، میری کیفیت کا اندازہ کون کر سکتا تھا؟ ہتھل نے اپنے آدمیوں کو تبتیوں کو چُن چُن کر مارنے کا حکم نامہ صادر کر دیا تھا۔ سب وقت کی راگنی تھی، دل کی بھڑاس نکالنا اور بات ہے، ہزار دو ہزار، تبتی مرجاتے تو کیا نتیجہ برآمد ہوتا؟ کیا ایک کورا ان کے مرنے سے پیدا ہو جاتی؟ یہ خوش فہمی نہیں تو اور کیا تھی۔ ایک تنہا جیون داس نے چار آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا، باقی تین موت کے خوف سے بھاگ گئے۔ ضروری نہیں تھا کہ بنرجی بھی جیون داس کی طرح کام یاب ہو جاتا۔ ایک سنسناتی ہوئی زہریلی سوئی کسی نامعلوم سمت سے ہَوا میں تیرتی ہوئی آتی اور بنرجی کے جسم میں اتر جاتی تو وہ چوکھی لڑنا بھول جاتا۔ شکلا جی بھی ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ منتیں دل کی دل میں رہ جاتیں، میں کس کس کے گریبان تھام کر سوال کرتا۔ بتاؤ، میری کورا کہاں ہے؟ تم جو توقعات اور امیدوں کی باتیں کر رہے تھے، کیا اب بھی میں انھیں شہد لگا کر چاٹتا ہوں!

میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑنے کو مچل رہا تھا یکایک کوئی دروازے سے پاگلوں کی طرح ٹکرایا۔ وہ سیورین تھی، شاید دیوانی ہوگئی تھی۔ دروازے سے ٹکرا کر سنبھلی تو جولین کو راستے سے ہٹاتی میرے سینے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔ جولین بھی پریشان ہوگئی۔ میرے اندر بھی طوفان ابھارنے لگے۔ اس سے پیش تر سیورین کبھی ایسی دیوانگی کا شکار نہیں ہوئی تھی کہ ہوش و حواس بالکل ہی گنوا بیٹھی ہو۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"کیا ہوگیا سیورین؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا "کون سی نفری کم ہوگئی؟"

"وہ... وہ کورا... وہ" اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ اٹک اٹک کر بولی۔ "ابھی شکلا جی کا فون آیا تھا۔ وہ... وہ بتا رہے تھے کہ کورا..."

"آگے بولو۔" میں بھی پھٹ پڑا۔ "کیا ہوا کورا کو؟"

"وہ... تمھاری کورا زندہ ہے۔ بنرجی نے انھیں کسی جگہ سے فون پر اطلاع دی ہے۔"

میری سانسیں میرے وجود کے پنجر میں اٹکنے لگیں سیورین بھی اس کی زندگی کی اطلاع سُن کر دیوانی ہوگئی تھی میں بھی گنگ رہ گیا۔ "مبارک ہو لاڈلے، میری جان!"

میں نے نظریں گھما کر دیکھا، ہتھل درمیانی دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑا تھا۔ کورا کی زندگی کی خبر نے اس کے خون کی گردش بھی تیز کر دی تھی۔ میں نے سیورین کو کریدا۔

"اور... اور کیا کہا تھا شکلا جی نے...؟"

"آدھے گھنٹے بعد دوبارہ فون کرنے کو کہہ رہے تھے..." سیورین نے مسکرا کر کہا پھر مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔

"بازی گر" سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

اُمنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان

پانچویں درویش کا بیان

ایک سرافراز، سینہ فگار نوجوان کا سفرنامۂ زندگی

باقی واقعات آئندہ شمارے میں

فتنہ بدوش

ہادی محمد شکیل

وہ عورت برف کی مورت تھی یا پھر اُس کے کمال کا ضبط تھا
وہ گرفت میں آتی تھی مگر کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل جاتی تھی
سادہ لیکن پُرپیچ، شوخ مگر بُردبار... ایک شعلۂ رُو ماہتابی

میرا نام ایلن گرانٹ ہے اور عمر بتیس سال۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں کیا ہوں؟ ایسے میں دھرتی پر اپنے وجود کو برحق ثابت کرنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔ ان دنوں میں لوگوں کو بتاتا ہوں کہ میں فلسفی ہوں۔ یہ سُن کر وہ چپ سادھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس سے پہلے میں خود کو سابق زمیں دار کہتا تھا۔ لیکن اس کے جواب میں بہت سارے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بڑی وضاحتیں کرنا پڑتی تھیں۔ اس سے بھی پہلے میں خود کو سابق معیشت داں کہتا تھا... اور وہ زمیں داری سے بھی بدتر ثابت ہوتا تھا۔ خود کو فلسفی قرار دینا کچھ عجیب سا لگتا ہے لیکن اظہار حقیقت کے مقابلے میں زیادہ قابلِ قبول ہے۔ اب میں خود کو دھرتی کا بوجھ قرار دینے سے رہا۔ کیا میں لوگوں کو یہ بتاؤں کہ میں ایک عورت پر انحصار کرتا ہوں!

جہاں تک میرا خیال ہے، میرا المیہ وراثتیں ہیں، ایسی وراثتیں جو بغیر سوچے سمجھے مجھ پر تھوپ دی گئیں۔ پہلی وصیت ان دنوں سامنے آئی، جب میں علمِ معاشیات کے حصول میں مصروف تھا۔ میرے دادا آں جہانی ہوتے وقت مجھے ایک بے حد قیمتی خردبین سونپ گئے۔ خردبین سونپنے میں

کوئی برائی نہیں تھی لیکن انھوں نے وہ چیز مجھے اس یقین کے ساتھ سونپی، بلکہ مجھ پر تھوپی کہ میں ایک دن مایہ ناز سائنس داں بنوں گا۔ ایک روز میں نے اس نامعقول خردبین سے استفادہ کیا... یعنی پنیر کا جائزہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں پنیر جیسی نعمت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔ تنگ آ کر میں پھر حصولِ علم معاشیات میں مصروف ہوگیا۔

عین اس وقت جب میں دنیا کی معاشی بیماریوں کے خاتمے کے لیے میدانِ عمل میں اترنے والا تھا، میری ایک بیوہ خالہ چل بسیں۔ چل بسنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کیوں کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ لیکن وہ پالے سے ماری ہوئی چھ سو چالیس ایکڑ زرعی اراضی میرے نام کر گئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم معاشیات کی رو سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ بڑی قیمتی زمین ہے۔ کم از کم گندم کی مسلسل چڑھتی ہوئی قیمت کے پیشِ نظر!

کینیڈا پہنچ کر پتا چلا کہ مکان اور فارم دونوں پر بن بلائے مہمان قابض ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں خالہ نے زبانی طور پر وہاں رہنے کی اجازت دی تھی۔ موسم کا یہ حال تھا کہ درجۂ حرارت... اگر اسے درجۂ حرارت کہا جاسکتا ہے... منفی 6 سینٹی گریڈ تھا۔ ظاہر ہے، میرے سمجھانے کے باوجود ایسے موسم میں وہ لوگ بے دخل ہونا پسند نہیں کر سکتے تھے۔ ناچار مجھے عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔ میری تمام پونجی عدالتی کارروائی کی نذر ہوگئی۔ اس کے علاوہ چھ قیمتی ماہ بھی میری زندگی سے رخصت ہوگئے۔ تب کہیں جا کر قانون کا پہیہ، دھیرے دھیرے میرے حق میں گھوما۔ بالآخر مجھے قبضہ مل گیا۔ اب مجھے پتا چلا کہ وہاں گندم اُگانا ممکن نہیں۔ ایک سال میں نے زمین کو کارآمد بنانے کی سعی ناکام میں گنوایا۔ عین اس وقت، جب میں زمین چھوڑ کر بھاگنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا، ایک اور وراثت نازل ہوگئی۔ حسب سابق وہ وراثت بھی مجھ پر بغیر سوچے سمجھے تھوپی گئی تھی۔

اس بار کرم فرمائی پھوپی میبل نے کی۔ پھوپی میبل دو سال قبل بیوہ ہوئی تھیں۔ ترکے میں انھیں ہلٹن انڈسٹریل ٹور نامی ایک ادارہ ملا تھا۔ پھوپا کی زندگی میں وہ ادارہ بے حد منفعت بخش ثابت ہوتا رہا تھا۔

میرے پھوپا، جارج ہلٹن کے بڑی بڑی صنعتی فرموں کے مالکان سے بہت اچھے روابط تھے۔ وہ ان لوگوں کے تعاون سے اپنے ادارے کے تحت فیکٹریوں کے ملازمین اور ان کے اہلِ خانہ کے لیے یورپ کا سیاحتی دورہ بہ ذریعہ موٹر کوچ ترتیب دیتے تھے۔ دورے کا ریٹ رعایتی ہوتا تھا۔ اس دورے بلجیئم، ہالینڈ، جرمنی، فرانس اور شمالی اٹلی کے اہم صنعتی یونٹوں سیر کے علاوہ، قابلِ دید مقامات، چرچ اور آرٹ گیلریز کی سیر بھی کرائی جاتی تھی۔ وہ ایک اچھا آئیڈیا تھا... اور ا تنظیم نے اسے کام یابی بخشی تھی۔

پھوپا کے چل بسنے کے بعد پھوپی نے ادارہ چلا کوشش کی تھی لیکن وہ زیادہ کام یاب نہیں رہیں۔ اب وہ یہ مجھے سونپ رہی تھیں۔ واپسی کی شرط پر اتنا قرض مل رہا تھا میں ادارے کا کام بہ آسانی سنبھال سکتا تھا۔ پیش کش کرنے کی صورت میں مجھے فوری طور پر امریکا سے یورپ تھا۔ اگر میں کینیڈا والی زمیں داری کو ترجیح دیتا تو پھوپی سامنے دو راستے رہ جاتے۔ پہلے تو وہ ادارے کو فروخت کر کی کوشش کرتیں اور اگر بات نہ بنتی تو ادارہ پھوپا جارج کے کزن کی اولاد کے سپرد کر دیتیں جو ادارے کے ابتدائی میں پھوپا جارج کا شریک رہا تھا۔

* * *

قریب ترین ٹیلی گراف آفس پینتالیس میل دُور تھا میں خرابی کے باوجود ایک گھنٹے میں، میں وہاں پہنچ گیا۔ اور پ کو اطلاع دے دی کہ میں نے ان کی پیش کش قبول کر لی ہے۔ کے دو گھنٹے بعد ایک اسٹیٹ ایجنسی والے نے ایک گاہک فرا دیا جس نے بڑی بے نیازی سے زمینوں کی وہ قیمت لگائی جو کی اصل قیمت کا محض پچیس فیصد تھی۔ میں نے اس کی پیش جتنی تیزی سے قبول کیا، اسے دیکھ کر وہ اپنی جلد بازی پر نظر آنے لگا۔ وہ اس قدر متاسف نظر آرہا تھا جیسے میرے ہا لٹ گیا ہو۔ میں نے رقم وصول کی، سامان پیک کیا اور را ٹرین پر سوار ہوگیا۔ اب میں سابق زمیں دار تھا۔

مونٹریال پہنچ کر بہ ذریعہ فون تحقیق کی تو پتا چ ادارے کو سنبھالنے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔ قریبی ریسٹورنٹ گیا اور واحد خالی میز پر قابض ہوگیا۔ نظریہ ہے کہ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور ہوتا ہے۔ کہانی کا سبق یہ ہے: بکھرے ہوئے، لمبے سنہرے بالو ہنستی ہوئی جھیل سی گہری آنکھوں اور دل نواز مسکراہٹ کو کم موقع نہ دیجیے کہ وہ آپ کی حسِ لطیف کو متاثر کر ڈالیں۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

عموماً پتلون پہننے والی لڑکیاں مجھے ایک آنکھ نہیں لیکن وہ ایسی تھی کہ پتلون اس پر سجتی تھی۔ میں زیر

ایا... اور پھر میرا چہرہ تپ سا گیا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ وہ زمین اور وہاں کی بے کراں تنہائی نے مجھے کس حد تک کر دیا تھا۔

وہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ویٹر ناشتا لے آیا... اور ہم دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ روم جارہی تھی... میں بھی جا رہا تھا۔ میں نے اُسے اپنی نئی کار کے متعلق بتایا اور اس نے کہ وہ اسکوٹر پر سفر کر رہی ہے۔ ناشتا ختم کر کے اس نے مجھے انہ مسکراہٹ سے نوازا۔ لیکن وہ ایسی مسکراہٹ تھی کہ میرا اچھل کر میرے دل سے ہم آغوش ہوگیا۔

* * *

ایک ضروری کال کی وجہ سے مجھے بولون میں رُکنا پڑا۔ م کے وقت میں پیرس جانے والی سڑک پر تھا۔ بولون سے میں کلومیٹر آگے آیا ہوں گا کہ مجھے سڑک پر بہت کچھ نظر آیا۔ ... چاند، زرد رنگ کا سویٹر اور وہ واحد نسوانی پتلون، جو مجھے گئی تھی... اور وہ محض کپڑے نہیں تھے۔ ان کے اندر وہ حسینہ تھی جس نے صبح میرے ساتھ ہی ناشتا کیا تھا۔ وہ ایک ج کے باہر کھڑی تھی اور بے حد سوگ وار معلوم ہو رہی تھی۔

”کوئی گڑبڑ ہوگئی؟“ میں نے پُراُمید لہجے میں کہا۔ دل اس سوال کا جواب اثبات میں سننے کے لیے بے ہو رہا تھا۔

”جی ہاں...!“ اس نے جواب دیا۔ ”کوئی پُرزہ ٹوٹ ہے... اور انگلینڈ سے منگوانا پڑے گا۔ بہت گڑبڑ ہوگئی۔ آج پیرس میں کوئی میرا منتظر ہوگا... اور میں اس بے چاری سے قائم نہیں کر سکتی۔“

اس کے بیان کی ابتدا تو بے حد دل شکن تھی لیکن لفظ ’بے ری‘ نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا۔ اگر وہ ’بے چاری‘ کے بجائے بے چارے‘ کا تذکرہ کرتی تو میری طرف سے وہ اس گیراج ساری رات کھڑی رہ سکتی تھی۔ ”آؤ... میں تمھیں لفٹ وں۔ میں بھی پیرس ہی جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اس نے گیراج کے مالک سے جس رواں فرانسیسی میں گفتگو ے لیے باعث رشک تھی۔ پھر اس نے چھوٹا سا سوٹ کیس نشست پر پھینکا... اور میرے برابر والی نشست پر آ بیٹھی۔

ہم کچھ ہی دُور گئے ہوں گے کہ بارش شروع ہوگئی۔ تسلیم کیا کہ ایسے موسم میں اسکوٹر پر سفر کرنا عذاب یونہی ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہم پیرس کے نواحی تک پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ میں نے شیمپس ایلیسی کے ایک گیراج کے سامنے اپنی کار روکی تو دس بج چکے تھے۔

”مجھے ڈر ہے کہ میری دوست نے اتنی دیر میرا انتظار نہیں کیا ہوگا...“ اس نے کہا۔ لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔ ”ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں ملاقات طے کی تھی۔ مجھے تو اس کا پتا بھی معلوم نہیں۔“

”اس صورت میں...“ میں نے مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میری تنہائی پر ترس کھاتے ہوئے، رات کا کھانا میرے ساتھ کیوں نہ کھاؤ۔“

لیکن اس نے یہ سوچ کر جانا ضروری سمجھا کہ ممکن ہے، اس کی دوست اب بھی اس کی منتظر ہو۔ چناں چہ میں ایک قریبی ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ ہم دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ اگر وہ آدھے گھنٹے میں واپس نہ آئی تو میں تنہا کھانا کھا لوں گا۔

میں ہاتھ منہ دھو کر، کپڑے بدل کر اپنے کمرے سے نکلا۔ لابی میں پہنچا تو اسے استقبالیہ کلرک سے محوِ گفتگو پایا۔ وہ شاید کمرا لے رہی تھی۔ مجھے احساس ہُوا کہ استقبالیہ کلرک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ شاید وہ میرے اور اس کے درمیان کوئی تعلق تخلیق کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت وہ بہت پیارا لگا۔ اس وقت میں نے اس کی نظروں کے اس تاثر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ بس، من میں لڈو پھوٹ کر رہ گئے۔

پندرہ منٹ بعد وہ سیاہ فراک میں ملبوس، مجھے بار میں ملی۔ ایک ایک جام لینے کے بعد ہم کسی اچھے سے ریستوراں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں ہی بے حد بھوکے تھے کیوں کہ صبح کے ناشتے کے بعد ہم نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

مرد... میرا خیال ہے، مردوں کی اکثریت اس امر پر مجھ سے اتفاق کرے گی... کہ مرد بل کی ادائیگی خواتین سے کرانا پسند نہیں کرتے۔ لیکن بعض اوقات... بعض حالات میں یہ اچھا بھی لگتا ہے۔ اس روز مجھے بھی اچھا لگا۔ میں نے کچھ دیر اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اسے قائل نہ کر سکا۔ ”تم نے مجھے لفٹ دے کر میرے ساتھ بڑی مہربانی کی ہے...“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”کھانے کا بل میں دوں گی۔“

”جیسے تمھاری مرضی...“ میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”ویسے... میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام ایلن گرانٹ ہے، اور شاید...“ میں نے کچھ دیر توقف کیا، لیکن جب وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو میں نے جملہ مکمل کیا۔ ”شاید تمھارا بھی کوئی نام ہوگا۔“

''نام میں کیا رکھا ہے...'' اس نے جواب دیا۔ ''یوں بھی ہم اتفاقیہ طور پر ملے ہیں... اور شاید ہی آئندہ کبھی ملیں۔ بچھڑ ہی جانا ہے تو ناموں کا تکلف کیسا؟''

''تمہاری مرضی... لیکن تمہیں پکارنے کے لیے کچھ تو ہو... 'اے تم' کیسا رہے گا؟''

''شان دار...!'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''یہ نام مجھے اچھا لگا ہے۔ بس، تم مجھے 'اے تم' کہہ کر پکارا کرو۔''

اس کی وہ بے تکلفی بھی میرا یہ احساس دُور نہ کر سکی کہ اس نے مجھے فاصلے پر رکھ کر میری اوقات یاد دلا دی تھی... میں اس کے لیے ایک غیر اہم سا اجنبی تھا۔

مجھے پیرس میں تین مصروف دن گزارنا تھے۔ 'اے تم' کی اپنی مصروفیات ہوں گی۔ ہم یہ وعدہ کر کے جدا ہو گئے کہ اپنی جدا جدا منزلوں کی طرف روانہ ہونے سے پہلے کم از کم ایک بار ضرور ملیں گے۔

اگلے روز وہ مجھے نظر نہیں آئی لیکن دوسرے دن لابی میں ہمارا ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مانٹریال کے گیراج سے اطلاع آئی ہے کہ مطلوبہ پرزہ دست یاب نہیں ہو سکا ہے اس لیے... وہ اپنا سفر ملتوی کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

''روم تک تو میں تمہیں لفٹ دے سکتا ہوں...'' میں نے کہا۔ ''بس یہ ہے کہ ذرا گھوم کر جاؤں گا۔ یہ میرا بزنس ٹرپ ہے۔ سوچ لو... پھر مجھے بتا دینا۔ اور ہاں... آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ نا۔''

* * *

ہم رات کے کھانے کے لیے ایک ساتھ نکلے۔ وہ مجھے چھوٹے سے ریستوراں میں لے گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم بھاپ اُڑاتی کافی سے لطف اندوز ہونے لگے۔

''میں شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے روم تک لفٹ دینے کی پیش کش کی...'' اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ ویسے بھی ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں اور...''

''میرا خیال ہے، روم پہنچتے پہنچتے صورتِ حال بدل جائے گی...'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں کل صبح آٹھ بجے روانہ ہوں گا۔ اگر تم میرا ساتھ دے سکو تو مجھے مسرت ہو گی۔''

اگلی صبح سات بج کر پچاس منٹ پر میں ہوٹل کا حساب صاف کرنے کے لیے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا تو 'اے تم' اپنا حساب صاف کر رہی تھی۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری پیش کش قبول کر میں کوئی حرج نہیں۔ میں تمہاری ممنون ہوں۔'' اس نے کہا لیکن درحقیقت میں اس کا ممنون ہوا تھا۔

ہمارا اگلا پڑاؤ لین تھا۔ وہاں ہوٹل والے کے ساتھ معاملہ کرنے میں دشواری ہوئی۔ ہوٹل والے کی انگریزی اتنی ہی خراب تھی جتنی کہ میری فرانسیسی... پھر 'اے تم' نے ترجمانی کے فرائض ادا کیے۔ یوں میں ہوٹل والے سے معقول معاہدہ کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ میں دو سو افراد کے لیے سستا سیاحتی دورہ ترتیب دے رہا تھا۔ ہوٹل کے ریٹ میں خفیف سا اضافہ مجھے منافع سے محروم کر سکتا تھا۔

زیورچ میں پھر زبان کا مسئلہ آڑے آیا... اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ 'اے تم' کی جرمن بھی اتنی ہی اچھی ہے جتنی کہ فرانسیسی...

''تم میری ترجمانی کا کام مسلسل انجام دے رہی ہو...'' اس شام میں نے اس سے کہا۔ ''بہتر ہے کہ تمہارے قیام کے اخراجات میں برداشت کر دوں۔''

''ہرگز نہیں...'' اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''معاملات یونہی چلنے دو۔ میں جو مدد کر سکتی ہوں، ضرور کروں گی۔ آخر مجھ پر بھی تو تمہاری لفٹ کا قرض ہے۔ میں اجنبی لوگوں کا احسان اپنے سر پر رکھنا پسند نہیں کرتی۔''

''معاف کرنا... اگر میں تمہارے لیے اب بھی اجنبی ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم میرے بارے میں جاننے کی خواہش کرتیں تو مجھے بتانے میں کوئی عار نہ ہوتی۔ میں تو تم سے، تمہاری دل آزاری کی وجہ سے کچھ پوچھتا بھی نہیں۔''

''میری فطرت میں تجسس کا مادّہ نہیں جو میں تم سے تمہاری زندگی کی داستان سنوں...'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یوں بھی اس اجنبیت میں بڑا لطف ہے۔ مجھے اُمید ہے، تم بھی سفر سے محظوظ ہو رہے ہو گے۔''

زیورچ سے ہم میلان پہنچے اور میلان سے ٹیورن... ٹیورن میں چند فیکٹریاں تھیں۔ وہاں میں نے اپنی پارٹی کی آمد کے سلسلے میں ضروری انتظامات کیے۔ وہاں بھی 'اے تم' بے حد مددگار ثابت ہوئی۔ وہ اطالوی بھی بے حد روانی سے بولتی تھی۔

کام مکمل ہونے کے بعد ہم نے رات کا کھانا ساتھ ہی کھایا۔ کھانے کے دوران میں نے اپنا حوصلہ مجتمع کر کے اس سے کچھ پوچھنے کی ٹھانی۔ ''تم سے یہ پوچھنا نازیبا تو نہیں ہو گا کہ تم کیا کرتی ہو؟ میرا مطلب ہے، تفریح کے لیے نکلی ہو یا کسی کام سے؟''

''میں بہت محنت کرتی ہوں...'' اس نے فخریہ لہجے میں ''میرے کام میں زبان دانی کی بڑی اہمیت ہے۔''

ٹیورن میں، میں نے ایک پورٹیبل ٹائپ رائٹر خریدا۔ مجھے خط کتابت کا کام کرنا تھا۔ اس رات میں دیر تک دو اں کے ذریعے ٹائپ رائٹر کو شرمندہ کرتا رہا۔ 'اے تم' کو اس کا پتا چل گیا کیوں کہ وہ سامنے والے کمرے میں مقیم تھی۔

''تمہیں جو ٹائپ کرانا ہو، مجھے دے دو۔ میں کر دوں گی۔'' اگلے روز صبح اس نے مجھ سے کہا۔ ''ٹائپنگ تمہارے بس کا روگ نہیں۔''

اس دن سے میرے مزے آ گئے۔ میں انگلش میں خط ڈکٹیٹ کراتا... 'اے تم' اسے مطلوبہ زبان میں منتقل کر کے ٹائپ کر دیتی۔

''یہ تو بڑی زیادتی ہے...'' وینس پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ''تمہاری ان مہربانیوں کے جواب میں میرا بھی کچھ بنتا ہے۔ آخر تم اپنی تعطیلات کے خوش گوار دن میری وجہ سے بوریت کی نذر کر رہی ہو۔''

''اگر تم مُصر ہی ہو تو آج کھانے کا بل تم ادا کر دینا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بہت خوب صورت رات تھی... میرے موڈ سے ہم آہنگ! اگر میں نے اس سے کوئی قریبی رشتہ اُستوار کرنے کی سمت میں کوئی قدم نہ اٹھایا ہوتا تو میری بشریت یقیناً مشکوک ہو جاتی۔ لیکن اس کا رویہ مثبت نہیں تھا۔

''پلیز... اتنی خوب صورت رات کو اس طرح برباد نہ کرو۔'' اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد اسے احساس ہو گیا کہ اس نے میرے جذبات کو مجروح کیا ہے اور میں بجھ کر رہ گیا ہوں۔ ''پلیز... معاملے کو روگ نہ بناؤ۔ مجھے اپنے معاملات خود تک محدود رکھنے ہیں۔ بس، اتنی ہی بات ہے۔ یقین کرو، کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔''

''مجھے بھی یقین ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے...'' میں نے کہا۔ ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم کوئی بہت مقبول ناول نگار ہو اور بھیس بدل کر نئے ناول کے لیے پلاٹ تلاش کرنے نکلی ہو۔ بس ایک کرم کرنا... مجھے ولن کا کردار نہ دے دینا۔ میں اس ٹائپ کا آدمی نہیں ہوں۔''

''میں جانتی ہوں ایلن...!'' اس نے پہلی مرتبہ میرے نام سے پکارا۔ ''تم صورت سے بھی ولن نہیں لگتے... ویسے بھی ایک ایسے شخص کو ولن کیسے کہا جا سکتا ہے جو خود کو بہ حیثیت سابق معیشت داں اور سابق زمیں دار متعارف کراتا ہو۔ بس ذرا خیال رکھو، کہیں تم سابق ٹریول ایجنٹ بھی نہ بن جاؤ۔''

اس کی یہ آخری بات مجھے چبھ گئی۔ ''میں کوئی بزنس جینیس ہونے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں...'' میں نے تند لہجے میں کہا۔ ''لیکن میرے کاروباری معاملات جس طرح چل رہے ہیں، ان کے مطابق میرا اندازہ ہے کہ اس سال موسمِ گرما میں، مَیں چھ ہزار افراد کو یورپ کی سیر کراؤں گا... اور اگر مجھے ایک پاؤنڈ فی کس بچت نہ ہوئی تو مجھے حیرت ہو گی۔ چھ ہزار پاؤنڈ، ممکن ہے، تمہارے نزدیک بے وقعت ہوں لیکن میرے لیے بہت ہیں۔''

اس کے بعد فلورنس، پیسا اور پھر روم کی باری آئی۔ 'اے تم' حسبِ سابق میرے بہت کام آئی۔ اور تمام معاملات بہ حسن و خوبی نمٹ گئے، لیکن وہ معاملات محض کاروباری تھے۔ رومانوی محاذ کی صورتِ حال بے حد حوصلہ شکن تھی۔

روم سے جنیوا جاتے ہوئے میں نے ایک کاروباری تجویز 'اے تم' کے سامنے رکھی۔ ''مجھے علم نہیں کہ تمہاری جاب کس قسم کی ہے...'' میں نے بات شروع کی۔ ''مجھے یہ بھی

لفظوں کی انجمن

سائیں

ہمارے ہاں فقیروں کو سائیں کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ سائیں کے معنی ہیں مالک، آقا، سائیں معنی مالکہ۔ رچرڈ برٹن کے خیال میں یہ لفظ سنسکرت کے لفظ ''سوامی'' کی ایک صورت ہے۔ منگولی زبان میں سائیں کے معنی ہیں عالیشان۔

صاحب

دورِ عباسیہ میں وزیر کا ایک لقب تھا۔ بعد میں تکریم کے لیے بولنے لگے۔ مالیات کے وزیر کو صاحب دیوان کہتے تھے۔

لکھنؤ

شہر ایودھیا کی نواحی بستی تھی جسے رام کے چھوٹے بھائی لکشمن کے نام پر بسایا گیا تھا۔ اس لیے لکھنؤ کے نام سے مشہور ہوئی۔

از علی عباس جلال پوری ✿ مطالعہ ☆ مصطفیٰ ارباب

نہیں کہ تمھیں اس میں کیا ملتا ہے۔ اس کے باوجود میری درخواست ہے کہ... تم وہ ملازمت چھوڑ دو اور میرے لیے کام کرو۔ مجھے اپنی شرائط بتاؤ تاکہ ہم اس پر گفت وشنید کرکے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

"شکریہ...!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تم مجھے اتنی رقم دے سکو گے جو میں اپنے کام سے حاصل کرتی ہوں۔ ایلن، اگرچہ میں عورت ہوں لیکن میرے عزائم بہت بلند ہیں..." پھر اس نے کچھ توقف کے بعد بے حد شیریں لہجے میں کہا۔ "میں جو کرنا چاہ رہی ہوں اگر اس میں کامیاب نہ ہوئی تو تم سے اس سلسلے میں بات چیت کروں گی۔"

سان ریمو، مونٹی کارلو، نائس اور کینز میں قیام کے دوران میں کاروباری معاملات میں اتنا مصروف تھا کہ کچھ اور سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ 'اے تم' کا بھی یہی حال تھا۔ ہمارے شب و روز ہوٹل والوں سے بحث مباحثے میں گزر رہے تھے۔ ہوٹل والوں کے مطالبات اتنے زیادہ تھے کہ ان سے متفق ہونے کی صورت میں میرا منافع صفر ہو کر رہ جاتا۔

اس تمام عرصے میں 'اے تم' میرے لیے نہ صرف بے حد اہمیت اختیار کر گئی بلکہ اس کے متعلق سوچتے ہوئے مجھے اپنی ذہنی صلاحیتیں کند ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ کینز پہنچتے پہنچتے ہماری ہم سفری کا ایک ماہ مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن مجھے اس کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ بارہا یوں ہوا کہ کسی ہوٹل کے استقبالیہ کلرک سے باتیں کرتے وقت مجھے خیال آیا کہ میں ہوٹل کے رجسٹر میں اس کا نام دیکھ لوں۔ لیکن ہر بار میری انا میرے آڑے آ گئی۔ اگر وہ مجھے اپنا نام نہیں بتانا چاہتی تو مجھے کیا پڑی ہے کہ اس کا نام معلوم کرنے کی زحمت کروں۔ اس کے علاوہ اس صورت میں استقبالیہ کلرک بھی مجھے احمق گردانتا۔ میں ایک لڑکی کے ساتھ سفر کر رہا تھا... طویل عرصے سے... میں یہ اعتراف کیسے کر سکتا تھا کہ میں اس کا نام تک نہیں جانتا۔

البتہ میں اس سلسلے میں سوچتا رہتا... اور طرح طرح کے نظریے گھڑتا رہتا۔ مثلاً، وہ کوئی بے حد اہم اور مشہور شخصیت ہے۔ لیکن میں نے اس تھیوری کو خود ہی مسترد کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی اسے پہچان چکا ہوتا۔ دوسری تھیوری یہ تھی کہ وہ حالتِ فرار میں ہے۔ یہ تھیوری مجھے بہت پسند تھی کیوں کہ اس صورت میں مجھے خود کو بڑا آدمی... وسیع النظر آدمی ثابت کرنے کا موقع ملتا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا میں اسے نظرانداز کر سکتا تھا، کیوں کہ وہ اس نے کیا تھا۔ ظاہر ہے، وہ کسی بڑے جرم کی متحمل تو نہیں ہو سکتی تھی۔ نظریے کی حد تک بات درست تھی لیکن وہ نظریہ بھی جان دار نہیں تھا۔ 'اے تم' کہیں سے بھی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ کبھی ملک کی سرحد پر اس کے انداز سے گھبراہٹ اور خوف زدگی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟

* * *

پھر ہم مارسیلز سے ہوتے ہوئے اسپین میں داخل ہو گئے۔ بارسلونا میں 'اے تم' سے کچھ خاص مدد نہ مل سکی۔ ہسپانوی زبان سے نابلد تھی۔

بارسلونا میں، میں نے تھوڑی سی بے ایمانی کی۔ میں ویک اینڈ وہاں گزارنے کے لیے ایک فرضی ملاقات کا حوالہ جو پیر کے دن ہونا تھی۔ حالاں کہ میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اب صرف واپسی کا سفر درپیش تھا۔

اتوار کا دن ہم نے ساحلِ سمندر پر گزارا۔ وہ مئی کا تھا... اور سمندر کا پانی بے حد لطف دے رہا تھا۔ 'اے تم' پیراکی کے لباس میں جل پری معلوم ہو رہی تھی۔ چار زبانیں روانی بولنے، بہترین شارٹ ہینڈ ٹائپسٹ ہونے اور اکاؤنٹنسی پر رکھنے کے علاوہ وہ ایسی خوب صورتی کی حامل تھی جو کسی بھی بے خواب راتیں عطا کر سکتی تھی۔

مجھے معلوم نہیں کہ 'اے تم' نے گریز کی تعلیم کہاں حاصل کی تھی... لیکن جہاں سے بھی حاصل کی تھی، یقین دنیا کی بہترین درس گاہ رہی ہوگی۔ وینس کی وہ شام میں نہیں بھول سکتا۔ ہم کشتی کی سیر کر رہے تھے اور آسمان پر چاند تابانیاں نچھاور کر رہا تھا۔ ہم کھانا کھا چکے تھے لیکن لقمہ طعام یاد تھی... ذائقہ زبان پر موجود تھا۔ اس وقت تک ہمارے معدوں میں اتنا مشروب اُتر چکا تھا کہ بہ ظاہر رومانی جادو کے سامنے مزاحمت کرنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اس پر ملاح گیت... اور آتشِ شوق بھڑکانے والی مزید کئی چیزیں... نتیجہ کیا نکلا؟ بتاؤں آپ کو...

"یہ بہت خوب صورت شام تھی ایلن..." 'اے تم' تھا۔ "تمھارا بے حد شکریہ... شب بخیر!"

اس روز ساحل پر 'اے تم' کو پیراکی کے لباس میں، میرا بلڈ پریشر یقیناً سو سے تجاوز کر گیا ہوگا... لیکن مجھے یہ یقین کہ 'اے تم' کو پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ میرے کانوں تک دھواں نکل رہا ہے۔ ہم پانی سے نکلے۔ 'اے تم' نے تولیے اپنے ہاتھ خشک کیے، اپنے ہینڈ بیگ سے ایک کاغذ نکالا اور پر کچھ لکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے، تم نے بہت اہم نکتہ نوٹ کیا ہے..." میں نے پُراُمید لہجے میں کہا۔ "یہی کہ تم آئندہ مجھے سنگ زاد کے بجائے آدم زاد تصور کرکے ملو گی۔"

"نہیں..." اس کی مسکراہٹ بے حد پُراسرار تھی۔ "گزشتہ روز میں نے کاربن کی آخری شیٹ بھی استعمال کر لی۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ مجھے کل پہلی فرصت میں کاربن خریدنا ہیں۔"

وہ لومڑی اور انگور والا معاملہ تو آپ جانتے ہی ہیں... انگور کھٹے ہیں! باقی سفر میں، میں نے بھی وہی دفاعی تکنیک استعمال کی۔ بات اتنی سی ہے کہ خوب صورت 'اے تم' نسلِ انسانی سے تعلق نہیں رکھتی۔ ایسے انگوروں کا کیا کرنا جو کھٹے ہوں۔ ایسی خوب صورتی کا کیا کرنا جو انسانی نہ ہو۔ اب میں کسی لڑکی کے لیے تو ہلکان ہونے سے رہا، خواہ وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ اس طرح میں نے واپسی کے سفر کے دوران اپنے بلڈ پریشر کو نارمل... بلکہ نارمل سے بھی کچھ کم رکھا... کہ اسی میں میری بہتری تھی۔

مانٹریال میں میں نے اس گیراج کے سامنے کار روکی جہاں سے میں نے اس فتنہ بدوش کو اپنا ہم سفر بنایا تھا۔ "لو بھئی... دنیا گول ہے۔ ہم یہیں سے تو چلے تھے نا...؟" میں نے کہا۔ "شاید اب تمھارے اسکوٹر کے پارٹس بھی مل گئے ہوں گے۔"

"ارے... وہ!" اس نے خوش دلی سے کہا۔ "میں نے پچھلے ہفتے گیراج والوں کو لکھ دیا تھا کہ میرا اسکوٹر انگلینڈ واپس بھیج دیں۔ ابھی مجھے تمھارے ساتھ ہی چلنا ہوگا لیکن اب رہا ہی کیا ہے۔ مجھے بولون سے تیس کلومیٹر پیچھے اُترنا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ دانت پر دانت جما لو... اور کچھ دیر مجھے مزید برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر لو۔"

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کار کے اندر کا ماحول اس وقت کیسا تھا!

"سفر بے حد پُرلطف رہا... ہے نا؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

یوں معاملہ ختم ہو گیا۔ میں ڈوور پر کار کے کاغذات دکھا رہا تھا اور کسٹم والوں سے نمٹ رہا تھا کہ 'اے تم' غائب ہو گئی۔ ایک لمحے پہلے وہ وہاں موجود تھی اور دوسرے لمحے اوجھل۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس رویے سے مجھے تکلیف پہنچی۔

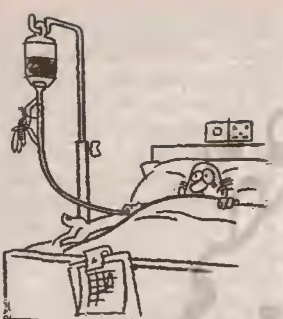

میں اس رویے کا مستحق نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جتنا اچھا اور معقول برتاؤ روا رکھا تھا، وہ خود میرے لیے بھی حیران کن تھا... بلکہ کبھی کبھی تو مجھے شک ہونے لگتا تھا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس کے باوجود اس نے مجھے خدا حافظ کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔

میں اپنی جذباتی کیفیت، ڈرامائی انداز میں بیان کرنا پسند کروں گا۔ بس، یہ سمجھ لیں کہ ڈوور سے لندن تک بہتر میل کا سفر مجھے بہت گراں گزرا... جب کہ ہزاروں میل کا سفر خوش گوار یاد کی طرح میرے ذہن میں تازہ تھا۔

'انگور کھٹے ہیں' والا فارمولا ذہن میں بسائے، میں نے کام میں مصروف ہو جانا چاہا۔ پہلا تفریحی دورہ جون میں ہونا تھا... جب کہ مئی کے کچھ دن گزر چکے تھے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ 'اے تم' کو بھول جاؤں گا۔ جہنم میں جائے وہ برف کی مورت!

لیکن یہ ارادہ بھی محض نظریاتی تھا۔ اس پر عمل کرنا بے حد دشوار تھا۔ سوئمنگ سوٹ میں لپٹے ہوئے وہ اعداد و شمار تو میرے تصور میں دھندلانے لگے تھے۔ البتہ ایک سنگین مسئلہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ جلدی سے غائب ہونے کے چکر میں 'اے تم' میرا وہ بریف کیس ساتھ لے گئی تھی جس میں تمام کاروباری معاہدے تھے۔ اس کے علاوہ تمام خط کتابت کی کاربن کاپیاں بھی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ 'اے تم' کو جب یہ پتا چلے گا تو وہ مجھے تلاش کرکے بریف کیس لوٹا دے گی... لیکن کب؟ ایک ایک دن بہت قیمتی تھا۔

میرے پاس 'اے تم' کو تلاش کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے اور انتظار کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں پانچ دن انتظار کرتا رہا... اور اگر اس عرصے میں اس کے کان گرم نہیں ہوئے تو وہ یقیناً سیمنٹ کے بنے ہوئے ہوں گے... کیوں کہ ان پانچ دنوں میں مَیں نے اسے جن ناموں سے نوازا، ان کی بازگشت آج بھی مجھے خجل کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود مجھے احساس تھا کہ اس کی فطرت میں لاپروائی اور خود غرضی کا عنصر نہیں ہے۔ کم از کم اس 'اے تم' میں تو نہیں تھا جسے میں جانتا تھا۔

* * *

اب مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ میں واپسی کا سفر کروں۔ مانٹریال کے گیراج والے کو 'اے تم' خوب یاد تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ اسے 'اے تم' کی طرف سے ایک خط موصول ہُوا تھا لیکن وہ خط اس سے ضائع ہوگیا، کیوں کہ اسکوٹر اس نے حسب ہدایت لندن بھجوا دیا تھا۔

"اسکوٹر میں خرابی کیا تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی خرابی نہیں تھی..." وہ حیران نظر آنے لگا۔ "خاتون نے کہا تھا کہ لمبے سفر کے لیے اسکوٹر مناسب نہیں ہے، چناں چہ انھوں نے ایک دوست سے بات کرلی ہے، اور کار میں سفر کریں گی۔ پھر آپ آئے اور خاتون کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

اگلا مرحلہ پیرس کا تھا۔ میں وہاں کیرنل پیلس ہوٹل کے منیجر سے ملا، جہاں ہم نے قیام کیا تھا۔ "بات تو عجیب سی ہے..." میں نے منیجر سے کہا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس خاتون کا نام اور پتا بھول گیا ہوں جو گزشتہ ماہ میرے ساتھ یہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ یہ معلومات آپ کے ریکارڈ سے حاصل ہوسکتی ہیں؟"

"یقیناً موسیو... یقیناً...!" اس نے جواب دیا۔ "میں ابھی آپ کا کارڈ نکالتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کارڈ تھا لیکن وہ پریشان نظر آرہا تھا... اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "خاتون کا نام اینابل ہے، موسیو۔" اس نے کہا۔

"پورا نام نہیں لکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جج... جی ہاں... لکھا ہے۔" اس نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ "پورا نام مسز اینابل گرانٹ ہے۔ پتا وہی ہے، جو آپ کا ہے۔ ہے نا عجیب بات، موسیو؟ یادداشت بھی بڑے کام کی ہے۔ کلرک کو یہ معاملہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ خاتون تھا کہ موسیو سوتے ہوئے بہت زور سے خراٹے لیتے ہیں، لیے وہ علیحدہ کمرا لے رہی ہیں۔"

"ہا... ہاں، یہ بات تو ہے۔" میں نے کہا اور وہاں کھسک لیا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ اگر معجزاتی طور پر مجھے بریف کیس مل بھی جاتا تو پہلا تفریحی دورہ نہیں ہوسکتا تھا۔ چلیں دورے کو تو چھوڑیں... اگر ہوٹلوں کے مالکان جن سے میں معاہدے کیے تھے، معاہدے پر عمل درآمد نہ کرنے پر مجھے عدالت میں گھسیٹ لیتے تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ اس کے علا میری ساکھ ہمیشہ کے لیے تباہ ہوجاتی۔

اب میں اس معاملے کو اور انداز سے دیکھ رہا تھا۔ محسوس تھا کہ اس نے مجھے چکما دیا ہے۔ پھر ذہن پر زور دیا تو تمام کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ ہر شہادت منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کررہی تھی 'اے تم' مانٹریال میں میری منتظر تھی۔ اسے خود پر... اپنے حسن اعتماد تھا... اور میں کتنی آسانی سے زیرِ دام آگیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ ہلٹن انڈسٹریل ٹور کو تباہی سے کیسے جائے۔ دو دن غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ ٹور کے لیے تمام انتظاما از سرِ نو کیے جائیں۔ اس صورت میں مجھے ہوٹل مالکان معذرتیں کرنا تھیں... وضاحتیں کرنا تھیں... اور یہ نہیں کہا جا تھا کہ وہ قبول کرلی جائیں گی یا نہیں۔ جون کے دورے کا وقت تو نکل چکا تھا۔ موسمِ خزاں کے دورے کے لیے کام کیا جا تھا۔ ہلٹن ٹور ہمیشہ سیزن سے ہٹ کر دورے ترتیب دیتا تاکہ تفریح کرنے والوں پر اخراجات کا بوجھ کم سے کم ہو۔ جولائی، اگست اور ستمبر کے وسط تک تو یورپ کے تمام ہوٹلو میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ رعایت کا کوئی سوال ہی نہیں جب کہ ہمارا گزر ہی رعایت پر تھا۔

چناں چہ میں نے پھر کار سنبھالی۔ البتہ اس مرتبہ میں محتا تھا۔ سفر کے دوران جابجا سڑک پر کھڑے، ہاتھ ہلاتے لوگوں نے لفٹ مانگی لیکن میں نے انھیں نظر انداز کردیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ دنیا میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جسے میں ا عالم میں بھی بہتر طور لفٹ دے سکتا ہوں۔ اسے دیکھ کر میر پیر بریک پر خود بہ خود جائیں گے۔ ہاں... 'اے تم' مجھے شد سے یاد آرہی تھی۔ اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں اس کے باوجود... اگر اگلے موڑ پر وہ مجھے بے بسی کے عالم کھڑی نظر آجائے تو چند سیکنڈ کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول ے گا... میں کار روکوں گا، دروازہ کھولوں گا اور اسے اپنے بٹھا کر خدا کا شکر ادا کروں گا۔ 'اے تم' اور اس کی یں... لعنت ہو... اس نے نہ صرف میرا کاروبار تباہ کردیا تھا ری عقل کو بھی جبری رخصت پر بھیج دیا تھا... مجھے منطقی شعور سے محروم کردیا تھا۔

سوئزرلینڈ کے سرحدی علاقے میں ایک چھوٹے ہوٹل سامنے میں نے کار روکی۔ ڈائننگ روم میں مَیں تنہا تھا لیکن ساری میزیں اس انداز میں آراستہ تھیں جیسے مہمانوں کی توقع ہو۔

ہوٹل والے نے مجھ سے کہا کہ مجھے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ باغیچہ میں چہل قدمی کے لیے نکل گیا۔ جب میں واپس آیا تو لاٹ میں پانچ عدد کوچ کھڑی تھیں۔ ان کے عقب ہلٹن فرینڈلی موٹر کوچ ٹورز تحریر تھا۔ پہلی کوچ میں ڈرائیور برابر بڑے حاکمانہ انداز میں 'اے تم' بیٹھی تھی۔ ان لوگوں اندر جانے تک میں نے خود کو چھپائے رکھا۔ پھر میں نے کوچ کے ڈرائیور سے پوچھ گچھ کی۔ مجھے پتا چلا کہ رات کو قیام جھیل کومو کے سرنوبیو ہوٹل میں ہوگا۔

میں دوپہر کا کھانا کھا ہی نہیں سکا۔ میری بھوک ہی اُڑ گئی ی۔ اس کے علاوہ مجھے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔ مجھے سامنا کرنا تھا... اس انداز میں کہ وہ اپنی نظروں میں اتنی تم ہو جائے... جتنا اس وقت سے میں ہو رہا ہوں جب سے ا بریف کیس لے کر گئی ہے۔

میں پانچ بجے سرنوبیو پہنچا۔ مجھے اچھا کمرا مل گیا۔ بالکونی کی طرف کھلتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت منظر تھا۔ میں میں بیٹھا انتقام کے لیے منصوبہ بندی کرتا رہا۔ لیکن پھر کچھ بھول گیا۔ میرے حلق میں گولا سا پھنس گیا۔

ر سے وہ قافلہ آتا نظر آیا تھا جس کا میں منتظر تھا۔ پھر 'اے تم' کو کوچ سے اُترتے دیکھا۔ اس کا انداز ؤں کا سا تھا جو اپنے غلے کے لیے فکرمند ہو۔ اس کے ادا اور حسنِ جہاں سوز میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے کو ہوٹل میں دھکیلا اور سب سے آخر میں خود داخل میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے کمروں میں جانے کے ہوگا۔ چناں چہ میں نے لباسِ غسل پہنا، تولیا اٹھایا اور ا۔

'اے تم' نے وہی سوئمنگ سوٹ پہنا ہوا تھا، جس سے میں خوب واقف تھا۔ 'اے تم' نے ڈائیونگ بورڈ پر خود کو متوازن کیا اور پھر بہت خوب صورت قوس بناتی ہوئی پانی میں کود گئی۔ میں ڈائیونگ بورڈ پر پہنچا تو وہ کوئی سو گز دور جاچکی تھی۔

میں اس کے عقب میں پہنچا تو وہ اس وقت پشت کے بل تیر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں شفاف نیلے آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی کمر کے نیچے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے پانی میں ڈبو دیا۔ دس سیکنڈ بعد میں نے اسے چھوڑا تو وہ کلیاں کرتی ہوئی اوپر ابھر آئی۔

"شام بخیر، مسز اینابل گرانٹ!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ پھر اسے ایک اور غوطہ دے دیا۔ وہ صرف 'اوہ' ہی کہہ سکی تھی۔ پانی کی سطح پر بلبلے رقص کرنے لگے تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔

"تم مجھے ڈبونے والے ہو کیا؟" اس نے اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد کہا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا ہے۔

"یقین سے نہیں کہہ سکتا..." میں نے جواب دیا۔ "اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم میرے سوالوں کے صحیح جواب دیتی ہو یا نہیں۔ میں سب کچھ سچ سننا چاہتا ہوں۔ آخر تم نے ایک ایسے شخص کو تباہ کرنے کی کوشش کیوں کی جس نے تمھیں کوئی ضرر نہیں پہنچایا... بلکہ جس نے تم سے اس قدر اچھا سلوک کیا۔

جوش و آزاد

جوشؔ ملیح آبادی ایک بار گرمی کے موسم میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی غرض سے اُن کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہاں ملاقاتیوں کا ایک جمِ غفیر پہلے سے موجود تھا۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی جب مولانا سے ملاقات کے لیے جوش صاحب کی باری نہ آئی تو اُنھوں نے اُکتا کر ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر چپراسی کے ہاتھ مولانا کی خدمت میں بھجوا دیا۔

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

مولانا نے یہ شعر پڑھا تو زیرِ لب مسکرائے، اور فی الفور جوش صاحب کو اندر طلب کرلیا۔

تعاون: زاہد حسین، ملتان

اتنا مہربان ثابت ہوا... تمہارا اتنا خیال کیا کہ جس کی تم مستحق بھی نہیں تھیں۔ اگر تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتانے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں نہیں ڈبوؤں گا۔" اپنی بات کا تاثر دینے کے لیے میں نے مزید دس سیکنڈ اسے زیرِ آب رکھا۔

"ہاں... ایلن، میں وعدہ کرتی ہوں... میں قسم کھاتی ہوں۔" اس نے جلدی سے رضامندی کا اظہار کیا۔ اس وقت تک اس کا آدھا پیٹ یقیناً جھیل کومو کے پانی سے بھر چکا تھا۔

ہم تیرتے ہوئے ساحل تک پہنچے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ریستوراں میں گئے جس کی بالکونی سے جھیل کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ 'اے تم' کو حیرت انگیز طور پر زوردار بھوک لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ بڑی بے نیازی سے صرف کھانے کے ساتھ انصاف کرتی رہی۔

"ہاں... اب تم مقدمہ چلا سکتے ہو۔" وہ بولی۔ ویٹر نے میز صاف کر دی تھی اور کافی لے آیا تھا۔

"پہلا سوال... تمہارا نام کیا ہے؟ میں تمہیں 'اے تم' کہتے کہتے بیزار ہو چکا ہوں۔"

"میرا نام ڈیفن ہے۔"

"ڈیفن کیا... میرا خیال ہے، تمہارے والد بھی یقیناً ہوں گے۔"

"ڈیفن بلٹن... ایک اعتبار سے ہم کزن ہیں۔ تمہارے پھوپا میرے چچا تھے۔ میرے والد اور چچا ہلٹن نے مل کر یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ بعد میں انکل جارج نے میرے والد کو بے دخل کر دیا تھا۔"

"اگر یہ سچ ہے تو تمہارے والد نے کوئی قانونی کارروائی کیوں نہیں کی؟"

"کیسے کرتے۔ وہ اس دنیا سے چلے جو گئے تھے تاہم ان کے حصے کا کام میں نے کر دیا۔ میں سب کچھ تم سے چھین کر لے گئی۔ تم ننھے سے بچے تھے... اور میں تمہاری نرس... ویسے تمہیں یوں آنکھیں بند کر کے دستخط نہیں کرنے چاہئیں۔ تمام معاہدے ہلٹن فرینڈلی موٹر کوچ ٹورز کے نام سے ہوئے اور یہ میرا ادارہ ہے۔ اور کوئی سوال؟"

"ہاں..." میں نے کہا۔ "تم کھانا پکا سکتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور کچھ؟"

"تمہارے خیال میں ہمارے بچوں کی کم از کم تعداد کتنی ہونی چاہیے۔ میرا مطلب ہے، ہمارے لیے کتنے بچوں کا والدین بننا مناسب ہے؟"

"ان احمقانہ باتوں میں وقت ضائع کرنے کی م پاس گنجائش نہیں ہے..." وہ تنک کر بولی۔ "یہ مت بھول میرے ذمے دو سو ٹورسٹ ہیں جن کے آرام و آسائش کا ہی خیال رکھنا ہے۔"

"کس کے دو سو ٹورسٹ؟" میں دہاڑا۔ "تم سمجھتی ہو میں تمہیں یونہی چھوڑ دوں گا؟ اگر میرے حسب منشا سمجھوتا تو یہاں سے... اس میز سے تم سیدھی کسی اطالوی پولیس اسٹیشن رُخ کرو گی... اور وہاں رات گزارو گی... بلکہ کئی راتیں گز گی۔ جعلی معاہدے، فراڈ، ہوٹل کے رجسٹر پر غلط نام لکھوانا میرا بریف کیس چرانا... اور خدا جانتا ہے، تمہارے جرائم فہرست کتنی لمبی ہے۔"

"ایلن... تم مذاق کر رہے ہو۔ تم میرے ساتھ سلوک..."

"کیوں نہیں کر سکتا۔ تم انکار کر کے دیکھو۔"

پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آئی جو نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ "تمہارا مطلب ہے ڈیئر..." نے بے حد شیریں لہجے میں کہا۔ "کہ تم اپنے ہونے والے کی ماں کی پیشانی پر مجرم ہونے کا ٹھپا لگواؤ گے؟"

"اگر مجبور کرو گی تو میں اس سے بھی باز نہیں آؤں گا۔"

"تب تو جان... میں جیل جانے کے مقابلے میں قید پسند کروں گی... یہ تو میرے ٹور کے لوگوں کے ساتھ ز ہو گی کہ وہ جھیل کومو کے کنارے بے یار و مددگار پڑے جائیں۔"

"کس کے ٹورسٹس؟" میں پھر دہاڑا۔

"ہمارے، ڈیئر...!" اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہو کہا۔ "آؤ... اب دونوں اداروں کو ضم کر لیں۔"

میں تو اسی انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے فوراً انضمام کی کارروائی مکمل کر ڈالی۔

اب ہلٹن فرینڈلی موٹر کوچ ٹورز ایک کامیاب ادارہ آئندہ سیزن کے لیے گیارہ ہزار افراد بکنگ کرا چکے ہیں۔ میرا مطلب ہے، ڈیفن کی خواہش ہے کہ ہمارے ننھے سردیوں میں پیدا ہوں، تاکہ وہ بغیر کسی دشواری کے، اپنے عا مزاج کی تشفی گھر میں بھی کر سکے۔ یوں مجھے فلسفی کا کردار ادا کے لیے وقت مل جاتا ہے۔ ویسے سابق فلسفی بننے سے پہلے لیے تمام چیکس پر دستخط میں خود کرتا ہوں۔

سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر ہیں
اردو ادب سے تین یادگار، طرح دار کہانیاں

پہلی کہانی

ڈرائنگ روم

محمد حامد سراج

ڈرائنگ روم میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے... لیکن بعض
ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو سب سے مختلف ہوتی ہیں...
اور جن کا کوئی ثانی نہیں ہوتا!

ایک روز شام ڈھلے میں ایک میڈیکل اسٹور سے دوا لے رہا تھا کہ موبائل پر مسڈ کال نے متوجہ کیا۔ نمبر دیکھا تو ں تھا۔ رانگ نمبر معمول ہوں تو توجہ دینا عبث ٹھہرتا ہے۔ ہ کے ضیاع کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ پانچ منٹ بعد اسی ے دوبارہ مسڈ کال آئی۔ تیسری مسڈ کال آدھ گھنٹے بعد خاموشی چھا گئی۔

اگلے روز دوپہر میں اسی نمبر سے ایک مختصر سا ایس ایم ومن اردو میں موصول ہوا۔

"کیا میں آپ کے ساتھ رابطے میں رہ سکتی ہوں؟"

"بغیر تعارف کے رابطے بے معنی ہوتے ہیں۔"

"میرا رابطہ بامعنی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ مجھے ثبوت چاہیے' تمہیں بات بھی کرنا ہوگی۔"

"سر...! ثبوت تو پیش کر دیتی ہوں لیکن بات... سر دست ممکن نہیں۔"

"چلیے، ثبوت ایس ایم ایس کیجیے۔"

"سر... آپ کی تخلیق "میا" نے میرا دکھ بانٹا ہے۔ میرا جی چاہا میں آپ سے رابطے میں رہوں۔ ایس ایم ایس کرنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔"

اس ایس ایم ایس کے بعد بہت سے دن بیت گئے اور میں بھول گیا۔ زندگی کی ذمے داریاں نبھانا بھی ایک مستقل نوعیت کی جاب ہے۔ قریباً مہینے بعد اس کا ایس ایم ایس آیا۔

"سر... سہ پہر کا وقت ہے۔ گہرے بادل چھائے ہیں، میں

آنگن میں درخت کے نیچے بیٹھی سہ پہر کی چائے پی رہی ہوں۔ یہ میرا روز کا معمول ہے۔ یہ وہ وقت ہے جس میں میں اپنی تنہائی سے ہم کلام ہوتی ہوں۔ کیا آپ مری تنہائی بانٹیں گے؟ میں چائے کے کپ پر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"یہ بتایئے، بات کرنا آپ کے لیے کیوں ممکن نہیں؟"

"سر، یہ کتھا ایس ایم ایس میں نہیں سما سکتی، وقت نے مہلت دی تو دل کا ورق آپ کو پڑھا دوں گی۔" پھر وہ اکثر سہ پہر کی چائے کے دوران مختصر سا ایس ایم ایس کرتی۔ چائے کے ساتھ جو بھی لوازمات ہوتے بسکٹ، کیک، سموسے، کباب، سب تفصیل بیان کرتی۔

"سر...! آپ کو خبر ہے، میرے سامنے ہمیشہ دو کپ رہتے ہیں۔"

"دو کپ کیوں؟"

"سر... یہ بھی طویل کہانی ہے۔ میرے من کے بینک میں دُکھ کا کریڈٹ روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے۔ کوئی تو ایسا آئے جو اسے کیش بھی کرائے۔ سر! میں نے اپنے دکھ اسی طرح سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں جیسے الماری میں بچپن کے گڑیاں پٹولے مجھے بچپن لوٹا دیتے ہیں۔"

دن روز ڈھل جاتا... عمر کا ایک حصہ کاٹ کر۔ مہینے میں دو تین ایس ایم ایس اس کا معمول تھے۔ بات کرنے کا موقع اسے میسر آیا نہ میں نے اصرار کیا۔ وہ ایک معمول کی سہ پہر تھی۔ اس نے بیل دی۔ پہلی گھنٹی، دوسری، تیسری، میں نے کال اٹینڈ کرلی۔

"سر! سلام پیش کرتی ہوں، لمبی بات نہ ہو پائے گی۔ میں ایک ایسی حویلی کی مکین ہوں جس کی دیواریں آسمان کو چھوتی ہیں۔ یہاں سے عورتوں کے صرف جنازے نکلتے ہیں۔ جیتے جی ان کی جھلک دیکھنا موت کی پکار پر لبیک کہنے کے مترادف ہے۔ سر، میں فون بند کرتی ہوں، پھر سہی۔ اللہ حافظ۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"

میں اکثر سوچتا، وہ کیسی تنہائی جھیل رہی ہے۔ اسے کیا غم ہے؟ میرے ساتھ اس کا ایک بے معنی رابطہ ہے، اس سے اسے کیا حاصل؟

ایک روز گفتگو کے دوران میں میں نے اس سے کہا۔ "یہ تمہارا موبائل نیٹ ورک بہت مہنگا ہے۔"

"سر... پیسا دراصل ہمارا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میرے پانچ بھائی ہیں، ہر سال کار کا ماڈل بدل لیتے ہیں۔ دولت کی فراوانی ہے، بزنس کے سلسلے میں بھائی شہر سے باہر رہتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں آپ کے موبائل نیٹ ورک پر سوئچ اوور کر لیتی ہوں۔"

"نہیں... ضروری تو نہیں۔"

"سر... آپ کی خاطر طعنے بھی سہہ لیں گے۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"سر... یہ جو موبائل نیٹ ورک ہے نا، یہ بھی اسٹیٹس سمبل ہو گیا ہے۔ ہمارے پورے خاندان میں کسی کے پاس بھی آپ والے موبائل نیٹ ورک کی سم نہیں، جب میں سوئچ اوور کروں گی تو سب کو اچنبھا ہوگا۔ کزنز قہقہے لگائیں گے... بے چاری غریب ہو گئی ہے... کوئی کہے گا، کنجوسی کی حد ہوتی ہے۔ وہ کسی ملاقات پر اپنے نیٹ ورک کی خوبیوں میں اتنے دلائل دیں گے اتنا شور مچائیں گے کہ اس شور سے چھت اُڑ جائے گی... لیکن... سر... کل سے میں آپ کے لیے سم بدل لوں گی۔"

"پاگل نہ بنو... رہنے دو..."

"نہیں سر... دل کی عدالت میں بیٹھا جج فیصلہ سنا کر ریٹائرنگ روم میں جا چکا ہے۔"

اگلے روز اس نے نئی سم سے مجھے کال کی۔

"سر... آپ کا نمبر بھی فیورٹ کرا لیا ہے۔ رات گیارہ بجے آپ سے تفصیلی بات کروں گی... آپ کے پاس وقت ہوگا... نا؟"

وقت کے ہی تو ہم امیر ہیں۔

گرمیوں کی رات تھی، آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ ویسے ہی تھے جیسے بچپن میں دادی ماں سے کہانی سنتے سے ہُوا کرتے تھے۔ سات ستاروں کا جھرمٹ جسے دادی ماں "ترنگڑ" کا نام دیا کرتی تھیں۔ "ترنگڑ" جس میں بھوسا ڈال کر اونٹوں پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے۔ ستارے جن سے پہلے زمانوں میں لوگ سمت نما کا کام لیتے اور راستے طے کرنے میں آسانی رہتی۔ میں اپنے بچپن سے محوِ کلام تھا کہ موبائل کی مخصوص آواز نے متوجہ کیا۔

"سر... آپ ٹھیک ہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے۔"

"سر... ایک بات کہوں؟"

"کہیے!"

"آپ اپنے طور پر مجھے کال یا ایس ایم ایس کیوں نہیں کرتے؟"

"اچھا نہیں لگتا۔"

"میں سمجھی نہیں..."

"تمہارے ماحول کا تقاضا ہے کہ تمہاری تکریم کا خیال رکھا جائے۔"

"سر...! میں اتنی اچھی نہیں ہوں، میرا اتنا خیال نہ رکھا کریں۔ میں کیسے کہوں ایک خیال رکھنے والا تھا، وہ خواب ہُوا...!"

"کون؟"

"سر... وہ جو... میرا نہیں تھا۔ سہ پہر کی چائے پر اپنا ادھورا کپ چائے کا چھوڑ گیا... میری زندگی ادھوری رہ گئی۔ تب سے میری میز پر میری چائے کے ساتھ اس کا آدھا کپ بھی موجود رہتا ہے۔ میں نے کرسی بھی اس جگہ سے نہیں اٹھائی جہاں سے وہ اٹھ کر گیا تھا، مبادا کسی لمحے اچانک لوٹے اور کرسی آباد ہو جائے... سر... وہ میرا تھا، میرے وجود کی مہک اور... اور...!"

سسکیوں میں آواز کا تار ٹوٹ گیا۔

"سر... کہا تھا... نا کہ ہماری حویلی کی دیواریں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ ہم گھر سے نکلتے ہیں تو کار تک نوکر پشت کیے چادریں تانے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم چادروں میں لپٹی کار میں بیٹھتی ہیں۔ کار کے شیشوں پر پردے لگے ہیں۔ فرنٹ اور بیک سیٹ کے درمیان بھی پردہ لگایا گیا ہے تاکہ آئینے میں ڈرائیور عکس نہ دیکھ لے... سر... دم گھٹتا ہے میرا۔ لگتا ہے، کسی اندھے کنوئیں میں قید کر دی گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی جس میں انسان اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لے سکے۔ کالج لائف میں دو نوکرانیاں مسلسل نگرانی پر مامور رہیں... ناک اتنی اونچی ہے کہ کوئی لڑکا میرے والدین کی نظر میں جچتا ہی نہیں اور وہ جو آدھا کپ چائے چھوڑ گیا تھا، اس کی جائیداد کم تھی۔"

"آدھے کپ والا گیا کہاں؟"

"سر... کہیں نہیں گیا۔ وہ جا بھی کہاں سکتا ہے، میرے دل میں بیٹھا ہے۔ باتیں کرتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے، ناراض ہوتا ہے، روٹھ جاتا ہے۔ منا لیتی ہوں میں اسے... کاش سر! جیسے اسے میرے گھر سے نکالا گیا، دل سے بھی نکال دیا جاتا تو چین سے جی لیتی سر...! یہ جو دل کے مکین ہوتے ہیں، یہ دل کی ریاست سے کیوں نہیں نکلتے... سر...! آپ میری باتوں سے اُکتا تو نہیں گئے؟"

اس کی آواز میں نمی تھی۔ میں اس کی گفتگو انہماک سے سُن رہا تھا۔ شاید وہ اپنی تنہائی کا صحرا پاٹنا چاہتی تھی۔

"سر... آپ چپ کیوں ہیں...؟"

"تمہاری گفتگو کا دھاگا کہیں ٹوٹ نہ جائے... تم کہو، میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"سر...! آپ نے آج تک مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا۔"

"بے نام رشتے کو، بے نام ہی سفر طے کرنے دو۔"

"ہاں... سر! میں کہہ رہی تھی، گھر کیا ہے... مغلیہ عہد کی حویلی ہے۔ باہر ڈیرے پر میلہ لگا رہتا ہے۔ میرے والد جاگیردار ہیں اور ہاں... بھائیوں کو سیاست کا چسکا ہے۔ مجرا بھی معمول کی بات ہے۔ میری کُل کائنات میرا کمرا ہے۔ کمرے میں ہلکا آسمانی پینٹ ہے، پردوں کا رنگ میچنگ ہے، دیوار پر صادقین کی پینٹنگ کے ساتھ تاج محل کی ایک آئل پینٹنگ ہے جو ایک سہیلی نے تحفے میں دی تھی۔ کلاسیکی موسیقی کی سی ڈیز ہیں۔ سامنے الماری میں پندرہ بیس انگریزی ناول اور اردو فکشن ہے جو میرا درد بانٹتے ہیں... سر، میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے..."

"کہو!"

"آپ سے ایک ملاقات کی خواہش... صوبہ پنجاب میں ہوتی تو شاید آسان ہوتا لیکن سر!... کہاں آسان ہوتا تھا، دیواریں، آسمان، بلندی، بندشیں، چھوڑیے سر!... کوئی خواہش نہیں پالنا اب مجھے... آدھا کپ چائے ہی کافی ہے۔"

باتیں کرتے کرتے وہ چپ ہو گئی۔ میں سمجھا کال کٹ گئی ہے...

"ہیلو... ہیلو!"

"جی... سر!"

"چپ کیوں سادھ لی؟"

"سر... میرے گاؤں کا رستا کٹھن ہے۔ خواہش کا کیا ہے، مُنہ زور ہے۔ زیادہ سے زیادہ پچھاڑ کھائے گی نا... پہلے ہی وجود ادھورا ہے۔ آپ میرے شہر کا نام ذہن میں محفوظ کر لیجیے شاید کبھی وقت کی لغت سرک جائے اور ملاقات کا سامان نکل آئے۔ ایک بڑی شاہ راہ سے گزرتے ہوئے آپ کو سائن بورڈ نظر آئے گا جس پر ہماری حویلی کا نام درج ہے۔ شاہ راہ چھوڑ کر ذیلی سڑک پر ہو لیجیے گا۔ چند کلومیٹر بعد گھنے درخت آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ کبھی زندگی میں ایک بار... سر... صرف ایک بار، میرے صوبے سے گزر ہو، گھنے درختوں میں حویلی کے اونچے برج ہیں۔ وہاں لوگوں کا تانتا بندھا ہوگا۔ مجھے ایک ایس ایم ایس کر دیجیے گا۔ میرے لیے یہ خوشی بہت ہوگی کہ آپ ایک بار، صرف میری خاطر یہاں آئے تھے۔"

وعدہ مشکل تھا۔

کال کٹ گئی۔

دن پھر اپنے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

سردیوں کی ایک دوپہر تھی۔

ایس ایم ایس... مختصر سا... "سر... آپ کے صوبے میں سانس لے رہی ہوں۔"

"کس شہر میں؟"

"لاہور..."

"خیریت ہے؟"

"کزن کی شادی میں آئے ہیں۔ سر!... اللہ حافظ... رات میں

ایس ایم ایس کروں گی۔" رات گزر گئی۔ رات میں موبائل سائیلنٹ موڈ پر ہوتا ہے۔ صبح دیکھا تو اس کے تین ایس ایم ایس موجود تھے۔

"سر... رات کا کھانا فورٹریس اسٹیڈیم کے ایک ہوٹل میں کھایا۔ بہت اچھا لگا۔"

دوسرا ایس ایم ایس: "سر... فورٹریس اسٹیڈیم کی سیر کے دوران میں ایک بک اسٹال پر رُکی۔ آپ کا 'افسانوں کا مجموعہ 'برائے فروخت' نظر آیا... سر کتنی خوشی ہوئی... مت پوچھیے، خرید لیا۔"

تیسرا ایس ایم ایس: "رات میں سوئی نہیں۔ 'برائے فروخت' مکمل پڑھ کے سوئی۔"

* * *

میرے موبائل میں اس کے چند ایس ایم ایس محفوظ ہیں جو میں نے ڈیلیٹ نہیں کیے... کیوں ڈیلیٹ نہیں کیے اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے، بہت سارے سوال ساری عمر جواب طلب رہتے ہیں۔ میں ایس ایم ایس ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

"کسی کو آنکھوں میں نہ بساؤ
آنکھوں میں صرف سپنے بستے ہیں
مانا ہے تو دل میں بساؤ
کیوں کہ دل میں صرف اپنے بستے ہیں"

"یوں راتوں کو نہ جاگو' سو لیا کرو
یوں دل میں آنسو نہ روکو' رو لیا کرو

"سر!... کیسے ہیں۔ امید ہے ٹھیک ہوں گے۔ کبھی کبھی تنہائی اور اُداسی کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

"پھر چاند کھلا پھر رات ہوئی
پھر دل نے کہا ہے تیری کمی
پھر یاد کے جھونکے مہک گئے
پھر پاگل ارماں بہک گئے
پھر گزرے لمحوں کی باتیں
پھر جاگی جاگی سی راتیں
پھر ٹھہر گئی پلکوں پہ نمی
پھر دل نے کہا ہے تیری کمی...

"سر... خبر نہیں کس چیز کی کمی ہے سمجھ نہیں آتی... اپنا خیال رکھیے گا...

"نہ ملتا نقدِ جاں دے کر بھی ہم کو
گراں تھا اس قدر سودا کہ ہم بازار چھوڑ آئے"

* * *

"کوئی آئینہ رکھا ایسا کہ خود بھی دکھائی دے، جس میں
ضروری ہوتی ہے خود سے بھی ملاقات کبھی کبھی"

* * *

"حیرت تو یہ ہے بخیہ گروں کے ہجوم میں
اک نامراد زخم ہے جو سِل نہیں رہا"

موبائل آف رکھنا میرے مزاج کا حصہ نہیں۔ جیسے شروع میں کہا کہ رات میں سائیلنٹ موڈ پر ہوتا ہے۔ ایک بار بخار کے دوران میں نے موبائل بند کر کے رکھ دیا۔ جس روز موبائل آن کیا... اس کا ایس ایم ایس اس کی تڑپ کی گواہی دے رہا تھا۔

"سر!... دیٹ اِز ناٹ فیئر۔ میں بہت ڈر گئی تھی۔ آپ ا نمبر کیوں بند تھا؟ بہت ڈر لگا مجھے۔ آپ ایسا نہ کیا کری اوکے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ شب بخیر... اللہ حافظ۔"

زندگی رواں ہے۔ ہم زمین پر اپنے حصے کا سفر مکمل کر کے سو جائیں گے تو بھی یہ رواں ہوگی۔ میرے من میں تھا کہ کسی روز اس شخص کا پتا معلوم کرنا ہے جو میز پر آدھا کپ چائے چھو گیا اور کرسی جس کے انتظار میں نہیں اٹھائی گئی۔ جب بھی ا کی تفصیل معلوم کرنے کو بات کی، وہ طرح دے جاتی...

"سر... آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے نا..."

"کیسے سمجھنے کی کوشش کروں؟"

"سر... جو زندگی سے نکل گیا' من کی تلاش سے واپس تو نہیں آئے گا۔"

وہ اپنے دُکھ... سکھ میرے ساتھ بانٹتی... الگنی پر ڈالے گئے کپڑوں تک کا ذکر کرتی۔ کوئی نئی کتاب' تازہ میوزک کی سی ڈی... اس نے اپنی زندگی کے سارے ورق مجھے سنائے۔ میرے دل کے ریک میں اس کی کتاب زیست محفوظ ہے۔

ارادہ باندھا، نہ خیال تھا کہ کبھی اس کے شہر کا سفر درپیش ہوگا۔

لیکن ایک دن پاؤں میں سفر باندھے انہی راہوں سے گزرنا تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن خیال آیا... اگر اس روز وہ گھر پر موجود نہ ہوئی تو اسے دکھ ہوگا۔

میں نے اسے ایس ایم ایس کیا۔

"سر... ناممکن... میں نہیں مانتی' کب؟ کس وقت...؟"

"ساون کی ایک سہ پہر میں تیرے دیس سے گزروں گا۔ حویلی کے باہر جو ڈیرا ہے' وہاں اتروں گا۔ درختوں کے درمیا گے جو مٹکے رکھے ہیں' مٹی کے کٹورے میں پانی پیوں گا۔ ی شاہ راہ سے ہوتا ہوا زندگی کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں گا۔"

"سر... آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"کیا تیرا میرا مذاق چلتا ہے؟"

ساون کی سہ پہر کون سی اتنی مسافت پر تھی۔ بڑی شاہ راہ سے ی میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا۔ تارکول کی ل' کہیں کہیں اونٹوں کے قافلے' سرکنڈوں کے درمیان چرتی وں کے ریوڑ... جب میں حویلی کی جانب مڑا' سامنے کشادہ اور ڈیرا تھا۔ گھنے درختوں کے نیچے دیوہیکل پایوں والی چار پائیاں ی تھیں۔ مٹکے رکھے تھے اور ان پر مٹی کے کٹورے دھرے تھے۔ چار ائی پر بیٹھے ایک شخص نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور آمد کا مقصد پوچھا۔

"میں نواب صاحب کی ملاقات کو آیا ہوں۔"

انھوں نے چارپائی کے سرہانے منقش جھالردار تکیے رکھے۔ نے مٹی کے کٹورے میں پانی پینے کی خواہش ظاہر کی....

"نواب صاحب کے باہر آنے کا وقت..." ایک خشخشی ڑھی والا جس نے سر پر پگڑی جما رکھی تھی... کہا۔

ابھی کٹورا میں نے منہ سے لگایا تھا کہ ملازمین میں ہلچل مچی ری فضا مؤدب ہوگئی۔ درمیانے قد کا ایک شخص' کاٹن کا کڑ ا سوٹ زیب تن کیے نمودار ہوا۔ مونچھیں ترشی ہوئی بال ریا نے پیچھے کی جانب جھٹکے ہوئے' پاؤں میں نفیس چپل ے کی' سونے کی انگوٹھیاں دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں...

میں نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا۔

"آپ کا تعارف؟"

"ایک مسافر' سیاح... بڑی شاہ راہ سے گزرتے ہوئے پ کی ریاست کا بورڈ پڑھا۔ ہم آبلہ پا' صحرا نورد یونہی پاؤں میں سفر باندھے گھومتے رہتے ہیں۔ کہیں کوئی منظر روک لے تو ھر سانس لینے کو رک جاتے ہیں۔"

وہ زیرِ لب مسکرائے۔

"پڑھے لکھے لگتے ہو... گفتگو کا سلیقہ بھی ہے۔ یونیورسٹی انے میں ہم نے بھی کئی شوق پال رکھے تھے۔ کتابوں کا ل بھی رہا۔ اب کتابوں کی جگہ گھوڑوں اور سیاست نے لے ی ہے۔ کتنی دیر رکنا ہے آپ نے؟"

"نواب صاحب... سفر طویل ہے... چند ثانیے...!"

"ایک کپ چائے ہو جائے' مہمان نوازی ہماری روایت ہاں ہے۔"

"جی... انکار کی جرأت کہاں سے لائی جائے۔"

"خوب' خوب!"

میں نے ان کے ساتھ اس آہنی گیٹ کی طرف قدم بڑھائے جس کے دونوں پٹ سیاہ بھاری گولڈن کنڈے' ساتھ ایک متصل منقش دروازہ' قدیم عہد کی تاریخ کا گواہ۔

دروازے میں میری دل چسپی دیکھ کر نواب صاحب نے کہا۔ "منگورہ سے یہ دروازہ ہم مہنگے داموں خرید کر لائے تھے۔"

* * *

نواب صاحب اسی دروازے سے اندر چلے گئے۔ وہ میری محبت نہیں تھی پھر بھی عجیب سی بے چینی تھی... ایک نوکر نے سرگوشی کی۔ "آپ خوش قسمت ہیں۔"

"کیسے؟"

"نواب صاحب کے ڈرائنگ روم میں منسٹرز اور قریبی دوستوں کے علاوہ اور کوئی داخل نہیں ہوتا..."

جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا' مجھے سکتہ ہوگیا۔ دیوار پر چیتے کی کھال' دائیں جانب نظر گھومی تو ان کے آباؤ اجداد کی منقش فریموں میں جڑی تصویریں' فرنیچر انتہائی قیمتی' نفیس' شیشے کی ڈائننگ ٹیبل کے گرد چوبیس کرسیاں...

"آپ ہمارے مہمان ہیں، گو چند لمحوں کے لیے سہی۔ ہماری کوشش ہوگی' یہ لمحے آپ کو یاد رہیں۔"

موضوعِ سخن کتابیں تھیں' تاریخ اور سیاست!

ایک نوکرانی بے آواز قدموں سے داخل ہوئی اور جوس کے دو گلاس میز پر رکھ کر اسی انداز میں مؤدبانہ لوٹ گئی۔ اگلے چند لمحوں میں اس نے میز پر فروٹ چُن دیے۔ چائے میں پیزا' فروٹ کیک' بسکٹ' سموسے قیمے والے' آلو کے کٹلس...!

میں اس لمحے ڈرائنگ روم میں موجود نہیں تھا۔ میں کہاں تھا...؟ نہیں معلوم... میں لوٹ جانا چاہتا تھا۔ میں کیوں آیا...؟ یہاں کیوں گھڑی بھر کو قیام کیا...؟ چائے کی پیالی ابھی ہونٹوں کے قریب ہی تھی کہ ایک نوکر رکوع کی حالت میں اندر داخل ہوا اور نواب صاحب کو کسی کی آمد کی اطلاع دی... آنے والا یقیناً اہم تھا کہ نواب صاحب خود چل کر گئے۔

نوکرانی ظاہر ہوئی۔

"مالکن کہہ رہی ہیں' خدمت میں کوئی کمی رہ جائے تو معاف کر دیجیے گا۔"

نوکرانی کو کیا معلوم تھا کہ کمی کس چیز کی ہے!

چند لمحات... ثانیے... وقت کی مٹھی سے پھسل کر گرے۔ پھسلتے لمحوں میں خوف تھا' امید' آس' خواب اور نہ جانے کیا... چند ثانیے... ڈرائنگ روم کے ساتھ ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا... پردہ سرکا۔

ایک ثانیہ... صرف ایک ثانیہ' ایک جھلک...

اس نے ماتھے پر اپنی مرمریں انگلیوں کو لے جا کر سلام مکمل کیا۔

اور... پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

ایک ثانیہ...!

وہ میری محبت نہیں تھی۔

پھر وہ لمحہ عمر بھر کے لیے میرے من میں کیوں ٹھیر گیا...؟ کیا محبت کے سوا بھی کوئی رشتہ ایسا ہے کہ ایک لمحہ من میں امر ہو جائے؟

چائے کب پی کر اٹھا؟ نواب صاحب سے وقتِ رخصت ملنے کا انداز کیا تھا؟ کس کو دیکھا...؟ کچھ یاد نہیں... گھنے درخت' مٹکوں پر مٹی کے آب خورے' اونچے چبوترے پر وہ رقص کرتے مور' جنگلے میں پاؤں سمیٹے بیٹھا چیتا...!

بہت حبس تھا جب میں وہاں سے نکلا...

وقت کی ہتھیلی پر حالات و واقعات کی' ریلوے لائن کی طرح ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی لکیریں ہیں۔ ان میں اس کی شادی کا بھی اندراج ہے... اس شادی کے بارے ایک روز اُس نے کہا۔ "سر... میں خوش اور مطمئن ہوں لیکن جو خوشی میرے حصے میں آئی ہے، اسے سمجھوتا کہتے ہیں..."

اس کے بعد وقت کی کلیکشن ڈسٹرب ہے... ایس ایم ایس اور کال کی کڑیاں بے ترتیب ہیں۔ شادی کے بعد بھی سہ پہر کی چائے اور آدھا کپ چائے جو کوئی بھول گیا تھا' موجود تھی۔ میں مطمئن تھا کہ اس نے تنہائی کے اوقات کو ترتیب دے لیا ہے... آدھا کپ چائے کی خیر ہے... کسی کی یاد کا ایسا لمحہ ہوگا جس نے اسے جینے کا انداز بھلا دیا۔

بہت مہینے گزر گئے... مجھے یاد رہا نہ اس نے ایس ایم ایس کیا...

ایک سرد صبح میں نماز کے لیے جاگا تو اس کا ایس ایم ایس بے چین کر گیا۔

"سر!... آج کسی بھی وقت میں آپ کو کال کروں گی۔"

دوپہر میں اس کا فون آیا۔

"سر! آپ کیسے ہیں؟"

"تم کہو..."

"سر... آپ کی تخلیق 'میا' اور 'برائے فروخت' سامنے میز پر رکھی ہیں۔ ساتھ میں اشفاق احمد کی 'زاویہ' جمیلہ ہاشمی کا 'دشت سوس' اور عبداللہ حسین کا ناول 'باگھ' رکھا ہے۔ سر... آپ نے 'ماں' کا کینسر جھیلا ہے اور 'برائے فروخت' میں ایک افسانہ ہے 'جھونکا ہوا کا'۔ اس میں بھی موت کی ڈیپتھ ہے۔ سر... آپ بڑی ہمت والے ہیں۔ کیسے کیسے درد جھیل جاتے ہیں... سر... ان دنوں میں بیمار ہوں۔ دعا کیجیے گا... شام میں فون کر
اللہ حافظ۔ اپنا خیال رکھیے گا!"

اس کی گفتگو معنی خیز تھی۔ دوپہر اور شام کے صدیاں بجھ گئیں... شام میں اس کا فون آیا...

"سر... آپ کو یاد ہے نا... آپ کے موبائل نمبر والی سم میں نے صرف آپ کے لیے لی تھی!"

"یاد ہے!"

"بس سر... سم چند دن کی مہمان ہے۔"

"کیوں...؟"

"سر... آپ ہمت والے ہیں۔ آپ سمجھ تو گئے ہوں

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"سر... جھوٹ اور وہ بھی آپ سے؟ سر... یہ تو ممکن ہے نا... بس ہو گیا... کینسر... بلڈ کینسر!

"کیوں' کیسے... کب...؟ سر... ان سوالوں کے جوا نہیں ہوتے نا! سر' آپ ایک افسانہ اور لکھ ڈالیے۔ میں کسی میں نہ سہی آپ کے افسانے میں تو زندہ رہوں گی نا... سہی... آپ کے اور میرے درمیان ایک رشتہ تو تھا..."

میری قوتِ گویائی جاتی رہی...

دوسرے روز سارا دن موبائل پر سناٹا چھایا رہا...

سہ پہر میں ایس ایم ایس کی مخصوص آواز سماعت ٹکرائی۔ خوف' امید' اندیشے' پسینے میں تربتر میں نے کرسی پشت پر سر ڈال دیا۔

ایس ایم ایس کھولنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔

کہیں دور سے آواز آئی۔

مرمریں انگلیوں نے ماتھے تک سفر طے کر کے سلام کیا۔ "سر! آخری ایس ایم ایس ہے... ہمت کیجیے' پڑھ لیجیے!"

ایک لمحے کو آس کی ڈوری کا سرا میں نے تھاما... شاید کینسر نہ ہو۔ اس ایس ایم ایس میں امید کی قندیل ٹمٹما رہی میں نے لرزتے ہاتھوں سے ایس ایم ایس کھولا... اور دھڑ کے سارے نیٹ ورک جام ہو گئے۔

"سر' آپ نے ایک بار ڈرائنگ روم کا پوچھا تھا' ڈرائنگ روم تو اک گزرگاہ ہے۔ یہاں تو روز بہت سے لوگ آتے ہیں لیکن یاد رکھیے گا کہ میں صرف ایک ہی شخص سے ملی تھی اور سے بھی بس ایک ہی شخص ملا تھا... جو آدھا کپ چائے چھوڑ ورنہ لوگ تو بہت آتے ہیں..."

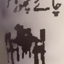

اُردو ادب کے عطر، دوسری منتخب کہانی

امر بیل

ابنِ حسن عثمان آبادی

ایک تناور درخت کے سہارے چڑھتی، پھلتی پھولتی نازک بیل کی کہانی
کوئی تھا جو درخت سے، والہانہ لپٹی اس بیل کو دیکھتا تو لاج سے مر مر جاتا...
پھر یوں ہوا کہ اُس نے بیل کو تکنا چھوڑ دیا!

میرے دروازے کے سامنے ایک بڑا سا درخت میں دیکھ رہی ہوں کہ پچھلے کئی ہفتوں سے ایک جنگلی اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بیل کا نام مجھے معلوم نہیں ہے لیکن میں نے چھو کر دیکھا ہے۔ اس کے پتے نازک اور چکنے ہیں۔ اس کی پتلی ڈالیاں ریشمی دھاگوں کی طرح ملائم ہیں جن میں کہیں کہیں تلیلی جڑیں پھوٹ پڑی ہیں۔ بیچ بیچ میں فیروزی رنگ کے ننھے ننھے پھول بھی ہیں جن میں ایک عجیب سی جنگلی مہک ہے۔ یہ پھول ڈالی سے چپکے رہتے ہیں اور توڑنے سے بکھر جاتے ہیں۔ میں نے کئی پھولوں کو چھوا... وہ بکھر گئے۔

میں نے انھیں پانے کی آرزو چھوڑ دی ہے۔ کیوں کہ میں ایسی چیزوں کو ہی اپنانا چاہتی ہوں جو خوشی سے میرے پاس آئیں۔ زبردستی کسی چیز کو حاصل کرنا مردوں کا کام ہے اور دوسرے کے رواج اپنانے کی عادت میری نہیں۔ ہاں، تو میں اس بیل کی بات کر رہی تھی۔ وہ بے چاری اپنے پھول پتوں سے لدی پھندی اس درخت کا سہارا پانے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا رہی ہے لیکن یہ منحوس درخت جب سے میں دیکھ رہی ہوں' اتنا چکنا چپڑا اور سیدھا سپاٹ ہے جیسے کوئی درخت نہ ہو، کسی تیلی کا اکلوتا بیٹا ہو۔ اس میں ڈالیاں ہیں، پتے بھی ہیں لیکن بیچ کا تنا اتنا چکنا ہے کہ کبھی کبھی قدرت کی صناعی پر تعجب ہوتا ہے۔ اُسے دیکھو تو لگتا ہے جیسے اس پر کسی بڑھئی نے پالش کی ہے۔

وہ بیل پتا نہیں کیسے اُسی کے نیچے اُگ آئی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا، وہ اُٹھتی ہے اور درخت سے لپٹتی ہے۔ لیکن درخت کی سرد چکناہٹ اُسے بے سہارا کر دیتی ہے۔۔۔ پھر نیچے گر کر اپنے پیدا کرنے والے کو کوستی ہے کہ جب تم اپنا

ہی تھا تو ایسے لُولے کے قدموں میں کیوں ڈال دیا جو بانہوں میں سمیٹنے کا بھی حوصلہ نہیں رکھتا۔

اِسی طرح کئی دن بیت گئے اور بیل نیچے ہی نیچے ایک گھونسلے کی شکل بناتی گئی جس میں اس کی ڈالیاں تکلیف سے اینٹھ اینٹھ گئی تھیں۔ میں نے اُسے قریب سے دیکھا۔ مجھے لگا، جیسے وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس نے مہینوں سے اپنے بالوں میں کنگھی نہ کی ہو۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تُو نے اپنا حلیہ کیوں بگاڑ رکھا ہے؟“

وہ تکلیف سے مسکرائی اور کہا۔ ”اپنا حلیہ تو بگڑا ہی رہنا چاہیے۔ کاہے کروں سِنگار پیا بِن...“

پھر اس کے ہونٹ کانپے اور بند ہو گئے۔

میں نے جھک کر اُس کی ڈالیوں کو پکڑا، انھیں ہلکا جھٹکا دیا اور تھوڑی کھینچا تانی کے بعد اس کا رُخ قریب کی چار دیواری کی طرف کر دیا۔ وہاں سے جب لوٹی تو مجھے اپنی وہ سہیلی یاد آ گئی جو جان بوجھ کر مائیکے میں عمر گزار رہی ہے اور اپنی بھابی کے بچوں کی اچھی بُوا ہے۔

اِس دوران میں میں ایک ہفتے کے لیے باہر گئی تھی۔ جب لوٹی تو دیکھا کہ بیل تو چار دیواری پر چڑھ چکی ہے۔ اس کے تنے سیدھے اور ہرے ہو گئے ہیں۔ اُن میں پرانی نرمی آ گئی ہے اور وہ جھوم جھوم کر جیسے میرا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

میں نے درخت کی طرف دیکھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ مجھ سے ناراض نہ ہو کہ اس کی چاہنے والی کو میں نے گمراہ کیا... لیکن وہ جوں کا توں پرانے انداز میں کھڑا تھا۔ مجھے لگا، وہ اونگھ رہا ہے اور تھوڑی دیر میں سو جائے گا۔ پھر خراٹے بھرے گا... اور مجھے خراٹوں سے بڑی نفرت ہے، اس لیے میں وہاں سے ہٹ گئی۔ میں نے سوچا، بڑا اچھا ہُوا جو بیل کو اس کا سہارا نہ ملا، نہیں تو اب تک وہ اس کے خراٹوں سے مر چکی ہوتی۔

تھوڑے دن بعد، میں نے دیکھا کہ بیل چار دیواری پار کر چکی ہے۔ مجھے کچھ شرمندگی سی ہوئی۔ حدوں کو پار کرنا مجھے پسند نہیں اور جسے میں نے راہ دکھائی، وہ آوارہ ہو جائے، یہ کتنے شرم کی بات ہے!

میرے جی میں آیا کہ جاؤں اور اسے گھسیٹ کر اِدھر کھینچ لاؤں۔ میں غصے سے بھری، گئی اور میرے ہاتھ لپکے بھی لیکن... اوہ! جو منظر میں نے دیکھا، اس سے میرا دل چیخ اٹھا۔ دل ہی چیخا، کیوں کہ آواز گلے تک نہیں آئی۔

اب ہماری بیل اپنے ان گنت پتوں کے ساتھ چار دیواری کے باہر نئے نازک سے پیڑ سے لپٹی پڑی تھی جو اُسے شاید پچھلے کئی دنوں سے سہارا دیتا آ رہا تھا۔ وہ گستاخ پیڑ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے حیا شرم گھول کر پی چکا ہو۔ بیل نے مجھے دیکھا اور شرما کر اس کے اِرد گرد ڈول گئی۔ اس کی ادا دیکھ کر مجھے محلے کی وہ کرسچن لڑکی یاد آئی جس کی کمر بہت پتلی ہے اور جو ہرے نیلے رنگوں کی فراک پہنتی ہے اور جو بھی اُسے دیکھتا ہے اس کی طرف ایک شرمیلی مسکراہٹ پھینک کر، اونچی ہیل کی سینڈلوں پر لچکتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ پھر مجھے بال ڈانس کا کمرا یاد آیا جہاں گڈے گڑیا کا ایک جوڑا تھرکتے تھرکتے لپٹ جاتا ہے۔ یہ جوڑا نہ خدا کا بنایا ہوتا ہے نہ سماج کا، یہ اپنے دل کا جوڑا ہوتا ہے لیکن یہ بات تو انسانوں کی ہیں، اِس بیل نے یہ سب کہاں سے سیکھا؟

میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اُس پیڑ کی تین ڈالیاں ہلیں جس میں بیل کے دھاگے اُلجھے ہوئے تھے۔ اس نے بار بار جھک کر اس کا استقبال کیا۔ مجھے اس کا جُھکنا، ہلنا اور مستی میں اِترانا بڑا پیارا لگا۔ اُس کی شکل کچھ ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی گورے چٹے آدمی نے کئی دنوں سے شیو نہ کیا ہو اور جس کے چہرے پر ہرے نکیلے کانٹے سج رہے ہوں۔

مجھے اِس طرح گھورتے دیکھ کر وہ کچھ بڑبڑایا۔ شاید کہہ رہا ہو... ”باجی! تمھارا یہاں کوئی کام نہیں۔ تم اپنا فرض پورا کر چکیں۔“

سچ سچ اب میری وہاں کیا ضرورت تھی؟ میں کچھ اُلجھی کچھ سُلجھی ہوئی سی واپس آ گئی۔ میں اُنھیں نیکی کا درس بھی نہیں دے سکتی تھی کیوں کہ خود آج تک نیکی کے بارے میں کوئی کتاب بھی پوری نہ پڑھ سکی تھی۔ اکثر سوچا، کم سے کم ایک دو تو پڑھ ہی جاؤں۔ شروع بھی کیا لیکن پانچویں صفحے تک پہنچتے پہنچتے اپنا حوصلہ کھو بیٹھی ہوں۔ پھر اگلی بار کے لیے اُسے حفاظت سے رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن آگے پھر کبھی اس کی باری آئی ہی نہیں۔ میں نے کبھی مذہبی مجلسوں میں بھی حصہ نہیں لیا۔ چاہا بھی لیکن وقت نہیں ملتا۔ سوچتی ہوں، ابھی یہی زندگی سُدھار لوں اور اگر زندگی پھر بھی باقی بچی تو پھر دوسرے جہاں کے لیے بھی کچھ کر لوں گی۔ ہاں، میرے گھر کے مغربی میدان میں اکثر تبلیغی اجتماع ہُوا کرتا ہے جن میں فلمی گیتوں کی دُھن پر نعتیں او الیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ سب مائیک پر ہوتا ہے اور میں اپنا گھر چھوڑ کر تو جا نہیں سکتی، اس لیے مجھے سننا پڑتا ہے۔ جیسے ”تیرا تیرا ابے تیر“ اس طرح ہر مشہور دُھن اپنی قسمت پر روتی ہے اور ساتھ ساتھ روتے ہیں موسیقار۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ نیکی کے بارے میں میں اتنی کوری ہوتے ہوئے کیسے دوسرے کو کچھ سکھا دوں؟ اگر میں کچھ کہنا بھی چاہوں تو میرا لہجہ اس قوالی کے سُریلے پن سے عاری ہو گا۔ اسی لیے میں چپکے سے اپنا مُنہ لے کر چلی آئی۔

آ کر دیکھا، ہمارا پرانا درخت جوں کا توں کھڑا تھا۔ اس کی جڑ کے پاس بیل کی جڑ تھی لیکن صرف جڑ ہی تھی۔ اس کی سبھی شاخیں آگے بڑھ چکی تھیں۔ جڑ کے پاس سے وہ اپنے آپ کو سمیٹ چکی تھی اور اس کی جڑ دیکھ کر کوئی باہر کے منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لمبی سانس میرے منہ سے نکلی جس میں اپنے پرانے درخت کے لیے ایک حسرت تھی۔

آدمی کا دل بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ آج مجھے اس درخت سے ہمدردی ہے۔ کل تک مجھے اس پر افسوس ہوتا تھا۔ آج جب اس کی بیل اُسے بالکل ہی بھول چکی اور پھر بھی یہ روٹھا نہیں ہے تو مجھے اس پر ترس آ رہا ہے۔ ابھی میں سوچ نہیں پا رہی ہوں کہ اس نے جان بوجھ کر بیل کو اپنا سہارا نہیں دیا یا یہ اس کے بس کی تھی ہی نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا نے اسے پیار کرنے کا حوصلہ ہی نہ دیا ہو؟ اسے بناتے وقت اس کے اندر دل رکھنا بھول گیا ہو۔ تب یہ بے چارہ کیا کرے! بغیر دل کے آدمی پیار کیسے کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ وہاں دل دھڑک رہا تھا۔

گھر میں آئی تو دل چاہا اپنے آپ کو دیکھوں کیوں کہ شکل یاد نہیں آ رہی تھی۔ جب بھی میں نے اپنی شکل یاد کرنے کی کوشش کی، وہ بیل میری نظروں پہ چھا گئی... چاروں طرف ہریالی تھی جس میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی لیے میں قدِ آدم شیشے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اپنے سامنے، میں تھی... ہاں، وہی پانچ فٹ ڈھائی انچ قد، وہی وزن، وہی سانولا رنگ... میں مطمئن ہو گئی۔ باہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے مجھے بے حس پتھر نہیں بنایا، نہیں تو بھلا میں دل کے ٹوٹنے کو، ان کے لٹ جانے کا راز کیسے چھپا پاتی؟

تبھی میری نظر اپنی آنکھوں پر پڑی۔ ان آنکھوں نے سچ سچ مجھے بڑا پریشان کر رکھا ہے۔ ان کی یہ حرکت تو دیکھیے کہ جو باتیں زبان تک کبھی نہیں آتیں انھیں بھی یہ اپنی پلکوں میں بھر کر ساری دنیا کے سامنے انڈیل دینا چاہتی ہیں۔ آج چودھویں شب ہے یا اماوس ہے یا کہیں گرہن لگا ہے۔ کچھ تو ضرور ہے۔ نہیں تو بھلا دل کے سمندر میں یہ اتنے جوار بھاٹا کیوں اٹھ رہے ہیں؟ کیوں میری آنکھیں ان لہروں کے تھپیڑوں سے تھک گئی ہیں؟ کیوں ان کے کنارے بھیگ گئے ہیں؟ کیوں مجھے ان لہروں پر تیرتی برسات کی رات یاد آ رہی ہے جس میں میری سہیلی اپنے قانونی ساتھی سے جیسے اس وقت وہ چاہتی تھی، آرزو کر رہی ہے کہ وہ اسے اپنے بستر پر جگہ دے۔ کیوں کہ اتنی سردی میں تنہا نیند نہیں آتی۔ اس کے ساتھی کو نیند بہت پیاری تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر نیند ساڑھی بلاؤز پہنتی تو وہ اسی سے شادی کرتا۔ خیر، وہ شخص ان سب سے ناراض ہو جاتا تھا جو نیند سے اُسے جدا کرتے

ضیاعِ وقت

منیجر، ٹائپسٹ سے۔ ”اگر تمہارے کام کی رفتار کا یہی حال رہا تو مجھے تمہاری رپورٹ میں لکھنا پڑے گا کہ تم بہت وقت ضائع کرتی ہو۔“

ٹائپسٹ، ”سر! مجھے یہاں آئے ہوئے صرف ایک مہینا ہوا ہے اور میں نے باس سے منگنی بھی کر لی ہے۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں وقت ضائع کرتی ہوں؟“

جنت

مردوں کے ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جوشیلے انداز میں ایک خاتون نے کہا۔ ”میرے ہم وطنو! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے عورت ماں ہے، عورت بہن ہے، عورت بیٹی ہے، عورت عظیم ہے۔ اگر کائنات میں عورت نہ ہوتی تو آپ لوگ کہاں ہوتے؟“

جلسے کے ایک کونے سے آواز آئی۔ ”جنت میں!“

مسز ڈارلنگ

ایک حسین سیکریٹری نے اپنے نوجوان افسر کو دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ”ہیلو ڈارلنگ!“

افسر کے پیچھے کھڑی ہوئی خاتون نے فوراً کہا۔ ”مجھ سے بھی ملو میں ہوں مسز ڈارلنگ۔“

تعاون ✿ احمد وسیم بلال، گوجرانوال

تھے۔ میری سہیلی چوں کہ اس کی بیوی تھی اس لیے اس ناراضی کا شکار سب سے زیادہ اُسے ہی ہونا پڑتا تھا۔ آج اس سردی میں نیند کچھ زیادہ ہی پیار کر رہی تھی۔ اس لیے اسے اس پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے میری سہیلی سے کہا۔ ''اگر تمہیں نیند نہیں آتی تو جا کر غلامو کے ساتھ سو جاؤ۔''

غلامو اُن کا نوکر تھا۔

میری سہیلی جب مجھے یہ قصہ سنا رہی تھی، اس وقت بھی اس رویے پر اس کے ہونٹ غصے سے پھڑک رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس سرد رات کے باقی حصے میں اسے اپنا تنہا بستر ذرا بھی ٹھنڈا نہیں لگا تھا... کیوں کہ اپنے بے عزت کیے جانے کی آگ اس کے سارے جسم کو جھلسائے دے رہی تھی۔ اس کے آنسو بھی نہیں نکلے کیوں کہ غصے کی بھٹی میں آنسو کیسے بچے رہتے؟

اس قصے کو سناتے سناتے بھی وہ پانی کے دو گلاس پی چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسی رات اس نے ایک فیصلہ کیا... کیا فیصلہ کیا؟ وہ اس نے نہیں بتایا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ کیوں چنگاری کو پھونک ماروں؟

پھر دوسری لہر اُچھلتی ہوئی آئی جس میں، میں نے اپنی سہیلی کو اس کے ایک دوست کے ساتھ دیکھا۔ اس نے اپنے دوست سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا دوست مجھے بہت پسند آیا۔ میری سہیلی جو سدا کی ضدی تھی، آج بڑی نرم نرم لگ رہی تھی۔ اس کی بات چیت کے لہجے میں اس کے مکمل ہونے کا احساس جھلک رہا تھا۔ اس کی بھوؤں میں ایک خاص قسم کا بل پڑ رہا تھا۔ جب وہ اپنے دوست کو دیکھتی تھی تو لگتا تھا جیسے وہ اسے دیکھ نہیں رہی ہو بلکہ کسی تازہ پھول سے اس کے چہرے کو سہلا رہی ہو۔ اس کا دوست اس کی ہر نظر کو اپنے دل میں سمو رہا تھا اور میں ان دونوں کو اتنی ہی خوشی سے دیکھ رہی تھی جیسے بچپن میں دو پیسے دے کر تو من کی رانی اور اس کے ایک من کے جھمکے دیکھا کرتی تھی۔ وہ دونوں چلے گئے پھر بھی کافی دیر تک مجھے پیار کی سوندھی خوشبو ملتی رہی۔ جب کبھی میں اپنے دھوپ سے تپتے آنگن میں پانی چھڑکتی ہوں تو مجھے اس کی یاد آتی ہے۔

اس کے بعد تیسری لہر آئی جس میں، میں نے اپنی سہیلی کے شوہر کو دیکھا۔ میں اسے دیکھتے ہی چونکی تھی کہ یہ غمگین ہوگا۔ شاید مجھے کچھ کہے گا لیکن نہیں، وہ ذرا بھی نہ بدلا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح رونی صورت لیے ہوئے تھا۔ آج ہی کی طرح، ٹھیک اسی درخت کی طرح مجھے اس پر ترس بھی آیا تھا وہ کام سے آیا تھا، اپنے پسینے کی بدبو کا تحفہ دے کر چلا بھی گیا... اور میں سوچتی رہ گئی کہ زندگی کے ناٹک میں اداکارو کی پرکھ کیسے کی جائے؟

اب میں شیشے کے سامنے سے ہٹ گئی کیوں کہ مجھے اپنا چہرہ بہت اداس لگ رہا تھا جس پر زمانے کے دُکھ اور درد کی پرچھائیاں اُبھرتی جا رہی تھیں۔ یہ سبھی پرچھائیاں میرے ا کہیں اندر جا کر کھو جاتی ہیں۔ پھر مجھے بڑی مشکل سے پتا پڑتا ہے کہ کس درد کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔

لیکن ان درد بھرے سُروں کے درمیان ہی میری کل اور اس کے دوست کی بانسری کیسے بج اٹھی؟ اس دُھن میں بھ درد ہے لیکن وہاں تو درد کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔

میری بیل اس باہر والے پیڑ سے لپٹی ہوئی ہے۔ ا کس بات کا غم ہوگا بھلا! اس نے جو چاہا، اسے ملا لیکن نہیں میرا وہم تھا۔

میں نے غور سے دیکھا... میری پیاری بیل دھیر دھیرے ڈولتی ہوئی، سہمی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہوں میں سوال بھر کر اس کی طرف، تو وہ کسمسائی اور بڑی مشکل سے بولی۔ ''مجھے خوف آندھیوں کا، جانوروں کا، خزاں کا اور تمہارا بھی۔ مجھے ا گھورا کرتی ہو۔''

میری نظریں کسی مجرم کی طرح جھک گئیں۔ میں نے ا گھورنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کی جڑ کے چاروں طرف نکیلے تار گھیرا ڈال دیا ہے۔ اس میں پانی ڈالتی ہوں لیکن آندھی اور پر مجھے اختیار نہیں ہے اس لیے معافی مانگ لی ہے۔ بیل نے دعائیں دی ہیں اور میں نے یہ دعائیں اپنی سہیلی کے لیے سنبھا رکھی ہیں جو ضرور ایک دن آئے گی اور کہے گی کہ اس نے کسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر پیار کے تپتے صحرا میں پاؤں رکھا ہے۔ درد سے بچنے کے لیے دوسرا درد پال رہی ہے اور ہر طرح دار ہوتے ہوئے بھی یہ بات بھول گئی ہے کہ

پریت کرے دُکھ ہوئے

لیکن وہ آئے گی تو میں اُس سے یہ سب کچھ نہیں کہ گی... کیوں کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اور وہ خدا کی، ماں باپ کی غلطیاں ٹھیک کرتے کرتے اپنی زندگی بہترین حصے گزار چکی ہے۔

من کی من میں

راجندر سنگھ بیدی

اُردو ادب کا عِطر، تیس کی منتخب کہانی

ایک رجائیت پسند بیوی کے قنوطی شوہر کا افسانہ
اُس کا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کے حصے کی مسرت میں بھی بھی

مادھو کی بیوی کو لوگ کلکارنی پکارتے تھے۔ اگر میں کچھ زیادہ نہیں بھولتا تو یہ نام کلتارنی سے ہی بگڑ کر بنا تھا۔ مطلب ل کی (ڈوبتی ہوئی) نیا کو پار لگانے والی۔ یہ پیار اور لاڈ کا نام نہ صرف کل کو لاج لگانے والی سے اختلاف ظاہر کرتا ہے، بلکہ اس کا کچھ اور بھی گہرا مطلب ہے جسے مادھو کے سوا کوئی کم ہی جان سکتا ہے۔ عین اسی طرح جیسے موسیقی سے فضا میں تموج کے علاوہ ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے کچھ دل ہی محسوس کر سکتا ہے... اور وہ بھی چوٹ کھایا ہوا دل!

سچ تو یہ ہے کہ بعض نام ہوتے ہی کچھ گورکھ دھندا سے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں، لوگ بعض اوقات جنم جنم کے اندھے کو نین سکھ اور نیٹ گنوار کو ودیا ساگر کہہ دیتے ہیں۔

کئی دفعہ کوئی بھولا بھالا بچہ اچانک اپنی ماں سے سوال کر بیٹھتا ہے۔ ''میں اس دنیا میں کہاں سے آیا؟'' ماں گھبرا کر جواب دیتی ہے۔ ''بیٹا'' نرالی پورنما کے روز اندر بھگوان نے بہت سا مینہ برسایا۔ اس وقت بہت سے بچے آکاش سے گرے تھے۔ ان میں سے ایک تم بھی تھے، مجھے بہت من موہنے لگے اور میں نے تمہیں صحن میں سے اٹھا لیا۔'' یا یوں کہتی ہے۔ ''تمہارا باپ ایک سو بیالیس کنڈیوں والا جال لے کر رام تلائی یا شاہ بلور کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا۔ صرف جونکیں تھیں۔ ایک ننھا سا مینڈک عمرو جولا ہے کے گھر کے سامنے روئی کے ایک گالے پر آرام سے بیٹھا برسات کی خوشی میں گا رہا تھا۔ وہ تم ہی تھے۔ تمہارا باپ تمہیں اٹھا لایا اور ہم نے پال لیا۔''

کچھ ایسی ہی بات ہم نے مادھو کے متعلق بھی سنی تھی کہ وہ چکنی مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا... اُدھر ندیا میں طغیانی آنے پر مٹی کے ایک ڈھیلے نے رام تلائی کے مندر میں ٹھاکر جی کے چرنوں کو چھوا۔ مٹی، پانی اور ہوا تو پہلے ہی موجود تھے۔ آکاش اور آگ ملی تو بچہ بن گیا اور یہ سب کچھ ٹھاکر جی

کی دیا سے ہُوا... گلاب گڑھ کے تمام پرائمری پاس یا مڈل فیل آدمی اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ بھلا وہ اس بات کا جواب تو دیں کہ سیتا جی کس طرح' کھیت میں دبائے ہوئے ایک گھڑے کو بیل کی ٹھوکر لگ جانے سے پیدا ہو گئیں؟ کرن جی کس طرح کنتی جی کی میل سے بن گئے؟ رام چندر جی کے دوسرے بیٹے کش کو کشا یعنی گھاس سے کیسے بنالیا گیا؟

خواہ مادھو مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا، پھر بھی اسے مٹی کا مادھو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک بہت سمجھ دار آدمی تھا۔ اگر گھر کے آدمی اسے مٹی کا مادھو سمجھتے تھے تو سمجھا کرتے۔ گھر کا جوگی جوگڑا... گھر والوں کو یہی شکایت تھی کہ مادھو گھر کا کام کاج کرنے کے بجائے دوسروں کا کام کر کے زیادہ خوش ہوتا تھا اور حقیقت میں اس بات سے مادھو کی تعریف ہی کا پہلو نکلتا ہے۔

ہاں! کچھ مادھو کی صورت کے متعلق بھی بات ہو جائے۔ وہ قد کا گٹھیلا تھا اور جسم کا اکہرا۔ عمر یہی کوئی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے پر چیچک کے داغ، گورے رنگ سے کچھ کھچڑی ہو رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھیں تو رسیلی تھیں ہی مگر مادھو کی زیادہ دور تک مار کرتی تھیں۔ قدرے باہر کو ابھری ہوئی تھیں... اتنی ابھری ہوئی کہ سوتے میں بھی ہمیشہ نیم باز رہتیں۔ گلاب گڑھ کے پرائمری اسکول کے منشی بھائی گریب داس، جو کبھی کبھی شہر میں جا کر ایک آدھ ردی سی فلم کے نظارے سے مستفیض ہوآیا کرتے تھے، مادھو کی آنکھیں کو "پیا ملن کی آس" مار کا آنکھیں کہا کرتے تھے۔ اور ان کے ہونہار شاگرد اپنے استاد کے ارشاد پر تضمین کرتے، یا بالکل تجدید کرتے ہوئے مادھو کو "چمگادڑ نینا" کہتے تھے۔

کلکارنی زندگی کے روشن پہلو اور مادھو تاریک پہلو کو دیکھنے کا عادی تھا۔ دونوں میں یہ ایک دل چسپ مگر خطرناک فطری تضاد تھا۔ اس وجہ سے اکثر ان کی آپس میں ایک آدھ جھڑپ ہو جایا کرتی۔ مادھو کی قنوطیت اس درجہ نمایاں تھی کہ جو کوئی اسے بازار میں ملتا تو بجائے' جے رام جی کی' یا صاحب سلامت کے' کہتا۔ "کہو بھئی مادھو... من کی من میں رہی؟"

فنا کا نمائندہ اور قنوطیت کا علم بردار فی الفور ایک گہرا، ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا۔ "ہاں بھائی!... من کی من میں رہی۔"

اس قسم کا طریقہ تخاطب کلکارنی کو سر سے پاؤں تک جلا دیا کرتا۔ کیا کرتی وہ؟ گلاب گڑھ کے لوگ تو اس کی شادی سے پہلے ہی مادھو کو اس کی یاس پسندی کی وجہ سے یوں خطاب کرنے کے عادی تھے۔ انھیں روکنا اس پودے کو موڑنے کے برابر تھا جو خاصا تن آور درخت بن چکا ہو۔ بہ ہر حال، وہ بہت ہی جھلاتی اور جو کوئی مادھو کو یوں خطاب کرتا، اگلے روز اس کی بیوی، ماں یا بہن سے کلکارنی کی لڑائی ہوتی اور کلکارنی جواب طلب کرتی۔ "آخر اس من کی من میں رہی، کا مطلب کیا ہے؟"

مادھو کلکارنی کے اس احتجاج پر بہت خوش ہوتا۔ ڈفلی بجاتا اور کہتا۔ "میری زندگی کلکارنی کو کتنی پیاری ہے۔ کسی کو من کی من میں رہی کہنے ہی نہیں دیتی۔ حالاں کہ نہ اسے ہنسلی بنوا کر دی ہے اور نہ پازیب... ارے تین مہینے سے تو پیٹ رہتی ہے۔"

ایک دن میں نے مادھو کو یک بہ یک فلسفی بنتے دیکھا۔ منشی گریب داس کے سامنے وہ عورت کی محبت و مروت کو سراہ رہا تھا... کنگرو کی قلانچ سے زیادہ عجیب، اجڈ اور دیہاتی انداز میں... اور کون نہیں بھانپ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ کلکارنی کی طرف ہے۔ اس کے لفظ تھے:

> بھائی گریب داس! اگر دنیا عورت کے بجائے آدمی کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دیا، پریم اور نرمی کا نام ہی نہ رہے۔ عورت آدمی کو اپنی کوکھ سے جنم دے کر اس کے اکھڑپن کو دور کر دیتی ہے۔

کتنا حقیقت سے لبریز تھا مادھو کا عملی فلسفہ! ایسی لاکھوں کی ایک سُن کر بھی جو مادھو کو مٹی کا مادھو کہے، کیا وہ خود مٹی کا مادھو نہیں ہے؟

برج والے کنوئیں کی بیڑ، جھر کل، ڈھول یا لٹھ ٹوٹتی ٹوٹ جائے گی مگر مادھو اس کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ بیلوں کی جوڑی سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر کم سے کم چارا ڈال کر اس کے مزارع دو دو سو کے بیلوں کی جوگ کو ایسا ناکارہ بنا دیں گے کہ کلو شاہ کے بھرے میلے میں ان کی قیمت پچاس پچاس روپے سے کوڑی نہ بڑھے گی۔ گھر میں کسی خوشی یا غم کے موقع پر مادھو سے کسی قسم کی توقع بے کار ہوگی۔ مگر وہ دوسروں کی مدد کے لیے کتنی جلدی لنگوٹ کسے گا... گلاب گڑھ میں ایک بیوہ امبو رہتی تھی۔ اس کے خاوند ڑلیا کو مرے سات سال کے قریب ہوئے تھے۔ اسی روز سے بے چاری اپنی عزت کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ اگر اسے سماج کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو بے چاری کبھی کی تباہ و برباد ہو چکی ہوتی۔ مادھو کو اس کی مدد کرتا دیکھ کر لوگ کئی طرح کے بہتان لگاتے، طرح طرح کی باتیں بنا کر معصوم مادھو اور بد نصیب بیوہ کو بدنام کرتے۔ سماج میں اتنی دیا کہاں کہ جس چیز کو وہ خود دینے سے ہچکچاتا ہے، اپنے کسی فرد کو دیتا دیکھے۔ امبو کی مدد پر لوگوں کی مخالفت نے دونوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی اور اس مخالفت میں کلکارنی سب کی پیشوائی کرتی تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ کسی غیر مرد کا یوں بیوہ کی مدد کرنا پاپ ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ سماج کے دائرے میں رکھ کر ایسی شکستہ حال بیوہ کے رہے سہے گوشت پوست کو نوچ نوچ کر کھانا کوئی پاپ نہیں!

ایک دن مادھو کہیں باہر سے آیا۔ وہ چہرے سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دیتا تھا۔

"مجھے بیس روپے دوگی کارنی؟" مادھو نے گاڑھے کی چادر کو شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گے اتنے روپوں کا؟"

مادھو کو اسی سوال کی توقع تھی۔ کارنی کو اس بات کا وہم رہتا تھا کہ مادھو اپنی سخاوت پسند طبیعت کی وجہ سے بے جا روپیا خرچ کرتا رہتا ہے اور اس کا عقیدہ تھا کہ جو آپ کھایا سو کھایا، جو کھلایا سو گنوایا۔ وہ روپیا جمع بھی کرتی تو اس لیے کہ زندگی میں کبھی کام آئے گا۔ گویا وہ ہمیشہ جیتی رہے گی... اتنی لمبی آس... اور شرادھ میں گئے گزروں کے نام پر وہ بہت سا روپیا دان بھی کرتی۔ مگر اس قسم کے دان سے مادھو متفق نہیں تھا۔

"کیا کرو گے ان روپوں کا؟" اس سوال کا جواب مادھو نے پہلے ہی سے اپنے ذہن میں تراش رکھا تھا۔ فوراً بولا۔

"چند دن ہی ہوئے تو خود ہی ہنسلی اور پازیب کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں باہر جا رہا ہوں، بنوا لاؤں گا۔"

کلکارنی اچھل پڑی۔ بھلا ہنسلی اور پازیب کے لیے کون بیس روپے نہ دے گا۔ وہ فوراً گندم کے ڈھیر میں چھپائی ہوئی ہنسلی اٹھا لائی اور بیس کے پچیس روپے مادھو کی کمر میں بندھوا کر بولی۔ "سنو کل سگرانت ہے... مکر سگرانت۔ تمہارے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار ہوگا۔ ہو سکے تو سنار کے پاس ہی بیٹھ کر ہنسلی ڈھلوا لینا، نہیں تو اس کے عوض کوئی اور ہی لے آنا... پل کی پل پہن لوں گی۔ جلدی آنا، میں نے تیوہار منانے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

مادھو نے کمر میں بندھی ہوئی ہانسلی پر ایک چست سی صدری ڈالی اور چل دیا۔ سگرانت بھی آ گئی۔ اس دن سورج دھن راسی سے نکل کر مکر راسی میں داخل ہوتا ہے، اس لیے اسے مکر سگرانت کہتے ہیں۔ سگرانت کی دیوی نے سوائے مادھو کے باپ کے' گلاب گڑھ تو کیا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لیے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سجی دھجی عورتیں تِل، گڑ، بیر، امرود اور گنڈیریاں بانٹ رہی تھیں۔ پریم کے اس تبادلے کو اوٹی بھرن کہتے ہیں۔ اوٹی بھرن کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ہماری زندگی میں ایک روح پھونک دینے والا پیغام دے رہی تھیں۔ دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔"

چوں کہ مادھو کے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار تھا۔ دونوں کو صحن کے وسط میں ایک دھوتی اور ایک لنگوٹی بندھوا کر بٹھا دیا گیا۔ جسم پر تیل اور دہی ملا گیا۔ اس کے بعد بہو کی بہن نے بہو کو اور دُلہا کی بہن نے دُلہا کو سہیلے گاتے ہوئے نہلایا۔ کونے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے چند پرانے سے ناقوس اور نفیریاں بجائیں۔ دف پر چوٹ پڑی، کلکارنی نے سیندور، مصری اور ناریل بانٹا۔ اس وقت مادھو کا بدھائی لینے کے لیے وہاں ہونا لازمی تھا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ کلکارنی کو تو اپنی ہنسلی اور پازیب کی پڑی تھی۔ وہ رو رو کر مادھو کو کوستی اور اپنے گلے اور ایڑیوں کو ساڑھی کے پلوؤں سے چھپاتی... کلکارنی جان گئی کہ سنار نے ہنسلی بناتے ہوئے دیر لگا دی ہوگی۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا' شاید مادھو میری زیادتیوں کی وجہ سے مجھ سے رُوٹھ گیا ہو۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ سگرانت

جھوٹے مرد

ایک طویل سفر کے دوران ایک پچپن ساٹھ سالہ مسافر خاتون نے اپنے ایک ہم عمر مسافر سے محض وقت گزارنے کی خاطر علیک سلیک اور تمہید کے بعد پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ مرد زیادہ جھوٹے ہوتے ہیں؟

اس پر مرد نے کہا۔ "محترمہ! چھوڑیے ان فروعی اور غیر اہم قیاسات کو! میں تو آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ باوجود اتنی عمر کے بھی آپ حسن و جمال میں اتنی پُرکشش ہیں کہ میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

خاتون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ شرما کر بولی۔ "وہ عورتیں کتنی غلط ہیں جو مردوں کو خوامخواہ جھوٹا قرار دیتی ہیں!"

طارق محمود کی شوخی، سعودی عرب سے

کے دن روٹھے منائے جاتے ہیں۔"

مگر سیدھا سادہ مادھو اتنے چھل بل کہاں جانتا تھا... سنار کے پاس آدمی دوڑایا گیا تو پتا چلا کہ مادھو وہاں پہنچا ہی نہیں۔

مادھو کی ڈھنڈیا پڑی۔ کوئی بچہ تو تھا نہیں کہ راستہ بھول جاتا۔ کلکارنی کی تشویش بڑھی۔ اس نے چاروں طرف آدمی بھیجے۔ اس میں شک نہیں کہ مادھو نے گھر کلی طور پر کلکارنی کی سی ہوش یار عورت کو سونپ رکھا تھا مگر وہ اتنا بے مہر نہیں تھا کہ اپنے بہو بیٹے کے پہلے تیوہار کے شگون منانے سے احتراز کرتا۔

شام تک مادھو نہ پہنچا اور نہ کلکارنی کی ہنسلی اور پازیب۔ کلکارنی کا غصہ اور فکر دونوں سرعت سے بڑھنے لگے۔

جب شام کو دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی تو عورتیں سب کی سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ پہلے شور و غوغا سے آشنا کان برابر خاموشی کو پا کر شائیں شائیں کرنے لگے۔ اس وقت کلکارنی کے کانوں میں ایک دھیمی سی آواز آئی۔ اس کا پڑوسی بنجارہ کہہ رہا تھا۔ "کہو بھائی مادھو! من کی من میں رہی؟"

جواب میں ایک مردہ سی آواز آئی۔ "ہاں بھائی! من کی من میں رہی!"

اب تک تو کلکارنی کی فکر اس کے غصے پر غالب تھی۔ لیکن مادھو کو بے آنچ پہنچتے اور پھر برس کے برس دن "من کی من میں رہی" کے الفاظ کہتے سن کر اس کا غصہ فکر پر غالب آ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک راکھ ہی تو ہو گئی۔ بجلی کے مانند لپکی، صحن میں آئی۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا دی۔ ننگی ایڑیوں کو دیکھ کر اس کا غصہ اور بھی چمک اٹھا، اس اثنا میں مادھو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ پوہ ماگھ کی سردی جگر تک پہنچتی ہے۔ کانپتے ہوئے مادھو نے کلکارنی سے درو کھولنے کے لیے منت کی۔

اندر سے آواز آئی۔ "جاؤ... باہر ہی رہو۔ اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے؟ جدھر منہ اٹھائے ہو اُدھر چلے جاؤ... اُتر ہے تو اُتر کو، دکھن ہے تو دکھن کو... گھر کیا ہے، ہنسی کھیل بنا رکھا ہے۔ بڑے سونٹھ کی جڑ تلاش کرنے گئے تھے... اتنا بھی نہیں سوجھا' گھر میں خوشی ہے... پرمیشر نے چاہا تو یہ من کی من میں رہے گی... واویلا کیوں کرتے ہو۔"

مادھو کچھ دیر کے لیے ٹھٹک گیا پھر بولا۔ "دروازہ تو کھولو... کارنی، دیکھو سردی کے مارے اکڑ رہا ہوں۔ تمہاری ہنسلی اور پازیب بنوانے گیا تھا۔"

"میں جانتی ہوں۔ سنار کے پاس تو تمہاری پرچھائیں تک نہیں پہنچی... سچ سچ کہو کیا تم اس میری سوت کے پاس نہیں گئے تھے؟"

"کون سوت؟"

"امبو... اور میری سوت کون ہوگی؟"

حقیقت میں مادھو اسی کے پاس گیا تھا۔ کلکارنی کے سامنے اس بات سے انکار کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ اور وہ انکار کرتا بھی کیوں؟ بولا۔ "ٹھیک ہے کارنی... امبو بہن نے کہلا بھیجا تھا' ساہوکار نے ایک ایک روپے کے دو دو اور دو دو کے تین تین بنا لیے ہیں' اور میں نے بیس روپے تم سے دراصل اسی لیے مانگے تھے۔ تمہاری ہنسلی میں اپنے پیسوں سے بنوا دوں گا جو ڈاک گھر میں جمع ہیں۔ فکر نہ کرو، دروازہ تو کھولو۔"

مادھو کو کوئی جواب نہ ملا۔ کلکارنی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "برس دن کے بعد ایک آدھ دن خوشی کا آتا ہے... اس میں بھی دکھ ہی ملتا ہے... بہو بیٹے کا تیوہار روز روز تو نہ آئے گا نا... سہیلے روز روز نہ گائے جائیں گے... ایسے موقع پر خوشی کو دبا کر کون دِق مول لے... یہ ہیں کہ..."

مادھو نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ "کسی بہن بھائی کو دکھی دیکھ کر مجھ سے تو مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں، نہ گائے جائیں گے!"

کلکارنی نے دروازہ نہ کھولا...

مگر اسے نیند کہاں آتی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس نے آہستہ سے کواڑ کھولے تو دیکھا۔ اس کا مجازی خدا دروازے کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر اونگھ گیا تھا۔ اس کے گھٹنے چھاتی سے لگ رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ شرمندگی کے ایک گہرے احساس سے اس نے مادھو کا شانہ ہلایا' بولی۔ "میں کہتی ہوں... چلو گے اندر...؟"

مادھو نے آنکھیں ملتے ہوئے سر اٹھایا اور بولا۔ "ہاں. چلوں گا!"

مادھو اندھیرے میں اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ سردی میں ہاتھ سن ہو رہے تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ اس کے اپنے نہیں ہیں۔ کلکارنی نے جلدی سے انگیٹھی جلائی۔ مادھو کے اکڑے ہوئے جسم کو گرم کیا اور اس کے پاؤں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی... اور یہ رونا دھونا کاہے کا... مادھو کو تو ذرا بھی غصہ نہیں تھا!

نصف شب کے قریب مادھو کو چھاتی میں کچھ درد محسوس ہوا۔ باقی رات وہ چھاتی کو دباتا اور کراہتا رہا۔ کلکارنی نے گھی گرم کر کے جائفل کوٹ کر مالش بھی کی مگر مادھو کا درد بڑھتا گیا۔ صبح ہوتے ہوتے اس کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی۔ دور نزدیک سے سیانے لائے گئے، مادھو کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑے شل ہو گئے تھے۔ سانس مشکل سے آتی تھی۔ کارنی کہتی تھی کہ نمونیا وغیرہ کچھ نہیں۔ امبو بہت گنڈے تعویذ جانتی ہے۔ اس نے کچھ نہ کچھ دے دیا ہوگا۔ اگر وہ گذشتہ شب کے واقعے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا قصور مان لیتی تو وہ دیوی سے کم کیا ہوتی۔ مگر وہ تو محض ایک عورت تھی!

دوپہر کے قریب کچھ افاقہ ہوا۔ اس نے کارنی کو بلایا اور بولا۔ "میں نے سنا ہے... کہ تم نے امبو کو اندر تک نہ آنے دیا... صبح جب وہ میری خبر لینے کے لیے آئی تھی... کیوں؟"

"نہ جانے کیوں۔"

"تم جانتی ہو' میں امبو بہن سے بہت پیار کرتا ہوں..."

"ہاں... مگر میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی۔ تمام دنیا میرے پیچھے کتے لگائے گی... جانتے بھی ہو دنیا کو...؟"

"جانے دو دنیا کو۔" مادھو نے بائیں پھیپھڑے میں درد کی ایک ٹیس محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اب جب کہ میں مر رہا ہوں، مجھے دنیا کی پروا ہی کیا ہے... میرے پاس تو اتنے بول بھی نہیں کہ میں امبو بہن اور اس کے ساتھ اپنے رشتے کی پاکیزگی کا دعوا کر سکوں... ہائے... تم اپنے مرتے ہوئے پتی کو وچن دو کہ تم اپنی زندگی میں اس غریب کی ایسی ہی خبر گیری کرتی رہو گی... اسے اپنے پاس بلا لو گی... کہو تو..."

"میری خبر گیری کون کرے گا؟... تمہارے دشمنوں کو..."

کلکارنی زار و قطار روتے ہوئے بولی۔

مادھو نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

مادھو دنیا کو چھوڑ رہا تھا مگر کارنی دنیا سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس نے تو مادھو کو خالی تسکین دینے کے لیے بھی اثبات میں سر نہ ہلایا۔ وہ بالکل اس آدمی کی طرح تڑپتا رہا جس کے دل میں بہت سی خواہشیں ہوں مگر موت اس کا گلا آ دبائے... کچھ دیر بعد مادھو کا درد ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔

مرنے کے بعد آں جہانی کی جو آخری باتیں نمایاں طور پر یاد آتیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔ "کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں، نہ گائے جائیں گے!

"ہمارے ملک میں تہوار ہی تہوار تو ہیں، اور ہے ہی کیا؟ کاش یہاں کوئی تہوار نہ ہوتا۔"

سلطان بایزید

28 ستمبر 1396ء کو نکوپولس کی فضا جنگی نعروں سے گونج رہی تھی۔ سلطان بایزید کے عساکر اور فرانس، جرمنی اور ہنگری کے عیسائی شہزادوں اور اُن کی لاکھوں رضاکار سپاہ میں معرکۂ کارزار گرم تھا۔ ایک عرصے تک لڑائی پورے زور شور سے جاری رہی۔ بالآخر بایزید نے یورپ کے عیسائیوں کی متحدہ افواج کے دانت کھٹے کر دیے اور اُنھیں شکستِ فاش ہوئی۔ غرور کا سر نیچا ہُوا، کیوں کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ اگر آسمان بھی گر پڑے تو ہماری فوج اُسے اپنے نیزوں پر سنبھال لے گی۔

اس کے بعد ایک عہد نامہ مرتب ہوا۔ اُس کی ایک شرط یہ تھی کہ فرانس، جرمنی اور ہنگری کے شہزادے اس بات کی قسم کھائیں کہ وہ آئندہ کبھی اپنے فاتح کے خلاف لڑنے کے لیے میدان میں نہیں آئیں گے۔

جب یورپ کے یہ شہزادے جنگی قیدیوں کی حیثیت سے سلطان کے رُو بہ رُو لائے گئے تو سلطان نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں اِس عہد نامے کی یہ شرط، کہ تم کبھی میرے خلاف تلوار نہیں اٹھاؤ گے، حذف کرتا ہوں۔ میں تمہاری قسموں اور میرے خلاف ہتھیار نہ اٹھانے کے عہد و پیماں کو قابلِ ملامت خیال کرتا ہوں۔ تم ابھی نوجوان ہو، تمہارے دل میں اپنی بے عزتی اور شکست کا بدلہ لینے کا جذبہ ضرور پیدا ہوگا اور تم پھر میرے مقابلے پر آنے کی تمنا کرو گے۔ اِس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ جاؤ، اپنی طاقت پھر جمع کرو اور شوق سے، جب چاہو، میرے مقابلے پر آؤ! میں بڑی خوشی سے ایک بار پھر تم سے مقابلہ کروں گا!"

سلطنتِ روما کا عروج و زوال از گبن ✿ مطالعہ۔ مسز اعجاز

بیوائیں اور یتیم تو رونے سے بچ جاتے۔ پھر ایک بار مکر سگرات آ گئی۔ پھر سورج دھن راسی سے مکر راسی میں داخل ہُوا۔ سگرانت کی دیوی نے سماج کے کلنک یعنی امبو کے باپ کے سوا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لیے اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں کو پھیلا کر اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اونٹ بھرن کرتے ہوئے دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔"

پھر موقع آیا کہ برسوں کے روٹھے ہوئے منائے جائیں۔ امبو سے تو گاؤں کا ہر ایک بچہ بوڑھا روٹھ گیا تھا۔ وہ کس کس کو مناتی۔ ایک زُلیا اور مادھو کے روٹھ جانے سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس سے روٹھ گیا تھا۔ ہائے! زُلیا اور مادھو۔ ایسے روٹھنے والے کوئی ماننے کے لیے تھوڑی روٹھے تھے!

امبو کے گھر میں کانسی کے چمکتے ہوئے برتن بالکل سونے کے بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جھونپڑی میں لیپ پوت یوں کیا گیا جیسے امبو کے گھر میں کوئی آنے والا ہو۔ کبھی کبھی وہ آنکھ اٹھا کر باہر دیکھ لیتی۔ کیا عجب جو کہیں گھومتا پھرتا زُلیا ہی آ جائے، نہیں تو مادھو کی صورت ہی دکھائی دے جائے!

مادھو کے بیٹے میں امبو کو مادھو بھائی کی ہی روح نظر آتی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ گاؤں کے لوگ عام طور پر اور کلکارنی اور اس کی بہو اور بیٹا خاص طور پر، اس کی شکل دیکھنے سے بیزار ہیں۔ کیوں کہ اُن کے خیال میں اسی نے تو مادھو کو کوئی جنتر منتر دے دیا تھا۔ پھر بھی اس نے کانسی کی تھالی میں کچھ گاجریں، مٹر، امرود، بیر اور گنڈیریاں وغیرہ رکھیں تاکہ مادھو کی بہو کو دے۔ اپنی پھٹی ہوئی ساڑھی کے ایک پلّو سے اس نے تھالی کو ڈھانپا اور مادھو کے گھر کی طرف چل دی۔

امبو کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ دہلیز کے اندر قدم رکھے۔ ایک برس پہلے لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس کی اس گھر میں پوچھ ہوتی تھی۔ آج وہ اس گھر میں کون تھی۔ ایک عورت نے اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"لو بہن... وہ رہی تمھاری سوت۔"

کلکارنی اسے دیکھ کر جل بھُن ہی تو گئی، آہستہ سے بولی۔ "مرتی بھی نہیں کم بخت... مرے تو میں آٹے میں لوبان اور گھی ریندھوں... دودھ کا کٹورا پیوں... گنگا نہاؤں، نہ جانے کیا کیا کروں۔"

جب امبو بالکل نزدیک آ گئی تو کلکارنی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی بولی۔ "آؤ بہن!... میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو!"

امبو نے ان دونوں کی باتیں تھوڑی بہت سُن لی تھیں۔ سوت کا لفظ کان میں پڑتے ہی اس کا تمام جسم کانپنے لگا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ "بھیّا کہاں ہیں؟"

دوسری عورتیں مسکرانے لگیں۔

پچھلے سال ٹھیک اسی دن مادھو اس سے آخری بار ملنے گیا تھا۔ اس بات کو یاد کرتے ہوئے امبو کا دل مسلا گیا۔ کلکارنی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے بھی پچھلی سگرانت یاد آ گئی۔ ٹھیک اسی دن امبو نے مادھو کا کلیجا نکال لیا تھا۔ مگر وہ اس سگرانت کی رات کا واقعہ بالکل بھول گئی تھی۔ صرف اسے مادھو کے وہ الفاظ یاد تھے۔ "کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں، نہ گائے جائیں گے۔"

تمام عورتیں ہنستی کھیلتی رہیں۔ پھر اوٹی بھرن کیا گیا۔ سہاگنوں نے ایک دوسرے کی مانگ میں سیندور لگایا۔ جب کلکارنی کی بہو کی مانگ میں پڑوس کی ایک دلھن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی۔ سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی رہے، رام رام!... کارنی نے امبو کو دھکا دے کر برآمدے سے باہر کر دیا، بولی۔ "دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے؟"

امبو نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اس کی طرف تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر سب کی نظریں اسی کی طرف تھیں۔ امبو نے مُنہ چھپا کر رونا چاہا مگر وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ برس کا برس دن اور رونا! کارنی جان ہی تو نکال لے گی۔ مگر رونا برس کے برس روز اور عام دن میں کوئی بھی تمیز نہیں کرتا۔ وہ آپی آپ آ جاتا ہے بلکہ یتیم اور بیوہ کو رونا برس کے برس دن تو زیادہ آتا ہے۔ اسی دن مرے ہوئے بالکل نزدیک آ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی اٹھتے ہیں، ساتھ ہی بیٹھتے ہیں، ہنسو تو ہنستے ہیں، روؤ تو روتے ہیں اور گلے مل مل کر روتے ہیں۔ کوئی انھیں دیکھتا ہے؟ کوئی نہیں دیکھتا۔

پڑوس کی بنجارن امبو کے پاس سے گزری اور محض امبو کو سنانے کی غرض سے گنگنانے لگی... "پی برتا کا ایک ہے، وبھچارن کے روئے!"

اور پھر سگرانت کے شور و غوغا میں شامل ہوتے ہوئے بولی۔ "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو!"

امبو کو زمین میں جگہ نہیں ملتی تھی کہ اس میں سما جائے۔ اس گومگو کی حالت میں کلکارنی نے اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ وہ محض دنیا سے چھٹی ہوئی تھی اور مادھو کے آخری الفاظ کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔

اگلی صبح لوگ کہہ رہے تھے۔ "نہ جانے امبو کہاں چلی گئی۔"

سماج کے ماتھے سے اس کلنک کے ٹیکے کو کلکارنی نے ہی دھویا تھا۔ لوگ اس سے خوش تھے اور جب وہ بہت خوش ہو کر عقیدت سے کہتے۔ "بھئی کلکارنی نے اپنے نام کی لاج رکھ لی" تو سوکھا سا مُنہ بنا کر بھائی گریب داس ایک ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا۔ "آہ! مگر غریب مادھو کے من کی من ہی میں رہی!"

* * *

بد صورت مخلوق

طاہر محمود

اپنے حُسن پر نازاں ایک مخلوق کی خود پسندی کا عالم
کائنات میں جسے اُن کے سوا کچھ رکھا ہی نہ تھا!

5070 ء ایڈر کلائن اپنے ساتھی سائنس دانوں کے ساتھ خلائی مرکز پر موجود تھا۔ اس کے یہ دونوں ساتھی مومین ۔ اور کلار آکی کٹ اس کے ساتھ عالمی سائنس کونسل کے سربراہ تھے۔ انھیں یہ اعزاز ایسے ہی حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ انھوں اپنے لوگوں کے لیے ایسے سائنسی کارنامے انجام دیے تھے جن کی وجہ سے اس تباہ شدہ سرزمین کی حالت بدل گئی تھی۔ جہاں ہزاروں سال سے صرف بربادی تھی، اب وہاں ہر طرف خوب صورت اور آباد شہر تھے۔ جلی ہوئی اور بنجر زمین ان تینوں کی کاوشوں سے آباد اور زرخیز ہوگئی تھی۔

ایک دور ایسا آیا تھا جب پورے سیارے پر سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ لوگ بھول گئے کہ یہ سیاہ بادل کیوں چھائے تھے۔ اس دوران میں ان کی تعداد مسلسل کم ہوتی گئی تھی۔ پھر جب سیاہ بادل ختم ہوئے تو قدرت ان پر مہربان ہوئی اور ان کی تعداد پھر سے بڑھنے لگی۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنا کیلنڈر اس تاریک دور کے خاتمے سے شروع کیا تھا۔ اے ڈی سے مراد آفٹر ڈارک تھا مگر ہر طرف بربادی اور تباہی کے [illegible]

تھے۔ وہ وسائل کی کمی کا شکار تھے۔ پھر مختلف نسلوں اور قوموں میں بٹے ہونے کی وجہ سے آپس میں لڑتے رہے تھے۔

کوئی ہزار سال پہلے ان لوگوں کو احساس ہُوا کہ وہ اسی طرح لڑتے رہے تو ان کی نسل مٹ جائے گی۔ جیسے اس سرزمین سے دوسرے جان دار مٹ گئے تھے۔ اب بس وہی باقی رہ گئے تھے۔ پھر انھوں نے ایک متحدہ کونسل بنائی۔ تمام ممالک کی سرحدیں ختم کردیں۔ رنگ، نسل، زبان اور مذہب کی تفریق کو بھلا کر وہ اپنی بھلائی کے لیے ایک ہوگئے تھے۔ جب وہ ایک ہوگئے اور ان کے اختلافات اور لڑائیاں ختم ہوگئیں تو جو وسائل انھیں کم لگ رہے تھے، اب وہ پورے ہونے لگے۔ دولت اور تعلیم کی مساوی تقسیم ہونے لگی تھی۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے آنے والے ایک ہزار برسوں میں شان دار ترقی کی تھی۔

لیکن ان کا عروج آج سے سو سال پہلے شروع ہُوا جب ان میں ایڈر، موسین اور کلار جیسے عظیم سائنس دان پیدا ہوئے۔ انھوں نے دن رات محنت کی اور اپنی تحقیق سے اپنے لوگوں کی قسمت بدل دی۔ انھوں نے انجینئرنگ سے لے کر ماحولیات تک، ہر شعبے میں کام کیا تھا اور اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ صحت، رہائش اور خوراک کے شعبوں میں ایک انقلاب برپا ہوگیا تھا۔ جن کی عمریں پہلے پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں، اب وہ دو سو سال جینے لگے تھے۔ یہی نہیں، ان کی صحت اور جسامت بھی بہتر ہوئی تھی۔

انھیں پہلے بھی یقین تھا کہ وہ اس کائنات کی حسین ترین مخلوق ہیں۔ لیکن اب تو وہ اپنے اوپر اترانے لگے تھے۔ اعداد و شمار بتاتے تھے کہ پچھلے بیس برس میں ان کے ہاں کوئی بدصورت یا نامکمل بچہ پیدا نہیں ہُوا۔ ایڈر نے بعض ایسے طریقے ایجاد کیے تھے جن کی مدد سے مکمل صحت مند اور خوب صورت بچے کا حصول ممکن ہوگیا تھا۔ ایڈر نے خواتین کے حسن اور صحت کے لیے بھی کام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی وہ ان تینوں میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ ہر فرد اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں چلا جاتا، اسے یکساں عزت اور محبت ملتی تھی۔

کلار اور موسین کی خدمات بھی کم نہیں تھیں۔ کلار نے سیارے پر موجود پانی کو صاف کرنے کا ایک ایسا طریقہ نکالا تھا جس سے پانی بہت کم خرچ میں اور کم وقت میں صاف ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے آج یہاں صاف شفاف سمندر اور دریا بہتے تھے۔ کہتے ہیں، کسی زمانے میں کسی وجہ سے پانی ہی غائب ہوگیا تھا مگر تاریک دور کے بعد دوبارہ پانی تشکیل پانے لگا تھا اور اب سیارے کا نصف حصہ سمندر پر مشتمل تھا۔ کلار نے آلودہ فضا کو صاف کرنے کے منصوبوں پر بھی کام کیا تھا۔ آج سے پہلے ہَوا اتنی آلودہ تھی کہ ہر فرد کو نصف وقت کسی گیس ٹ گزارنا پڑتا تھا۔ یہ گیس ٹینک جگہ جگہ موجود تھے۔ ایک وقت سے زیادہ کھلی ہَوا میں گزارنے کے بعد ان لو حالت خراب ہونے لگتی تھی۔ اس وقت ان لوگوں کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اور دن رات میں نصف گزارنے کی وجہ سے وہ اتنا کام نہیں کر پاتے تھے۔

کلار نے ہَوا کی آلودگی ختم کرنے کے لیے کئی طریقے ایجاد کیے۔ اور جب ان پر عمل کیا گیا تو یہ حیرت حد تک کام یاب رہے تھے۔ ہزاروں سال سے خراب ہُوا عشرے میں صاف ہوگئی۔ اور اب یہ دن بہ دن صاف ہو رہی تھی۔ ان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ پہلے سے زیادہ ہوا سانس لیتا تھا۔ یہ سب کلار کی کاوشیں تھیں۔ اس وجہ سے اس کے احسان مند تھے۔ اگرچہ اسے ایڈر جیسی مقبولی حاصل نہیں تھی مگر اس کی عزت کسی طرح اس سے کم نہیں تھی

موسین نے زمین کی بربادی کو ختم کر دیا تھا۔ اس نے مقصد کے لیے سالوں تحقیق کی تھی۔ اس کی کوشش سے بنجر اور کار زمین زرخیز اور کارآمد بنی تھی۔ تاریک دور میں زمین میں ایسے کیمیائی عناصر سرایت کر گئے تھے جو کسی بھی قسم کی فصل کے لیے زہر سے کم نہیں تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے لیے خوراک کی فراہم بہت محدود تھی اور جو خوراک ہوتی تھی اس میں بھی غذائیت کم ہو تی تھی۔ اس وجہ سے ان کی تعداد کم تھی اور ان کی صحت بھی اچھی تھی۔ یہ کیمیائی عناصر ایسے تھے کہ ان سے پہلے سائنس دان سار کوشش کے باوجود انھیں دور کرنے کا کوئی آسان اور کم خرچ طریقہ نہیں ایجاد کر سکے تھے۔ جو طریقے مروجہ تھے وہ بہت مہنگے اور مشکل تھے۔ ان سے زمین کی صفائی بہت سست روی سے جاری تھی۔ ا سے زمین کا بہت چھوٹا سا ٹکڑا ہی صاف ہو پایا تھا اور وہ بھی پو طرح صاف نہیں ہُوا تھا۔

موسین جب بچہ تھا تو غذائیت کی کمی کی وجہ سے اس کے تما بہن بھائی مر گئے تھے۔ وہ ان کی موت کا صدمہ نہیں بھولا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ بڑا ہو کر وہ زمین کی بہتری کے لیے کام کرے گا تاکہ خوراک کی پیداوار بڑھ سکے اور کوئی بھوک یا غذا کی کمی سے نہ مرے۔ بڑے ہو کر اس نے تعلیم میں اسی شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے پورے پچاس سال اس شعبے میں کام کیا تھا تب کہیں جا کر وہ ایسے طریقے ایجاد کرنے میں کام یاب ہُوا تھا جن کی مد سے زمین بہت آسانی سے اور کم خرچ میں صاف ہو سکتی تھی۔ یہی

لکہ یہ پہلے سے زیادہ اور اچھی پیداوار دینے کے قابل ہو س کے ایجاد کیے طریقوں کی مدد سے ان کی ساری زمین الوں میں آلودگی سے پاک اور زرخیز ہوگئی تھی۔ اس کی وار اتنی زیادہ اور بہتر ہوگئی کہ اب ان میں ایک فرد بھی رات کو نہیں سوتا تھا۔ پیدا ہونے والے ہر بچے کو پوری غذا ملتی تھی۔ مین صاف اور اُجلی ہوگئی تھی۔

ان تینوں کے ان لازوال کارناموں کی وجہ سے انھیں طور پر سائنس کونسل کا تاحیات سربراہ بنا دیا گیا تھا۔ اب ں ہی ہونے والے تمام سائنسی کاموں کی نگرانی کرتے اور مل کر آنے والے دنوں کے لیے پروگرام تیار کرتے ۔ اگر ان میں کسی مسئلے پر اختلاف رائے ہوتا تھا تو اس کا کثرتِ رائے سے ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ کیوں کہ ان تینوں میں مثالی ہم آہنگی ی۔ دراصل ان تینوں نے اپنے لوگوں کے لیے جو کیا وہ اور صرف خدمت کے جذبے کے تحت کیا تھا۔ انھوں کبھی صلے کی پروا نہیں کی تھی۔

لیکن حکومت اور لوگوں نے ان کی خدمات، بلکہ احسانات د رکھا اور انھیں وہ مرتبہ اور عزت دی جس کے وہ مستحق ۔ پورے سیارے پر ان کے نام سے جگہ جگہ شہر آباد کیے تھے پیدا ہونے والے تیسرے بچے کا نام ان میں سے کسی کے پر رکھا جاتا تھا۔ ہر قابلِ ذکر جگہ ان کے مجسمے نصب کیے گئے ۔ یہی نہیں، بلکہ کوئی بھی فیصلہ جس کا تعلق سائنس اور لوجی سے ہو ان کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جاتا تھا۔ اس میں جو پالیسی وہ بناتے تھے اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ وہ کام کے سلسلے میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تھے اور کسی کے جواب دہ نہیں تھے۔

لیکن دوسری طرف انھوں نے اپنے منصب اور ارات کو ہمیشہ اپنے لوگوں اور سیارے کی بہتری کے لیے عمال کیا تھا۔ وہ پچاس برس سے سائنس کونسل کے سربراہ اور اس دوران میں ان پر کسی کو انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں ۔ وہ لوگوں کے لیے باپ جیسی حیثیت رکھتے تھے، جن کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کا ہر فیصلہ تنقید سے بالاتر ہوتا ۔ ان پچاس برسوں میں انھوں نے جو بھی فیصلہ کیا تھا وہ س سیارے کے لوگوں کے لیے بہتر ہی ثابت ہُوا تھا۔

جب انھوں نے سیارے کے بنیادی مسائل حل کر لیے انھوں نے اس سے باہر کی طرف توجہ دی۔ ابھی تک انھوں نے نظامِ شمسی کے دوسرے سیاروں کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ کلار کا خیال تھا کہ ان کے پڑوسی سیارے پر آبادی ممکن ہے کیوں کہ وہ ان کے سیارے سے بہت ملتا جلتا تھا۔ وہ بھی ان کے سیارے کی طرح ٹھوس تھا اور سورج سے اس کا فاصلہ بھی ایسا تھا کہ وہ نہ تو بہت دُور تھا کہ سردی سے منجمد ہو جائے اور نہ اتنا قریب تھا کہ اس کا درجۂ حرارت اوون جتنا ہو جائے۔ جیسا کہ سورج کے قریب والے دو سیاروں کا درجۂ حرارت تھا۔ ان میں کیک تو آسانی سے بیک کیا جاسکتا تھا لیکن ان میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے بعد یہ دو سیارے تھے جو ایک جیسے فاصلے پر گردش کرتے تھے۔ ان میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ان کا درجۂ حرارت بھی ایک جیسا تھا اور حالات بھی ایک ہی جیسے تھے۔ پانی دونوں پر موجود تھا۔ سب سے بڑھ کر کہ اس سیارے پر رات کے وقت روشنیاں نظر آتی تھیں، اس لیے کلار کا خیال تھا کہ وہاں زندگی موجود تھی۔ اور جس سیارے پر زندگی ہو وہاں کوئی نہ کوئی ذہین مخلوق ہوتی ہے۔

ایڈر کو اس خیال سے اختلاف تھا۔ "یہ تو ممکن ہے کہ اس سیارے پر زندگی ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس پر کوئی ذہین مخلوق ہو۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی..." کلار نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ "جب ہمارے سیارے پر ہو سکتی ہے تو وہاں کیوں نہیں ہو سکتی ہے۔"

"بس مجھے اس کا یقین ہے..." ایڈر نے ضدی لہجے میں کہا۔ "میرا اس پر ایمان ہے کہ اس نظامِ شمسی بلکہ اس پوری کائنات میں سب سے ذہین اور سب سے خوب صورت مخلوق ہم ہی ہیں۔"

ذائقہ

فلم اسٹار انیل کپور کے ہاں ایک دعوت میں قتیل شفائی، اظہر جاوید اور جاوید اختر شریک تھے۔ دورانِ گفتگو جاوید اختر قتیل سے کہنے لگے، "پنجاب کے لوگوں نے اردو زبان کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ مثلاً ہم لوگ کہتے ہیں، کھانا کھائیے... اسی کو پنجاب کے لوگ کہیں گے، کھانا کھائیں..."

اس پر قتیل صاحب نے برجستہ جواب دیا، "کھانا کھائیں کہنے سے کھانے کے ذائقے میں کیا کوئی فرق پڑ جاتا ہے؟"

اس پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

تعاون ✿ وقار احمد، راولپنڈی

"یہ صرف خیال ہے..." کلار نے کہا۔ "کسی دوسری ذہین اور خوب صورت مخلوق کی موجودگی عین ممکن ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" ایڈر کا لہجہ اور بھی ضدی ہو گیا۔

"دوست، تم اس وقت ایک بڑے اور مشہور سائنس دان کے بجائے کوئی بچے لگ رہے ہو..." موسین نے مداخلت کی۔ "میں کلار کی تائید کرتا ہوں کہ نظامِ شمسی میں کسی اور ذہین مخلوق کی موجودگی عین ممکن ہے۔"

"نہیں ہو سکتی۔" ایڈر نے پاؤں پٹخے۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔

"اس خیال کی وجہ؟" کلار نے پوچھا تو ایڈر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اپنے پڑوسی سیارے پر توجہ دینی چاہیے۔ ممکن ہے، وہاں کوئی ذہین مخلوق موجود ہو۔" کلار بولا۔

اس پر ایڈر نے مُنہ بنایا۔ "بے کار ہے میرے خیال میں ایسی کسی کوشش سے صرف وقت اور پیسا برباد ہو گا۔"

"ایسا نہیں ہے دوست، کسی بھی سائنسی کام کا کبھی نہ کبھی فائدہ ضرور ہوتا ہے۔" موسین نے کلار کی تائید کی۔

"تو یہ طے ہے کہ اب ہمیں اپنے سیارے سے باہر کی دنیا پر بھی توجہ دینی چاہیے۔"

کلار کی اس بات پر ایڈر نے کہا۔ "اس تجویز سے میں متفق نہیں ہوں۔"

"لیکن ہم دونوں تو ہیں اور اکثر رائے کے اصول کے تحت اب یہ ہم تینوں کا فیصلہ ہے۔"

ایڈر نے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھا۔ "تم دونوں مجھے تکلیف دے رہے ہو۔"

"تم ہماری بات تو مانو..." کلار نے خلوص سے کہا۔ "اگر تمھاری بات درست نکلی تو ہم تم سے معذرت کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے..." ایڈر نے سرد آہ بھری۔ "اگر تم لوگوں کی بات درست نکلی تو میرے لیے یہ بہت صدمے کی بات ہو گی۔"

ان تینوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا تو پھر کس کی مجال تھی کہ اسے رد کرتا۔ اگرچہ یہ سائنسی سے زیادہ سیاسی معاملہ بھی تھا کیوں کہ کسی دوسرے سیارے پر کسی ذہین مخلوق کی موجودگی کا مطلب تھا کہ ان کی حکومت کو مداخلت کرنا پڑتی۔ مگر فی الحال یہ سائنسی معاملہ تھا، اس لیے حکومت نے دخل اندازی سے گریز کیا۔ انھوں نے پڑوسی سیارے سے رابطے کی کوشش کا آغاز کیا۔ ان کے پاس ایسے طاقت ور آلات تھے جو خلا سے آنے والے ہر سگنل کو کیچ کر سکتے تھے۔ مگر ان کے پاس سگنل بھ والے آلات اتنے طاقت ور نہیں تھے۔ اس لیے انھوں طاقت ور نشریاتی آلات کی تیاری شروع کر دی۔ اس میں عرصہ لگا تھا لیکن جلد ان کے پاس ایسے نشریاتی آلات آ گئے جو نظامِ شمسی کی آخری حد تک سگنل بھیج سکتے تھے۔ انھیں ایک رصدگاہ میں نصب کر کے ان تینوں نے اپنے کام کا آغاز تھا۔ انھوں ہر طرح کے سگنل اپنے پڑوسی سیارے کی طرف بھ شروع کر دیے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ شاید انھیں فوری جواب نہ ملے اور اس سیارے پر کوئی مخلوق تھی تو اسے ان کا سگنل سمجھنے کے لیے کئی سال درکار تھے۔ مگر جب سگنل بھیجنے کے ایک مہینے بعد انھیں اس سیارے کی طرف سے سگنل ملا تو وہ حیران رہ گئے سگنل ایسا تھا جسے وہ سمجھ سکتے تھے اور اس کا مطلب انھوں نے جو نکالا تھا۔ وہ کچھ یوں تھا۔

"ہم جان گئے ہیں... ہم آ رہے ہیں۔"

کلار خوشی سے اُچھل پڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "دیکھا میں کہتا تھا کہ اس سیارے پر کوئی ذہین مخلوق ہے۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہُوا ہے۔"

"اتنا بھی نہیں..." ایڈر نے برا سامُنہ بناتے ہوئے کہا۔ "تم صرف ایک سگنل کی وجہ سے انھیں ذہین مخلوق کہہ رہے ہو۔"

"نہیں دوست، میں انھیں دو وجہ سے ذہین کہہ رہا ہوں ایک تو انھوں نے ہمارا سگنل اتنی جلدی سمجھ لیا۔ دوسرے ان کے پاس اتنے طاقت ور نشریاتی آلات پہلے سے موجود تھے جنھیں ہم نے ایک سال میں جا کر بنایا تھا۔"

"صرف یہ تو ذہین ہونے کی دلیل نہیں ہے۔" ایڈر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ایڈر تم ایک اہم بات نظر انداز کر رہے ہو۔" موسین نے کہا۔ "انھوں نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔"

"اور اس کا مطلب ہے کہ وہ اتنے ترقی یافتہ ہیں کہ خلا میں سفر کر سکتے ہیں۔ جب کہ ہم ابھی اپنے سیارے کی حد سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔" کلار نے کہا۔ تو ایڈر کسی حد تک قائل ہوتا نظر آنے لگا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ لیکن اس کا مطلب ایک اور بھی ہے انھوں نے اپنے سیارے کے وسائل اپنے لوگوں پر خرچ کرنے کے بجائے انھیں خلائی سفر جیسی چیزوں پر خرچ کیا ہے۔"

"ممکن ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو..." کلار نے کہا۔ "وہ آئیں گے تو ہم دیکھ لیں گے۔"

"وہ خلا میں سفر کیسے کریں گے؟" موسین نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے کسی خلائی جہاز میں..." ایڈر بولا۔ "میں ایک بات دعوے سے کہتا ہوں۔ ممکن ہے، وہ لوگ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں لیکن وہ ہمارے جتنے خوب صورت نہیں ہو سکتے ہیں۔ ہم اس کائنات کی سب سے خوب صورت مخلوق ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ایڈر کے لہجے میں غرور آ گیا تھا۔

کلار اور موسین مسکرانے لگے تھے۔ "جب وہ آئیں گے تو اس کا بھی پتا چل جائے گا۔"

"تم لکھ کر رکھ لو ان لوگوں کی آمد ہمارے لیے اچھی نہیں ہو گی۔ وہ کوئی بدصورت مخلوق ہوں گے جنھیں ہمارے لوگ برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

"ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے..." موسین نے شرارت سے کہا۔ "ممکن ہے وہ ہم سے زیادہ خوب صورت ہوں۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔" ایڈر نے پورے یقین سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

انھوں نے اب تیاری شروع کر دی تھی کہ جب دوسرے سیارے والے ان کے سیارے پر آئیں گے تو ان کے استقبال کے لیے کوئی جگہ ہونی چاہیے تھی جہاں وہ اُتر سکیں۔ اس کے لیے ایک بڑے سے میدان میں ایک رن وے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ اس کے ساتھ انھوں نے پڑوسی سیارے سے پیغام رسانی جاری رکھی تھی۔ ان پیغامات کی مدد سے وہ رفتہ رفتہ ایک ایسا طریقہ وضع کرنے میں کام یاب ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کو اپنی بات آسانی سے سمجھا سکتے تھے۔ وہ انھیں بتا رہے تھے کہ ان ایک طاقت ور خلائی جہاز تکمیل کے آخری مرحلے میں تھا اور وہ اپنے خلا بازوں کی تربیت کر رہے تھے، تا کہ وہ یہ طویل سفر کر سکیں۔ ساتھ ہی وہ ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھے۔ ان کی طرف سے روز ہی سوالات آتے تھے۔ اور وہ اپنی بساط کے مطابق ان کے جواب دینے کی کوشش کرتے تھے۔ کیوں کہ سوالات سائنسی نوعیت کے ہوتے تھے جن کی اصطلاحات ان کے لیے نامانوس ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ ایڈر بھی اس کام میں پوری دل چسپی لینے لگا تھا اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ یہ لوگ ذہانت میں ان سے کسی طرح کم نہیں تھے بلکہ شاید زیادہ ہی ذہین تھے۔ مگر دوسرے معاملے میں ایڈر کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی کہ آنے والے کسی صورت ان سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو سکتے تھے اور موسین اور کلار اسے چھیڑتے تھے۔

بالآخر پڑوسی سیارے کا خلائی جہاز روانہ ہُوا اور دو مہینے کی طویل مسافت طے کرتا ہُوا ان کے سیارے کے مدار میں داخل ہُوا تھا اور آج صبح وہ ان کی طرف سے تیار کیے ہوئے مخصوص رن وے پر اترنے والا تھا۔ ایڈر، کلار اور موسین وہاں موجود تھے۔ ان کے علاوہ ان کے حکمران اور دوسرے اہم لوگ موجود تھے۔ عوام کا بھی ایک بڑا جمِ غفیر آنے والوں کو دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ سب کی نظریں آسمان پر مرکوز تھیں۔ ایک نقطہ سا نمودار ہُوا اور پھر ایک گرج دار آواز کے ساتھ ایک دیوہیکل خلائی جہاز ان کے سامنے رن وے پر اتر گیا تھا۔ جب خلائی جہاز اتر گیا تو اس کے پہلو سے ایک دروازہ کھلا اور اس سے سیڑھی نکل کر زمین پر ٹک گئی۔ پھر اندر سے کچھ لوگ برآمد ہوئے۔ انھوں نے احتیاط کے طور پر ایک مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ جس کا اوپری حصہ شیشے کے گنبد پر مشتمل تھا اور وہ اس میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان سب کے مُنہ کھلے رہ گئے تھے اور ان میں سے بہت سوں کے چہروں پر دہشت کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ آنے والے کچھ ایسے ہی خوف ناک اور بدصورت تھے۔

"دیکھا میں نے کیا کہا تھا۔" ایڈر نے طنزیہ نظروں سے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "بہت شوق تھا تم لوگوں کو اس بدہیئت مخلوق کو یہاں دیکھنے کا۔"

کلار اور موسین بھی ڈر رہے تھے لیکن پھر ان پر سائنسی تجسس غالب آ گیا تھا۔ کلار نے کہا۔ "یہ جو ان کے جسموں کے اوپر گول سے چیز ہے شاید اسی میں ان کا دماغ ہے۔"

"کیا بدصورت مخلوق ہے...!" موسین نے کہا۔ "اور اس گولے میں جو یہ ابھار اور گڑھے ہیں یہ شاید ان کے دیکھنے، سننے اور بولنے والے اعضا ہیں۔"

ایڈر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے غصے سے ان سے کہا۔ "مجھے تو اجازت دو اور تم لوگ اس مخلوق پر تحقیق جاری رکھو لیکن میرا ایک مشورہ ہے کہ انھیں عوام کے سامنے مت آنے دینا۔ ممکن ہے، کسی کا مارے دہشت کے انتقال ہو جائے۔"

یہ کہہ کر مریخ کے سب سے بڑے سائنس دان ایڈر نے اپنی پیلی گدلی اور گدھ نما آنکھوں تلے اپنی کوے کی چونچ جیسی ناک ہلائی اور اپنے چمگادڑ جیسے سیاہ پَر پھڑپھڑاتا ہُوا اس جگہ سے روانہ ہو گیا جہاں زمین نامی سیارے سے آنے والوں کا استقبال کیا جا رہا تھا۔

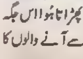

پریم کہانی

یعقوب جمیل

ایک عجیب محبت کا عجیب تر فسانہ، اس کہانی کا مصنف بعض کرداروں سے ملنے کا خواہاں تھا...
اور کبھی اس کی ملاقات ہو گئی، اسے معلوم ہی نہ تھا

مجھے فوری ایک کہانی لکھنا تھی!

ہمارے ایڈیٹر صاحب کا حکم تھا کہ جلد سے جلد ایک اچھی سی کہانی لکھ کر بھیج دو۔ لیکن اچھی کہانی تو کیا' مجھ سے ایک جملہ تک نہیں سوچا جا رہا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں سے طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اور لکھنے لکھانے کا موڈ بھی نہیں بن رہا تھا۔ میں نے ایڈیٹر صاحب سے معذرت چاہی لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی اور مجھے وعدہ کرنا پڑا۔

اس دن میں صبح سے ہی کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ لیکن صبح سے دوپہر ہو گئی اور میں ایک سطر بھی لکھ نہیں پایا۔ لکھتا بھی کیا؟ کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ تنگ آ کر میں اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ فٹ پاتھ پر ٹہلتے ٹہلتے میں خاصا دور آ گیا تھا لیکن ذہن اب بھی مرتکز نہیں ہو پا رہا تھا۔ ٹریفک کے شور نے تو دماغ کو اور بھی بوجھل بنا دیا تھا۔ ابھی میں واپس مڑنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میری سڑک کے دوسری جانب ایک گلی پر پڑی۔ مجھے خیال آیا' چوڑی سی گلی میں ذرا آگے جا کر ایک چھوٹا سا خوب صور پارک ہے جو بے ہنگم ٹریفک کے شور سے بالکل محفوظ ہے۔ خیال کے آتے ہی میرے قدم اس طرف اٹھ گئے۔ سڑک کرنے کے بعد میں خراماں خراماں چلتا ہوا پارک میں آ گیا

اس وقت پارک میں بہت زیادہ رش نہیں تھا۔ کچھ بچے اُدھر دوڑ بھاگ رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے اس لیے آ پاس کی چند عورتیں اور لڑکیاں بھی پارک کی سبز گھاس پر ٹولی کی شکل میں بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ ان سب سے ہٹ کر' میں ایک کونے میں خالی پڑی ہوئی بینچ پر آ کر بیٹھ گیا لکڑی کی اس کشادہ بینچ پر چار آدمی آرام سے بیٹھ سکتے تھے پارک کی کھلی فضا میں چلنے والی ہوا' گرمی میں بہت بھلی لگ رہ

۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک دلکش خال والی سانولی سلونی لڑکی جس کی عمر انیس بیس برس رہی آ کر اسی بینچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔ پارک جیسی ی تفریح گاہ میں کسی لڑکی کا یوں کسی بینچ پر آ کر بیٹھ جانا کوئی سا واقعہ نہیں تھا۔

دل پھینک قسم کے نوجوانوں کو ایسے موقعوں کی تلاش رہتی اور وہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر لڑکی سے بات کرنے کا بہانہ ڈنے لگتے ہیں۔ میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ البتہ میں ضرور کہوں گا کہ اس لڑکی کی آنکھیں اور اس کے چہرے کے و نگار انتہائی دلکش تھے۔ بال بہت لمبے' گھنے اور سنہرے ۔ قد بھی پانچ فٹ سے اوپر تھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی ی باندھی ہوئی تھی جو اُس کے پُرکشش جسم پر خوب سج رہی ی۔ اس کی جلد کی رنگت سرخ و سفید تو نہیں تھی لیکن اس کے و وہ ایک بے حد حسین لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی جس کی تمنا ہر کوئی ر سکتا تھا' ایسا دلکش چہرہ جو آنکھوں کے رستے دل میں اتر ئے' زندگی میں کبھی کبھی ہی نظر آتا ہے۔

اس کے پیروں میں ربر کے سفید چپل تھے اور ہاتھ میں ے کا پرس تھا۔ میں نے ایک نظر میں ہی یہ ساری چیزیں لی تھیں۔ زیور کے نام پر اُس کی گردن اور چہرے پر کچھ نہیں صرف کلائیوں میں ہلکے نیلے رنگ کی کانچ کی چوڑیاں یں۔ میں نے یہ ساری چیزیں اس لیے جلدی جلدی دیکھ ڈالی یں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی میرے بارے میں کوئی غلط ے قائم کر بیٹھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اُس لڑکی نے بھی میری طرح جلدی ی میرے چہرے مہرے اور لباس وغیرہ کا جائزہ لے لیا اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے لاتعلق ہو کر بیٹھے ۔ ویسے بھی میں اُس کے لیے اور وہ میرے لیے اجنبی تھے اس لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہنے کا سوال یدا نہیں ہوتا تھا۔

لکڑی کی وہ بینچ کافی لمبی تھی اور ہم دونوں کے بیچ کی جگہ ڑی تھی جس میں ابھی مزید دو لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ۔ اس طرح چپ چاپ بیٹھے بیٹھے کچھ وقت گزر گیا۔ پھر اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ میں اٹھ کر وہاں سے جانے کے ے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بائیس چوبیس سالہ نوجوان ہوا ہمارے نزدیک آ گیا۔ وہ باری باری ہم دونوں کی دیکھنے کے بعد دھیرے سے بولا۔ "دیکھیے' مہربانی کر کے آپ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ جائیں تاکہ میں بھی ایک طرف بیٹھ جاؤں۔"

لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے نوجوان سے کہا۔ "آپ چاہیں تو یہاں بیٹھ جائیں" میں نے خالی جگہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ خالی پڑی ہے۔"

میری بات سن کر نوجوان نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ تب میں سمجھا کہ نوجوان ہمیں میاں بیوی یا پھر عاشق معشوق سمجھ بیٹھا ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے کچھ کہتا' وہ خود ہی بول پڑا۔ "دیکھیے جناب' کبھی کبھی آپس میں میٹھی میٹھی ناراضی بہت اچھی لگتی ہے... لیکن آپس کی یہ ناراضی لوگوں کے سامنے نہیں آنی چاہیے۔ اس لیے آپ دونوں اپنی ناراضی دور کر کے ساتھ ساتھ بیٹھ جائیں تاکہ میں بھی ایک کونے پر بیٹھ جاؤں۔"

اس کی بات سن کر وہ لڑکی بھی اُس کی غلط فہمی بھانپ گئی' فوراً ہی بولی۔ "آپ کو غلط فہمی ہو رہی مسٹر۔ اگر آپ کو بیٹھنا ہے تو بیٹھ جائیں' ہم دونوں ساتھ نہیں ہیں۔"

"اوہ... آئی ایم سوری!" نوجوان بولا اور پھر درمیان والی جگہ پر بیٹھ کر' ہاتھ میں دبا ہوا ایک انگریزی میگزین کھول کر آرام سے پڑھنے لگا۔ چند منٹ بعد میں نے پھر وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ایک سرسری نظر اس نوجوان اور پھر اس لڑکی پر ڈالی۔ نوجوان میگزین میں منہمک تھا اور وہ لڑکی سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو وہ نوجوان میگزین اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا کر بولا۔

"کیا آپ جا رہے ہیں؟"

"جی" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو پھر آپ مجھے یہ بتاتے جائیں کہ اسٹار سینما میں اس وقت کون سی فلم چل رہی ہے اور شام کا شو کتنے بجے شروع ہوتا ہے؟"

نوجوان کے اس واہیات سوال پر مجھے سخت غصہ آیا۔ اکثر اس قسم کے سوالات خود واہیات نہیں ہوتے لیکن جب وہ کسی کی الجھن اور پریشانی کی حالت میں اس سے پوچھے جاتے ہیں تو واہیات لگنے لگتے ہیں۔

"آپ نے جواب نہیں دیا؟" مجھے خاموش دیکھ کر نوجوان نے پوچھا۔

''مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' یہ کہہ کر میں چل پڑا۔

پارک سے نکل کر میں میرین ڈرائیو پر آ گیا۔ ذرا دور چلنے کے بعد جب میں چوپاٹی والے راستے پر مڑا تو اچانک پیچھے سے ''اے مسٹر... اے مسٹر!'' کی آوازیں آنے لگیں۔ میں چلتے چلتے رک گیا اور پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو ہاتھ ہلاتا ہوا تیز تیز قدموں سے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ قریب آنے کے بعد وہ رُک رُک کر بولا۔ ''مسٹر... یہ آپ کا رومال!'' یہ کہہ کر اس نے ہلکے گلابی رنگ کا ایک رومال میری جانب بڑھا دیا۔ ''اسے آپ اس بنچ پر ہی بھول آئے تھے۔''

میں نے رومال پر نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ ''یہ رومال میرا نہیں ہے۔''

''لیکن یہ رومال بنچ کے نیچے اسی جگہ گرا ہوا تھا جس جگہ آپ بیٹھے ہوئے تھے۔'' نوجوان نے کہا۔ ''میں سمجھا کہ یہ آپ کا ہوگا۔''

''جی نہیں... شکریہ'' وہ میرے ساتھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ بے کار کی باتوں میں اپنا سر کھپاؤں۔ آگے کچھ کہے بغیر میں چل پڑا تو وہ بھی میرے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگا۔ مگر میں نے کوئی بات نہیں کی۔ جب اس سے یہ خاموشی برداشت نہیں ہوئی تو پوچھنے لگا۔ ''آپ کہاں رہتے ہیں اور اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟''

اس بار میں اپنے غصے کو نہیں روک سکا۔ جھلا کر بولا۔ ''میں جہاں چاہے جاؤں اور جہاں چاہے رہوں، آپ کو اس سے مطلب؟ آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں؟''

''آپ تو ناراض ہو رہے ہیں۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ''مجھ پر ناراض نہ ہوں جناب... میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں۔''

''لیکن کوئی اچھا آدمی کسی کو اس طرح بلاوجہ تنگ بھی تو نہیں کرتا۔'' میں نے اسی غصیلے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو جہاں جانا ہو جائیں' میں بعد میں چلا جاؤں گا... پلیز جائیں۔''

''آپ کا مزاج بہت گرم ہے۔'' شرمندہ ہونے کے بجائے وہ بولا۔ ''لگتا ہے ابھی تک آپ کو کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ اگر کسی سے آپ کو محبت ہوئی ہوتی تو آپ کے مزاج میں اتنی گرمی نہ ہوتی... کیونکہ پیار کرنے والوں کے مُنہ سے تو پھول جھڑتے ہیں۔''

مجھے اب وہ نوجوان پاگل لگنے لگا تھا، حالانکہ ابھی تک اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس سے یہ شبہ یقین میں بد کہ وہ پاگل ہے۔

میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کیا اس خیال کے ساتھ آگے بڑھ گیا کہ اب وہ میرے پیچھے نہیں آئے گا لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ پھر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ اس وقت ہم ایک ریستوران کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس ریستوران پر نظر پڑتے ہی وہ اچانک بولا۔ ''مسٹر... اچلیے' ایک ایک پیالی چائے پیتے ہیں۔''

''نہیں۔ مجھے چائے نہیں پینی ہے۔'' میں اسی جھلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ اصل میں میں کسی طرح بھی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

''دیکھیے پلیز... مان جائیے اور غصہ تھوک دیجیے۔'' وہ بڑی معصومیت سے میری طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ''میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ پلیز' میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔''

''لیکن میں اس وقت چائے پینے کے موڈ میں نہیں ہوں'' میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں آپ کی بات ضرور مان لیتا۔''

''ٹھیک ہے' آپ نہ پئیں... مگر مجھے تو آپ کو چائے پلانی ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''دیکھیے' اگر آپ انکار کریں گے تو میں آخر تک آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ مجھ سے چھٹکارا ہے تو میرے ساتھ اندر چلیں اور ایک پیالی چائے پی لیجیے۔''

میں عجیب کش مکش میں پڑ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کروں تو کیا کروں؟ اس وقت جو صورتِ حال میرے سامنے تھی اس نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔ دھیرے دھیرے میرے دل میں یہ تجسس پیدا ہونے لگا کہ آخر یہ نوجوان ہے کون؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا میرے ان سوالوں کا جواب تو مجھے اسی وقت مل سکتا تھا جب میں کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھ کر اُس کی باتیں سنتا۔

میں اس کے ساتھ ریستوران کی طرف چل پڑا۔ جب اندر داخل ہوئے تو وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ہم ایک خالی میز آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے بیرے کو بلا کر چائے کا آرڈر اور پھر مسکراتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ''دیکھیے جناب' مجھ ڈرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ نہ میں کوئی برا آدمی ہوں' نہ ہی پاگل ہوں۔''

میں کچھ نہیں بولا اور چپ چاپ بیٹھا اس کی طرف رہا۔ ذرا دیر بعد وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میری بات مان جناب' اب آپ جلد سے جلد کسی سے پیار کر ہی لیجیے۔ جب تک آپ کسی سے پیار نہیں کریں گے' آپ کی زندگی اسی طرح پھیکی پھیکی گزرے گی۔ زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہے گی۔ کوئی آپ کے دل میں سما جائے گا تو دماغ کی یہ گرمی خود بہ خود ختم ہو جائے گی اور آپ خوش رہا کریں گے۔''

اس کی یہ بات سن کر بھی میں' خود پر ضبط کیے' چپ بیٹھا رہا۔ اتنے میں بیرا چائے رکھ کر چلا گیا اور وہ نوجوان جلدی سے پیالیاں اپنے سامنے رکھ کر چائے بنانے لگا۔ میں دھیان سے اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ تب اچانک ہی میرے دماغ میں ایک زبردست دھماکا ہوا اور مجھے لگا کہ میں صبح سے جس کہانی کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں' کہیں وہ کہانی اس نوجوان کے اندر ہی چھپی ہوئی تو نہیں ہے؟ اس خیال کے ذہن میں ابھرتے ہی میرا تجسس زور پکڑنے لگا اور میں دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ مُنہ بند کیے کیوں بیٹھے ہیں؟ میں اتنی دیر سے بول رہا ہوں اور آپ ہیں کہ جواب بھی نہیں دیتے۔''

''میں کیا بات کروں؟'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور آگے بولا۔ ''آپ اگر کسی سے محبت کرتے ہیں تو یہ اچھی بات ہے لیکن آپ مجھے محبت کرنے کا مشورہ دے کر کیوں حیران کر رہے ہیں؟''

''میں آپ کو حیران نہیں کر رہا ہوں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''میں تو آپ کو بتا رہا ہوں کہ آپ اب بھی جوان ہیں اور ایک طویل زندگی آپ کے سامنے ہے۔ ویسے ہمارے دور کی یہ دنیا اور زندگی بے شمار مسائل سے بھری پڑی ہے۔ ایسے میں اگر کسی کو دل میں بسا لیا جائے تو آدمی کی آدھی سے زیادہ فکریں، پریشانیاں اور الجھنیں دور ہو جاتی ہیں کیونکہ محبت اپنے سوا کسی کو اور کچھ سوچنے ہی نہیں دیتی...''

''آپ تو محبت کے معاملے میں کافی تجربہ کار لگتے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''خیر میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''بالکل ٹھیک۔'' یہ کہہ کر اُس نے بیرے کے ہاتھ پر چائے کا بل رکھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔ اب چلیے' ہم اپنے اپنے رستے پر چلتے ہیں... یعنی وعدے کے مطابق میں آپ کا پیچھا چھوڑ رہا ہوں۔''

میں ہنس پڑا اس کی بے فکری، زندہ دلی اور بے ریا گفتگو کے انداز نے میرے تجسس کو اور بڑھا دیا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتائے لیکن ابھی تک وہ صرف پیار و محبت کی باتیں ہی کرتا رہا تھا۔ آخر کار میں نے چلتے چلتے پوچھ لیا۔ ''آپ نے مجھے تو محبت کرنے کا مشورہ دے دیا لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ خود بھی کسی سے محبت کرتے ہیں؟''

''میں...؟ میں بھی کسی سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور وہ لڑکی وہی تھی جسے ابھی آپ نے پارک میں دیکھا تھا۔''

''لیکن وہ تو آپ کو جانتی بھی نہیں ہے!'' میں حیرانی سے بولا۔ ''بلکہ آپ خود اُسے میرا ساتھی سمجھ رہے تھے۔''

''وہ مذاق تھا۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''آج کل وہ ذرا ناراض ہے... لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ محبت میں تو یہ چلتا ہی رہتا ہے۔ میں جلد ہی اسے منا لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔ مجھے اس کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ کیونکہ میں اس لڑکی کو دیکھ چکا تھا۔ وہ اس نوجوان سے بالکل ہی لاتعلق نظر آ رہی تھی۔ خیر مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ دونوں محبت کرتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے میں اس سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس بار وہ میرے ساتھ یا میرے پیچھے نہیں آیا تھا۔ ذرا آگے جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا بھی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اپنے وعدے کے مطابق اس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔

اس واقعے کے دو دن بعد میں اپنے ایک دوست کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اسی پارک کے سامنے سے گزرا تو اچانک ہی میری آنکھوں کے سامنے اس نوجوان اور اس لڑکی کا چہرہ گھوم گیا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا۔ ''چلو ذرا دیر پارک میں بیٹھتے ہیں۔''

ہم دونوں پارک میں آ گئے۔ میری نظر سیدھی اس کونے والی بنچ کی جانب اٹھ گئی اور میں حیرت سے اچھل پڑا کیونکہ اس بنچ پر مجھے وہی لڑکی بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ اس لڑکی کو پہچان لینے کے بعد میں نے اپنے دوست کو وہیں بیٹھ جانے کے لیے کہا اور ہمت کر کے اس بنچ کی جانب بڑھ گیا جس پر وہ لڑکی اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے مجھے اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن پھر بھی وہ انجان بنی بیٹھی رہی۔ اس کے نزدیک پہنچ کر میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کیوں بہن' آج تو مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کی ناراضی دور ہو گئی ہے... ہے نا؟''

میرا سوال سن کر پہلے تو وہ لڑکی گھبرائی لیکن پھر میرا چہرہ اسے یاد آ گیا اور وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ نے چونکہ مجھے بہن کہا ہے اس لیے آپ سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں لگتا۔"

"جی کوئی حرج نہیں ہے۔" میں بولا۔ "میں نے سچے دل سے آپ کو بہن کہا ہے۔"

"تو وہ بھائی جو اس دن آپ کی موجودگی میں یہاں آیا تھا، وہ پھر آپ سے کہیں مل چکا ہے؟"

میں لڑکی کی بات سن کر چونک پڑا تھا کیونکہ یہ لڑکی اس نوجوان کو بھائی کہہ رہی ہے اور وہ نوجوان مجھے بتا چکا ہے کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ بات کچھ عجیب سی ہو گئی تھی اور یہ معما میری سمجھ سے باہر ہو گیا تھا۔ لڑکی شاید میری خاموشی سے میری اندر کی کیفیت سمجھ گئی تھی، بولی۔ "آپ اگر روزانہ اس پارک میں آتے ہوتے تو آپ کو حقیقت سمجھنے میں دیر نہ لگتی۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا ٹھہر گئی پھر بنچ کی خالی جگہ کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "آپ بیٹھ جایئے میں آپ کو ساری بات سمجھاتی ہوں۔"

میں ایک اور نئی کہانی سننے والا تھا۔ اس لیے جلدی سے بنچ پر بیٹھ گیا۔ بات شروع کرنے سے پہلے اس نے کہا...

"بات ذرا لمبی ہو جائے گی، کہیں آپ کو دیر نہ ہو جائے۔"

"جی نہیں۔ مجھے کوئی خاص کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ایک منٹ میں ذرا اپنے دوست کو رخصت کر دوں۔" یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور وہیں سے اپنے دوست کو اشارہ کر کے چلے جانے کے لیے کہا اور پھر بیٹھ کر بولا۔ "جی، اب کہیے۔"

"زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات یا حادثات پیش آ جاتے ہیں کہ جن پر افسوس کرنے کے علاوہ آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" لڑکی نے گمبھیر سے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اس دن جس نوجوان سے آپ یہاں ملے تھے، وہ مجھے یہاں تقریباً روز ہی ملتا ہے... بلکہ آس پاس کے گھروں سے آنے والے بچے، عورتیں اور مرد، سب ہی اس سے واقف ہیں۔ کیونکہ وہ روزانہ ہی اسی وقت یہاں آتا ہے۔ آج بھی آیا ہی ہوگا، پارک کے اندر ہی کہیں ہوگا۔ اس کے پاس ایک ہلکے گلابی رنگ کا رومال بھی ہوتا ہے..." لڑکی نے گلابی رنگ کے رومال کی بات کی تو مجھے یاد آ گیا اور میں بول پڑا۔ "ہاں... ہاں۔ وہ رومال اس نے مجھے بھی دکھایا تھا..." یہ کہہ کر میں نے لڑکی کو وہ ساری بات بتا دی جو میرے اور اس نوجوان کے درمیان راستے میں اور ریستوران میں ہوئی تھی۔

اوہ...! اس لڑکی کے ہونٹ سکڑ گئے پھر وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ "اس گلابی رنگ کے رومال کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے... ویسے یہ حقیقت ہے کہ وہ رومال اس نوجوان کا نہیں ہے۔"

"کیا؟" میں چونک پڑا۔ "وہ رومال اس کا نہیں ہے تو پھر کس کا ہے؟"

"سریتا کا۔" وہ جلدی سے بولی اور آگے کہا۔ "سریتا گنگولی کا نام تو شاید آپ نے کہیں پڑھا یا سنا ہوگا؟"

"سریتا گنگولی...!" میں نے دھیرے سے یہ نام دہرایا اور پھر اچانک ہی چونک پڑا۔ سریتا گنگولی بہت اچھی افسانہ نگار تھی اور میں نے اس کے کئی افسانے مختلف رسائل اور جرائد میں پڑھے تھے۔ یہ یاد آتے ہی میں نے کہا۔ "ہاں ہاں، میں نے انہیں پڑھا ہے یہ تو بہت مشہور نام ہے۔"

"ہاں، وہی سریتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے کاغذ قلم کی دنیا سے نکل کر اپنے چھوٹے بھتیجوں اور پڑوس کے ننھے ننھے دوستوں کے ساتھ اس پارک میں آ جایا کرتی تھی۔" لڑکی نے سریتا گنگولی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "اور اکثر پارک کے اس دوسرے گوشے میں جہاں بچوں کے لیے جھولے وغیرہ لگائے گئے ہیں، وہیں جا کر بیٹھتی تھی۔ لیکن ایک دن وہ اپنے ننھے منے دوستوں کے بغیر اکیلی ہی یہاں چلی آئی تھی۔ اس روز سارے بچے اسکول کی طرف سے پکنک پر گئے تھے اور سریتا اپنی کسی نئی کہانی کا پلاٹ سوچتے سوچتے اس بنچ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔" یہاں تک کہہ کر لڑکی اچانک ہی چپ ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ بھول رہی ہے۔ جب اس کی خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے کہا۔ "آپ چپ کیوں ہو گئیں؟ سریتا جی کے ساتھ کیا ہوا تھا اس بنچ پر؟"

"اس بنچ پر بیٹھنے کے ذرا دیر بعد ہی سریتا کو لگا کہ آس پاس بہت ہی سناٹا ہے۔" لڑکی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "چونکہ اس روز سریتا اکیلی تھی اس لیے اُسے ڈر بھی لگنے لگا۔ اُس نے گھر چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ابھی وہ بنچ پر سے اٹھنے بھی نہیں پائی تھی کہ ایک نوجوان اچانک ہی پیچھے سے آیا اور بنچ پر اس کے برابر بیٹھ گیا اور پھر اُس کے چہرے کو دھیان سے دیکھتے ہوئے، دھیمے اور جذباتی لہجے میں بولا۔ 'میں جانتا ہوں، آپ وہ نہیں ہیں مگر پھر بھی آپ وہی ہیں۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ میں زندگی میں دوبارہ یہ چہرہ دیکھ سکوں گا۔'

"'یہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں؟ آپ کو شرم نہیں آتی ا

اجنبی لڑکی سے ایسی باتیں کرتے؟' سریتا نے غصے سے کہا اور جانے کے لیے اٹھ گئی۔"

"ذرا ایک منٹ۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اُس لڑکی کو آگے بڑھنے سے روک کر پوچھا۔ "کیا یہ وہی نوجوان تھا جو اس دن میری موجودگی میں اس بنچ پر آ کر بیٹھ گیا تھا؟"

"جی ہاں۔" لڑکی نے کہا۔ "یہ وہی نوجوان تھا۔"

"پھر کیا ہوا سریتا کے ساتھ؟" میں نے پوچھا۔

"سریتا کے اٹھتے ہی وہ نوجوان بھی تیزی سے اٹھا اور سریتا کے سامنے کھڑا ہو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ 'دیکھیے اگر میری کوئی بات آپ کو بری لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں تو بس تھوڑی دیر آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں... پلیز ابھی نہ جائیں! مجھ سے ڈریں مت۔ میں برا آدمی نہیں ہوں۔ پلیز، تھوڑی دیر بیٹھ جایئے۔'

"لیکن سریتا غصے میں بھری ہوئی تھی۔ اُس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھاتی، نوجوان جھپٹ کر سامنے آ گیا اور اس کا راستہ روک کر بولا۔ 'میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔' اتنا کہہ کر وہ ذرا آگے بڑھا تو سریتا کے مُنہ سے ایک ڈری سی چیخ نکل گئی۔

"اس کی چیخ سن کر آس پاس کے لوگ وہاں آ گئے۔ سریتا لوگوں کی اس بھیڑ کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ 'کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟' لوگوں نے پوچھنا شروع کیا لیکن سریتا کے جواب دینے سے پہلے ہی صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک رعب دار ادھیڑ عمر شخص لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ سریتا کے لیے بالکل ہی اجنبی تھا مگر سریتا کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ذرا دیر تک کچھ کہے بغیر سریتا کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نوجوان پر ایک نظر ڈال کر سریتا کو مخاطب کر کے بولا۔ 'بیٹی اگر اس لڑکے نے تم سے کچھ کہا ہے یا کوئی غلط حرکت کی ہے تو اسے معاف کر دینا...' ادھیڑ عمر شخص آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کا گلا رُندھ گیا اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ سریتا کو اس ادھیڑ عمر شخص پر ترس آنے لگا جبکہ وہ نوجوان ان سب باتوں سے لاتعلق بنا ایک طرف کھڑا سریتا کو ہی تکنے جا رہا تھا۔

"ذرا دیر بعد ادھیڑ عمر شخص نے خود کو سنبھال لیا اور اپنے آنسو پونچھ کر آس پاس کھڑے لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا۔ نہ جانے اس شخص کی آواز میں کیسا درد تھا کہ لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے ہٹتے چلے گئے۔ سریتا حیران حیران نظروں سے اس ادھیڑ عمر شخص کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"'بیٹی تمہیں ڈرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔' ادھیڑ عمر شخص سریتا کے نزدیک آ گیا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولا۔ 'میں تمہارے باپ کے برابر ہوں بیٹی۔ میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں۔'

"سریتا نے اس شخص کو بتایا کہ اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے لیکن وہ شخص اس کے ساتھ اس کے گھر تک جانے کے لیے بضد تھا۔ اس لیے مجبوراً سریتا کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔ جانے سے پہلے ادھیڑ عمر شخص نے اس نوجوان کو اشارے سے وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا۔ پھر سریتا کے ساتھ پارک سے باہر آ گیا، بولا۔ 'بیٹی، وہ سامنے میری کار کھڑی ہے۔ اگر تم چاہو تو ہم کار میں بھی جا سکتے ہیں۔'

"'نہیں انکل۔' سریتا نے کہا۔ 'بس، وہ سامنے ہی تو گھر ہے میرا۔ پیدل ہی چلتے ہیں۔'

"پھر چلتے چلتے ادھیڑ عمر شخص نے سریتا کو بتایا۔ 'اس لڑکے کا نام انیل ہے بیٹی... اور وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں اس کی طرف سے ایک بار پھر تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اصل میں اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'

"'ایسا کیا ہو گیا تھا انکل؟' سریتا نے پوچھا۔ 'کیا دماغ پر کوئی چوٹ وغیرہ لگی تھی؟'

"'چوٹ دماغ پر نہیں، دل پر لگی تھی بیٹی... جس نے اس کا

چیلنج

عدالت کے کٹہرے میں کھڑے، خوب تگڑے ملزم سے مخاطب ہو کر، جیوری کے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جج نے کہا۔ "انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے، مقدمے کی کارروائی سے پہلے، عدالت تم سے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ کیا تم جیوری کے کسی فرد کو چیلنج کرنا چاہتے ہو؟"

ملزم نے غور سے جیوری کی طرف دیکھا پھر زیر لب مسکراتا ہوا بولا۔ "آج کل میں فارم میں نہیں ہوں پھر بھی کونے میں بیٹھے ہوئے اس موٹے شخص کو چار راؤنڈز میں ناک آؤٹ کرنے کا چیلنج کرتا ہوں۔ اس کا جب اور جہاں جی چاہے، مقابلہ کر لے۔"

مرسلہ: احمد وسیم بلال، گوجرانوالہ

ذہنی توازن ہی بگاڑ دیا۔ بات یہ ہے بیٹی کہ تمہاری عمر کی اور لگ بھگ تم جیسی صورت شکل والی ایک لڑکی نرگس سے اسے محبت ہوگئی تھی۔ دونوں ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ مجھ سے ان کی محبت چھپی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے دو ایک بار اس لڑکی کو اس کے ساتھ دیکھا تھا اور وہ مجھے پسند بھی تھی۔ انیل چونکہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اس لیے میں اس کی محبت اور خوشی کے آگے دیوار بننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہ پہلے دل لگا کر اپنی تعلیم مکمل کرے۔' یہاں تک کہہ کر ان کی آواز بھرّا گئی اور وہ کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے آگے بولا۔ 'فائنل امتحان کے دنوں میں میں نے اس کو یہ بات بتادی کہ اگر وہ لڑکی بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے تو پھر پوری توجہ سے امتحان دو پھر میں اسی لڑکی سے تمہاری شادی کرادوں گا۔ میری اس بات پر وہ بہت خوش ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ دل لگا کر امتحان دے گا لیکن قدرت کو میری اور میرے بیٹے کی خوشی منظور نہیں تھی۔ ایک دن کالج آتے ہوئے وہ لڑکی ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہوگئی۔ اس کی موت کی خبر سن کر انیل پچھاڑیں کھانے لگا اور پھر اسے چپ سی لگ گئی۔ وہ ہر وقت خلا میں گھورتا رہتا۔ کئی دن تک تو وہ کھائے پیے بغیر' بے سدھ پڑا رہا تھا۔ کسی سے کچھ کہتا سنتا بھی نہیں تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ یکایک گھر سے نکل بھاگتا اور سیدھا اس پارک میں جا کر اسی بینچ پر بیٹھ جاتا جس پر وہ اور اس کی محبوبہ نرگس بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔'

"ذرا رک کر ادھیڑ عمر شخص نے ایک بار پھر اپنے آنسو پونچھے اور کہا۔ 'اُس بینچ پر آج تم اسے بیٹھی نظر آگئیں۔ پہلی نظر میں تو میں بھی تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ نرگس میں اور تم میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ شاید اسی لیے نرگس کے دھوکے میں انیل نے تمہیں تنگ کیا ہوگا۔ آج وہ اچانک ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کی ماں گھر میں اکیلی تھی اور کسی کام میں مصروف تھی۔ اس لیے اُسے پتا ہی نہیں چلا۔ جب میں گھر واپس آیا تو مجھے بتایا گیا کہ انیل بہت دیر سے گھر میں موجود نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پارک میں ہی ہوگا۔ پھر جب میں اسے ڈھونڈتا ہوا پارک میں داخل ہوا تو اس بینچ کے پاس لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ تو مجھے لگا کہ میرے انیل نے ہی کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہوگی۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور اب مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی اسے معاف کردیا ہوگا۔'"

"پھر کیا ہوا؟" وہ لڑکی یہ ساری بات بتا کر چپ ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا سریتا اس واقعے کے بعد بھی انیل سے ملی؟"

"ہاں۔" لڑکی نے کہا۔ "اس روز انیل کے ڈیڈی سریتا اس کے گھر کے باہر چھوڑ گئے تھے۔ لیکن دوسرے ہی روز انیل کی ممی کو ساتھ لے کر سریتا کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت دونوں کافی پریشان اور غم زدہ لگ رہے تھے۔ انیل کے ڈیڈی نے سریتا کے والدین کی موجودگی میں یہ کہا کہ انیل کا خوش رہنا بہت ضروری ہے۔ اگر اسے ذرا بھی دکھ پہنچا تو اس کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جائے گا اور اس کے مکمل پاگل ہو جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ کوئی بھی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کیا جائے اور اس کی خوشی کا پورا خیال رکھا جائے۔ کچھ عرصے تک وہ اسی نارمل حالت میں رہے اور اسے کوئی نیا صدمہ نہ پہنچا تو اس کا علاج آسان ہوسکتا ہے۔

"'اور اس کے لیے تم ہی ہماری مدد کرسکتی ہو بیٹی۔' انیل کی ممی نے سریتا کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ 'ایک ذرا سی قربانی دے کر تم ہمارے بیٹے کو خوش رکھ سکتی ہو۔'

"'یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی؟' سریتا گھبرا کر بولی۔ 'میں بھلا اسے کیسے خوش رکھ سکتی ہوں؟ میں ایسا کچھ نہیں کرسکتی۔'

"'سریتا ٹھیک کہتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں آپ کی کوئی نہیں کرسکتی۔' سریتا کی ماں نے کہا۔ 'اور ہم اس کی اجازت بھی نہیں دیں گے، کیونکہ چند ماہ بعد اس کی شادی ہونے والی ہے۔'

"'یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ سریتا ہماری بھی بیٹی ہے۔ ہم اس کے لیے دعا گو رہیں گے۔' انیل کے ڈیڈی روہانسے لہجے میں کہا۔ 'بس' ہماری اتنی سی درخواست ہے کہ سریتا کچھ روز تک پارک کی اس بینچ پر آ کر بیٹھ جایا کرے۔ مجھے یقین ہے کہ سریتا کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے لگے گا کہ وہ اپنی نرگس کے پاس بیٹھ کر اُس سے باتیں کر رہا ہے۔ اس طرح وہ خوش رہا کرے گا۔'

"سریتا کے گھر میں اس وقت اُس کا منگیتر مکیش بھی موجود تھا۔ وہ سریتا کو لے کر شاپنگ کے لیے جانے والا اس نے بھی یہ ساری.. باتیں خاموشی سے سنی تھیں۔ سے پہلے کہ سریتا انیل کے ڈیڈی ممی کو کوئی جواب دیتی مکیش نے انیل کے ڈیڈی سے کہا۔ 'انکل آپ بالکل دکھی ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو آپ کا انیل بہت جلد ہو جائے گا۔ سریتا پارک میں جا کر ضرور انیل کے پاس گی اور اس سے باتیں بھی کرے گی۔'"

"کیا...! یہ بات سریتا کے منگیتر نے کہی؟" میں

حیرت سے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کوئی ہونے والا شوہر اپنی ہونے والی بیوی کو کسی اجنبی... اور تقریباً پاگل نوجوان کے پاس تنہائی میں ملنے اور باتیں کرنے کی اجازت بھلا کیسے دے سکتا ہے؟ کیا سریتا نے اپنے منگیتر کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا؟"

"جی نہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "اس دن کے بعد سے سریتا روزانہ پارک میں جا کر انیل سے ملتی ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے؟" میں بولا۔ "مگر سریتا نے اس پاگل نوجوان پر بھروسا کیسے کرلیا۔ وہ تو کسی وقت بھی سریتا کو اپنی محبوبہ نرگس سمجھ کر کوئی زیادتی کرسکتا؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔" لڑکی نے بتایا۔ "پہلے روز انیل کے ڈیڈی' سریتا اور مکیش' تینوں پارک میں گئے تھے۔ سریتا اکیلی اس بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ انیل کے ڈیڈی اور مکیش بینچ سے ذرا دور ایک درخت کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد انیل بھی آگیا اس نے سریتا کو بینچ پر بیٹھے ہوئے دیکھا پھر اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ 'سوری' مجھے آنے میں ذرا دیر ہوگئی۔'

"اس کے بعد وہ سریتا کو نرگس سمجھ کر بڑبڑانے کے انداز میں کچھ بولتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خود سے گفتگو کر رہا ہو۔ پھر اچانک ذرا اونچی آواز میں بولا۔ 'مگر تم مجھ سے ناراض کیوں ہوجاتی ہو؟ اب دیکھو نا' کتنے دنوں کے بعد تم آج آئی ہو۔ تم جانتی ہو' میں تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟' سریتا نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھر بولا۔ 'تمہاری کوئی نشانی بھی تو میرے پاس نہیں ہے جسے دیکھ دیکھ کر میں اپنا جی بہلا لیا کروں۔ نہ ہی کوئی تصویر ہے۔ اگر تمہاری تصویر بھی ہوتی تو میں اس سے باتیں کر کے اپنا وقت گزار لیتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں روز روز یہاں آکر مجھ سے ملنے میں تکلیف ہوتی ہوگی۔ مگر میں کیا کروں؟ خیر آج تو تم مجھے اپنی کوئی نشانی دے ہی دو۔ میں تمہاری نشانی سے ہی باتیں کرلوں گا۔'

"لیکن اس وقت سریتا کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اسے نشانی کے طور پر دیتی۔ بس ہلکے گلابی رنگ کا ایک رومال اس کے ہاتھ میں تھا' وہی اس نے انیل کو دے دیا۔ رومال لے کر وہ بہت خوش ہوا اور بار بار رومال کو سونگھنے لگا۔"

لڑکی نے دھیرے دھیرے یہ سب باتیں مجھے بتائیں پھر آگے بولی۔ "انیل کی جذباتی کیفیت تو اب بھی باقی رہی ہے لیکن اب اس میں پہلے جیسی شدت نہیں ہے۔ اب اس میں بڑی حد تک سکون اور ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ اب اُس کے تمام تر جذبات اور توجہ کا مرکز رومال ہوگیا ہے۔ وہ اس رومال سے ہی محبت کرنے لگا ہے۔ اب اسے جو بھی ملتا ہے' اسے وہ کسی نہ کسی بہانے رومال ضرور دکھاتا ہے۔ آپ کو بھی وہ رومال دے رہا تھا۔ لیکن اگر آپ اُس سے وہ رومال اس سے لینا چاہتے تو وہ آپ کو کبھی نہ دیتا۔" لڑکی اتنا کہہ کر چپ ہوگئی۔

فلفل سیاہ

استاد: "ہم نے اپنے اعداد و شمار عربوں سے لیے، اپنی جنتری رومنوں سے لی اور اپنا بینکاری نظام اطالویوں سے لیا۔"

"زاہد! تم کوئی اور مثال دے سکتے ہو؟"

زاہد نے کہا: "جی ہاں، ہم نے استری رحمان صاحب سے لی اور جھاڑو مسز بیگ کے گھر سے لی۔"

مسعود الحسن کی تاک جھانک

"لیکن یہ کہانی تو ابھی ادھوری ہے۔" میں بولا۔ "آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ سریتا کب تک وہاں آتی رہی اور اس کا منگیتر مکیش کب تک یہ برداشت کرتا رہا؟"

"سریتا کا منگیتر بہت اچھا انسان ہے۔ اس کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑکتا ہے وہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔" لڑکی نے کہا۔ "سریتا نے اسے رومال دینے والی بات بتائی اور یہ کہا کہ اگر انیل کے پاس اس کی محبوبہ نرگس کی تصویر ہو تو وہ اس تصویر کے سہارے اپنے دن سکون سے گزار سکتا ہے مگر افسوس بے چارے کے پاس کوئی تصویر نہیں ہے۔ وہ جب ایک رومال ملنے سے اتنا خوش ہے تو پھر تصویر سے تو اس کی کیفیت ہی بدل جائے گی۔ سریتا کی بات سن کر مکیش کی آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی۔ اس نے فوراً ہی اس مسئلے کا حل نکال لیا۔"

"کیسا حل؟" میں نے پوچھا۔

"دوسرے دن جب سریتا' انیل کے ساتھ بیٹھی تھی تو مکیش گلے میں کیمرا اور کندھے پر بیگ لٹکائے اسٹریٹ فوٹو گرافر کے بھیس میں وہاں آگیا اور سریتا سے اجازت لے کر اس نے انیل کے ساتھ اس کی دو تین تصویریں اتاریں اور پھر دونوں کی الگ الگ تصاویر بھی بنائیں۔ اگلے دن اسی جگہ تصویریں دے جانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ دوسرے روز مکیش پھر فوٹو گرافر بن

کر وہاں آیا اور ساری رنگین تصاویر انیل کو دکھائیں اور سریتا سے پیسے لے کر چلا گیا۔ انیل وہ تصویریں دیکھ کر مارے خوشی کے اچھلنے لگا۔ سریتا کے چہرے میں اسے اپنی محبوبہ کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے اسے دنیا بھر کی دولت مل گئی ہو۔ سریتا نے جب اس کی خوشی کا یہ عالم دیکھا تو اس نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انیل سے کہا۔ 'دیکھو انیل' تم میری بات کا برا نہ ماننا اور نہ ہی مجھے غلط سمجھنا۔ میں ایک لڑکی ہوں اور گھر والوں سے چھپ چھپ کر میرا یہاں روزانہ آنا بہت مشکل ہے۔ ہاں ہفتے میں دو دن یعنی بدھ اور جمعرات کو ضرور آیا کروں گی۔'

''سریتا کی یہ بات سن کر انیل ذرا بھی ناراض نہیں ہوا۔ البتہ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی تھی۔ پھر اس نے انتہائی شکستہ سی آواز میں کہا۔ 'میں جانتا ہوں تم وہ نہیں ہو، مگر میں تو تمہیں نرگس سمجھ کر ہی ہنس بول لیتا ہوں۔ کیا کروں' دیوانہ جو ہوں! اور پھر تم ہو بہو نرگس ہی تو ہو... ذرا بھی تو فرق نہیں ہے۔' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں مگر پھر بھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ 'کوئی بات نہیں اب تو یہ تصویریں میرے پاس ہیں۔ میں انہیں نرگس کی تصویریں سمجھ کر آرام سے رہ لوں گا...''

''پھر کیا ہوا؟'' لڑکی کے خاموش ہوتے ہی میں اپنا تجسس کو نہ دبا سکا۔

''پھر یہ ہوا کہ انیل تو اس پارک میں روزانہ آتا ہے۔'' لڑکی نے مجھے بتایا۔ ''لیکن سریتا ہفتے میں دو ایک بار ہی آتی ہے۔ اُس کے ساتھ اس کا منگیتر مکیش بھی ہوتا ہے جو ذرا دور کسی جھاڑی یا درخت کی اوٹ میں بیٹھ جاتا ہے۔ سریتا بنچ پر بیٹھی رہتی ہے۔ انیل کی ذہنی کیفیت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اب اس کے دل و دماغ میں وہ پہلے جیسا ہیجان اور پاگل پن نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسے اب اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ اس کی محبوبہ اب ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ چکی ہے۔ اسی لیے اب وہ سریتا سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ مگر کبھی کبھی سریتا کے سامنے دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگتا ہے جیسے اپنی نرگس سے ہی باتیں کر رہا ہو۔ انیل کے ڈیڈی کا کہنا ہے کہ اس کا علاج ہو رہا ہے اور ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے کہ انیل جلد ہی اس کیفیت سے نکل آئے گا۔ اس کے ممی ڈیڈی سریتا اور مکیش کے بہت شکر گزار ہیں اور ان دونوں کے شاندار مستقبل کے لیے دعا گو ہیں۔''

''واقعی سریتا گنگولی صاحبہ اور ان کے منگیتر مکیش نے انیل کو اس کی نارمل زندگی کی طرف واپس لانے میں بڑی مدد کی ہے ورنہ آج کے دور میں کون کسی کے لیے ایسا کچھ کرتا ہے۔'' میں نے کہا اور پھر اچانک پوچھ بیٹھا۔ ''کیا میری سریتا گنگولی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اور... ایک بات اور ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ کو یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ کیا آپ کا سریتا جی سے کوئی قریبی تعلق ہے؟''

میری بات سن کر وہ لڑکی مسکرائی' ذرا دیر تک مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''آپ کے پہلے سوال کا جواب ہے کہ آپ سریتا گنگولی سے مل چکے ہیں... اور...''

''کیا؟'' میں حیرت سے بولا۔ ''میں سریتا گنگولی سے مل چکا ہوں؟''

''جی ہاں۔ ایک بار نہیں' دو بار۔'' وہ لڑکی ہنس کر بولی ''اب رہا آپ کا دوسرا سوال... کہ یہ سب باتیں مجھے کیسے معلوم ہوئیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں خود ہی سریتا ہوں... سریتا گنگولی۔''

''کیا؟'' مجھے ایک بار پھر شدید جھٹکا لگا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا' وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی' پارک کے گیٹ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''مکیش آ گئے۔ اب مجھے جانا چاہیے... گڈ بائی!'' اتنا کہہ کر وہ چل پڑی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

آج مجھے زندگی کا ایک بڑا ہی عجیب و غریب تجربہ ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر اس روز میں کہانی کا پلاٹ، سوچتے سوچتے پارک کی اس بنچ پر آ کر نہ بیٹھا ہوتا تو کیا زندگی کے ان جیتے جاگتے عظیم کرداروں کو کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھ پاتا؟ کیا میں مکیش اور سریتا گنگولی جیسے لوگوں کو کبھی بھول پاؤں گا جو صرف اپنے لیے ہی نہیں... بلکہ دوسروں کے لیے بھی جینے کا ہنر جانتے ہیں!

اس روز میں سریتا گنگولی سے اپنا تعارف نہیں کرا سکا تھا۔ یہ کہانی سریتا گنگولی کی آپ بیتی ہے... جو میں نے اس کی زبانی سنی تھی۔ لیکن اسے قلم بند میں کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جب سریتا یہ کہانی پڑھے گی تو اسے میرے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کی آپ بیتی کا انجانے میں میں بھی ایک کردار بن گیا تھا۔

جینئس

مامون الحق

جینیات کے ایک ماہر کی بے بسی کا عالم، وہ والدین سے بچوں کو منتقل ہونے والے
موروثی خواص کے حوالے سے انتہائی اہم کامیابی حاصل کر چکا تھا
قبل اس کے کہ اس کی تحقیق عوام میں دھوم مچاتی، ایک حقیقت ایسی سامنے
آئی کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

ڈاکٹر سالوے نے اپنا نیپکن نفاست سے تہہ کر کے، طرف رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی ہیلن اور اسسٹنٹ ل بہ دستور کھانے میں منہمک تھے۔

''ابھی مجھے گھنٹے دو گھنٹے مزید لگیں گے لیب میں۔'' یہ کہہ اکٹر کمرے سے چلا گیا۔

''یوں کہہ گئے ہیں جیسے کوئی نئی بات بتائی ہو۔ حالاں کہ دو گھنٹے ان کا روز کا معمول ہے۔'' ڈاکٹر کی بیوی نے کہا۔

اسسٹنٹ نے خالی الذہنی کے عالم میں لحہ بھر کو ہیلن کی ل دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب کچھ ناراض رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، مجھے واپسی کی تیاری کرنی ہے۔'' فرانسیسی اسسٹنٹ نے اپنی گلابی انگریزی میں کہا۔

ہیلن نے گھور کر مارسل کو دیکھا اور بولی۔ ''اب ایسا بھی نہیں ہے۔''

''مجھے تو کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' مارسل بولا۔ ''آج دوپہر بھی ہمارے درمیان خوب تکرار ہوئی۔ پچھلی تمام تکراروں کے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔''

''مارسل! تم اس کے ساتھ ذرا معاملہ فہمی سے کیوں نہیں کام لیتے۔''

''بات معاملہ فہمی کی نہیں... حقیقت پسندی کی ہے۔'' مارسل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ جس تھیوری پر تجربہ کر رہا ہے، اس پر سے تمہارا اعتماد اٹھ گیا۔''

''نہیں نہیں۔ یہ میرا مطلب نہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا اور سر کو بری طرح نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ان کی تھیوری زبردست ہے۔ ان کے نظریات سے مجھے کوئی اختلاف نہیں۔'' اپنی کمزور

انگلش کے سبب وہ بات سمجھانے کے لیے آنکھوں، چہرے کے عضلات اور ہاتھوں کی حرکت سے زیادہ سے زیادہ کام لیتا تھا۔

"حالاں کہ واپس جانا میرے لیے سودمند ثابت نہ ہوگا۔" اس نے بات جاری رکھی۔ "کل ڈاکٹر صاحب ایک سیمینار میں تقریر کر رہے تھے۔ اس میں انھوں نے اپنی تحقیق کے حوالے سے لوگوں کو بتایا جس کا عنوان تھا' اکتسابی صلاحیتوں کی موروثیت کا مشاہدہ... بہت عمدہ مقالہ تھا مگر ڈاکٹر کو اپنی بات کہنی نہیں آئی۔ وہ سمجھا ہی نہیں پائے اپنے سننے والوں کو۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ لوگ ان پر ہنس رہے تھے' مذاق اڑا رہے تھے۔" مارسل نے توقف کیا پھر بولا۔ "مگر ہمارے ڈاکٹر صاحب بے وقوف نہیں۔ اور وہ جو کام کر رہے ہیں وہ بھی بہت قابلِ قدر ہے۔ مگر وہ بہت... آپ کیا کہتی ہیں انھیں... خود غرض... بہت خود غرض ہیں۔ ضرورت سے زیادہ کوئی بات کسی کو معلوم ہی نہیں ہونے دیتے... تاکہ ہر بات کا کریڈٹ بھی صرف انھی کے حصے میں آئے۔"

ہیلن نے اس کی تردید نہیں کی۔ "تم یہی کہہ رہے تھے نا کہ ڈاکٹر نے اپنے نظریے کو عملی طور پر ثابت بھی کر دیا ہے۔"

"جی... لیکن یہ ثبوت ابتدائی ہیں۔ اگلا مرحلہ بڑے ثبوتوں کا ہے جو صرف بڑے پیمانے پر کیے گئے تجربات سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر کی باتوں پر کوئی کان نہیں دھرے گا۔ میں یہ باتیں انھیں بتاتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا بھی ہے کہ دوسروں کی طرح آپ بھی اپنے تجربات کے حوالے سے میڈیکل رسالے میں مضامین تحریر کریں' یونیورسٹی کو اپنے تجربات کی طرف متوجہ کریں۔ تب آپ کو، آپ کے تجربات کو اہمیت اور شہرت ملے گی۔ تبھی آپ کی بات سنی بھی جائے گی اور قبول بھی کی جائے گی۔" مارسل نے تاسف سے سر ہلایا۔ "مگر وہ میری بات نہیں سنتے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ چناں چہ میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔"

اس نے ایک بار پھر ہیلن کا جائزہ لیا' بولا۔ "آج میں نے ان سے کہا کہ آپ کی دریافت میں، تحقیق میں میرا بھی حصہ ہے' میری بھی محنت ہے۔ یہ معاملہ ہے ہی اتنا اہم۔ بس اس بات پر ذرا زیادہ تلخی ہو گئی۔ چناں چہ اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنا بوریا بستر لپیٹ لینا چاہیے۔"

"چچ چچ چچ!" ہیلن نے تاسف کا اظہار کیا پھر بولی۔ "میرا خیال ہے کہ کل تک اس کا غصہ اتر جائے گا۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ اب کے ایسا ہو۔ آپ کے شوہر بہت بڑے آدمی... مگر بہت چھوٹے انسان ہیں۔ بہ ہر حال..." نے کندھے جھٹکے "میرا خیال ہے، اس موضوع پر بہت ہوگئی۔ اب اَور کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ دنیا میں ا دل چسپ موضوعات ہیں جن پر ہمیں گفتگو کرنی چاہیے۔" نے بہت ہی نرم... لوچ دار آواز میں کہا۔

◆

ڈاکٹر سالوے کے گھنٹے دو گھنٹے ہمیشہ کی طرح کم و بیش گھنٹوں پر محیط ہوئے۔ وہ تجربہ گاہ سے نکلا تو بارہ سے ا وقت تھا۔ اس کی بیوی خواب گاہ میں بستر پر دراز' کسی کتا مطالعہ کر رہی تھی۔

"بچے ٹھیک ہیں؟" ڈاکٹر نے جوتے اتارتے ہو پوچھا۔ "میں نے ابھی آتے ہوئے کھانسی کی آواز سنی تھ شاید ڈیوڈ کھانسا تھا۔"

"ہاں، اسے ذرا کھانسی ہے۔ دوا دے دی ہے۔" نے جواب دیا۔ پھر ہم دردی سے بولی۔ "سالوے، تم تھک جاتے ہو۔ مت کرو اتنی محنت! اپنا بھی خیال رکھو۔"

"ہاں، تھکن تو محسوس کر رہا ہوں۔" سالوے نے انگ لیتے ہوئے اعتراف کیا۔ "کام بھی بس ختم ہونے کی طرف رہا ہے۔ اہم حصہ تو سمجھو ہو گیا۔ اب تو بس نتائج کو چیک کر اور کراس چیک کرنے کا مرحلہ باقی ہے تاکہ کسی ناقد کو تنقید یا تنق کا کوئی پہلو نہ ملے۔ اس مرحلے پر مجھے ایک ایسا ثبوت درکار خامی سے مبرّا اور غیر متنازع ہو... ایسا جسے نظر انداز نہ کیا جا اس کے لہجے میں دبا دبا جوش اور ولولہ تھا۔

"مگر تمھارے پاس تو اپنی تھیوری کے کئی ثبوت ہیں!"

"کئی نہیں... کافی۔ بہت کافی ثبوت ہیں۔ مگر یہ ا لیے ہیں جو بات معقولیت سے سنتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کے نہیں جو دوسروں کی ٹانگ کھینچنے کے درپے رہتے ہیں۔ ا دکھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ انھیں یہ چیز ہضم نہیں ہوتی کہ بڑا کوئی کام کسی اَور نے کیوں کر لیا... وہ کیوں نہیں کر سکے ڈاکٹر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں نے کئی مرتبہ ان موٹی عقل والو سمجھایا کہ میں انسان کی اکتسابی عادتوں پر نہیں... ا اہلیتوں کی موروثیت پر تجربہ کر رہا ہوں، جو اولی الذکر سے مختلف چیز ہے... یہ سمجھنے کے لیے انھیں اتنی ہی فہم درکا جتنی تجربہ کرنے والے کے پاس ہے۔"

"حالاں کہ تمھاری وضاحت میری سمجھ میں بالکل آ سے آ گئی۔ دونوں چیزوں میں بہت واضح فرق ہے۔"

"مگر ان غبیوں میں تمھارے جتنی عقل بھی نہیں۔" ڈاکٹر نے رواروی میں کہا۔ "انھیں تو بس کیڑے نکالنے آتے ہیں۔ حالاں کہ جیسا کہ تم نے کہا، اس میں بہت فرق ہے... زمین اور آسمان کا۔ سامنے کی بات ہے کہ اگر آپ کسی چوہے کا اگلا سیدھا پاؤں کاٹ دیں اور یہ سلسلہ اس کی کئی نسلوں تک جاری رہیں... مثلاً دس بیس یا پچاس نسلوں تک اس چوہے کے ہر بچے اور بچے کے بچوں کا اگلا سیدھا پاؤں کاٹتے رہیں... تو بھی کبھی یہ نہیں ہوگا کہ اس کی آئندہ نسل بغیر اگلے سیدھے پاؤں کے پیدا ہونے لگے۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس بات کا موازنہ تم یوں کرو، کوئی ایسا پرندہ جو بہت ہی خاص قسم کا گھونسلا بنا کر رہتا ہے' اس کے آباؤ اجداد میں سے کسی کو صدیوں پہلے کبھی نہ کبھی تو یہ ہنر ودیعت کیا گیا ہوگا۔

"اب سوال یہ ہے کہ جب جان داروں کی بعض اقسام ایسا کچھ کر سکتی ہیں تو دوسری اقسام یہ سب کیوں نہیں کر سکتیں؟ کیا یہ عجیب نہیں لگتا کہ مکڑی جیسا چھوٹا... حقیر سا جان دار تو اپنا پیچیدہ جال بننے کی فنکارانہ صلاحیت من و عن اپنی نسل میں آگے منتقل کرتا رہتا ہے... مگر آدمی اپنے بیٹے کو محض... ریاضی میں مہارت بھی آگے منتقل کرنے پر قادر نہیں۔ لیکن میں یہ ستم تسلیم نہیں کرتا۔ یقیناً کوئی ایسا طریقہ ہوگا جسے اختیار کر کے... دریافت کر کے انسان بھی اپنی حیران کن صلاحیتیں اور تجربات اپنی نسل کو منتقل کر سکے۔ مجھے اپنے اس نظریے پر پورا یقین ہے اور اس طریقے کی فوری دریافت بے حد ضروری ہے۔ ورنہ بنی نوعِ انسان کے نقصان میں روز بہ روز' مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ انسانوں کا کوئی کمال محفوظ رہتا ہے نہ اگلی نسل میں پہنچ کر اس میں کوئی ترقی... کوئی اضافہ ہو پاتا ہے! ہر بچے کو سب کچھ وہیں سے شروع کرنا پڑتا ہے جہاں سے اس سے پہلے اس کے والدین یا والدین کے والدین نے کیا تھا۔ نسل در نسل ہم انسان یہی کرتے آ رہے ہیں... ہم میں سے ہر ایک پہلے اے بی سی، دو، چار' سی اے ٹی کیٹ اور بی اے ٹی بیٹ پڑھتا ہے... ل اسی طرح جیسے اس سے قبل یہ کسی نے نہ پڑھا ہو... کچھ نہ کھا ہو۔ کیسی مضحکہ خیز صورت حال ہے یہ! حالاں کہ یہ بات لکھنا، پڑھنا، ڈرائنگ کرنا اور اس جیسی دیگر آسان چیزیں اپنی نسل کو آگے منتقل کرنا، اس کام کے مقابلے میں کتنا آسان جو کام شہد کی مکھی اپنے چھتے کی نہایت پیچیدہ سماجی زندگی گزارنے کی خاصیتیں آگے منتقل کر کے کرتی ہے۔ میں نے ل سے ثابت کیا ہے کہ اس کا یقیناً کوئی سبب ہوگا کہ آخر وہ وجہ کیا ہے کہ جان داروں کی بعض اقسام میں اپنی اکتسابی عادتیں آگے بڑھانے کی صلاحیت بے حد توانا ہوتی ہے... جو ممکن ہے کسی مرحلے پر جا کر جمود کا شکار ہو جاتی ہو... جب کہ بعض اقسام میں یہ صلاحیتیں عملاً مفقود ہوتی ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟" یکایک ڈاکٹر کو خیال آیا کہ وہ محققین اور ناقدین کے کسی مجمع کے سامنے نہیں بلکہ اپنی بیوی کے روبرو اپنی ادق تحقیق کا ماحصل بیان کر رہا ہے۔

"ہاں... میرا خیال ہے، میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ یہاں یہ پوچھنا بے جا نہ ہوگا کہ بعض اقسام کی مخلوقات کی جبلت اتنی پیچیدہ کیوں ہوتی ہے... اور بقیہ کی اتنی سادہ کیوں؟"

"جبلت!" ڈاکٹر نے ہیلن کا استعمال کردہ لفظ دہرایا۔ "لفظ جبلت میں مفاہیم کا خزانہ پوشیدہ ہے... درحقیقت تم نے جو سوال کیا، اسی کا جواب جاننے کے لیے میں یہ تحقیق کر رہا ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اب تک اس کا جواب نہیں پا سکا... لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اس کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ تاہم اس تحقیق کے دوران کچھ اور بھی میرے سامنے آیا۔ میں نتائج ظہور میں لانے کے ذرائع تک تو پہنچ گیا... مگر وجوہات جاننے سے اب تک قاصر ہوں۔" ڈاکٹر نے کام یابی اور ناکامی کا ملا جلا اظہار کیا۔ "اب میں اس مرحلے تک پہنچ گیا ہوں کہ ثابت کر سکوں کہ جو کچھ اب تک کہتا رہا ہوں' وہ درست ہے۔"

"کیا درست ہے؟" ہیلن نے بے اختیار پوچھا۔ ڈاکٹر کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی بہت اہم... غیر معمولی بات بتانے والا ہے۔

"یہ کہ میملز... یعنی دودھ پلانے والے جان دار بھی اپنی کوئی صلاحیت، اپنی آئندہ نسل کو منتقل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں! میں اس کے درجنوں تجربے کر چکا ہوں۔"

"ہم... میں ٹھیک سے سمجھی نہیں۔ تم اسے کیسے ثابت کرو گے؟"

"دیکھو، اس کا سب سے آسان ذریعہ تو چوہے ہیں۔ میں نے ایک کھلونا نما چھوٹی بھول بھلیاں تیار کی اور ایک چوہے اور چوہیا کو اس میں چھوڑ دیا۔ بھول بھلیاں کے آخری سرے پر پنیر وغیرہ رکھ دیا۔ چوہے اور چوہیا کو اس پنیر تک پہنچنے کے لیے اپنا راستہ تلاش کرنا تھا۔ ابتدا میں میں نے ان کے لیے آسان بھول بھلیاں بنائی جو بہ تدریج مشکل بناتا گیا۔ جوں ہی چوہا اور چوہیا ایک بھول بھلیاں کے عادی ہو جاتے اور اپنی غذا تک کوئی ایک موڑ بھی غلط مڑے بغیر پہنچ جاتے، میں بھول

بھلیاں تبدیل کر دیتا... اور اگلی بار ذرا مشکل! پھر میں نے ان کا کچھ علاج کیا اور دونوں کا جوڑا لگا دیا۔

''جب ان کے بچے چند ہفتوں کے ہو گئے تو میں نے انھیں کچھ وقت بھوکا رکھا اور پھر انھیں باری باری اس بھول بھلیاں کے داخلی راستے پر رکھ دیا جس کے دوسرے سرے پر خوراک تھی... اور اسی بھول بھلیاں میں ان کے والدین بغیر کوئی غلط موڑ مڑے، پہلے ہی اپنی غذا تک کام یابی سے پہنچنے کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے...'' ڈاکٹر نے خوشی سے معمور آواز میں کہا۔ ''کہ وہ بچے باری باری، پہلی ہی مرتبہ میں ایک بھی غلط موڑ مڑے بغیر براہِ راست غذا تک پہنچ گئے۔ لگتا تھا وہ راستے سے بہ خوبی آگاہ ہیں... حالاں کہ وہ پہلی بار اس بھول بھلیاں میں چھوڑے گئے تھے۔

''پھر میں نے ان بچوں کے ذرا اور بڑا ہونے پر نر اور مادہ کا جوڑا لگایا۔ ان سے جو بچے ہوئے، وہ بھی بھول بھلیاں میں چھوڑے جانے پر پہلی بار میں ہی اپنی غذا تک پہنچ گئے... کوئی ایک موڑ بھی غلط مڑے بغیر! تم جانتی ہو، اس کا کیا مطلب ہے؟''

ہیلن نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال داغا۔ ''تم نے کہا... کہ تم نے پہلے والے چوہے اور چوہیا کا علاج کیا تھا۔ یہ علاج کیا تھا؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تفصیلات تمھارے سر کے اوپر سے گزر جائیں گی اور ویسے بھی فی الحال یہ راز، راز ہی رہے تو اچھا ہے۔ اور تمھیں معلوم ہے جو بات راز رکھنی ہو وہ ہر ایک سے راز رکھنی چاہیے۔ تاہم یہ بتا سکتا ہوں کہ اس کا طریقِ کار بہت آسان ہے۔ اس کا براہِ راست انجکشن بھی لگایا جا سکتا ہے اور اسے غذا کے ذریعے بھی دیا جا سکتا ہے۔

''اگر اسے کسی انسان پر استعمال کیا جائے تو اس شخص کی اولاد کو دوسرے بچوں کی طرح سب کچھ شروع سے نہیں سیکھنا پڑے گا۔ وہ پیدائشی طور پر گزشتہ نسل کی اہلیت اور اوصاف سے متصف ہوگا۔ ذرا کسی ایسے بچے کی پیدائشی اہلیت کا اندازہ تو لگاؤ! اسے کتنی چیزوں پر وقت ضائع نہیں کرنا پڑے گا۔ چار برسوں پر محیط ابتدائی تربیت و معلومات کے حصول میں اسے سر نہیں کھپانا پڑے گا۔ یہ سب کچھ پہلے ہی سے اس کے اندر محفوظ ہوگا۔ وہ پیدا ہوتے ہی پڑھنے پر قادر ہوگا... یا زیادہ سے زیادہ اس وقت جب اسے اپنی آنکھوں کے استعمال پر قدرت حاصل ہو جائے گی۔ زبان پر قابو پاتے ہی وہ بولنا شروع کر دے گا... اور گننا بھی۔ ذرا سوچو، جب وہ پیدائشی طور پر اتنی منازل طے کر چکا ہوگا تو بڑا ہو کر کہاں تک پرواز کرے گا! ابتدائی چند برس میں ہی وہ اسکول سے فارغ ہو جائے گا۔ نو یا دس برس کی عمر تک یونیورسٹی سے نمٹ جائے گا۔ وہ... وہ عجوبہ بچہ ہوگا... عجوبہ! ایسے کسی بچے کی موجودگی کی صورت میں، اکتسابی اہلیت کی موروثیت کے تبادلے کے حوالے سے تمام شکوک و شبہات دھل جائیں گے۔''

اس نے ذرا توقف کیا پھر اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ بھی منہ کھولے اسی کی طرف نگراں تھی۔

ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ قبل از وقت کہنا مشکل ہے کہ کتنی معلومات اگلی نسل میں منتقل ہوں گی۔ اس حقیقت کا پتا لگانا چند دل چسپ حقائق میں سے ایک ہے۔ اور یہ کہ خوابیدہ صلاحیتوں کی شکل میں منتقل ہونے والی اہلیتیں اس سے اگلی نسل کو منتقل ہوں گی یا نہیں، اس بارے میں میں پُر یقین نہیں لیکن یہ آگے منتقل ہو بھی سکتی ہیں۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ خود کو اوسط تعلیم کی حد تک ہی صلاحیتوں سے ہی متصف پائے موروثی طور پر...''

''ہاں، واقعی!'' ہیلن بالکل اچانک بولی۔ ''اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص سگریٹ یا شراب کا عادی پیدا ہو... یا کسی خاص سیاسی نظریات کا حامل!''

ڈاکٹر سالوے پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔

''کیوں، ایسا نہیں ہو سکتا؟'' ہیلن نے پوچھا۔ ''کیا تمھارے پاس ایسا کوئی طریقہ ہے کہ تم اس کا انتخاب کر سکو کہ کیا چیز آگے منتقل ہونی چاہیے اور کیا نہیں؟''

ڈاکٹر اسے گھور کر رہ گیا۔ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''اس میں واقعی احتیاط کی ضرورت ہے۔'' اس نے تسلیم کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر زیرِ علاج شخص اپنی خواہش کے مطابق صلاحیتیں ہی آگے منتقل کرنی چاہے اور... جیسا کہ میں نے کہا کہ ایسا خوابیدہ صلاحیتوں کی صورت میں...''

''تمھارا خیال ہے!'' ہیلن نے اس کی بات کاٹ کر طنزیہ انداز میں اس کی بات دہرائی۔ ''سالوے، تم نے اس موروثیت کے تجربے سے متعلق آج تک ایک لفظ بھی غیر ضروری طور پر کسی سے نہیں کہا۔ اور اب... اب میں اپنے ذہن میں کچھ سوال محسوس کر رہی ہوں... اور ان کا جواب 'نہیں' ملتا ہے! بالکل، کلی اور قطعی طور پر 'نہیں'!''

ڈاکٹر سالوے ایک بار پھر پلکیں جھپک کر رہ گیا۔

''مم... مائی ڈیئر! میں سمجھا نہیں، تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''بنومت سالوے! تمھارا کیا خیال ہے کہ اتنے برس تمھارے ساتھ رہ کر میں نے جھک مارا ہے اور تمھیں بالکل نہیں سمجھتی ہوں؟ میں تمھیں اور تمھاری تحقیق کو خوب سمجھ رہی ہوں۔ بہت گھناؤنی اور دہشت ناک بات ہے میرے نزدیک۔ کوئی بھی شخص جو اپنی بیوی کا احترام کرتا ہو، اس بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ تمھیں ایسا سوچتے ہوئے خود پر شرم نہیں آئی!''

''مم... مگر مائی ڈیئر! ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میں تو صرف یہ...''

''تم نے ابھی نہیں کہا... مگر مزید پانچ دس منٹ کے بعد گھما پھرا کر کہتے... لیکن کہتے ضرور۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسی کریہہ اور مایوس کن بات نہیں سنی۔ تم مجھ پر... اپنی بیوی کو، معمولی کیڑے مکوڑوں اور چوہوں کی حیثیت دے کر، اس پر تجربہ کرنا چاہ رہے ہو! میرا خیال ہے کہ اب مجھے بھی تمھاری لیبارٹری میں کسی پنجرے میں بند ہو کر رہنا چاہیے، دوسری قابلِ تجربہ اشیا کی طرح! افسوس کی بات ہے!''

''دیکھو ہیلن...! اسے اتنی سنجیدگی سے مت لو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں واقعی تم سے یہ سب کہنے والا تھا۔ دنیا میں شہرت... غیر معمولی شہرت اور عزت کے لیے غیر معمولی قدم ہی اٹھانے پڑتے ہیں۔ اور اس شہرت اور عزت میں تم بھی میری برابر کی حصے دار ہوگی۔ اور ایسا صرف میری... ڈاکٹر سالوے کی بیوی ہونے کی وجہ سے نہیں ہوگا بلکہ... اس غیر معمولی نوعیت کے بچے کی ماں ہونے کی وجہ سے ہوگا! میرا خیال ہے کہ اس کے لیے اگر جینئس کا لفظ استعمال کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ مم... میرا خیال ہے...''

''خوب!'' ہیلن زہر خند سے بولی۔ ''اگر تم اب تک نہیں جانتے تو اب جان لو کہ میں اس بارے میں کیا سوچتی ہوں۔ یہ نہایت نفرت انگیز اور گھناؤنا... اور شرم ناک خیال ہے۔ آج شام ہی مارسل نے مجھے بتایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ اور اب تمھاری سوچ سے آگاہ ہونے کے بعد میرا خیال ہے کہ وہ لوگ غلط نہیں کہتے۔''

''یہ مارسل نے کہا؟'' سالوے نے ہیلن کو گھورا۔

''مارسل ان سے متفق نہیں۔ وہ تمھارے تجربات سے متاثر ہے۔ وہ تو تمھیں عظیم آدمی قرار دیتا ہے۔ لیکن تمھارا یہ آئیڈیا سُن کر وہ تمھارے بارے میں کیا خیال کرے گا، مجھے نہیں معلوم۔''

''یہ آئیڈیا جیسا بھی ہو... لیکن جب تک تم اسے نہیں بتاؤ گی، اسے معلوم نہیں ہو سکتا۔ بات صرف ہمارے درمیان ہے۔''

''یقیناً ہمارے ہی درمیان ہوئی ہے۔ لیکن ذرا تم بتاؤ گے کہ اگر تم کسی سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو، اس کی عزت و احترام کے محافظ ہو اور پھر اچانک اسے اپنی تجربہ گاہ کے جانوروں کی حیثیت دے کر، اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک شروع کر دو، تو اس کی کیا حالت ہوگی... کیا ردِّ عمل ہوگا؟''

ازدواجیات

شوہر: مجھے لگتا ہے کہ ہمارے ذہین بچے نے دماغ میرا پایا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟

بیوی: مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے، کیوں کہ میرا اپنا دماغ تو میرے ہی پاس ہے۔

😂...😂...😂

''تمھاری پہلی شادی کے اختتام کی وجہ؟''

''شریکِ حیات کی وفات۔''

''کس شریکِ حیات کی؟''

تعاون ✿ ڈاکٹر احمد نصیر

''مم... میں یہ نہیں کہہ رہا تھا۔ میں مارسل کے علم میں آنے کی بات کر رہا تھا... میرا مطلب ہے، اس کے علم میں نہ آنے کا کہہ رہا تھا۔ نہ جانے وہ... بہ ہر حال۔ دیکھو، ہیلن! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بات تمھیں اتنا اپ سیٹ کر دے گی۔ میرا خیال تھا کہ دنیا میں تہلکہ مچا دینے والی اس دریافت میں حصے دار بننے کا موقع ملنے پر تم... خیر... معاملہ اس طرح نہیں جیسے تم اسے دیکھ رہی ہو۔''

''ہاں ہاں، یہ ایسا نہیں بلکہ...''

''ہاں، ہاں۔ تم کہہ چکی ہو نا۔ میں تمھارا نکتۂ نظر سمجھ گیا۔ میں اپنا تجربہ جاری رکھوں گا۔ تم اس میں حصہ نہیں لینا چاہتیں تو نہ سہی۔ اب مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔''

''کہنے کو ابھی بہت کچھ ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ...''

''مائی ڈیئر! میں تمھیں کہہ چکا ہوں کہ میرا مقصد تمھیں اپ سیٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔'' ڈاکٹر نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں تم سے واقعی شرمندہ ہوں۔ میں نے تمھارے حوالے سے سوچ کر غلطی کی تھی۔ اب ہمیں اس غلطی کو بھول جانا چاہیے، کیا خیال ہے؟''

''سمجھ میں نہیں آتا۔'' ہیلن بولی۔ ''یہ غلطی تم سے ہونی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اسے بھلانا آسان نہیں ہے میرے لیے۔ مگر تم کیوں کہ ایک مرد ہو نا... اس لیے تم سمجھ ہی نہیں سکتے

میرے جذبات۔ اگر تم عورت ہوتے...“

”اگر میں عورت ہوتا۔“ ڈاکٹر کے بولنے پر ایک بار پھر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ”تو ایسا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اور نہ ہی ہم دونوں ساتھ ہوتے۔“

”مجھے بولنے دو۔ بہ ہر حال، پھر بھی...“

”بس تم سمجھو کہ میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔“

”میں... پوری کوشش کروں گی۔“

کچھ دیر بعد جب ڈاکٹر بیڈ پر لیٹا تو ہیلن بولی۔ ”مارسل کا خیال ہے کہ تم اسے نکالنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔“

”مارسل کا خیال بالکل درست ہے۔“

”میرا خیال ہے، مارسل ان تمام لوگوں سے بہت بہتر ہے جنھیں تم آج تک اپنا اسسٹنٹ رکھتے رہے ہو۔ تم ذرا سی بحث کرنے پر اس سے ناراض ہو گئے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ میں نے مارسل کو اپنی مدد کے لیے ملازم رکھا ہے... نہ کہ اس لیے کہ وہ مجھے ہدایات دے۔ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارے درمیان بنیادی پالیسی پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس صورت میں ہمارا مزید آگے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ اگر اس نے یہ اختلاف دور نہ کیا تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ مہینے کے آخر تک اپنا بوریا بستر باندھ لے۔“

”دکھ کی بات ہے۔ تمھیں اس کے کام سے تو کوئی شکایت نہیں ہے نا؟“

”بالکل نہیں۔ وہ بہت سمجھ دار آدمی ہے۔ اور وہ بہت کام کا ثابت ہو سکتا ہے... اگر بنیادی پالیسی کے معاملات میں مداخلت کیے بغیر، اپنے کام سے کام رکھے۔ مگر اب میں اسے مزید نہیں رکھ سکتا... کیوں کہ وہ باز آنے والا نہیں۔“

* * *

میعاد ختم ہونے پر مارسل واپس چلا گیا۔ وہ اپنے وطن لوٹتے ہوئے بہت خوش تھا۔ کیوں کہ اسے انگریزی بولنے، سننے، سمجھنے اور پڑھنے سے نجات مل رہی تھی۔ اسے اس زبان میں اظہار رائے کرنے اور سمجھنے میں بے حد دقّت پیش آتی تھی۔ پھر اسے یہاں کا موسم بھی سخت ناپسند تھا۔ اور چائے اور کھانے بھی۔ پھر بھی نہ جانے وہ یہاں کیسے رہ رہا تھا۔

کھانوں کی تو اُس نے باقاعدہ شکایت کی تھی ہیلن سے۔ اُس کی اس بات سے ہیلن بھی متفق تھی کہ کھانوں میں ان دنوں وہ ذائقے نہیں رہ گئے تھے جو اَب سے کچھ عرصے پہلے تک تھے۔ ایسا شاید نئی کک کے آنے کے بعد سے ہُوا تھا۔ پچھلا کک اچانک ملازمت چھوڑ گیا تھا تب ڈاکٹر سالوے نے بڑی کوششوں کے بعد یہ نئی کک تلاش کی تھی۔ اس دوران میں جتنے دن انھوں نے بغیر کک کے گزارے، وہ خاصے مشکل ثابت ہوئے تھے۔

مارسل کی کہی ہوئی یہ باتیں ہیلن نے ڈاکٹر سالوے کو بتائی نہیں بس جو آخری دن اس سے ہوئی تھیں۔

”میں تو اسے ناشکرا پن کہوں گا۔“ ڈاکٹر سالوے نے منہ بنا کر کہا۔ ”اسے بیٹھے بٹھائے اچھا کھانے کو مل رہا تھا نا، اس لیے بہت نخرے ہو گئے تھے۔ گھٹیا فرانسیسی کھانے کھانے والوں کے منہ سے تو یہ بات بھی نازیبا لگتی ہے۔“

”کھانوں میں بے لذتی تو میں بھی محسوس کر رہی ہوں سالوے۔“ ہیلن بولی۔ ”ابتدا میں تو اس نے بہت اچھے کھانے پکائے... شاید ہمیں متاثر کر کے اپنی نوکری پکی کرنے کے لیے۔ مگر اب... بہ ہر حال، میں خود جائزہ لوں گی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ ڈاکٹر سالوے نے شدت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ضرورت نہیں اس سے کچھ کہنے سننے کی۔ مجھے تو اس کے کھانوں میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔“

”پھر بھی روک ٹوک اور سرزنش ضروری ہوتی ہے۔ میں بات کروں گی۔“

”میں نے کہا نا“ تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ تمھیں پتا ہے کتنی مشکل سے کک کا انتظام ہُوا ہے۔ تمھاری باتوں سے کہیں وہ چھوڑ کر نہ چلی جائے۔ اچھے کک مشکل سے ملتے ہیں۔“

”سالوے، یہ میرا شعبہ ہے۔ تم اس میں مداخلت نہ کرو تو اچھا ہے۔“

”بالکل یہ تمھارا شعبہ ہے۔ بس یہ ذہن میں رکھو کہ یہ لوگ بہت حساس اور زود رنج ہوتے ہیں۔“

* * *

اس بات کے کوئی ہفتہ بھر بعد ہیلن کو علم ہوا کہ وہ اُمید سے ہے۔ ایک صبح وہ سو کر اٹھی تو ایک عجیب لرزا دینے والا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس خیال کے آنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ علی الصباح کا وقت تھا اور اس کی آنکھ ابھی کھلی ہی تھی مگر یہ خیال کچھ اس طور اس کے ذہن میں راسخ ہُوا کہ اس نیم خوابیدہ ذہن سے خوابیدگی لمحوں میں کافور ہو گئی۔ لگتا تھا قدرت نے اس کے ذہن میں یہ سوچ ڈالی ہے۔ اپنی انکشافی کیفیت پر وہ خود بھی حیران تھی۔ پھر جوں جوں وہ اس پر غور کرتی گئی، اسے یقین ہوتا چلا گیا کہ یہ محض خیال نہیں، قدرت کی طرف سے اس کی رہنمائی ہے۔ پہلے تو اس نے خود کو خوف زدہ کی کیفیت میں پایا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ خوف اشتعال میں ڈھل گیا۔ اس اشتعال کے عالم میں وہ پلٹی اور برابر میں سوتے شوہر کو بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔

”دھوکے باز... گھٹیا آدمی!“ غصے کی شدت سے اسے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ ”میں اتنی گری ہوئی حرکت کے متعلق سوچ نہیں سکتی تھی!“

ڈاکٹر ہڑبڑا کر جاگا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بیوی کے غصے نے اس کا خمار دُور کر دیا۔ وہ بھی ہیلن کو گھورنے لگا، بولا۔ ”تم ہوش میں تو ہو! یہ طریقہ ہے کسی سوتے ہوئے آدمی کو جگانے کا۔“

”میں ہوش میں...؟ خوب! میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم اس کی تردید کر دو گے۔“

”تردید! کس کی تردید؟“ ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔

”اچھا! تو اب یہ بھی مجھے بتانا ہوگا! دیکھو، تم یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اور تم نے جھوٹ کا سہارا لیا نا تو مجھے فوراً معلوم ہو جائے گا۔“

”خدا کے لیے! کچھ بتاؤ تو سہی، ہُوا کیا ہے؟“

”تمھیں سب پتا ہے۔ کھانوں کے معاملے میں کک کا کوئی قصور نہیں، وہ بالکل صحیح کھانے پکا رہی ہے۔ تم کچھ کاری گری دکھا رہے ہو کھانوں کے ساتھ... ’علاج‘ کے نام پر۔ تم اپنی سفلہ خواہشات پوری کرنے کے لیے اس حد تک گر جاؤ گے، اتنی کمینگی پر اتر آؤ گے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تمھیں پتا تھا کہ میں تمھاری تحقیق کے بارے میں کیا سوچتی ہوں۔ میرے شور مچانے کے بعد تم نے یہ ذلالت اختیار کی۔ تم نے میری مرضی کے خلاف میرا استعمال جاری رکھا۔ علاج کے نام پر تم جانے کیا کیا مجھے کھلاتے رہے اور کھانوں کے بدمزہ ہونے کا الزام بے چاری کک پر لگتا رہا۔“

”مم... میں نے کبھی اسے الزام نہیں دیا۔ میں نے کہا تھا...“

”مجھے تمھاری کوئی بات نہیں سننی۔ تمھاری مجال کیسے ہوئی وحشیانہ تجربات کے لیے مجھے استعمال کرنے کی!! اوہ... شدت سے اپنے بے حیثیت ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔“

ڈاکٹر سالوے بولا تو اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ اس نے صورت حال ٹھنڈا کرنے کے لیے منافقت سے کام لیا۔ ”ٹھیک ہے، میں اعتراف کرتا ہوں، میں نے غلط کیا۔ لیکن ایسا صرف تمھارے ساتھ نہیں کیا، اپنے ساتھ بھی کیا۔ اسے وحشیانہ حرکت کہنا محض جذباتیت ہے۔ یہ انتہائی اہم نوعیت کا تجربہ ہے۔ اس کے نتائج بنی نوع انسان کو ایک ہی جست میں کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے۔“

”مجھے کسی جست سے کوئی غرض نہیں۔“ ہیلن کے غصے میں بالکل کمی نہیں آئی تھی۔ ”مجھے صرف خود سے اور اپنے بچے سے غرض ہے۔ تم میرے احساسات سے بخوبی آگاہ تھے۔ مگر تم نے ان کی ذرّہ برابر پروا نہ کی۔ بس خود غرضانہ بے حسی سے اپنا کام کرتے رہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمھارے نزدیک میری اہمیت کیا ہے۔ اب ہمارے درمیان کچھ نہیں بچا۔ ہماری راہیں اب جدا ہیں۔ میں تمھیں چھوڑ جاؤں گی... میں طلاق لوں گی۔“

”آہا!“ ڈاکٹر سالوے کے مُنہ سے نکلا۔

”اس ’آہا‘ سے تمھارا کیا مطلب ہے؟“

”میں پبلسٹی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ طلاق کے مطالبے سے لوگوں میں اس تجربے کے نتائج کے حوالے سے دل چسپی کئی گنا بڑھ جائے گی۔“

وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔ ”کتنے سفاک ہو تم! ٹھیک ہے۔ ممکن ہے کوئی قانونی رکاوٹ طلاق میں مانع ہو۔ اگر بیوی کے ساتھ تجربہ گاہ کے کسی جانور کی طرح کا سا سلوک کیے جانے کی بنیاد پر طلاق ملنے میں کوئی رکاوٹ ہے تو ہُوا کرے۔ لیکن اس کے باوجود میں تمھارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ میں جاؤں گی اور اپنے ساتھ بچوں کو بھی لے کر جاؤں گی۔ کیا پتا میرے پیچھے تم ان پر کیا تجربات کرو۔ اب میں تمھارے ساتھ ایک دن بھی ایک چھت تلے نہیں گزار سکتی...“

اپنے مصمم ارادے کے باوجود ہیلن اپنے کہے پر عمل نہ کر سکی۔ کئی مسائل تھے جو اس کے جانے کی راہ میں حائل تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ کہاں جائے۔ پھر بچوں کے اسکول کا مسئلہ! چیزوں کی پیکنگ تھی... اور پھر ہاتھ میں رقم نہ ہونے کی رکاوٹ۔ اس کے علاوہ بھی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے سبب اس نے روانگی اگلے ہفتے تک کے لیے ملتوی کر دی۔ چناں چہ وہ صرف اتنا ہی کر پائی کہ اس نے اپنا بیڈ روم بدل لیا۔ روانگی کے انتظامات ہونے تک اب اسے وہیں رہنا تھا۔

بظاہر جو فیصلہ بہت سادہ و آسان لگ رہا تھا، عملی طور پر اس کی پیچیدگیوں نے اسے مشکل بنا دیا تھا۔ کچھ دن مزید گزرے تو اسے اندازہ ہُوا کہ مقررہ میعاد میں بھی وہ یہاں سے جانے کے قابل نہیں ہو پائے گی۔ سب سے بڑا مسئلہ اب ہونے والے بچے کے حوالے سے تھا۔ اس نے فیصلے میں تبدیلی کرتے

ہوئے، اس بچے کے دنیا میں آنے تک یہیں رہنے کا پروگرام بنایا اور دوبارہ اپنے بیڈ روم میں شفٹ ہوگئی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر سالوے کے لیے اس کے رویے میں کوئی لچک آئی ہو۔ اس نے ڈاکٹر سالوے کا سامان دوسرے بیڈروم میں شفٹ کرادیا۔ وہ اس کی بددیانتی، بے ایمانی اور دھوکے بازی کے بعد اب اس پر بالکل اعتبار نہیں کرسکتی تھی۔ اس ناقابلِ معافی عمل کے بعد وہ اسے کوئی موقع نہیں دے سکتی تھی۔ اور جس رشتے کے مابین اعتبار اور اعتماد ہی نہ رہ جائے پھر اس رشتے کی حقیقت ہی کیا! ڈاکٹر نے اس کے اعتبار کو ٹھیس پہنچا کر، اس کے بھروسے کو توڑ دراصل اس رشتے کی بنیاد پر ضرب لگائی تھی... محض اپنے پیشہ ورانہ مستقبل کی اونچی عمارت کی بنیاد مضبوط رکھنے کے لیے یہ نہایت گھناؤنا عمل تھا اور ہیلن ہر روز نہایت صدقِ دل سے یہ دعا کرتی تھی کہ ڈاکٹر کا تجربہ ناکام ہو اور اسے مایوسی اور نامرادی کے سوا کچھ نہ ملے۔

اپنے مقررہ وقت پر ہیلن کا نیا بچہ دنیا میں آ گیا۔

جب ہیلن نرسنگ ہوم لے جائی جارہی تھی، شکوک و شبہات نے اسے پریشان کیا ہُوا تھا۔ نت نئے وسوسے ایک کے بعد ایک اس کے دل میں آرہے تھے۔ ہر چند کہ اس نے ان شکوک و شبہات اور وساوس کو ڈاکٹر سالوے پر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے سامنے وہ ہمیشہ پُراعتماد اور پُریقین نظر آنے کی کوشش کرتی کہ جو کچھ بھی ہوگا، معمول کے مطابق ہوگا اور معمول کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ بچہ لے کر گھر آئی تو ایک فاتحانہ احساس بھی اس کے ساتھ تھا۔ گھر آنے کے بعد اس نے ڈاکٹر کی باقی ماندہ امیدوں پر بھی پانی پھیرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

"آخرِ کار تمھارے سارے احمقانہ نظریات دھرے رہ گئے۔ سراب کا پیچھا کرتے کرتے تم وہ بھی گنوا بیٹھے جو تمھارے پاس تھا۔ میرا خوب صورت بچہ بالکل نارمل ہے۔ میں نے ایک بڑے ڈاکٹر سے اس کا خصوصی معائنہ کرایا تھا۔ اس نے اطمینان کرنے کے بعد بتایا کہ بچہ بالکل نارمل ہے... بالکل نارمل، ہر لحاظ سے۔"

ڈاکٹر سالوے نے ہیلن کی گود میں موجود بچے کو دیکھا۔ پھر جیسے کچھ کہنے کو مُنہ کھولا مگر بعد میں ارادہ بدل دیا۔ وہ ہیلن کے قریب گیا اور نوزائیدہ بچے کے ننھے ننھے نازک نقوش پر غور کیا۔ اسے بھی یہ بچہ دیگر عام بچوں جیسا ہی لگا۔ اس میں کوئی مختلف یا غیر معمولی بات نہ تھی۔

رفتہ رفتہ گھریلو صورتِ حال معمول پر آتی گئی۔ نئے نے گھر میں اپنی جگہ بنالی۔

ڈاکٹر سالوے کی امیدیں ہر گزرتے دن کے ساتھ کم ہوتی جارہی تھیں۔ تاہم وہ انھیں زندہ رکھنے کی شدید کوششیں کررہا تھا۔ وہ دن میں کئی کئی مرتبہ بچے کا بغور جا لیتا۔ اس کی عادات اور حرکات و سکنات کا نہایت گہری نظروں سے مشاہدہ کرتا۔

ہیلن ابتدا میں تو اس کے یہ معمولات برداشت کرتی پھر پھٹ پڑی۔ "یہ تم کیا بچے کو بار بار ٹٹولتے رہتے ہو۔ اس سے بچہ پریشان ہوتا ہے اور نروس ہو جاتا ہے۔" اس نے قد بے رخی سے کہا۔ "بچہ خوف زدہ اور بے چین ہوتا ہے۔ خود کو اس کی جگہ رکھ کر سوچو، اگر تم اس کے جتنے ہوتے اور کوئی بڑا کھردرا چہرہ تم پر دن میں کئی کئی مرتبہ دیر تک جھکا تمھیں رہتا تو تم پر کیا گزرتی۔ یہ بچے کے ساتھ ظلم ہے۔"

ہیلن کے ٹوکنے سے یہ ہُوا کہ ڈاکٹر سالوے نے تکنا اور ٹٹولنا کم کردیا۔ پھر ہیلن نے بھی بچے کو ڈاکٹر کی نظروں سے بچانا شروع کردیا۔ اب بچے سے اس کا سامنا کم ہی ہوتا۔ کم و بیش پندرہ دن میں ایک دفعہ۔

ایک دن ڈاکٹر سالوے نے محسوس کیا کہ ہیلن نسبتاً کمز لگ رہی ہے۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ کچھ دنوں سے وہ معمولی طور پر خاموش بھی ہے۔ اس کے دیگر رویوں میں بھی نمایاں تبدیلی محسوس ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر سالوے کے میں ایک شبہ سا پیدا ہُوا اور اس کے پورے وجود کو اپنے میں لے لیا۔

پندرہ دن پورے ہوئے تو ڈاکٹر سالوے بچے کو دیکھنے پہنچا "یہ تم بچے کو کچھ زیادہ ہی نہیں چھپانے لگی ہو مجھ سے" ڈاکٹر نے اپنی بیوی سے کہا۔ اس کے سوال کے جلو میں امید کے طوفان تھے تاہم اس نے انھیں مصنوعی اطمینان کے پر میں چھپایا ہُوا تھا۔

"چھپانے لگی ہوں!" ہیلن نے دہرایا۔ "یہ تم کس کی بات کررہے ہو۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ بچہ اب نہ ہو۔ اور جب تک کوئی اسے خوامخواہ نہ گھورے اسے تنگ کرے، یہ خوش رہتا ہے۔ یہ بہت حساس بچہ ہے پریشان ہو جاتا ہے۔"

"یہ میرے سوال کا کوئی معقول جواب نہیں مائی ڈیئر" "اچھا! تو پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا جواب ہونا چاہیے۔"

"میں بتاؤں؟ ٹھیک ہے، میں ہی وضاحت کردیتا ہوں۔ میں یہ اندازہ لگا پایا ہوں کہ تم نہیں چاہتیں کہ میں بچے سے بار بار ملوں۔ تمھاری خواہش یہ ہے کہ میں بس لمحہ بھر کو بچے کی ایک جھلک دیکھ لیا کروں اور بس۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لیے ہے مائی ڈیئر کہ تم نہیں چاہتیں کہ میں وہ علامتیں دیکھ سکوں جن سے مجھے یقین ہوجائے کہ میرا تجربہ بالکل ناکام نہیں رہا ہے۔ بولو؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"کیا فضول بات ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمھیں بتا چکی ہوں کہ بڑے ڈاکٹر نے کیا کہا تھا۔ اس نے بچے کو ہر لحاظ سے نارمل قرار دیا تھا۔ نارمل... نہ کم، نہ زیادہ۔"

"آہ! مجھے یاد ہے۔ مگر یہ بات ہفتوں پہلے کی ہے مائی ڈیئر۔ بعض اوقات معمول سے ہٹی ہوئی کوئی بات فوری طور پر سامنے نہیں آتی۔ اس کے لیے یا تو انتظار کرنا پڑتا ہے یا اس تبدیلی کو کرید کر، احساس دلا کر نمایاں کرنا پڑتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟"

"تت... تم احمقانہ اور ناقابلِ یقین باتیں کررہے ہو، سالوے۔ وہ بالکل نارمل، بہت پیارا اور خوش باش بچہ ہے۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ وہ بہت حساس بچہ ہے اور جلد اپ سیٹ ہو جاتا ہے؟"

"ہاں، میرا مطلب یہ تھا کہ اسے بہت آسانی سے اپ سیٹ کیا جاسکتا ہے... چناں چہ بہتر یہی ہے کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

"بہ ہر حال، میں اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی ایسا مت کرو۔ وہ ابھی سویا ہے۔"

"تم مجھے اس سے دور رکھنا چاہتی ہو، مجھے افسوس کے ساتھ بار بار یہ کہنا پڑ رہا ہے۔ میں تمھیں بتادوں کہ اس طرح میری راہ روکنا کسی طرح مناسب نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کر کے تم میرے شکوک... بلکہ یقین کو اور پختہ کررہی ہو ورنہ اور کیا وجہ ہے اس کی؟ بہ ہر حال، مجھے بچہ دیکھنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ بچے کے بیڈ کی طرف بڑھا۔

ہیلن کھڑی مُٹھیاں بھینچتی رہی۔

ڈاکٹر سالوے کا مصنوعی اطمینان اب بے صبری میں بدل گیا تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ ہیلن کے رونے اور اس کی حالت نے سالوے کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ پھر اب، بچے سے ملنے کی راہ میں مزاحم ہونے نے تو سب کچھ جیسے واضح کردیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ تجربہ مکمل طور پر ناکام نہیں رہا تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ کام یابی کی حدود اور تناسب کا تعین باقی تھا۔ اور یہ بچے کو دیکھنے، جائزہ لینے اور پرکھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا تھا۔ اسی پر اس بات کا انحصار تھا کہ وہ اس تجربے کے نتائج کے ساتھ اپنے ساتھیوں اور ناقدین کا سامنا کرسکتا ہے یا نہیں۔ اپنے نظریات کے تجربے کا ثبوت وہ اپنے بیٹے کی شکل میں پیش کرتا!

وہ دھڑکتے دل سے بیڈ کے ساتھ، زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بے چین و بے سکون ہیلن بھی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ بچہ جاگ رہا تھا۔ وہ سیدھا لیٹا، بچوں ہی کی طرح غوں غاں کررہا تھا۔ اس کی شفاف نیلی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ انھیں اپنے قریب آتا دیکھ کر وہ اُن کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ نیلی آنکھیں اب سالوے کی جانب متوجہ تھیں۔ سالوے کو دیکھ کر بچہ مسکرایا پھر اس نے اپنا سر تکیے پر اِدھر اُدھر رگڑا گویا ماں کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور پھر غائب ہوگئی۔ ننھے ننھے لب وا ہوئے پھر بند ہوگئے۔ ہیجان سے ڈاکٹر سالوے کا برا حال تھا۔ ڈاکٹر سالوے کو پورا پورا یقین تھا کہ بچہ بولنے کی کوشش کررہا ہے۔

وہ جھکا اور اپنا کان بچے کے مُنہ کے نزدیک تر لے گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ اگر بچے کے مُنہ سے کوئی بے معنی آواز بھی نکلے تو اسے بہ خوبی سُن سکے۔ ہیلن اس کے قریب، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے، عجیب ملتجیانہ سے انداز میں کھڑی تھی۔

"ما..." بچے کے مُنہ سے نکلا۔ اس کے ننھے ننھے نازک سے لب کھلے اور پھر بند ہوگئے۔ ڈاکٹر سالوے کا یہ خیال سو فیصد درست تھا کہ وہ بولنے کی کوشش کررہا ہے۔ بچے کا مُنہ ایک بار پھر کھلا۔ بچے نے اپنی، ننھے کنچوں جیسی آنکھوں سے اپنی ماں کی طرف مشتاقانہ انداز میں دیکھا۔ ہونٹ بند ہو کر دوبارہ وا ہوئے۔ غالباً دانت نہ ہونے کی وجہ سے تلفظ واضح نہ تھا لیکن بولے گئے جملے کے الفاظ اور مفہوم بالکل صاف اور قابلِ فہم تھے۔

"ماما... دودھ پلاؤ۔" بچے نے کہا... اور یہ جملہ فرانسیسی زبان میں بولا گیا تھا۔

منتظر اور بے قرار آنکھوں کے لیے ایک محبوب کہانی

عشق کا شین

علیم الحق حقی

عزیز قارئین! اس تحریر کا مطالعہ کرنے سے قبل خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیجیے کہ آپ ایک غیر معمولی اور طویل داستان کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ کوئی روایتی سلسلے وار کہانی نہیں ہے۔ تصوف کی بھول بھلیاں میں عشق کی متلاشی نگاہ کے 'معرفت کی روشنی تک پہنچنے کی داستان ہے۔ یہ عشق کی ابجد کے دوسرے حرف 'شین' کا ابتدائیہ ہے جو آپ ان شاء اللہ ہر ماہ قسط وار مطالعہ کریں گے۔ یہی نہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ مصنف کو صحت و عافیت والی دراز عمر عطا کرے، آپ عشق کا شین کا اختتامیہ اور پھر عشق کا قاف بھی سب رنگ ہی میں ملاحظہ کریں گے۔

اس ابجد کا حرف اول یعنی عشق کا عین 1995ء میں شائع ہوا۔ اور قارئین کے قلب و ذہن پر ان مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ ڈائجسٹ میں چھپنے کے بعد، کتابی صورت میں اس کے متعدد ایڈیشنز شائع ہوئے اور ٹی وی سیریل بھی بنائی گئی۔ اس کی تاثر انگیزی کے تسلسل کا یہ عالم ہے کہ موقع پرست پبلشرز نے انھی ناموں اور ملتے جلتے ناموں سے کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ کسی اور سے عشق کا شین کا دوسرا حصہ لکھوا کر اس عظیم داستان کو مضحکہ خیز انجام تک دے دیا گیا۔ یہ اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ لیکن قارئین کو دھوکا ایک حد تک ہی دیا جا سکتا تھا۔ باذوق اور رمز شناس قارئین کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ محض نام کے بل پر، لایعنی اور بے روح الفاظ کا ہجوم ہے جسے بیچنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہر قلم میں وہ سحر نہیں ہوتا جو الفاظ میں معانی اور تاثیر کی روح پھونک دے۔ لکھنے والے بے شمار ہیں، نقال بھی بہت ہیں... لیکن علیم الحق حقی ایک ہی ہیں... جو اپنا کام محنت، جاں فشانی اور سچائی سے کرتے ہیں اور عاجزی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ یعنی ان کے کام کو والہانہ سراہا جاتا ہے۔ ایسی تحریریں برسوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اور پڑھنے والے بھی بڑے صبر و تحمل سے ان کا انتظار کرتے ہیں۔ عشق کا شین کے تحریری سفر میں علیم الحق حقی کی زندگی کے دس برس گزر چکے ہیں۔ اب یہ سفر منزل کے قریب پہنچ چکا ہے۔

غیر معمولی قبولیت عام اور سند اعتبار کی حامل یہ داستان، خود مصنف کو بھی اپنی تحریروں میں بہت پسند ہے۔ سب رنگ کے قارئین کے لیے بہ طور خاص اس کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پڑھیے اور مصنف کو.. اور ساتھ ہی ہمیں بھی اپنی دعاؤں سے نوازیے۔

مُشرکوں کے گھر پیدا ہونے والے ٹھاکر اوتار سنگھ کی کہانی
اُس کے من میں ایک چنگاری تھی جو شُعلہ بننے کے لیے بے تاب تھی
اُسے عشق ہُوا تو ایک خُوب صُورت آواز سے، جب وہ کلام الٰہی کی قرأت کر رہی تھی
اب یہی آواز اُس جویائے حق کے لیے راہ نُمائے حق تھی

گھور اندھیرے میں جنم لینے والی ہستی کی رُوداد، اس کے وجود میں خیرہ کُن روشنی موج زن تھی

گرد و پیش سے بے خبر، وہ دونوں اس پر ضرور حیران تھے کہ دونوں بیر بہوٹیوں نے اچانک ہی اپنے پنجے سمیٹ لیے۔

”یہ کیا؟“ وصال دین نے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ اب پھر منتر پڑھنا ہو گا اور نہ جانے بیر بہوٹیاں پنجے کھولنے میں کتنی دیر لگائیں۔

* * *

ان آٹھوں کو یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اب وہ مایوس ہونے لگے تھے۔ ویسے تو وہ آئے ہی ناخوش تھے۔ جسونت کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ آتے ہی نہیں۔ پندرہ سال کے ایک عام سے لڑکے کو ٹھکانے لگانے کے لیے آٹھ آدمی! ان کے خیال میں یہ بات وقت ضائع کرنے کی تھی۔

”یارا... یہ کام تو میں اکیلا ہی کر آؤں گا۔“ کرتار جسونت نے کہا۔ ”کیوں ہم سب کو ذلیل کرتے ہو۔“

”دیکھو... میں بہت سوچ سمجھ کر کام کر رہا ہوں جسونت نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اس میں احتیاط ضرور صرف ٹھکانے لگانا کافی نہیں ہے۔ کام ایسے ہو کہ کوئی نہ چھوڑا جائے۔ کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ ورنہ ایک نشان ہی پرتاپ کو اصل آدمی تک پہنچا دے گا۔“

”اور اصل آدمی کون ہے؟“

”یہ تمھیں پتا نہ ہو، اسی میں بھلائی ہے۔“

اس پر کرتارا آپے سے باہر ہو گیا۔ ”ا صاف بول نا کہ ہم کو زنانی سمجھتا ہے۔ اکوئی

اُگلوا سکتا ہے بھلا!''

''کام میری مرضی کے مطابق کرنا ہے...'' جسونت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے کسی کو وچن دیا ہے کہ اونچ نیچ نہیں ہوگی۔ مجھے اس وچن کا پالن کرنا ہے۔''

''تو یارا مکھی کو مارنے کے لیے توپ چلاؤ گے۔'' اس بار گوپال نے زبان کھولی۔

''تو تم لوگ رہنے دو۔ میں کسی اَور سے بات کرلوں گا۔''

یہ سُن کر کرتارا تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ یہ تو بہت بڑی بے عزتی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا یار کسی اَور سے کام لے۔ ''پر یارا سمجھا تو۔ یہ سب کیوں؟''

''بات یہ ہے کہ وہاں چھپنا آسان نہیں۔ وہ کوئی شہر تو ہے نہیں۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں...'' کرتارے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک آدمی کا کام ہے۔ ایک آدمی کا چھپنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آٹھ آدمیوں کی کیا ضرورت ہے؟ اور آٹھ آدمی کہاں چھپ سکتے ہیں!''

''بدھی سے کام لے کرتارے! مجھے بتایا گیا ہے کہ لڑکا من کا موجی ہے۔ کسی بھی وقت' کس بھی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے اور نہیں نکلتا تو کئی کئی دن حویلی سے باہر بھی نہیں آتا۔ ایک بار تو وہ راستہ بھول کر دوسرے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں' تم لوگ ڈاکو بن کر جاؤ۔ موقع ملے تو بے شک کسی کو لوٹ بھی لو۔ اور تم لوگ الگ الگ رہو۔ یوں تم پورے علاقے پر نظر رکھ سکو گے۔ میں نے کہا نا کہ وہ کسی بھی وقت کہیں بھی نکل سکتا ہے۔ ایک آدمی ہو تو وہ برسوں بھی کسی کو نہیں ملے گا۔''

بات کچھ کچھ سمجھ میں آئی تھی۔ پھر بھی دل نہیں مانتا تھا۔ یہ تو واقعی مکھی کو توپ کے گولے سے مارنے والی بات تھی۔ لیکن دوستی کا لحاظ تھا۔ کرتارے کو ماننا پڑا۔

یہاں آ کر وہ ایشور لال کی حویلی میں ٹھیرے۔ صبح سویرے جانکی داس انھیں کھانا دے کر رخصت کرتا اور وہ نکل کھڑے ہوتے۔ وہ اونٹوں پر سوار ہوتے اور صحرا میں پہنچ کر الگ ہو جاتے۔ دو وقت ان کی یکجائی کے ہوتے تھے۔ دوپہر میں کھانا کھانے کے لیے وہ ندی کے کنارے اکھٹے ہوتے اور رات کو واپس جاتے سمے بھی وہ وہیں ملتے۔ وہاں سے وہ ساتھ ہی مہیش پور جاتے۔

اس ایک ہفتے میں انھوں نے چند افراد کو لوٹا تھا۔ مگر قسمت کی بات کہ وہ سب دُور پرے کے گاؤں دیہات کے لوگ تھے... جو یا تو شہر کی طرف جا رہے تھے یا شہر سے گاؤں واپس آرہے تھے۔ یوں قریب کے دیہات میں ڈاکوؤں کی آمد کا چرچا نہ ہو سکا' جو وہ چاہ رہے تھے۔

بہ ہر حال' اس ایک ہفتے میں ان کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ من موجی لڑکا جس کی وجہ سے وہ یہاں آئے تھے' اس کی ایک جھلک بھی انھیں دکھائی نہیں دی تھی۔ بس دو دن پہلے وہ تہہ خانے میں بیٹھ کر اس پر گفتگو کر رہے تھے کہ کیا مقصد حاصل کرنے کے لیے انھیں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حو میں ہی گھسنا پڑے گا۔

''یہ تو بھول جاؤ...'' کرتارے نے کہا تھا۔ ''دل تو م بھی یہی کرتا ہے لیکن مجبوری ہے۔''

پھر کل شام موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ ان کے لیے تو وہ مسئلہ بن گئی۔ کہاں پناہ لیتے۔ مجبوراً ایک ایک کر کے وہ معمول سے پہلے مہیش پور چلے گئے' تاہم کسی نے انھیں نہیں دیکھا۔ بارش کے نتیجے میں لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

بارش ان کے لیے بڑی شبھ ثابت ہوئی تھی۔ صحرا ہرا ہونے کے بعد ایسا مقام نہیں رہا تھا کہ جہاں چھپنا کچھ مشکل ہو۔ بعض جگہوں پر تو وہ گھنا جنگل بن گیا تھا۔ ادھر موسم سے ان کی طبیعت بھی جولانی پر آ گئی۔

دوپہر کے وقت وہ یکجا ہوئے اور ندی کی طرف چل دیے۔ کرتارا آگے تھا۔ جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتے ہی انھیں دونوں نظر آئے۔ اوتار سنگھ کو اس نے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا۔ وہ اپنی تصویر کے عین مطابق تھا۔

کرتارے نے جھٹکے سے اپنے اونٹ کو روکا اور ہاتھ اٹھا کر ساتھیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ پھر پلٹ کر سرگوشی میں بولا۔ ''شکار بھٹ سے نکل آیا ہے۔''

ان سب کے چہرے کِھل اُٹھے۔

''اونٹ یہیں باندھ دو۔ میں اور راجو آگے جائیں گے باقی یہیں رُکیں گے۔''

''تم سردار ہو' کرتارے۔ موقع ہمیں ملنا چاہیے۔'' ا کے ایک ساتھی نے کہا۔

کرتارے نے چند لمحے سوچا۔ بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے' یہ کام راجو اور گوپال کریں گے۔''

راجو اور گوپال نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونو نے اپنے ہتھیاروں کو چھوا اور آگے بڑھ گئے۔

* * *

اوتار سنگھ نے آہٹیں سنی تو تھیں مگر اس کا دھیان بیر بہوٹی کی طرف تھا۔ اس لیے اس کے دماغ نے ان پر توجہ نہیں دی۔ دونوں بیر بہوٹیوں کے پنجے بند کرنے کے بعد اس کی چھٹی حس نے اچانک ہی اسے نامعلوم خطرے کا احساس دلایا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ڈھاٹے باندھے ہوئے دو افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بڑا ابلم تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں خنجر جسے وہ بار بار دونوں ہاتھوں میں تول رہا تھا۔ اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ وہ دشمن ہیں۔

وہ دونوں ابھی کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ اوتار سنگھ نے سرگوشی میں وصال دین کو پکارا۔ ''ویر جی... جلدی کرو۔ لٹھیا سنبھالو۔''

وصال دین نے چونک کر ایک نظر اسے اور پھر ان دونوں کو دیکھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہو۔

ان کی لاٹھیاں کچھ دُور پیچھے کی طرف پڑی تھیں۔ اوتار سنگھ تیزی سے جھپٹا اور لاٹھی اٹھائی۔ اسی لمحے وصال دین بھی جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ بھی لاٹھی کی طرف لپکا۔ دونوں دوست لاٹھیاں اٹھانے کے بعد ایک دوسرے سے خاصا دُور چلے گئے۔

ڈھاٹا باندھے ہوئے دونوں افراد نپے تلے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن ان دونوں نے جس انداز میں لاٹھیاں سنبھالی تھیں اس سے وہ کچھ جھجک گئے۔ انھوں نے پلٹ کر اس سمت دیکھا جدھر سے وہ آئے تھے۔

ادھر کرتارے کی نگاہوں سے تشویش جھلکنے لگی تھی۔ لڑکوں نے جس انداز میں لاٹھیاں سنبھالی تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں لٹھیا چلانی آتی ہے۔ اور یہ خطرناک بات تھی۔ اگر وہ اوسط درجے کے لٹھیا باز بھی تھے تو راجو اور گوپال ان کے لیے ناکافی تھے۔

''دو آدمی اَور چلے جائیں۔'' کرتارے نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا۔

دو آدمی اَور آگے بڑھ گئے۔

دونوں لڑکے لاٹھی سنبھالے کھڑے تھے۔ انھوں نے دو اَور آدمیوں کو جھنڈ سے نکل کر آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں بھی نیزے تھے۔ دونوں لڑکوں کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ پُراعتماد بھی تھے۔ انھیں جمال دین جیسے ماہرِ فن نے یہ فن سکھایا تھا۔ لیکن کچھ ڈر بھی تھا کیوں کہ آپس میں مشق کرنا اور بات ہے اور مسلح دشمنوں کا سامنا کرنا اور بات۔ وہ پہلا موقع تھا کہ ان کا واسطہ سچ مچ کے کسی دشمن سے پڑا تھا۔

نئے آنے والے دونوں آدمی اپنے پہلے ساتھیوں سے آملے۔ اب ان میں سے دو وصال دین کی طرف بڑھ رہے تھے اور دو اوتار سنگھ کی طرف۔

درمیانی فاصلہ کم ہوتے ہی دونوں لڑکے تیزی سے حرکت میں آئے۔ لاٹھیاں اتنی تیزی سے گردش کر رہی تھیں کہ نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔

پھر جو کچھ ہُوا' وہ لمحوں میں ہُوا۔ پہلے خنجر والا لپیٹ میں آیا۔ اس کا خنجر ہاتھ سے نکلا اور اُڑتا ہُوا دُور جا گرا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر چیخ رہا تھا اور اس کا ہاتھ پہنچے کے پاس سے لٹک رہا تھا۔ دوسرا شکار ابلم والا تھا۔ اوتار سنگھ کی لاٹھی اس کی کنپٹی پر لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

دونوں نیزے والے بھی گھبرا گئے تھے۔ وہ نیزے سے لاٹھی کا کام لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن لٹھیا بازی کے فن سے نابلد تھے۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ دیر نہیں ٹک سکیں گے۔ دشواری یہ تھی کہ انھیں پلٹ کر بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔

وصال دین کچھ نروس تھا۔ اس کا ارتکاز مکمل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیزہ اس کے بازو کو چھو کر گزرا۔ اس کی قمیص پھٹ گئی اور بازو پر ایک لکیر سی کھنچ گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے خون سے بھر گئی۔

''تم ہٹ جاؤ ویر جی...'' اوتار سنگھ نے اسے پکارا۔ ''انھیں میں سنبھال لوں گا۔''

لیکن زندگی بھر وفاداری کا سبق پڑھنے والا اس آزمائش سے مُنہ نہیں پھیر سکتا تھا۔

اُدھر جھنڈ میں صورت حال اور خراب تھی۔ دو ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر باقی لوگ میدان میں اترنا چاہتے تھے۔ جوش تو کرتارے کا خون بھی مار رہا تھا لیکن اسے اپنے وچن کی فکر بھی تھی۔ وہ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ''تم میں سے کوئی آگے نہیں بڑھے گا۔'' وہ سرگوشی میں پھنکارا۔

''تو اپنے ساتھیوں کو پٹتا دیکھتے رہیں۔'' رنگھبیر نے غرا کر کہا۔

''اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ لٹھیا چلانی آتی ہے تم میں سے کسی کو؟'' کرتارے نے چیلنج کیا۔

وہ تینوں خاموش رہے۔

"ہم بیس بھی ہوتے تو ان کے لیے کم تھے۔" کرتارے نے کہا۔ "اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہمیں اپنے کسی ساتھی کو یہاں چھوڑ کر نہیں جانا ہے... زندہ نہ مردہ۔ اور میں اکیلا سات آدمیوں کو لے کر نہیں جاسکتا۔"

اتنی دیر میں لڑکوں سے لڑنے والے ان کے دوسرے دو ساتھ بھی ڈھیر ہو چکے تھے۔

"چلو ویر جی' گاؤں کی طرف..." اوتار سنگھ نے وصال دین سے کہا۔ "ہمیں وہاں سے لوگوں کو لے کر آنا ہے۔"

"میں یہیں رُک جاتا ہوں۔" وصال دین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان کی فکر نہ کرو ویر جی۔ یہ اٹھنے والے نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔ ہمیں جانے اور واپس آنے میں بس دس منٹ لگیں گے۔"

بات ماننے والا وصال دین' اوتار سنگھ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

لڑکوں کے اوجھل ہوتے ہی کرتارا اور اس کے ساتھی اپنے گرے ہوئے ساتھیوں کی طرف لپکے۔ جس کی کنپٹی پر لٹھیا لگی تھی' وہ بے سُدھ تھا۔ باقی تین ہوش میں تھے مگر اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ "جلدی کرو۔" کرتارے نے کہا۔

انھوں نے چاروں ساتھیوں کو اونٹوں پر لادا۔ "اب کرنا کیا ہے؟" رگھبیر نے پوچھا۔

"نکلنا ہے یہاں سے۔"

"مہیش پور چلیں گے؟"

"بے وقوف نہ بنو۔ اب اس علاقے میں ہمیں ایک پل بھی نہیں رُکنا ہے۔" کرتارے نے جھنجلا کر کہا۔

* * *

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے وید کو وصال دین کی مرہم پٹی کرنے کو کہا اور اپنے ساتھ کچھ آدمیوں کو لے کر اوتار سنگھ کے ساتھ چل پڑا۔ کیدار ناتھ بھی ان کے ساتھ تھا۔

وہ وہاں کوئی ایسی نشانی نہیں تھی جو اس واقعے کی گواہی دے۔

کیدار ناتھ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور تمسخرانہ لہجے میں اوتار سنگھ سے بولا۔ "پتر... کہیں ایسا تو نہیں کہ تم دونوں نے خواب دیکھا ہو۔ یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

اوتار سنگھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکر پرتاپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ "وصال دین کے بازو کا زخم تو اصلی ہے۔ یا وہ بھی خواب میں لگا ہے۔"

"کسی درخت کی شاخ سے خراش لگی ہوگی ٹھاکر ویر..." کیدار ناتھ نے بڑے ادب سے کہا۔ "ورنہ سوچو تو' اتنی سی دیر میں چار زخمی آدمی کہاں جاسکتے ہیں۔ جب کہ پتر اوتار سنگھ کا کہنا ہے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔"

ٹھاکر پرتاپ کے ساتھ ایک کھوجی بھی تھا۔ ٹھاکر نے اس سے کہا۔ "تو اِدھر اُدھر دیکھ۔ مجھے لگتا ہے ان کے اور ساتھی بھی ہوں گے۔"

اس دوران میں اوتار سنگھ متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا تھا۔ ندی کے کنارے ایک چمکتی ہوئی چیز نظر آئی تو وہ اس کی طرف لپکا۔ وہ ایک حملہ آور کا خنجر تھا۔ "یہ دیکھیں پتا جی۔" اس نے پکارا۔

ٹھاکر پرتاپ اس کی طرف بڑھا۔ کھوجی چند لمحے اِدھر اُدھر جائزہ لینے کے بعد جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر نے وہاں پہنچ کر وہ خنجر اٹھایا اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ "یہ لو کیدار ناتھ' خواب کا خنجر' خواب سے باہر بھی آگیا ہے۔"

"میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا ٹھاکر ویر...!" کیدار ناتھ نے کھسیا کر کہا۔ "یہ نشانی تو نہیں دیکھی تھی نا میں نے۔"

ذرا ہی دیر میں کھوجی واپس آگیا۔ "وہ آٹھ اونٹوں پر سوار آٹھ منش تھے اَن داتا۔" اس نے کہا۔

"چار نے حملہ کیا اور چار تماشا دیکھتے رہے..." ٹھاکر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "انھیں وشواس ہوگا کہ دو لڑکوں کے لیے چار آدمی کافی ہیں۔ مگر جب انھوں نے چار ساتھیوں کو گرتے دیکھا تو حملہ کیوں نہیں کیا!" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

"ڈاکوؤں کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں ٹھاکر ویر۔" کیدار ناتھ نے جلدی سے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈاکو تھے؟" ٹھاکر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

کیدار ناتھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اوتار سنگھ بول اٹھا۔ "ان کے چہروں پر ڈھاٹے تھے پتا جی۔"

"دیکھا ٹھاکر ویر' میں نے کہا تھا نا۔"

"میں نہیں مانتا کیدار ناتھ کہ وہ ڈاکو تھے۔"

"لیکن کیوں ٹھاکر ویر؟"

"پچھلے دنوں اِدھر اُدھر کے گاؤں دیہاتوں میں ایسا کچھ نہیں سنا گیا۔ ورنہ آٹھ ڈاکو آجائیں تو شور مچ جاتا ہے علاقے میں۔ پھر وہ ڈاکو ہوتے تو میرے چھوٹے اور وصال دین پر حملہ کیوں کرتے۔ ڈاکو تو مال دیکھ کر حملہ کرتے ہیں۔" ٹھاکر نے دلیل دی۔

"تو ٹھاکر ویر' تمھارے خیال میں وہ کون تھے؟"

"وہ جو کوئی بھی تھے' میرے پتر کی جان لینا چاہتے تھے..." ٹھاکر نے کہا۔ "صرف جان! مال سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی۔"

"اگر وہ ڈاکو نہیں تھے تو انھوں نے ڈھاٹے کیوں باندھ رکھے تھے؟" کیدار ناتھ نے اعتراض کیا۔

"خود کو چھپانے کے لیے اور اسی لیے انھوں نے چار آدمی گرنے کے بعد مزید کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان چاروں کو اٹھا کر لے جانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ جو بھی تھے' شناخت سے بچنا چاہتے تھے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے ٹھاکر ویر۔" کیدار ناتھ نے لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے کہا۔

"مگر میری سمجھ میں بہت کچھ آرہا ہے..." ٹھاکر بولا۔ "خیر اب اس پر حویلی میں بات ہوگی۔"

کیدار ناتھ کے مَن میں کھد بد ہو رہی تھی۔ وہ ٹھاکر کے ساتھ حویلی چلا آیا۔

وہ لوگ کچھ دیر ڈیوڑھی میں بیٹھے۔ ٹھاکر اپنے بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "پتر اوتار سنگھ..." بالآخر اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی محبت سے چھلک رہا تھا۔ "مجھے تم پر فخر ہے پتر۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم ٹھاکر ہو... اصل ٹھاکر!"

اوتار سنگھ نے کچھ نہیں کہا۔ بس باپ کو دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ اب اس پر پابندیاں لگیں گی۔ وہ جانتا تھا کہ پتا جی اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب وہ اسے اسکول نہ بھیجیں۔

"دیکھو پتر' جیون اوپر والے نے جتنا دیا ہے' منش اتنا ہی جیتا ہے۔ نہ ایک پل کم' نہ ایک پل زیادہ..." ٹھاکر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "راجپوت موت سے نہیں ڈرتے۔ ہاں' بلکہ وہ جان لینے کے لیے لڑتے ہیں' جان دینے کے لیے نہیں۔ پر جانتے ہیں کہ اس کھیل میں جان جا بھی سکتی ہے۔ سو وہ بہادروں کی طرح جیتے اور بہادروں کی طرح مرتے ہیں۔"

اوتار سنگھ اب بھی چپ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔

"میں تم سے یہی کہوں گا پتر کہ جو ہُوا' اسے بھول جاؤ۔ پر ہر بات کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ جیسے چاہو جیو' جو چاہو کرو' جہاں چاہو جاؤ۔ بس یہ یاد رکھو کہ تم راجپوت ہو اور راجپوت دشمن پر دیا کبھی نہیں کرتے۔"

"جی پتا جی۔"

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟ کچھ بےکل ہو پتر؟"

"جی پتا جی' وہ پڑھنے کے لیے جانا ہے۔"

ٹھاکر بے ساختہ مسکرایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ اسے احساس ہُوا کہ وہ خوامخواہ بیٹے کو پڑھا رہا ہے' جب کہ بیٹا اس سے بھی بڑھ کر نکلا ہے۔ ابھی اس پر جان لیوا حملہ ہُوا تھا اور وہ... وہ پڑھائی کی فکر میں بے حال ہو رہا تھا۔ "تو تم جاؤ... پڑھو۔ شاباش پتر!" اس نے کہا۔

اوتار سنگھ چلا گیا۔

کیدار ناتھ کی بے چینی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اوتار سنگھ کے جاتے ہی اس نے ٹھاکر سے کہا۔ "ٹھاکر ویر' تمھارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کے جیون کو کوئی خطرہ ہے؟"

"جیون کے ساتھ مرن کا دھڑکا تو لگا ہی رہتا ہے کیدار ناتھ۔ جیون کا انت تو مرن ہی ہے نا۔ پل میں ہو یا برسوں میں..." ٹھاکر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "پر مجھے خوشی ہے کہ میرا پتر جانتا ہے... جانتا ہے کہ ٹھاکر موت سے نہیں ڈرتے۔"

"پر ٹھاکر ویر' دھڑکا ہے تو اس کا اُپائے تو سوچنا ہوگا..." کیدار ناتھ نے کہا۔ "اور دشمنی ہے تو اس کا کارن بھی ہوگا۔"

"ہوگا... اوش ہوگا۔" ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا۔

کیدار ناتھ کو اس کی بے پروائی بہت عجیب اور غیر فطری لگی۔ "میں دیکھتا ہوں ٹھاکر ویر کہ تم کچھ بے پروائی کر رہے ہو۔ چھوٹا ٹھاکر تمھارا ایک ہی پتر ہے... تمھاری نسل چلانے والا! اگر اسے خطرہ ہے تو تمھیں اس کی حفاظت کی فکر کرنی ہوگی۔ پر تم تو اسے اور آزادی دے رہے ہو۔ جیسے چاہو جیو' جو چاہو کرو' جہاں چاہو جاؤ۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

ٹھاکر مسکرایا۔ "مجھے اس کی کوئی چنتا نہیں۔"

"پر کیوں؟"

"یوں کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا میرے پتر کو۔ وہ لمبا جیون جیے گا۔"

ٹھاکر کے لہجے کے یقین نے کیدار ناتھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ "اس کا اتنا وشواس کیوں ہے تمھیں؟"

’’تم نہیں جانتے کیدارناتھ کہ وہ مجھے کیسے ملا ہے...‘‘ ٹھاکر نے کہا۔ ’’مجھے بتادیا گیا تھا کہ کوئی اس کا بال بانکا نہیں کرسکے گا۔‘‘

’’پھر بھی ٹھاکر دیو...‘‘

’’چھوڑو اس بات کو کیدارناتھ۔ یہاں ایک تم ہی تو ہو جس سے من کی بات کرسکتا ہوں میں۔ جب تک اوتار سنگھ پیدا نہیں ہوا تھا‘ میں سوچتا تھا کہ ساری زمین اپنے کارندوں میں بانٹ دوں گا۔ لیکن جب وہ پیدا ہوا تو مجھے جیون اچھا لگنے لگا۔‘‘ ٹھاکر کہتے کہتے رُکا۔ چند لمحے وہ کیدارناتھ کو غور سے دیکھتا رہا۔ ’’میں اپنی وصیت تیار کرچکا ہوں۔ اگر میرے پتر کو کچھ ہوگیا تو میرا سب کچھ سرکار کے پاس چلا جائے گا۔ اوتار سنگھ کو کچھ نہ ملا تو کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا اور بھگوان نے اسے جیون دیا تو میں نے اپنی وصیت میں سب کا خیال رکھا ہے۔ کوئی محروم نہیں رہے گا۔‘‘

کیدارناتھ کو لگا کہ ٹھاکر جان بوجھ کر اسے یہ سنا رہا ہے... جتا رہا ہے... سمجھا رہا ہے کہ اوتار سنگھ کے جینے میں ہی اس کا فائدہ ہے۔ اوتار سنگھ کو راستے سے ہٹا کر اسے کچھ نہیں ملے گا۔

’’ایسی باتیں نہ سوچو ٹھاکر دیو۔‘‘ کیدارناتھ نے بجھے دل سے کہا۔ من میں وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے جے پور جاکر جسونت سے بات کرنی پڑے گی۔

* * *

مولوی برکت علی اس کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ’’اوتار سنگھ‘ استاد ہونے کے ناتے ایک بات کا مجھے شروع ہی میں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھیں پڑھانے کی فکر میں اسے میں بھول ہی گیا۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں مولوی صاحب۔‘‘

’’بھئی اسکول میں تمھیں ہوم ورک بھی تو ملا ہوگا نا؟‘‘

’’جی ہاں... ملا ہے۔‘‘

’’اور میں نے اس کی فکر بھی نہیں کی۔ بس اپنا مضمون پڑھانے میں لگا رہا۔ بڑی غیر ذمے داری ہوئی مجھ سے۔ مگر خیر! ابھی کچھ دن کی چھٹیاں باقی ہیں۔ اس کی تلافی اب کرنی ہوگی۔‘‘

’’آپ کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب؟‘‘ اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

’’اب پہلے تم اپنا ہوم ورک مکمل کروگے۔‘‘

’’وہ تو میں پہلے ہی مکمل کرچکا ہوں۔‘‘

مولوی صاحب کو ایسا شاک لگا کہ وہ گنگ ہوکر رہ گئے۔ ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بڑی کوشش کے بعد انھوں نے خود کو سنبھالا۔ ’’کک۔ کیا... کیا مطلب! تم ہوم ورک پہلے ہی کرچکے ہو؟‘‘

’’جی... جی ہاں۔‘‘

’’ہر مضمون کا... تمام مضامین کا؟‘‘

’’جی مولوی صاحب‘ تمام مضامین کا۔ لاکر دکھاؤں آپ کو؟‘‘

’’ہاں... دکھاؤ تو۔‘‘

’’ابھی لاتا ہوں۔‘‘ اوتار سنگھ نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

مولوی صاحب نے پیشانی سے پسینا پونچھا۔ ہوم ورک دیکھنے میں انھیں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ انھیں یقین تھا کہ اوتار سنگھ نے کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ بس اس بہانے انھیں کچھ مہلت مل گئی۔ اب تو وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں یہ لڑکا جن تو نہیں۔

کچھ دیر بعد اوتار سنگھ ہوم ورک کی کاپیاں لے آیا اور ہوم ورک چیک کرانے لگا۔ مولوی صاحب بے دلی سے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ’’ٹھیک ہے‘ شکر ہے کہ میں شرمندگی سے بچ گیا۔‘‘

’’چلیں... پڑھائی شروع کریں۔‘‘ اوتار سنگھ نے خوش ہوکر کہا۔

اب مولوی صاحب اور کیا کرسکتے تھے۔ وہ اسے پڑھانے لگے۔

اس رات مولوی صاحب پھر الجھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے وہی مسئلہ تھا۔ اب اوتار سنگھ جب عربی میں کچھ پڑھنا چاہے گا تو وہ کیا کریں گے؟ اس سوال کا تو کوئی جواب انھیں نہیں سوجھ رہا تھا۔ البتہ یہ انھوں نے سوچ لیا کہ وہ اپنے پڑھائے ہوئے کو بار بار ری وائز کراتے رہیں گے۔ اوتار سنگھ ایسا شاگرد تو ہے نہیں کہ کوئی اعتراض کرے۔ اس سے یہ ہوگا کہ اس کی بنیاد اور مضبوط ہوجائے گی۔

لیکن اصل مسئلے کا حل ابھی تلاش کرنا تھا۔ ری وائز کرانا اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے بالآخر ایک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا... یہ کہ وہ اردو کی کہانیاں اور داستانیں خود عربی میں منتقل کریں۔

یہ سوچنے کے بعد وہ مطمئن ہوگئے۔ مگر ساتھ ہی انھیں احساس ہوا کہ ان کا یہ شاگرد ان کے لیے کتنا فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی صلاحیتوں سے متعارف ہو رہے تھے۔ ورنہ شاید انھیں کبھی اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کا خیال نہ آتا۔

اس رات وہ سوئے تو بے حد مطمئن تھے۔

* * *

چھٹیاں اب ختم ہورہی تھیں۔ اسکول کھلنے سے تین چار دن پہلے وہ دہلی کے لیے روانہ ہوجاتے تاکہ وہاں رہنے کھانے کا بندوبست کرلیا جائے۔ چناں چہ وہ گڑھی میں ان کی آخری رات تھی۔

اوتار سنگھ معمول کے مطابق پتا جی کے پاؤں دبا رہا تھا۔ لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہت بے چین تھا۔ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔

’’کیا بات پتا جی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟‘‘ اوتار سنگھ نے پوچھا۔

’’اب طبیعت کا کیا پوچھتے ہو پتر۔ اب سال بھر ایسے ہی رہنا ہے۔‘‘

’’ایسی باتیں نہ کریں پتا جی۔‘‘

’’چھوڑو پتر۔ تم بس مجھ سے لپٹ کر لیٹ جاؤ۔‘‘

اوتار سنگھ ٹھاکر سے لپٹ گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب پتا جی کو اس نئے معمول کی... اس سے لپٹ کر سونے کی عادت ہوگئی ہے۔ یہ سال تو انھیں بہت ہی بھاری لگے گا۔ اسے یاد آیا کہ جب پہلی بار وہ ان سے لپٹ کر سویا تھا تو انھوں نے کہا تھا کہ مدت سے وہ نیند کو ترسے ہوئے ہیں۔ تو کیا اب وہ پھر رات رات بھر جاگا کریں گے۔

اس خیال سے وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا علاج ہے اس کا؟

’’کیا یہ نہیں ہوسکتا پتر کہ تم دو دن اور رُک جاؤ۔‘‘ ٹھاکر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

ٹھیک ہے پتا جی۔ جو آپ کی اِچھا۔ اوتار سنگھ نے بلا جھجک کہا۔ ’’اس بار تو میرا بالکل دل نہیں چاہتا ہے جانے کو۔‘‘

ٹھاکر کو اس پر شدت سے پیار آیا۔ اس نے اسے بھینچ لیا۔ ’’تم بہت اچھے ہو پتر۔ میں تو بچوں کی سی بات کر بیٹھا اس سمے۔ ارے جانا ہے تو جانا ہے۔ دو دن سے کیا فرق پڑے گا۔ سال تو اکیلے ہی بتانا ہے نا۔‘‘

اوتار سنگھ کا دل کٹنے لگا۔ ’’پتا جی... ایسا ہے کہ میں اسکول نہیں جاتا۔‘‘ اوتار سنگھ نے بے حد خلوص سے کہا۔ کہنے کو تو وہ باپ کی محبت میں یہ بات کہہ گیا۔ لیکن فوراً ہی اس کی نگاہوں میں وہ کوٹھا پھر گیا۔ سماعت میں وہ آواز گونجنے لگی۔

مشفق خواجہ

حسِ مزاح مشفق خواجہ کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُن کا ہدف عموماً میں ہی بنتا، شاید اس لیے کہ شفقت کا اظہار بھی سب سے زیادہ مجھی سے فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا، ’’طارق! تمھارے بچے ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں۔ ذہین بھی ہیں اور سعادت مند بھی۔‘‘ قدرے توقف کے بعد فرمایا، ’’کیا ہی اچھا ہوتا، اگر یہ خوبیاں اُن کے باپ میں بھی ہوتیں!‘‘

ایک بار میں نے اُن کے ایما پر سب بھائی بہنوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے، اچانک اُنھوں نے سب کو مخاطب کر کے فرمایا، ’’دیکھیں، آج طارق کس تیزی سے کھانا کھا رہا ہے! دراصل آج یہ جو کچھ کھالے گا، وہی اِس کی بچت ہوگی۔‘‘

ایک مرتبہ والدِ گرامی پر ایک نوٹ اُنھوں نے مجھ سے لکھوایا جو غلطی سے اُن کے نام سے چھپ گیا۔ میں نے ازراہِ مذاق بھائی بہنوں کے اجتماع میں کہا کہ مشفق بھائی جان نے میرا ایک مضمون اپنے نام سے چھپوا لیا ہے، فوراً فرمایا، ’’ہاں، میں بہت شرمندہ ہوں۔ کئی لوگوں نے اُسے پڑھ کر کہا کہ میری تحریر کا معیار بہت گر گیا ہے!‘‘

آپ نے گھر کے دروازے پر ایک بورڈ آویزاں کر رکھا تھا۔ پیشگی اطلاع کے بغیر زحمت نہ فرمائیں... جب کوئی صاحب پیشگی اطلاع کے بغیر زحمت فرما لیتے، اور معذرت پیش کرتے تو آپ مسکرا کر فرماتے، ’’یہ بورڈ میں نے آپ کے لیے نہیں اپنی بیوی کے لیے آویزاں کیا ہے۔‘‘

’’جوش اور خامہ بگوش‘‘ از خواجہ طارق ● مطالعہ۔ کاشف حسین فائز

لیکن وہ آزمائش بس ایک لمحے کی تھی۔ ٹھاکر نے کہا۔ ’’ایسی بات نہ کرو پتر۔ تمھاری تعلیم میرا شوق ہے۔ اسکول تو تمھیں جانا ہے۔‘‘

اوتار سنگھ اب شرمندہ تھا۔ اسکول جائے بغیر تو وہ خود بھی نہیں رہتا۔ یہ خیال اسے شرمندہ کر رہا تھا کہ اُس آواز والی کی محبت‘ باپ کی محبت کے مُنہ لگ رہی ہے۔

’’تو پتا جی‘ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ وہیں رہیں۔‘‘

اس نے کہا۔

"نہیں پتر... یہ کہاں ممکن ہے۔ جیون کی بندشوں سے کہاں چھوٹتا ہے منش۔ چھوڑو اس بات کو۔"

مگر بات چھوڑ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آنکھیں بند کر لینے سے مسائل ختم نہیں ہو جاتے۔ یہ وہ رات تھی کہ وہ دونوں ہی نہیں سو سکتے تھے۔ یہ ان کے جاگنے کی رات تھی۔ دونوں کو معلوم تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ لیکن وہ سونے کی اداکاری کرتے رہے۔

وقت گزر ہی جاتا ہے۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ صبح روانگی تھی۔ وہ دو راجپوتوں کے لیے سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بہ ہر حال، وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔

* * *

دہلی میں سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ بس ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ سرفراز بیگم کو ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ انھوں نے بچیوں کو قرآن کی تعلیم تو دلا دی تھی لیکن ان کی دینی تعلیم ابھی نامکمل ہے۔ حدیث شریف اور سیرتِ مبارکہ کے علم کے بغیر تو وہ مکمل نہیں ہو سکتی۔

محلے میں ایک خاتون تھیں... مہر النسا۔ سنا تھا کہ وہ ان علوم میں طاق ہیں۔ سرفراز بیگم نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے گھر میں ہی بچیوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ لیکن سرفراز بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بچیاں گھر سے باہر قدم رکھیں۔

"آپ گھر پر آنے کی زحمت نہیں کر سکتیں؟" سرفراز بیگم نے مہر النسا سے کہا۔

مہر النسا کچھ ہچکچائیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہاں اس زحمت کی انھیں معقول فیس بھی ملے گی۔ "آپ انھیں میرے گھر ہی بھیج دیں نا۔ اجتماعی تعلیم زیادہ موثر اور دل نشیں ہوتی ہے۔" انھوں نے کہا۔

"آپ میری بچیوں کے لیے وقت نکالیں نا۔" سرفراز بیگم نے اصرار کیا۔

مہر النسا سوچ میں پڑ گئیں۔ "ان بہت ساری بچیوں کو میں نہیں چھوڑ سکتی جو میرے گھر پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"یہ تو میں چاہتی بھی نہیں۔ آپ الگ سے کوئی وقت دے دیں۔"

کچھ سوچ بچار کے بعد مہر النسا نے کہا۔ "تو ٹھیک ہے۔ میں عصر اور مغرب کے درمیان انھیں پڑھا دیا کروں گی۔"

تینوں لڑکیاں اس نئی مصروفیت سے بہت خوش تھیں۔ ا کی، روز و شب کی یکسانیت سے جان چھوٹ گئی تھی۔ یہ معمول انھیں بہت خوش گوار لگا تھا۔

دوسری طرف حور بانو اوپر والوں کی آمد کا ایک ایک دن گن رہی تھی۔ اسکول کھلنے میں ایک ہفتہ رہ گیا تو اُس نے اُن انتظار شروع کر دیا۔ لیکن اس انتظار میں، نہ کوفت تھی نہ اُداسی کیوں کہ یہ یقینی انتظار تھا۔ اسکول کھلنے سے پہلے انھیں بہ ہر حال آنا تھا۔ سو اب حور بانو کے لیے ہر لمحہ ان کے انتظار کا تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکراتی رہتی۔ بار بار چلمن کی طرف جاتی۔ چ لمحے وہاں کھڑی رہتی اور پھر لوٹ آتی۔ وہ بہت کم گو لیکن بے خوش مزاج ہو گئی تھی۔

چار دن اس انتظار میں گزر گئے اور وہ نہیں آئے، لیکن حور بانو خوش تھی۔ آج نہیں تو کل... وہ آ ہی جائیں گے۔

اور پانچویں دن وہ آ گئے!

ان کی آمد سے چند لمحے پہلے حور بانو کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا اور اس کے قدم خود بہ خود چلمن کی جانب اٹھے۔ وہ وہاں جا کر کھڑی ہوئی ہی تھی کہ ایک بگھی اور تانگا سامنے آ کر رُکا۔

تب حور بانو نے دو ماہ کے بعد پہلی بار چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ ان دو مہینوں میں وہ پہلے سے اونچا ہو گیا تھا۔ یا شاید یہ اُس کا گمان تھا۔

* * *

اوتار سنگھ کے دہلی جانے کے بعد وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پہلی رات تھی۔

دن تو جیسے تیسے اِدھر اُدھر کی مصروفیات میں گزر گیا۔ مگر اب رات... پہاڑ جیسی رات مُنہ پھاڑے کھڑی تھی۔ یہ رات جس سے وہ بہت پہلے سے خوف زدہ تھا۔ سوچتا رہتا تھا کہ یہ رات آئے گی تو وہ کیا کرے گا... کیا گزرے گی اس پر۔ اور اب یہ رات آ گئی تھی۔

سارے معاملات نمٹانے کے بعد وہ مجبوراً اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اپنا سیف کھول کر اس نے وہ کتابیں نکالیں جو وہ چھپا کر رکھتا تھا۔ اس مطالعے میں اس کا خوب دل لگتا تھا۔ لیکن اس روز معاملہ مختلف تھا۔ وہ کتاب کھول کر پڑھ رہا تھا لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں پڑھ رہا تھا۔ اسے ایک لفظ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ پھر وہ ری سانس لے کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ 'یہ تو پہلی رات ہے۔' نے سوچا، 'اور ایک سال میں 365 راتیں ہوتی ہیں۔ بنے گا میرا؟'

اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت ناخوش تھا۔ کچھ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھا وہ۔ حد یہ ہے کہ اس نے اوتار سنگھ بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر اس سے اُس کے بارے ہی نہیں سوچا گیا۔

اس نے اپنی ڈائری نکالی اور بڑی بے دلی سے قلم اٹھایا۔ ن اگلے ہی لمحے وہ لکھنے میں محو ہو گیا۔

اس ڈائری لکھنے کے شغل کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔ اجپوت ویسے بھی تلوار کے دھنی ہوتے ہیں، قلم کے نہیں۔ پھر مین داری کا بکھیڑا الگ۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ائری لکھے گا۔

زمانۂ تعلیم میں اس کا روم میٹ امان ڈائری لکھا کرتا تھا۔ اکر اسے ڈائری لکھتے دیکھ کر ہمیشہ الجھتا تھا۔ "یہ تم کیا لکھتے ہو ڈائری میں؟" اس نے امان سے پوچھا تھا۔

"بس یونہی۔" امان نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"اچھا مجھے دکھاؤ۔"

"کیا کرو گے دیکھ کر؟"

"دیکھوں گا کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو۔"

"یہ ڈائری ہے پرتاپ سنگھ۔ اور ڈائری بڑی ذاتی چیز ی ہے۔ سوری... یہ میں تمھیں نہیں دکھا سکتا۔"

"کیوں بھئی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ میں بس یکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو۔"

"یہی تو میں تمھیں سمجھا رہا ہوں..." امان نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی۔ "ڈائری میں آدمی وہ باتیں لکھتا ہے جو وہ کسی سے نہیں کر سکتا... کسی سے بھی نہیں۔ تو جو باتیں وہ کسی سے کر نہیں سکتا، وہ کسی کو پڑھوا بھی نہیں سکتا۔ اسی لیے ڈائری بڑی ذاتی چیز ہوتی ہے۔"

ٹھاکر کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ "میں تو نہیں سمجھ پایا تمھاری بات۔"

"بھئی سیدھی سی بات ہے۔ ڈائری خود کلامی ہے... ایک طرح سے خود سے گفتگو۔"

"تو کان گھما کر کیوں پکڑتے ہو؟ خود سے باتیں کر لیا کرو۔"

امان ہنسنے لگا۔ "یہ بتاؤ تم مجھے خود سے باتیں کرتے دیکھو گے تو کیا سمجھو گے۔"

ٹھاکر نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔ "پاگل ہی سمجھ سکتا ہوں۔"

"بس اس لیے میں خود سے باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ باتیں ڈائری میں لکھ لیتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں ایک بات اور نہیں آئی۔" ٹھاکر نے کہا۔

"ایسی کون سی باتیں ہو سکتی ہیں جو منش کسی سے نہیں کر سکتا۔"

اس بار امان کو حیرت ہوئی۔ "کمال کرتے ہو۔ ارے آدمی سوچنے والا جانور ہے۔ دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ اس میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے کہے تو وہ اسے برا، بہت برا سمجھنے لگے۔ آدمی تمام باتیں کسی سے نہیں کر سکتا۔"

"اپنے سب سے اچھے دوست سے بھی نہیں؟"

امان نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں تمھارا بہت اچھا دوست ہوں۔ اور تم جانتے ہو کہ راز رکھنا بھی جانتا ہوں۔ تم مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ گے تو مجھ سے آگے کبھی نہیں جائے گی۔"

"میں جانتا ہوں یہ بات۔" امان نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مگر بھائی، بہت سی باتیں میں تم سے بھی نہیں کر سکتا۔"

"بھروسا نہیں ہے مجھ پر۔" ٹھاکر کے لہجے میں خفگی تھی۔

"یہ بات نہیں۔ بھروسا ہے لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آدمی خود سے بھی کرے تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔ میں وہ باتیں خود سے نہیں کر سکتا، تم سے کروں گا تو پھر کبھی تم سے نظریں نہیں ملا سکوں گا۔ تمھارا سامنا کرنے سے گھبرانے لگوں گا۔ شاید تمھیں چھوڑ ہی بیٹھوں۔"

"تب تو مجھ بتانے کی ضرورت بھی نہیں..." ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ "میں تمھیں کھونا نہیں چاہتا۔"

"چلو، بات تمھاری سمجھ میں تو آئی..." امان بولا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایسا تمھارے ساتھ بھی ہوتا ہوگا... تو تم کیا کرتے ہو؟"

"مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہم ٹھاکر لوگ تو ہر بات صاف کرنے کے قائل ہیں۔ میرے دل میں جو بھی آتی ہے، میں کسی سے بھی کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔"

امان نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "اتنا مت اکڑو۔ ابھی تم اس سے محفوظ ہو۔ لیکن یہ وقت ہر

انسان پر آتا ہے۔"

"مجھ پر نہیں آئے گا۔" ٹھاکر نے بڑے یقین سے کہا۔

اس کے بعد بھی برسوں گزرے۔ ٹھاکر کا یقین سلامت رہا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی پوشیدہ... خفیہ موڑ نہیں آیا۔ دوسرے وہ صاحب اقتدار تھا۔ کسی سے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔

پھر جب ٹھاکرانی کا دیہانت ہوا اور اوتار سنگھ تعلیم کے سلسلے میں دہلی چلا گیا تو وہ اکیلا رہ گیا۔ وہ ایسی تنہائی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ زندگی جیسے رینگ رینگ کر چلنے لگی اور وہ رینگنا بھی برائے نام تھا۔ وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ صبح سے شام کا انتظار رہتا۔ شام رات کے خوف میں گزرتی اور رات صبح کی آرزو میں کٹتی۔ چند ہی دنوں میں وہ اندر سے بیمار ہو گیا۔

گاؤں میں جمال دین کے علاوہ کوئی ایسا نہیں تھا جس سے وہ قربت محسوس کرتا ہو۔ شام کے بعد جمال دین کا اس کے پاس آنا اور وقت گزارنا معمول بن گیا۔

اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے ایک ہی خواب جو اس نے اور رنجیتا نے ایک ہی رات دیکھا تھا، درخت کا سوکھنا، مجذوب کی آمد اور اس کی باتیں، اوتار سنگھ کا اس کے کمرے میں پہنچنا۔ پھر اوتار سنگھ جس خاص حال میں پیدا ہوا تھا، جس کی وجہ سے دائی راجو اور شانتا کی شامت آ گئی تھی، پھر اوتار سنگھ کا دودھ سے انکار اور حمیدہ کا دودھ پینا... یہ سب ایسے معاملات تھے جنہیں وہ برسوں سے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا... وہ ان پر کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ بہت کچھ واضح طور پر جاننا... سمجھنا چاہتا تھا۔

ایک اعتبار سے جمال دین اس کا ہم راز تھا۔ ان میں سے کم از کم ایک معاملے سے واقف تھا۔ پھر اپنی فطرت، اپنی عادات اور اپنے کردار سے اس نے ٹھاکر کا دل جیت لیا تھا۔ ٹھاکر تو اسے اپنا دوست ہی سمجھتا تھا۔ لیکن وہ خود اسے زمیں دار کا اور خود کو رعیت کا درجہ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے درمیان کبھی بے تکلفی کی فضا پیدا نہیں ہو سکی۔

ٹھاکر نے کئی بار جمال دین سے اس موضوع پر بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اسے اماں کی بات یاد آئی اور تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ کچھ باتیں آدمی کسی سے نہیں کر سکتا... خود سے بھی نہیں!

یوں پہلی بار اس نے ڈائری لکھنی شروع کی۔

گاؤں میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب سے جمال دین جلدی گھر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ بھی تھی کہ نیند آتی ہی نہیں تھی۔ یہ کمی اسے مطالعے کی طرف لے گئی مطالعے نے ڈائری کی اہمیت اور بڑھا دی۔ اب تو تقریبا کچھ ایسا تھا جس پر وہ کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ چناں ڈائری لکھنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

ڈائری لکھنے کی افادیت تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا ڈائری لکھنے کے بعد وہ بوجھل نہیں رہتا تھا۔ ہلکا پھ ہو جاتا تھا۔ مگر آج اس پر ڈائری لکھنے کا ایک اور فائدہ کھلا جس وقت وہ کمرے میں آ کر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے نے مطالعے کی کوشش کی تھی مگر وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ پڑ کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دل لگ ہی نہیں رہا تھا لیکن اب ڈائری لکھنے کے بعد وہ ہلکا ہوا تو اس کتاب اٹھائی اور سرسری طور پر اسے دیکھا۔ فوراً ہی اس دل کتاب میں لگ گیا۔ وہ مطالعے میں محو ہو گیا۔

جو کتابیں وہ پڑھتا تھا، اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار بہت بھاری تھیں۔ شوق ہونے کے باوجود ایک حد سے زیادہ مطالعہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس حد سے بڑھ کر مطالعہ کرتا تو سمجھ م کچھ نہ آتا۔ لگتا تھا، خالی لفظوں سے سر ٹکرا رہا ہے۔ ایسے میں و سمجھ جاتا کہ اب مطالعہ چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب اس مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

اس وقت بھی یہی ہوا اور اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

اس نے گہری سانس لے کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی رات آدھی سے زیادہ باقی تھی اور اس کے پاس کرنے کو کچھ نہ رہا تھا۔ وہی پرانا والا مسئلہ اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا اوتار سنگھ کے جانے کے بعد اسے نیند کم ہی آتی تھی۔

وہ کمرے میں بے چینی سے، اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے تھکن کا احساس ہونے لگا دماغی طور پر تو وہ پہلے ہی تھک چکا تھا۔ ڈائری لکھنے اور مطالعے کے بعد دماغی تھکن تو ہوتا ہی تھی۔ اور اب جسم بھی تھک گیا تھا۔

تھکن کا تقاضا تھا کہ وہ لیٹ جائے۔ سو وہ لیٹ گیا۔ اس کے بعد وہی کروٹیں بدلنے کا پرانا معمول۔ کچھ دیر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس وقت اوتار سنگھ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ کبھی وہ اس سے لپٹ کر لیٹا کرتا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلائے اور جیسے اس کے ہاتھ نے اوتار سنگھ کو چھو لیا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اوتار سنگھ کا تکیہ تھا۔ مگر اس میں ارت تھی... اوتار سنگھ کے جسم کا لمس تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کر اس کا ہاتھ تکیے پر نہیں، اوتار سنگھ کے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہے۔

اس کا دل طمانیت سے بھر گیا۔ اس نے تکیے کو اپنی طرف کھینچا اور یوں سینے سے لگا لیا جیسے وہ اوتار سنگھ ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سکون اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ 'اوتار سنگھ جاتے جاتے مجھے یہ تحفہ دے گیا ہے۔' اس نے سوچا۔ 'شاید اب اس کی جدائی کا سمے اتنا سخت مشکل گزرے گا۔'

اس کا خیال درست تھا۔ کچھ دیر وہ اس تکیے کو لپٹائے لیٹا رہا۔ پھر کب اسے نیند آئی، اسے پتا ہی نہ چلا۔ اور وہ بہت گہری نیند تھی۔

⁂

مولوی صاحب گھر ان سب کے ساتھ آئے تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھے بھی پھر انھوں نے کہا۔ "اوتار سنگھ، اب میں چلتا ہوں؟"

"کہاں مولوی صاحب؟ کہاں جائیں گے آپ؟" اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

مولوی صاحب کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔ "ارے بھئی، اپنے گھر۔ اور کہاں جاؤں گا!" انھوں نے کہا۔

"گھر؟" اوتار سنگھ نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں بھئی گھر، جہاں میں رہتا ہوں۔ میرے بچے رہتے ہیں۔"

اوتار سنگھ کو شاک لگا۔ اتنے دن مولوی صاحب اس کے ساتھ رہے تھے کہ وہ یہ سب بھول ہی گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ مولوی صاحب دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کا گھر ہے، بیوی بچے ہیں اور وہ اسی اسکول میں پڑھاتے بھی ہیں جہاں وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اب وہ اپنے گھر تو جائیں گے۔ اور وہیں رہیں گے۔ وہ اُداس ہو گیا۔ تو اب وہ ان کی خدمت سے... ان کے پاؤں دبانے سے محروم ہو جائے گا!

"کچھ دیر اور رُکیں نا مولوی صاحب۔" اس نے کہا۔

مولوی صاحب نے جواب نہیں دیا۔ بس بیٹھ گئے لیکن اضطراب ان کے صرف چہرے پر نہیں تھا۔ ان کا جسم تک مرتعش تھا۔ اوتار سنگھ نے انھیں غور سے دیکھا۔ اس بار بات ایک لمحے میں اس کی سمجھ میں آ گئی۔ گھر کو اور بیوی بچوں کو ترسے ہوئے مولوی صاحب کے لیے اس وقت ایک پل بھی یہاں رُکنا دوبھر تھا۔ ان کا بس چلتا تو اُڑ کر گھر پہنچ جاتے۔ اسے احساس ہوا کہ اس وقت اس نے ان پر بڑا ظلم کیا تھا۔

"مجھے معاف کر دیجیے مولوی صاحب! آپ جائیے... گھر جائیے آپ۔" اس نے کہا۔

"چلا جاؤں گا۔ اب تین دن بعد اسکول کھل رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہو گا کہ میں تمھیں کب وقت دے سکوں گا۔"

"جی... جی ہاں۔"

"تو اب یہ سمجھ لو کہ ایک ہفتے کی چھٹی۔ اس کے بعد پڑھائی کا وقت طے کریں گے۔"

ایک ہفتے کے لیے عربی پڑھنے کی چھٹی! یہ اوتار سنگھ کے لیے تکلیف دہ بات تھی لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچوں کے لیے کچھ وقت تو ملنا چاہیے۔ پھر اسے کوٹھے کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو بے تاب ہو رہا تھا کہ شام ہو اور وہ کوٹھے پر جائے۔

"جی مولوی صاحب جیسا آپ مناسب سمجھیں..." اس نے کہا۔ "میں اتنے دن اپنا سبق دہراتا رہوں گا۔"

مولوی صاحب چلے گئے۔

اگلے چند گھنٹوں میں زندگی کے معمولات پھر سے جاری ہو گئے۔ رگھو بازار جا کر سودا لایا۔ اتنی دیر میں رنجنا نے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ رگھو سودا لے کر آیا اور وہ رسوئی میں جا گھسی۔ تین گھنٹے بعد وہ دہلی میں پہلا کھانا کھا رہے تھے۔

اوتار سنگھ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت بے چین، بہت مضطرب تھا۔ اس وقت اسے نہ اسکول کا خیال تھا، نہ اسکول کی پڑھائی کا اور نہ ہی اسے عربی کی پڑھائی کی فکر تھی۔ اس کے دماغ پر تو صرف کوٹھا سوار تھا۔ وہ یونہی وقت گزاری کے لیے کانتی پرشاد جی سے اور کبھی دصال دین سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی بے تابی ایسی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی وہ کوٹھے پر چلا گیا۔

رنجنا اوپر آ کر صفائی کر گئی تھی۔ کرسیاں اس نے جھاڑ پونچھ کر ترتیب سے رکھ دی تھیں۔ اس لیے کوٹھا ویسا ہی لگ رہا تھا جیسا وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس بار اس نے کتابیں ساتھ لانے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

وہ بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھتا... جائزہ لیتا رہا۔ لیکن گرد و پیش سے درحقیقت اسے ایسی کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ محض وقت گزاری تھی۔ چند منٹ میں ہی وہ اُکتا گیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

دیر ہو گئی مگر وہ آواز سنائی نہیں دی جس کا انتظار وہ دو ماہ سے کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ وقت سے کافی پہلے

اوپر آ گیا ہے۔ مگر پھر اسے گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ ان دو مہینوں کی دُوری میں ایسا کیا ہو گیا کہ آج وہ آواز سنائی نہیں دے رہی۔ کہیں وہ... اس 'کہیں وہ' کے آگے متعدد امکانات تھے جن پر وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے احساس بھی نہیں ہُوا کہ اس کے ٹہلنے کی رفتار دوڑنے کے برابر ہو گئی ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہُوا کہ نیچے سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے!

* * *

دو ماہ سے ترسی ہوئی حور بانو کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کی ایک جھلک دیکھ چکی تھی اور اس جھلک نے اسے اور بے تاب کر دیا تھا۔ وہ بار بار دالان کے چکر لگا رہی تھی۔

پھر اس نے اون کا گولا' اپنی سلائیاں اور ادھ بُنا سویٹر اٹھایا اور دالان میں پڑے تخت پر آ بیٹھی۔ لیکن اس کی سلائیاں حرکت میں نہیں تھیں۔ اس کیفیت میں وہ بُننے کی کوشش کرتی تو یقیناً غلط پھندے ہی ڈالتی۔

وہ وہاں بیٹھی رہی۔ اس کی نظریں نامکمل سویٹر پر تھیں لیکن سماعت اوپر والے مکان کی آوازوں پر مرکوز تھی۔ عقل اسے کہتی تھی کہ وہ شام کو اسی مخصوص وقت میں کوٹھے پر جائے گا۔ مگر دل مُصر تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرے۔ کون جانے' آج وہ جلدی ہی آ جائے۔

زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بغیر دیکھے وہ بتا سکتی تھی کہ وہ رنجنا ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ رنجنا ہی تھی جو ہاتھ میں جھاڑو لیے کوٹھے پر جا رہی تھی۔

اس کا وہاں بیٹھنا فائدہ مند ثابت ہُوا۔ اس بار قدموں کی آہٹ وہ تھی جس کے ساتھ اس کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑکتا تھا۔ وہ اس کی توقع سے خاصا پہلے اوپر جا رہا تھا' ورنہ اس کے اوپر جانے کا وقت مخصوص تھا۔

اس کی نظریں اوپر اٹھیں اور جم کر رہ گئیں۔ چند لمحے بعد چھوٹا ٹھاکر اس کے حیطۂ نگاہ میں داخل ہُوا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں نہیں تھیں۔ وہ اوپر پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے گرد و پیش سے دو ماہ کا ٹوٹا ہُوا تعلق پھر سے جوڑ رہا ہو۔

پھر وہ اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

حور بانو کی نگاہیں اس کی ایک ایک حرکت پر جمی تھیں۔ وہ والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ وہ اب بھی ٹہل رہا تھا مگر ا حور بانو کو ایک غیر محسوس تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی دا کی وجہ سے وہ شعوری طور پر تو اسے محسوس نہیں کر سکی تھی لیکن کے لاشعور نے اسے سمجھ لیا تھا۔ چناں چہ اب وہ غور کر رہی تھی۔

پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کی رف بڑھ گئی تھی۔ یہی نہیں' اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس اندرونی اضطراب کا اظہار کر رہا تھا۔

حور بانو سوچ میں پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے محض چند لمحو میں یہ تبدیلی کیسی؟ وہ آ کر بیٹھا تو پُرسکون تھا۔ پھر اس نے ٹہلنا شروع کیا' تب بھی وہ اوپر تھا۔ مگر اچانک ہی وہ مضطرب ہو گیا۔ کیوں؟

وہ اس پر سوچتی۔ مگر اسے موقع ہی نہیں ملا

"حور بانو عصر پڑھ لو۔ استانی جی آتی ہی ہوں گی۔" امی اسے پکارا۔

"جی امی' وضو کر کے آتی ہوں۔"

اس نے اٹھ کر سلائیاں' اون کا گولا اور ادھ بُنا سویٹر رکھ اور کاہلی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کرتے ہو بھی وہ کوٹھے کی طرف دیکھتی رہی۔ چھوٹے ٹھاکر کی رفتار ا اس کا اضطراب اور بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی عجیب ہی کیفیت میں تھا۔ اور حور بانو اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہ اچانک ہو کیا گیا ہے۔

وہ نماز پڑھ رہی تھی کہ استانی جی آ گئیں۔ تینوں بہنیں ا سے پڑھنے بیٹھ گئیں۔

استانی جی بہت اچھا پڑھاتی تھیں۔ ان کا انداز بڑا دل نشیں تھا۔ وہ ایسی فضا بناتی تھیں کہ اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس دن حور بانو کا دل کوٹھے پر اٹکا ہُوا تھا اور چھوٹے ٹھاکر کے اچانک مضطرب ہونے پر غور کر رہی تھی۔

پڑھائی ختم ہوئی تو مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ انھوں نے مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھتے ہی حور بانو دالان کی طرف لپکی۔ اس نے سلائیوں کو اٹھانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے نظریں اٹھا کر کوٹھے کی طرف دیکھا۔

وہاں اندھیرا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ کچھ دیکھ نہ پا چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود تھا۔

* * *

آس ایک بہت پتلے اور کم زور دھاگے کی طرح تھ اور وہ کہتی تھی کہ کسی بھی لمحے وہ آواز ایک بار پھر فضا میں ا گی۔ لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ کم زور دھاگا بھی اوتار سنگھ کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا تھا۔

پھر مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ اوتار سنگھ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسی آواز ہے اور اس کا کیا مطلب ہے مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ جس آواز سے اسے عشق ہُوا تھا' وہ نسوانی آواز اس آواز سے پہلے خاموش ہو چکی ہوتی تھی۔

آس کا وہ کم زور دھاگا بھی ٹوٹ گیا!

اوتار سنگھ کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی بہت اہم چیز اس سے چھن گئی ہے۔ مایوسی ایسی تھی جیسے دنیا میں کچھ بچا ہی نہ ہو۔ باہر جھٹ پٹے کا سماں تھا لیکن اس کے اندر تو جیسے گھُپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ٹہلنا موقوف کر کے وہ بیٹھ گیا اور یوں بیٹھا جیسے مر گیا ہو۔ خود اسے بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی۔ مگر ہاتھ تو کیا' اس سے ایک انگلی بھی نہیں ہلائی گئی۔

'یہ کیا ہُوا ہے میرے ساتھ؟ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔' اس نے گھبرا کر سوچا۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟' وہ نہایت خوف زدہ تھا۔ 'کیا یہی موت ہے؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ موت ساکت ہو جانے کا ہی تو نام ہے۔'

لیکن وہ سوچتے ہوئے ذہن کا آدمی تھا۔ بدترین صورتِ حال میں بھی اس کا ذہن تجزیہ کرنے کی راہیں نکال لیتا تھا۔ ماں کی موت جیسے صدمے پر بھی اس کا ذہن سوچتا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔

چناں چہ اس کے بعد ایک تردید ابھری۔ نہیں' یہ موت نہیں' موت تو سب کچھ ختم کر دیتی ہے۔ ماسٹر جی کہتے تھے کہ موت مکتی ہے۔ زندگی کے تمام دکھوں' تمام پریشانیوں کو مٹاتی ہے۔ منش تمام بکھیڑوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ نجات پا لیتا ہے' جب کہ وہ تو اس وقت بہت زیادہ دُکھی' بہت زیادہ مایوس ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔

پھر جس طرح بالکل اچانک اس کے اندر گھُپ اندھیرا ہُوا تھا' ویسے ہی بالکل اچانک اس گھُپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن چمکی۔ وہ ننھا سا ایک روشن نقطہ تھا۔ اس کے دل میں ایک امید جاگی۔ شاید ایسا ہے کہ نیچے والی لڑکی نے وقت تبدیل کر دیا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد یا زیادہ دیر بعد بہ ہر حال' وہ آواز ابھی آئے گی اور یہ اندھیرا روشنی میں تبدیل ہو جائے گا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے دل اور دماغ دونوں اس پر متفق تھے کہ یہ بہت موہوم امید ہے۔ بے حد دور از کار۔ اس کے باوجود اس کے اندر اس امید کے لیے قبولیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فضا بدلی اور دل نے بھی اس امید کے دھاگے کو تھام لیا۔

پڑوس کے گھروں میں کوٹھوں پر روشنی ہوئی تو اس کا کوٹھا بھی کچھ روشن ہو گیا۔ ساتھ ہی اندر کے اندھیرے میں بھی کچھ کمی ہوئی۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس نے اپنا دھیان اصل مسئلے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ مایوس اب بھی تھا۔ دو ماہ وہ اس آواز سے محروم رہا تھا اور ان دو مہینوں کے ہر دن' اور ہر دن کے ہر لمحے اس نے یہی سوچا تھا کہ چھٹیاں ختم ہوں گی' وہ دہلی جائے گا اور وہ آواز سنے گا۔ لیکن آنے کے بعد پہلے ہی دن اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ اور زیادہ مایوسی کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سوچ رہا تھا۔ شاید یہ تبدیلی مستقل ہے... شاید اب وہ کبھی یہ آواز نہیں سُن سکے گا اور اس کا یہ سوچنا فطری بھی تھا۔

اس موہوم امید کے تحت وہ اب بھی انتظار کر رہا تھا لیکن وہ نیم دلانہ انتظار تھا۔ اندر کی مایوسی کا عکس اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر اس کی سوچ کا رُخ بدلا۔ اسے ایک خیال آیا۔ یہ اس کے اندر گھُپ اندھیرے میں امید کی وہ ایک کرن کہاں سے آئی؟ اسے ماں کی موت یاد آئی۔ کیسے اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ وہ جی ضرور رہا ہے' سانس بھی لے رہا ہے لیکن زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں وہ اتنا بڑا غم خود بہ خود بھول گیا تھا۔ اس نے پھر سے ہنسنا بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت اُس نے سوچا تھا کہ وہ مہانوں کا مہان جو دنیا کا نظام چلا رہا ہے' بہت مہربان ہے۔ وہ آتما کے گہرے زخم بغیر کسی دوا کے بھر دیتا ہے۔ اور آج اس نے دیکھا تھا کہ وہ مہربان گہری مایوسی کے اندھیروں کو امید کی روشنی دیتا ہے۔ جیسے وہ کسی کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتا۔

اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ بہت دنوں سے اُس نے اس انداز میں... اس اوپر والے بھگوان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ وہ تو اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ اسے جاننا' اسے سمجھنا چاہتا تھا تا کہ وہ اس سے محبت کر سکے' کیوں کہ سب سے زیادہ محبت تو صرف اسی کا حق ہے۔

آخر وہ اپنی اس جستجو سے دُور کیسے ہُوا... کیوں ہُوا؟ اس پر اُس نے سوچا تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ تبدیلی تو اسی دن سے آئی

تھی جب اس نے پہلی بار نیچے والی لڑکی کی آواز سنی تھی۔ یہ تو طے ہے کہ اسے نہ صرف اس آواز سے... بلکہ آواز والی سے بھی محبت ہو گئی تھی۔ تو اس محبت نے اسے بدل ڈالا تھا۔ اس کے مزاج' اس کے معمولات تک کو بدل دیا تھا۔ واقعی محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

پھر اسے ایک اَور خیال آیا۔ اگر وہ اوپر والے بھگوان سے محبت کرنے کے قابل ہو جائے تو وہ محبت یقیناً دنیا کی سب سے بڑی محبت ہو گی۔ اس کے دل نے فوراً اس کی تائید کی۔ بے شک' وہ اس محبت سے بہت بڑی ہو گی جو اسے اس آواز والی لڑکی سے ہے۔ اور اس لڑکی کی محبت میں وہ اتنا کچھ بھول گیا کہ اسے اپنی جستجو بھی یاد نہ رہی تو اس محبت میں اس کا کیا ہو گا۔ کیا وہ سب کچھ بھول جائے گا' حتیٰ کہ خود کو بھی!

''بھائی' کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ تمھیں ہوش ہی نہیں۔ کب سے تمھیں آواز دے رہا ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو؟''

اس نے چونک کر وصال دین کو دیکھا جو عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''کیا... کیا بات ہے ویر جی؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔

''تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی؟'' وصال دین کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہو گیا؟''

''اتنی آوازیں دیں' تم نے سنی ہی نہیں۔ میں تمھارے سامنے کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔''

اب اوتار سنگھ کو احساس ہُوا کہ یہ بات وصال دین نے شروع میں بھی کہی تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اور بے شک' وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن نظر اٹھا کر دیکھنے سے پہلے اسے احساس بھی نہیں تھا۔

شاید وہ اپنے آپ میں بہت زیادہ کھویا ہُوا تھا۔

''اچھا' اب چلو۔ کھانا کھا لو۔'' وصال دین نے کہا۔

''ٹھیک ہے' چلتا ہوں۔'' اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہُوا۔

سچ یہ ہے کہ اسے بھوک بالکل نہیں تھی اور وہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ کھانا نہیں کھاتا تو سب لوگ اور خاص طور پر ویر جی کو تشویش ہوتی اور تشویش ہوتی تو وہ اس کی وجوہات پر غور کرتے اور یہ اوتار سنگھ نہیں چاہتا تھا۔

وہ دونوں نیچے چلے آئے۔

* * *

دہلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا!

اوتار سنگھ کے لیے وہ بدترین محرومی کے سات سخت ترین دن تھے۔ ان سات دنوں میں نہ صرف یہ کہ وہ اس آواز کو سننے کی ہر اُمید کھو بیٹھا تھا اور پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ بلکہ ہر لمحے اس کا دل بدترین اندیشوں سے لرزتا رہتا تھا۔ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔

وہ اس راز کو راز رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے پوچھ گچھ کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ معاملہ بہت سنگین اور اس کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں، جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ پھر وہ تو تھا بھی بہت ذہین۔ اس نے ایک ترکیب سوچ ہی لی۔

اس شام وہ چاندنی چوک گیا اور وہاں سے رس ملائیاں لایا۔ پھر اس نے رنجنا سے کہا۔ ''نیچے بھی دے آؤ۔''

''جی چھوٹے ٹھاکر۔''

''سنو۔ ہر ایک کے لیے دو تو ہونی چاہئیں نا۔ تو تم ایسا کرو کہ دس رس ملائیاں قاب میں ڈال کر نیچے دے آؤ۔''

رنجنا نے چند لمحے سوچا، حساب لگایا پھر بولی۔ ''دو کے حساب سے تو نیچے بارہ دینی ہوں گی چھوٹے ٹھاکر۔''

''وہ کیسے؟'' اوتار سنگھ نے معصومیت سے پوچھا۔

''وہ چھ ہیں سرکار۔ تین لڑکیاں، ایک ماں اور دو نوکر۔''

''اوہ... میں سمجھا تھا کہ آج کل کوئی ایک ان میں سے گھر میں نہیں ہے۔ شاید کہیں گیا ہُوا ہو۔''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ سب لوگ موجود ہیں۔''

''چلو تو بارہ دے آؤ۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں اطمینان تھا۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔

رنجنا نیچے چلی گئی۔ اوتار سنگھ سوچتا رہا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہُوا تھا کہ وہ بغیر کسی تردّد کے کسی بھی طرح کی پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔ آخر وہ لوگ اس کے ملازم ہیں اور اس کے سامنے چون وچرا نہیں کر سکتے۔ وہ تو اس سے ڈرتے ہیں۔ تو وہ ان سے کیوں ڈرے! بس اسے ذرا احتیاط سے کام لینا ہو گا۔

مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ پھر خوف زدہ ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس پر... اس کی محبت کے بارے میں موہوم سا شک ہو۔ ایسا ہُوا تو ملازم جو اس سے ڈرتے ہیں، کہیں گے تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن دل میں تو سوچیں گے اور اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا۔

اسے خیال آیا کہ پچھلے ایک ہفتے میں پریشان ہوکر وہ خاصی بے احتیاطی کرچکا ہے۔ اس کی وجہ اس کا یہ خیال تھا کہ ممکن ہے، نیچے والی نے وقت بدل لیا ہو۔ چناں چہ وہ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ کوٹھے پر چلا جاتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھا رہتا۔ یہاں تک کہ نیچے اندھیرا ہوجاتا اور رات کے سناٹے کے ہوا کوئی آواز نہ رہتی۔ اسے یقین ہوجاتا کہ وہ سب سوچکے ہیں۔ تب وہ مایوس واپس آجاتا۔ وہ اس آواز کے لیے ترس رہا تھا۔ مگر اس سے زیادہ اب وہ آواز والی کے لیے پریشان تھا۔ اسے رہ رہ کر ہول اٹھتے تھے کہ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔

اسی لیے آج اس نے یہ ہمت کرلی تھی اور اس کے نتیجے میں اسے معلوم ہوگیا تھا کہ لڑکی بہ ہر حال، اپنے گھر میں ہی ہے اور خیریت سے ہے۔

مگر اب وہ گومگو کی کیفیت میں تھا۔ کیا مزید پوچھ گچھ مناسب رہے گی۔ کچھ بھی ہو بس اس کا راز افشا نہیں ہونا چاہیے۔

رنجنا واپس آئی تو اس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے بڑے سرسری انداز میں کہا۔ "رنجنا یہ نیچے والے شام کے وقت کیا کرتے ہیں؟ کیا معروفیت ہوتی ہے ان لوگوں کی؟"

اس کی توقع کے خلاف رنجنا بالکل نہیں چونکی۔ "بچیاں پہلے بھی پڑھتی تھیں شام کو۔ اور اب بھی پڑھتی ہیں۔ فرق یہ ہے چھوٹے مالک کہ پہلے خود پڑھتی تھیں، اب ایک ماسٹرنی آتی ہے پڑھانے۔ اور ان کی ماتا اور بھمن بوا رسوئی میں ہوتی ہیں۔"

اوتار سنگھ ایک دم مطمئن ہوگیا۔ بلکہ وہ خوش ہوگیا۔ حالاں کہ اندازہ ہورہا تھا کہ اب وہ آواز وہ شاید ہی کبھی سن سکے۔ لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ بات اداس کن تھی کہ جب تک وہ ماسٹرنی سے پڑھیں گی وہ اس آواز کو سننے سے محروم رہے گا۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا کب ہوگا۔ مگر اس خوشی اور اطمینان کے سامنے کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے، اس اداسی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اس روز اوتار سنگھ پر محبت کی ایک اَور عظمت عیاں ہوئی۔ محبت ہو تو آدمی کی سب سے بڑی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ اس کا محبوب خوش و خرم ہو اور خیر و عافیت سے رہے۔ اپنی خوشی کہیں پیچھے چلی جاتی ہے اور اوتار سنگھ جانتا تھا کہ بے غرضی بہت بڑا انسانی وصف ہے۔

اگلے روز مولوی برکت علی نے اسکول میں اس سے رابطہ کیا۔ "برخوردار اوتار سنگھ، اب پڑھائی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ چاہیے۔" انھوں نے کہا۔

"جو آپ کا حکم مولوی صاحب!"

"میں نے بہت سوچا۔ اسکول کی چھٹی کے فوراً بعد مناسب نہیں۔ ہم دونوں ہی تھکے ہوئے ہوں گے۔ اس میرے خیال میں شام کا وقت مناسب رہے گا۔ یہ بتا وقت تمھاری کوئی معروفیت تو نہیں؟"

اوتار سنگھ نے چھٹیوں سے پہلے کی شام کے بارے سوچا۔ وہ تو اس کے لیے مقدس ترین معروفیت کا وقت ہوتا لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ وہ دن ہوتے تو وہ صاحب کو انکار کردیتا۔

مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے

"کیا بات ہے اوتار سنگھ۔ بتاؤ نا، شام کا وقت مناسب رہے نہیں تو کچھ اُور سوچتے ہیں۔"

"جی نہیں مولوی صاحب۔ یہ وقت بہت مناسب" اوتار سنگھ نے کہا۔ دل میں اس نے کہا۔ 'اس سے مناسب وقت کوئی اَور ہو ہی نہیں سکتا۔'

"تو ٹھیک ہے۔ آج شام کو میں آؤں گا۔" مولوی صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔

اوتار سنگھ گھر پر اس بارے میں سوچتا رہا۔ جتنا غور کرتا آنے والی معروفیت اسے بہت بڑی نعمت معلوم ہوتی۔ مولوی صاحب سے وہ عربی ہی تو سیکھ رہا تھا... اور محض اس آ کی وجہ سے سیکھ رہا تھا۔ اب وہ اس خاص وقت میں اس آ سننے سے محروم ہوگیا تھا۔ تو اس وقت کا اس سے اچھا مصرف اَور کیا ہوسکتا تھا کہ وہ اس میں مولوی صاحب سے پڑھے۔ آخر میں وہ ان سے کچھ سنا بھی کرے گا۔ واہ... محروم ہونے محرومی کا مداوا بھی ہوگیا تھا!

اُدھر مولوی صاحب کچھ سوچ کر جھجک رہے تھے۔ اوتار سنگھ کو اس کی حویلی میں پڑھاتے رہے تھے جہاں ان کا ایک کمرا تھا اور پڑھائی کے درمیان انھیں مکمل تنہائی میسر تھی۔ مگر یہاں معاملہ مختلف تھا۔ بہ ہر حال، پڑھانا تو تھا۔

شام کو مولوی صاحب آئے۔ وہ وہی خاص وقت تھا جب چھٹیوں سے پہلے اوتار سنگھ کوٹھے پر جاتا تھا اور وہ آواز سنتا تھا اب جب کہ آواز کا سلسلہ رُک چکا تھا تو اب بھی یہ حال تھا کہ وقت ہوتا تو اس کے قدم اوپر جانے کے لیے تھرکنے لگتے۔

"مولوی صاحب، میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو جائیں۔" اس نے کہا۔

"جو تم مناسب سمجھو اوتار سنگھ۔"

"جی نہیں۔ فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔ چلیں... میں کوٹھا دکھادوں۔"

اوتار سنگھ مولوی صاحب کو اوپر لے گیا۔ کوٹھا دیکھ کر مولوی ب کا دل خوش ہوگیا۔ انھوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور ہت سے سرہلاتے ہوئے بولے۔ "اس سے مناسب جگہ تو نہیں سکتی۔"

اوتار سنگھ بھی خوش ہوگیا۔ ایک خوشی سے... بہت بڑی سے محروم ہُوا تھا۔ مگر اس کا جو بہترین مداوا ممکن تھا، وہ ہوگیا "اور آخر میں آپ مجھے کچھ سنادیا کریں گے۔" یہ کہتے اس کے لہجے میں التجا تھی۔

مولوی صاحب نے اسے تو نہیں بتایا۔ مگر انھوں نے سوچا عصر پڑھ کر یہاں آیا کریں گے اور یہاں سے جاتے ئے جامع مسجد میں مغرب پڑھ لیا کریں گے۔ یہ فرمائش یں اور اچھی لگی۔ انھوں نے سوچا کہ یوں وہ مغرب کی اذان تلاوت بھی کرلیا کریں گے۔

"کیوں نہیں اوتار سنگھ..." انھوں نے شفقت سے کہا۔ "ب میں چلتا ہوں، کل سے اسی وقت آؤں گا۔"

"کل سے ہی کیوں مولوی صاحب؟ آج سے کیوں نہیں؟"

مولوی صاحب نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اس کی بے تابی پر انھیں پیار آگیا۔ "ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔ آج ہی سہی۔"

یوں ایک معمول دوسرے معمول میں ڈھل گیا۔

* * *

حور بانو بہت اُداس تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی کوئی بے حد یمتی چیز اُس سے چھن گئی ہے۔ اوپر والے جب واپس آئے تو وہ بہت خوش تھی لیکن اب وہ مایوس بھی تھی اور اسے محرومی کا اس بھی ستا رہا تھا۔

بہ ظاہر تو معمول میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ مغرب ھتے ہی دالان میں جاتی۔ چھوٹا ٹھاکر اسے کوٹھے پر بیٹھا نظر آتا۔ لیکن وہ بہت بجھا بجھا لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا کہ جیسے اس کی کوئی بہت قیمتی چیز چھن گئی ہے۔ وہ بس اُداس بیٹھا کچھ سوچتا رہتا۔ اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی خوش کن بات نہیں سوچ رہا ہے۔

اسے دیکھ کر حور بانو کو پہلے جیسی خوشی ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی دید دوبارہ مل گئی ہے۔ لیکن اس کی اداسی دیکھ کر اُس کا دل کٹنے لگتا تھا۔ وہ خود بھی اداس ہوجاتی تھی۔ وہ دعا کرتی کہ چھوٹے ٹھاکر کی اُداسی دُور ہوجائے۔

ایک تبدیلی اُور آئی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر اب دیر تک کوٹھے پر بیٹھا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان لڑکا اسے بلانے کے لیے آتا تھا اور پھر وہ نیچے چلے جاتے تھے۔ تیسرے چوتھے دن ایک ضرورت کے تحت حور بانو اٹھی اور بیت الخلا کی طرف گئی۔ اس وقت رات کافی ہوچکی تھی۔ اتفاقیہ طور پر اس کی نظر اٹھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر بیٹھا ہے۔

وہ بیت الخلا سے آکر کچھ دیر دالان میں بیٹھی اور چھوٹے ٹھاکر کو دیکھتی رہی۔ وہ اس وقت زیادہ ہی مضطرب تھا۔ بیٹھے ہوئے بھی اس کے چہرے کا تاثر پل پل بدلتا رہتا۔ اور ہر دو منٹ بعد وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔

حور بانو کا بس چلتا تو وہ وہاں بیٹھی رہتی۔ لیکن وہ بے وقت تھا اور وہ ڈرتی تھی کہیں امی کی آنکھ کھل جائے اور وہ اسے یہاں بیٹھا دیکھ لیں تو وہ انھیں کیا جواب دے گی۔ وہ کیا سوچیں گی اس کے بارے میں۔ اس خوف نے دل چاہنے کے باوجود اسے ٹھیرنے نہیں دیا۔

یہ سلسلہ دو تین رات تک یونہی چلا مگر اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ اس کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔

ایک شام مغرب پڑھ کر وہ دالان میں گئی تو دیکھا کہ کوٹھا اجڑا ہوا ہے۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے حیرت تو ہوئی مگر کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہُوا۔ وہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں آیا۔ کچھ دیر گزری تو وہ بے چین ہوگئی۔ اب ہر گزرتا لمحہ اسے مایوسی میں مبتلا کررہا تھا۔ پھر بھی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "حور بانو! عشا کب پڑھوگی؟"

"اٹھتی ہوں امی۔"

اس نے اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی۔ پھر خلافِ معمول وہ دالان میں واپس آئی۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر نہیں تھا۔ بہ ہر حال، وہ بیٹھ گئی۔

"حور بانو، چلو اب سو جاؤ۔ پھر صبح اٹھنے میں پریشان کرتی ہو۔"

وہ بغیر ایک لفظ کہے اٹھ گئی۔ لیکن بستر پر لیٹ کر وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ پھر جب اسے یقین ہوگیا کہ امی' بہنیں اور سب لوگ سو گئے ہیں تو وہ اٹھ کر دالان میں چلی آئی۔

مگر چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر موجود نہیں تھا۔

اس بار وہ زیادہ دیر نہیں رُکی۔ ایک تو وہ اس بات سے ڈرتی تھی کہ امی اٹھیں، اسے یہاں دیکھیں اور انھیں اس پر کسی بھی طرح کا شک ہو۔ دوسرے نہ جانے کیسے اس نے یہ جان لیا تھا کہ اب وہ چھوٹے ٹھاکر کو کوٹھے پر کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی کیفیت میں جو فرق اس نے دیکھا تھا' اس کا کوئی بڑا سبب تھا۔ وہ سبب کوئی بھی رہا ہو، اس نے چھوٹے ٹھاکر کو اس کے کسی خاص معاملے میں مایوس کردیا تھا... بہت مایوس!

اسے یقین ہوگیا تھا کہ اب چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن دل کہاں مانتا ہے۔ حور بانو اس کے بعد بھی تقریباً ایک ہفتے اس کی جستجو کرتی رہی۔ اس نے آدھی رات کو وہاں آ آ کے دیکھا۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں تھا۔

بالآخر وہ مایوس ہوگئی!

اب چھوٹے ٹھاکر کی دید کے وہی دو اوقات رہ گئے تھے۔ اسکول جاتے وقت اور اسکول سے آتے وقت اسے دیکھنا۔ حور بانو یہ موقعے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ناخوش تھی۔ دن بھر ناخوش رہتی۔ وہ چڑچڑی ہوگئی۔ بات بات پر جھنجلاتی۔ نیند بھی اس کی کم ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خوابوں سے بھی محروم ہوگئی تھی اور جب آدمی پر جھنجلاہٹ طاری رہنے لگی تو جاگتی آنکھوں تو وہ خواب دیکھ ہی نہیں سکتا۔

لیکن آدمی کے اندر اُمید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ خراب صورتِ حال میں وہ اندر... بہت نیچے، دبک کر، چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر اچانک کسی دن وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ حور بانو کو بھی وہ اُمید اچانک کبھی دالان میں لے آتی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر موجود ہوگا۔ کبھی وہ رات کو بستر سے اٹھ کر دالان میں چلی آتی۔ مگر مایوس جاتی اور ہر بار موہوم سی وہ اُمید زیادہ دن کے لیے سر جھکا کر، مُنہ چھپا کر بیٹھ جاتی۔ مگر وہ ختم بہ ہر حال، کبھی نہیں ہوتی تھی۔ ہاں، ہر بار اس کے سر اٹھانے کا دورانیہ بڑھ جاتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن ایسا اتفاق ہُوا کہ استانی جی انھیں پڑھانے کے لیے نہیں آئیں۔ یوں کافی عرصے کے بعد حور بانو کو اس خاص وقت میں آزادی ملی۔ پڑھنے کے بعد وہ بلاوجہ ہی دالان میں چلی آئی۔ وہاں بیٹھ کر چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

مگر وہاں تو اسے بن مانگے بہت بڑی خوشی مل گئی۔ ٹھاکر وہاں موجود تھا۔

خوشی ایسی تھی کہ کچھ دیر تو وہ کچھ سننے، سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ پھر اسے احساس ہُوا کہ چھوٹا ٹھاکر اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ہے اور یہ غیر معمولی بات ہے۔ ورنہ وہ تو اکیلا ہی وہاں آتا تھا۔

اس نے اُچک اُچک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ شخص جو بھی تھا' اس کی پیٹھ اس طرف تھی۔ البتہ چھوٹا ٹھاکر اس رُخ پر بیٹھا تھا۔

اب حور بانو سماعت پر زور دے رہی تھی۔ اوپر سے آواز آتی تو تھی لیکن بالکل صاف نہیں ہوتی تھی۔ بہ ہر حال، وہ سننے کی کوشش کرتی رہی۔ پہلے مرحلے میں اسے یہ اندازہ ہوگیا کہ دوسرا شخص کوئی استاد ہے اور وہ چھوٹے ٹھاکر کو پڑھا رہا ہے۔

پھر اچانک اس کے کانوں میں کچھ لفظ پڑے اور اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ وہ تو عربی زبان کے الفاظ تھے۔ وہ سماعت پر اور زور دیتی رہی۔ ذرا دیر بعد اسے یقین ہوگیا کہ چھوٹا ٹھاکر عربی پڑھ رہا ہے۔

اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر... ہندو... مُشرک... یہی اس کی شرمندگی تھی مگر اب وہ مُشرک، وہ ہندو عربی زبان پڑھ رہا ہے۔ کیوں؟ ایک ہندو کا عربی سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ پتا نہیں، کیوں، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بہت اچھی علامت ہے، کیسے...؟ اس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

وہ بیٹھی اوپر کی آوازیں سنتی رہی۔ خوشی اس کے وجود میں موج در موج اُٹھ رہی تھی۔ محبت تو اسے خود بہ خود بغیر کسی ارادے کے ہوگئی تھی۔ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہوتی تھی کہ اس کا محبوب مُشرک ہے۔ اب وہ عربی پڑھ رہا تھا تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جیسے اس کے راستے کی کوئی رکاوٹ دُور ہو رہی ہو۔

لیکن وہ کسی اور کو نہ بتاتی تو وہ خوشی ادھوری رہ جاتی۔ وہ اٹھ کر اندر گئی۔ نور بانو کچھ پڑھ رہی تھی۔ ‘‘نور... نور... اٹھو، کچھ دکھانا ہے تمھیں۔’’ اس کے لہجے میں بھی سنسنی تھی۔

نور بانو نے چونک کر' سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ‘‘باجی؟’’

‘‘میرے ساتھ چلو۔’’

‘‘کہاں؟’’

‘‘دالان میں۔ اور کہاں لے جاسکتی ہوں میں تمھیں!’’

‘‘میں پڑھ رہی ہوں باجی۔ یہیں بتادو نا۔ کیا بات ہے؟’’

‘‘بہت عجیب بات ہے۔ بتانے میں مزہ نہیں آئے گا۔ آؤ۔’’ نور بانو اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

‘‘تم بہت اول جلول ہو باجی۔ پڑھنے بھی نہیں دیتیں مجھے۔’’

نور بانو کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن بہن کے اصرار پر مان گئی۔

وہ دونوں دالان میں چلی آئیں۔ ‘‘آؤ' یہاں بیٹھو۔’’ حور بانو نے تخت پر بیٹھتے ہوئے نور بانو سے کہا۔

نور بانو بیٹھ تو گئی لیکن وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ ‘‘یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے باجی۔’’ بالآخر وہ مایوس لہجے میں بولی۔

‘‘جو میں دکھانا چاہتی ہوں وہ یہاں نہیں' اوپر ہے... کوٹھے پر۔’’

‘‘کوٹھے پر!’’ نور بانو نے حیرت سے دُہرایا۔ پھر اس نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔ ‘‘وہاں دو آدمی بیٹھے ہیں۔ مگر اس میں کیا خاص بات ہے؟’’

‘‘دیکھنا اتنا ضروری نہیں۔ تم ذرا کان لگا کر سنو۔’’

نور بانو نے چند لمحے سماعت پر زور دیا پھر بولی۔ ‘‘پڑھائی ہو رہی ہے۔’’

‘‘بالکل ٹھیک۔ مگر یہ سنو کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے۔’’

اس بار چند لمحے گزرے تو نور بانو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ‘‘ارے ہاں! یہ تو عربی پڑھا رہے ہیں۔’’

‘‘ہاں۔’’ حور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ‘‘مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عربی کیوں پڑھ رہے ہیں!’’

‘‘اس میں کیا خاص بات ہے باجی۔ لوگ عربی بھی پڑھتے ہیں اور فارسی بھی۔’’

‘‘لیکن ایک ہندو عربی کیوں پڑھنے لگا؟’’ حور بانو نے استفسار کیا۔

‘‘ہندو! یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی۔’’ نور بانو نے کہا۔ ‘‘ایک مسلمان لڑکا بھی تو رہتا ہے وہاں۔’’

‘‘وہ تو ہے۔ لیکن اس وقت جو پڑھ رہا ہے' وہ مسلمان لڑکا نہیں، چھوٹا ٹھاکر ہے۔’’

فیاضی

میر محبوب علی خان نظام دکن کا دربار لگا ہوا تھا۔ حسبِ دستور تمام ارکانِ دربار اپنے اپنے منصب پر کھڑے تھے۔ مولانا بھی اپنے مقام پر ایستادہ تھے۔ بدحواس آدمی تو تھے ہی، اِزار بند باہر لٹک رہا تھا۔ حضور نظام کی نظر پڑ گئی۔ اپنے پیش کار سے کہا، ‘‘گرامی کو دیکھو، اِزار بند لٹک رہا ہے اور کوئی ہوش نہیں!’’

پیش کار پریشان ہوا کہ کہیں عتاب نہ ہوجائے۔ جھٹ بات بنائی، ‘‘حضور والا! گرامی پریشان رہتا ہے۔ یہاں جو مشاہرہ ملتا ہے، وہ نوکر چاکر، گھوڑا گاڑی میں خرچ ہوجاتا ہے۔ وطن میں ہمشیرہ کی شادی درپیش ہے (حالاں کہ اُن کی کوئی بہن تھی ہی نہیں)۔ یہ پنجاب کے لوگ لڑکیوں کو جہیز میں سونے کے ٹھوس زیور دیتے ہیں، اس لیے بے چارہ فکر مند رہتا ہے۔’’

میر محبوب علی خان میں پرانے بادشاہوں کی سی فیاضی تھی۔ حکم دیا، ‘‘گرامی کو پانچ سیر سونا دے دیا جائے!’’

حکم کی تعمیل ہوئی۔ گرامی کو پانچ سیر سونا ملا تو اُن کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پیش کار سے ماجرا پوچھا۔ اُس نے سارا قصہ سنایا۔ شام کے وقت مولانا اپنے مکان پر یاروں میں بیٹھے کہہ رہے تھے، ‘‘ابھی تو اِزار بند لٹک رہا تھا کہ پانچ سیر سونا ملا۔ اگر کہیں کھل گیا ہوتا تو دس سیر ملتا!’’

غزالہ متین کی تحقیق، کینیڈا سے

نور بانو نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ انھیں نہیں پہچانتی تھی۔ ‘‘یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی؟’’

حور بانو چوری سی ہوگئی۔ لیکن اب وہ پہلو نہیں بچاسکتی تھی۔ ‘‘میں پہچانتی ہوں ان دونوں کو۔’’ اس نے مجوب لہجے میں کہا پھر جلدی سے صفائی پیش کی۔ ‘‘کبھی کبھی اسکول آتے جاتے نظر آ جاتے ہیں دونوں۔ یہ چھوٹا ٹھاکر ہے۔’’

نور بانو چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ‘‘واقعی یہ تو غیر معمولی بات ہے...’’ پھر وہ چند لمحے خاموش رہی۔ ‘‘لیکن باجی' میں نے سنا ہے، ہندو بھی عربی فارسی پڑھتے ہیں۔ دیکھو نا' علم تو کسی کی میراث نہیں۔’’

حور بانو سوچنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اصل میں وہ اسے غیر معمولی بات ثابت کرنا

چاہتی تھی... کسی اور کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کوئی اور اس کی تائید کرے۔

لیکن اسی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اوپر موجود پڑھانے والے نے تلاوت شروع کر دی۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی اور وہ بے حد خوب صورت قرأت کر رہا تھا اور وہ سورہ یٰسین کی تلاوت کر رہا تھا۔

لمحوں میں سماں بندھ گیا۔ اب جیسے اس آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دونوں بہنیں مبہوت ہو کر سُن رہی تھیں۔

تلاوت کرنے والے نے "صدق اللہ العظیم" کہہ کر تلاوت ختم کی اور خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں خالی خالی نظروں سے سامنے کی طرف کسی غیر مرئی چیز کو تک رہی تھیں۔ پھر انھوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔ حور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "اب کیا کہتی ہو نور بانو۔ بات صرف عربی پڑھنے کی نہیں۔ یہ تو قرآن کی تلاوت تھی۔"

"یہ تو واقعی غیر معمولی بات ہے۔" نور بانو نے کہا۔

حور بانو مسکرانے لگی۔ وہ کسی کو یہ بات بتا نہیں سکتی تھی۔ لیکن در حقیقت وہ بہت خوش تھی۔ اور وہ خوشی اس کے لیے بہت غیر متوقع تھی۔ اس نے تو چھوٹے ٹھاکر کو عربی پڑھتے سنا تھا اور نور بانو کو گواہ بنانے کے لیے لے آئی تھی۔ لیکن یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات قرآن پاک کی تلاوت تک پہنچے گی۔ یہ تو بہت بڑا معاملہ تھا۔ اب تو وہ آگے کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔ کیا چھوٹا ٹھاکر مسلمان ہو گیا ہے؟ یہ سوچتے ہوئے اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ کوٹھے پر پڑھنے والا اور پڑھانے والا، دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب انھوں نے پہلی بار پڑھانے والے کو دیکھا۔ ان کی آدھی کالی، آدھی سفید لمبی ڈاڑھی تھی۔ چہرہ نورانی تھا اور سر پر ٹوپی تھی۔

وہ دونوں بھی وضو کرنے چل دیں۔

نماز کے بعد حور بانو پھر دالان میں گئی۔ لیکن کوٹھا سنسان پڑا تھا۔

مگر اس بار حور بانو کو کوئی مایوسی نہیں ہوئی بلکہ وہ تو خوش تھی۔ اس خوشی کے لیے وہ تو چھوٹے ٹھاکر کی دید بھی قربان کر سکتی تھی۔

اس دن کے بعد اس کے خواب خوب صورت ہوتے چلے گئے!

* * *

ابتدا میں اوتار سنگھ کو اس آواز کی محرومی بہت بڑی لگی تھی۔ لیکن مداوا ہو گیا تو محرومی کا وہ زخم دھیرے دھیرے مند ہونے لگا۔ انھی اوقات میں مولوی صاحب کا عربی پڑھانا اس کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہُوا تھا۔ پھر آخر میں وہ مولوی صاحب سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتا تھا اور مولوی صاحب سناتے تو ان کی آواز کہیں دُور چلی جاتی اور وہی نسوانی آواز اس کی سماعت میں شہد اُنڈیلتی رہتی۔

پھر پڑھائی کا بوجھ بھی بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس سال اسے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ اس امتحان کی اہمیت بہت زیادہ تھی... صرف طلبا کے نزدیک ہی نہیں، اساتذہ کے لیے بھی وہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ اسکول کے میٹرک کے نتائج اس کی ساکھ سے کم نہیں ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک چیلنج تھا اساتذہ کے لیے۔ چناں چہ انھوں نے پڑھائی کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

یہ اوتار سنگھ کے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنی جماعت کا ہونہار ترین طالب علم تھا۔ لیکن کانتی پرشاد جی اسکول کے اساتذہ سے بڑھ کر اس امتحان کو چیلنج بنائے ہوئے تھے۔ ایک بات ماننے والی تھی۔ پچھلے برسوں کی طرح وہ اس بار بھی اوتار سنگھ کو پڑھائی کے معاملے میں اسکول پر سبقت دلائے ہوئے تھے۔ لیکن اوتار سنگھ کے لیے وقت مسئلہ بن گیا تھا۔ اس کے پاس فرصت کے لمحے کم... بہت کم ہوتے تھے۔

ہر آدمی کے لیے ہر محرومی کا ایک مثبت نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ بلکہ محرومی جتنی بڑی ہو، مثبت نتیجہ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اس آواز نے اوتار سنگھ کو اس کے طبعی تجسس سے اور اس کی زندگی کی ایک بہت بڑی جستجو سے محروم کر دیا تھا۔ اب وہ اس آواز سے محروم ہُوا تو اس کی فطرت کے وہ دبے ہوئے عناصر پھر اُبھر آئے۔ وہ پھر پہلے کی طرح تجسس، غور و فکر کرنے لگا... پھر سے سوچنے لگا۔

اسکول میں تفریحی پروگرام بھی ہوتے تھے۔ ایک اتوار کو اوتار سنگھ کی جماعت آم کے ایک باغ میں گئی۔ باغ شہر کے ایک بڑے رئیس کا تھا جس کا بیٹا اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہ دعوت اس کی طرف سے تھی۔

باغ دیکھ کر اوتار سنگھ کی آنکھیں کھل گئیں۔ زمین تو اس نے بہت دیکھی تھی۔ بڑے بڑے کھیت بھی دیکھے تھے اور صحرا بھی، جس کا کوئی انت نظر نہیں آتا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی، آسمان جھک کر ریت کو چومتا دکھائی دیتا۔ لیکن پھلوں کا اتنا بڑا باغ اس نے نہیں دیکھا تھا۔

اس کے ہم جماعت تو آم کھانے میں مگن تھے۔ مگر وہ ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ کچھ لڑکے درختوں پر چڑھے ہوئے تھے اور آم توڑ توڑ کر نیچے کھڑے اپنے ساتھیوں کو دے رہے تھے۔ ایک ٹولی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد آم کھانے میں مصروف تھی۔

باغ کے رکھوالے نے اسے الگ تھلگ دیکھا تو ہنس کر کہا۔ "میاں، آم کھاؤ، پیڑ کیوں گنتے ہو۔"

اوتار سنگھ گن بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک باغ کا جائزہ لیا تھا اور پیڑوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہر پیڑ دوسرے سے مختلف تھا۔ کچھ اونچے تھے، کچھ بہت چھوٹے تھے اور کچھ درمیانے۔ پھر یہی ایک فرق نہیں تھا۔ کچھ پیڑ زیادہ گھنے تھے، کچھ چھدرے، کچھ پیڑ آموں سے لدے ہوئے تھے اور کچھ پر بہت کم آم تھے۔ یہی نہیں، ایک پیڑ کی مختلف شاخوں کا معاملہ تک مختلف تھا۔ کوئی ڈال آموں سے محروم تھی اور کوئی آموں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ پھر گزرتے ہوئے اس نے آموں کے ڈھیر کو دیکھا جو اس کے ساتھیوں نے جمع کیا تھا۔ ان میں ہر طرح کے آم تھے، چھوٹے، بڑے، پیلے، ہرے، ملی جلی رنگت والے۔

"گن نہیں رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں۔" اس نے رکھوالے کو جواب دیا۔

"کھانے کی چیز کھانے کے لیے ہوتی ہے میاں، دیکھنے کے لیے نہیں۔" رکھوالے نے کہا۔ "ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم دیکھ کیا رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ پیڑ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔"

"وہ تو ہوتے ہی ہیں۔ کھا کر دیکھو میاں، تو پتا چلے گا کہ ہر آم کا ذائقہ بھی جدا ہے اور خوش بُو بھی۔"

"یقیناً ہوگی۔" اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن ایسا کیوں ہے؟"

"اللہ کی شان ہے میاں۔ اللہ کی قدرت ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی سے مختلف کیوں ہے؟ شکل و صورت الگ، کسی ایک آدمی کی آواز تک دوسرے سے نہیں ملتی۔ پھر عادتیں، مزاج اور فطرت تو ہیں ہی الگ۔"

اوتار سنگھ نے سوچا۔ 'واقعی یہ تو سامنے کی بات ہے۔'

"اور اللہ نے سب کو ایک سا بنایا ہوتا تو پہچان کیسے ہوتی! نام رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی!"

اس بار اوتار سنگھ نے باغ کے رکھوالے کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ وہ بڑی عقل کی باتیں [illegible] ایک جیسے ہیں۔" اس نے وہ مخصوص انداز اختیار کیا [illegible] جی سے باتیں اُگلوانے کے لیے کرتا تھا۔

"نہیں میاں، ایسا نہیں ہے۔ جانور بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ کسی بھی بندر کو دیکھ لو۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہمیں لگتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم ان میں دل چسپی نہیں لیتے۔ انھیں غور سے نہیں دیکھتے۔ ہاں جو جانور ہمارے ہوتے ہیں، انھیں تو ہم پہچانتے ہیں نا۔ اپنی بھینس کو ہر آدمی پہچانتا ہے۔ کوئی چوری کر لے، تب بھی شناخت کر لیتا ہے۔ ہزاروں گھوڑوں میں بھی آدمی اپنے گھوڑے کو پہچان لیتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟"

اب اوتار سنگھ کو اس گفتگو میں لطف آ رہا تھا۔ وہ بات بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن..."

"جنگل کی بات لو۔" رکھوالے نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جانور ایک دوسرے کو الگ الگ پہچانتے ہیں... بہت اچھی طرح۔ ان میں دوستیاں بھی ہوتی ہیں اور دشمنی بھی۔ ایک دوسرے کو شناخت نہ کر پائیں تو بھلا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر یہ بے جان درخت..."

"درخت بے جان نہیں ہوتے۔ یہ جان دار ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں، ہماری طرح۔ کسی درخت کو نظر انداز کریں تو وہ اُداس ہو جاتا ہے۔ کسی کو غذا نہ ملے تو سوکھ جاتا ہے۔ غذا اچھی نہ ملے تو اس کے پھل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ میں اس باغ کے ایک ایک درخت کو جانتا ہوں... پہچانتا ہوں۔"

اس بار اوتار سنگھ کو سچ مچ حیرت ہوئی۔ "واقعی! کیسے؟"

"یہاں کا ایک ایک بوٹا میرے ہاتھوں لگا ہے۔ میرے ہاتھوں پروان چڑھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کس کے پھل کا ذائقہ کیسا ہے۔"

"تو مجھے بتائیں ان کے بارے میں۔ کچھ درخت چھوٹے کیوں رہ گئے؟ کسی میں پھل کم اور کسی میں زیادہ کیوں ہیں؟"

"یہاں دو طرح کے پیڑ ہیں میاں۔ ایک تخمی اور دوسرے قلمی۔ تخمی تو وہ ہیں جو گٹھلی بوئی گئی اور اس سے کلا پھوٹا اور درخت بن گیا۔ اور قلمی وہ ہیں جو ہم نے زمین میں قلم لگائی..."

"قلم کیا ہے؟" اوتار سنگھ نے پوچھا۔ وہ تو بس لکھنے والے قلم سے واقف تھا۔

"کسی درخت کی پتلی ٹہنی کو تراشا جاتا ہے جیسے تم لکھنے والے قلم کو تراشتے ہو۔ اسی لیے اسے قلم کہتے ہیں۔ وہ قلم لگائی جاتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے پھر وہ درخت بن جاتا ہے۔"

"مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟ جب کہ گٹھلی سے بھی وہی کچھ حاصل ہوتا ہے؟" اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

"قلمی آم، تخمی آم سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ تخمی آم میں رس ہوتا ہے۔ اسے چوسا جاتا ہے جب کہ قلمی آم میں، آم تیار ہوتے ہوتے رس گودے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسے کھایا جاتا ہے۔ پھر اس میں تجربوں کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔ دو آموں کو ملا کر ایک بنایا جاتا ہے۔ پیوند کاری کی جاتی ہے۔ میں ابھی تمھیں دکھاؤں گا۔"

اوتار سنگھ بہت حیران تھا۔ "دو آموں کو ملانے کا... پیوند کاری کا کیا مطلب ہے؟"

"دو مختلف قسم کے درختوں کی قلمیں بنائی جاتی ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے ملا کر زمین میں لگایا جاتا ہے۔ یوں ایک نئی قسم وجود میں آتی ہے جس کے پھل میں ان دونوں قسموں کی خاصیتیں اور ذائقے گھلے ملے ہوتے ہیں۔"

اوتار سنگھ کے ذہن میں شادی کا خیال آ گیا۔ انسانوں میں شادی اسی طرح تو ہوتی ہے۔

"آؤ میرے ساتھ۔ میں تمھیں آم بھی کھلاؤں گا اور کچھ دکھاؤں گا بھی۔"

اوتار سنگھ باغ کے رکھوالے کے ساتھ چل دیا۔

"یہ دیکھو۔ یہ سب تخمی آم کے درخت ہیں۔" رکھوالے نے چلتے ہوئے کہا۔ "آگے میں نے الگ الگ قلمیں لگائی ہیں۔ ابھی سب دکھاؤں گا۔"

وہ بڑھتے رہے۔ باغ کے آگے والے حصے میں جو درخت تھے وہ دیکھنے میں ہی مختلف لگ رہے تھے۔ وہ زیادہ اونچے نہیں تھے۔ کچھ تو اتنے چھوٹے تھے کہ ہاتھ بڑھا کر ہی آم توڑے جا سکتے تھے۔ لیکن اونچے درختوں کے مقابلے میں لدے ہوئے تھے۔

اوتار سنگھ نے اس کی وجہ پوچھی۔

"دیکھو۔ درخت کو غذا تو اتنی ہی ملتی ہے۔ اب اگر درخت اونچا ہوگا تو وہ خوراک اس کے لیے نسبتاً کم ثابت ہوگی۔ جب کہ چھوٹے درخت کو اتنی ہی خوراک فراوانی کے ساتھ ملے گی۔ اس لیے اس پر پھل زیادہ ہوں گے۔"

اوتار سنگھ کچھ شرمندہ ہوا۔ اگر وہ سوچتا، غور کرتا تو یہ بات خود بھی سمجھ سکتا تھا۔

"دیکھو، یہ سرخاب ہے اور وہ انور رٹول ہے..." رکھوالا درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتائے جا رہا تھا۔ "اور وہ آگے میں نے ان دونوں کا ملاپ کیا ہے۔ ابھی ان میں پھل نہیں آئے ہیں۔"

رکھوالے نے آم توڑے، اپنے کندھے پر پڑا کپڑا زمین پر پھیلایا اور بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکالا اور ایک قاش کاٹ کر اوتار سنگھ کی طرف بڑھائی۔

اوتار سنگھ نے کھایا اور اس کا دل خوش ہو گیا۔ وہ بہت میٹھا تھا۔ مگر اسی درخت کے دوسرے آم میں ہلکی سی کھٹاس تھی۔ ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ تمام آموں کا بنیادی ذائقہ ایک سا ہے۔ لیکن ہر آم دوسرے آم سے مختلف ہے۔

"یہ تو ہوتا ہے۔ کسی ڈال پر دھوپ کم پڑتی ہے تو اس سے فرق پڑتا ہے۔ نیچے کی ڈالیوں کے آم عام طور پر زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ غذا ان تک پہلے پہنچتی ہے اور بھرپور بھی ملتی ہے۔ مگر ذائقے کا فرق تو ایک ڈال کے آم میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ایک باپ کے بیٹے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، صورت میں بھی اور مزاج اور فطرت میں بھی۔"

اس روز اوتار سنگھ نے اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ اور بہتر آم کھائے اور سوچنے کو جو کچھ ملا وہ اضافی انعام تھا۔

اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر وہ اسی حوالے سے سوچتا رہا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کو دیکھو تو ایک حوالے سے دوسری اور تیسری... بلکہ اَن گنت باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ بس آدمی غور تو کرے۔ دیکھے تو، سوچے تو۔ یہ فرق صرف آم کا نہیں۔ یہ تو ہر پھل میں ہوگا۔ جیسے ہر پھل اپنی جگہ ایک فرد ہے۔ اس کی سمجھ میں تو یہ آ رہا تھا... کوئی اس کے اندر بیٹھا کہہ رہا تھا... یہ سب نشانیاں ہیں، اس ہستی کی جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ یہ مربوط نظام قائم کیا ہے۔ مگر اس سے آگے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

پھر ایک دن اس نے کیلنڈر پر غور کیا۔ وہ تو بہت اہم چیز تھا۔ اسی سے آدمی وقت کا حساب رکھتا تھا۔ زندگی میں ترتیب اور تنظیم کیلنڈر کے دم سے تھی۔ اس پر اُس نے کانتی پرشاد سے گفتگو بھی کی۔ "جب کیلنڈر نہیں ہوگا تو ام چلتا ہوگا ماسٹر جی؟"

"کام تو چلتا تھا اوتار سنگھ۔ اس لیے کہ اُس وقت زندگی سست رفتار تھی۔ گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ پرانے زمانے کا ں نہیں جانتا تھا۔ اس کی اُسے اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ر تو بس بنیادی ضروریات کی فکر کرنا اور زندہ رہنا تھا۔ تو ج اور چاند تو موجود تھے نا۔ دن اور رات کا تو اسے معلوم پھر اس کے پاس اور پیمانے بھی تھے... موسم کے پیمانے۔ دی، گرمی، بہار اور خزاں۔ تب لوگ کہتے ہوں گے... دو بہار میرا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ پھر آدمی نے مشاہدے سے یہ بھی سمجھ ا کب بیج بونا فائدہ مند ہوتا ہے۔ کب فصل کٹنی چاہیے۔"

"کیلنڈر مختلف کیوں ہیں ماسٹر جی؟"

"ایک شمسی کیلنڈر ہے اور دوسرا قمری۔"

"فرق کیا ہے دونوں میں؟"

"زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ 365 دن اور چند ں میں زمین کا ایک چکر مکمل ہوتا ہے۔ اسی لیے شمسی سال ن کا ہوتا ہے۔"

"تو چند گھنٹوں کے فرق کا کیا بنتا ہے؟"

ماسٹر جی مسکرائے۔ "وہ اضافی گھنٹے تین سال میں ایک بن جاتے ہیں۔ اسی لیے تو ہر چوتھا سال لیپ ہوتا ہے... دن کا۔"

"اور قمری کیلنڈر؟"

"چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ وہ 28 دن اور چند وں میں اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ تو قمری مہینا 29 یا ن کا ہوتا ہے۔ اور سال وہی بارہ مہینوں کا۔"

"مگر یہ معلوم کیسے ہوا ماسٹر جی؟"

"گرنتھ سے... جسے علم ریاضی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا ہے... دیوتاؤں کا علم۔ اس سے آدمی نے زمین کا، سورج کا اند کا قطر معلوم کیا۔ درمیانی فاصلہ بھی معلوم کیا۔ زمانہ قبل از یح یونانیوں نے چاند اور سورج گرہن کا حساب لگایا تھا۔ نے دو ہزار عیسوی تک کے تمام گرہنوں کا وقت لکھ دیا ور اس میں سیکنڈ کے دس ویں حصے تک کا فرق نہیں ہے۔"

بعد میں اوتار سنگھ اس پر غور کرتا رہا۔ واقعی دنیا کا نظام اتنا تھا جیسے حساب کتاب سے قائم کیا گیا ہے۔ لگتا تھا کہ ہر یاضی کے تحت ایک خاص رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔ ورج، ستارے ایک سسٹم کے تحت چل رہے ہیں اور وہ ایسا ہے کہ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم رکھنے والے انسانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کب چاند کہاں ہے اور کوئی اور ستارہ کہاں ہے۔ اس کا ثبوت جنتریاں ہیں جن میں چاند سورج اور تمام ستاروں کی آگے کے وقت تک کی ہر لمحے کی پوزیشن موجود ہے۔ یہ علم فلکیات ہے جو علم نجوم میں بھی کام آتا ہے۔

وہ خیال اور راسخ ہو گیا کہ جس نے یہ پورا نظام قائم کیا ہے، وہ ہستی بہت مہان ہے۔ اس کی شکتی کی کوئی حد نہیں۔ اور منش جو کچھ بھی جانتا ہے، وہ اسی مہان ہستی نے اسے سکھایا ہے۔ مگر جو کچھ منش نہیں جانتا، وہ بہت زیادہ ہے۔

* * *

اس شام ٹھاکر پرتاپ سنگھ بیٹھا اپنی کارندوں سے باتیں کر رہا تھا کہ پنڈت روپ سہائے آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک بہت بوڑھا آدمی تھا جس کی بھویں تک سفید تھیں۔

ٹھاکر نے سر اٹھا کر ذرا خفگی سے اسے دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ "روپ سہائے، تم تو اس دن آنے کا وعدہ کر کے ایسے غائب ہوئے کہ میں تمھاری صورت بھی بھول گیا۔"

"شما کر دو ٹھاکر جی۔ پر میں نے وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

"سو تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر بیچ میں سولہ سال ہیں... پورے سولہ سال!"

"میں نے کہا تھا نا ٹھاکر جی کہ میں اپنے گرو جی کو لے کر آؤں گا۔ تو میں انھیں تلاش کر رہا تھا۔ یہ ہیں میرے گرو جی۔" روپ سہائے نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "بڑے گیانی ہیں۔ مگر سیلانی بھی ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں۔"

ٹھاکر نے بوڑھے کو غور سے دیکھا۔ "آپ کا شبھ نام؟"

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ "میں رام دیال ہوں، ٹھاکر جی۔"

"آپ نے بڑی کرپا کی کہ ہمیں درشن دیے۔"

"نہ ٹھاکر جی۔ یہ تو میرا بھاگیہ ہے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ میں تو تڑپ رہا تھا یہاں آنے کے لیے۔"

ٹھاکر کی نگاہوں میں ایک لمحے کی حیرت جھلکی۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے روپ سہائے کو دیکھا۔

"میں نے گرو دیو کو چھوٹے ٹھاکر کی جنم کنڈلی دکھائی۔ تب سے یہ بے چین ہیں انھیں دیکھنے کو..." روپ سہائے نے کہا۔ "اب تو وہ جوان ہو گئے ہوں گے۔"

"مجھے راج کمار کے درشن تو کرا دیجیے ٹھاکر جی۔" رام

دیال کی آواز لرز رہی تھی۔

”اوتار سنگھ تو دہلی میں رہتا ہے۔ وہیں اسکول میں پڑھتا ہے۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”بس گرمی کی چھٹیوں میں گھر آتا ہے۔“

پنڈت رام دیال نراش نظر آنے لگا۔ ”میں سوچتا تھا کہ ان کی دید ہوگی تو بھاگ جاگ جائیں گے۔ پرنتو مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی، چلتے ہیں۔“

وہ اٹھنے لگا تو ٹھاکر نے اس کا ہاتھ تھام کر بٹھالیا۔ ”اب میں آپ کو ایسے تو نہیں جانے دوں گا...“ اس نے کہا۔ ”یہ تو بتائیں، آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“

”بنارس سے۔“

”اتنی دُور سے...!“ ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”اتنا کشٹ اٹھا کر آپ یہاں آئے میرے پتر کو دیکھنے کو۔ اور میں نہ روکتا تو ایسے ہی واپس چلے جاتے!“

”ٹھاکر جی، میں اسی کی خاطر تو آیا ہوں اتنی دُور سے...“ پنڈت رام دیال بولا۔ ”جب چاند ہی نہیں نکلا تو رُکنا کیسا؟“

”نہیں پنڈت جی۔ آپ دو چار دن یہاں رُکیں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ آپ ایسے نہیں جاسکتے۔“

ٹھاکر کے بے حد اصرار پر پنڈت رام دیال نے ایک رات رُکنے کی ہامی بھرلی۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض مروّت میں آمادہ ہُوا ہے۔ ورنہ وہ رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ پنڈت روپ سہائے رُکنا چاہ رہا تھا۔ اور وہی اسے لے کر آیا تھا۔

ٹھاکر نے مہمان خانے میں ان کے ٹھیرنے کا بندوبست کردیا۔ رات بھوجن بھی اس نے ان کے ساتھ کیا۔

بھوجن کے بعد اس نے کہا۔ ”آپ مجھے اوتار سنگھ کے بارے میں نہیں بتائیں گے؟“

”کیا بتاؤں؟ کیا بتا سکتا ہوں؟“ پنڈت رام دیال کے لہجے میں بے بسی بھی تھی اور عاجزی بھی۔ ”میں تو خود سمجھنا چاہتا ہوں۔“

”مگر مہاراج، اس کی کنڈلی دیکھ کر کچھ تو سمجھ میں آیا ہوگا۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”بہت مشکل ہے۔ ایسی ہی کنڈلیاں تو گیان دیتی ہیں۔ مگر جیون میں ایک ایسی کنڈلی بھی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کنڈلی کبھی نہیں دیکھی...“ پنڈت رام دیال عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ ”میرے بے شمار چیلے ہیں۔ میں روپ سہائے کو اپنا اچھا چیلا مانتا ہو پرنتو یہ کنڈلی دیکھی تو مجھے اس پر شک ہونے لگا۔ مجھے اس ک سے کوئی غلطی ہوئی ہے کنڈلی بنانے میں۔ یا پھر جنم کا وقت تاریخ غلط ہے۔“

”دیکھیں مہاراج، اس کے جنم کی تاریخ اور وقت بھول ہی نہیں سکتا۔“ ٹھاکر نے تیز لہجے میں کہا۔

”میری آپ سے ایک بنتی ہے ٹھاکر جی۔“

”آپ حکم کریں مہاراج۔“

”میں آپ کی اور چھوٹے ٹھاکر کی... دونوں کی کنڈلی چاہتا ہوں...“ رام دیال نے کہا۔ ”بلکہ آپ کی پتنی کی بھی۔“

”ضرور بنائیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ ٹھاکر نے پھر اپنی رنجیتا کی اور اوتار سنگھ کی تاریخ پیدائش اور وقت بتایا۔

پنڈت رام دیال کنڈلیاں بنانے میں مصروف روپ سہائے پُرتشویش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

رام دیال نے پہلے اوتار سنگھ کی کنڈلی بنائی۔ پھر اس اپنے تھیلے سے ایک اَور کنڈلی نکالی اور تازہ کنڈلی سے موازنہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جارہی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھایا اور روپ سہائے کو ستائشی نظروں دیکھا۔ ”تمھاری کنڈلی میں رتی بھر فرق نہیں ہے۔“ اس اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

روپ سہائے پہلی بار مسکرایا۔ ”جو بھی سیکھا ہے، آپ سے سیکھا ہے مہاراج۔“ وہ بولا۔

رام دیال دوسری اور تیسری کنڈلی میں مصروف دو کنڈلیاں بنانے کے بعد اس نے اوتار سنگھ کی کنڈلی سا رکھی اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگا۔ لگتا تھا، اسے دنیا کی خبر نہیں۔

ٹھاکر اسے متوقع نظروں سے دیکھے جارہا تھا۔ اس جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ لگتا تھا کچھ بھید کھلنے والے بڑے بھید!

پھر اچانک پنڈت رام دیال نے کئی بار سر جھٹکا او شروع کیا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں اور وہ کسی کو سُنا نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے کررہا ہے۔ ”عجیب... بہت عجیب...!“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ا کنڈلی میں راج یوگ ہے... اور بہت شکتی والا راج یوگ تو چھوٹے ٹھاکر راج تو کریں گے، راجا تو بنیں گے کنڈلی میں سنت یوگ بھی ہے... اور وہ بھی بڑا شکتی والا

ی بات نہیں کہ یہ کوئی انہونی ہو۔ میں نے سیکڑوں جنم لیاں دیکھی ہیں جن میں یہ دونوں یوگ موجود تھے۔ پرنتو یاں ہے کہ دونوں یوگ ایک دوسرے کو ناکارہ کردیتے منش نہ راجا رہتا ہے نہ بھکاری۔ بس عام سا منش بن کر رہ تا ہے۔ یا یوں ہوتا ہے کہ وہ من کا راجا ہوتا ہے اور بھاگیہ کا یوں سمجھ لو کہ دونوں یوگ شکتی میں برابر ہوں تو ایک ے کو صفر کردیتے ہیں۔ اگر راج یوگ کی شکتی 4 ہو اور سنت کی 3 تو راج یوگ کا اثر ایک درجے کا رہ جاتا ہے۔“

”اوتار سنگھ کی کنڈلی میں راج یوگ کی شکتی کتنی ہے؟“ کر نے پوچھا۔

رام دیال نے اسے یوں چونک کر دیکھا جیسے اب تک اس موجودگی سے بے خبر رہا ہو۔ ”بہت ہے ٹھاکر جی، بہت گر سنت یوگ کی شکتی بھی اتنی ہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”یعنی دونوں نے ایک دوسرے کو کاٹ دیا؟“ ٹھاکر بولا۔

”نہیں ٹھاکر جی۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا۔ لیکن کنڈلی میں ادر یوگ بھی ہیں۔ سہارا دینے والے یوگ... جنھوں نے یں کٹنے نہیں دیا۔ سو میں کہتا ہوں کہ دونوں یوگ پورا اثر ڈال ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کام کررہے ہیں۔ میرے لیے ب بات ہے۔ میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا اور پھر یہی نہیں، کنڈلی میں ایسی بہت سی باتیں ہیں۔“

”مطلب کیا ہے۔ مجھے تو یہ بتائیں۔“ ٹھاکر کے لہجے میں یش بھی تھی اور بے چینی بھی۔

”چھوٹے ٹھاکر راجا ہوں گے لیکن جیون غلامی کا اریں گے۔ اور روپ سہائے سچ کہتا ہے۔ اس کنڈلی میں اتنی زیادہ ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کچھ نظر آنے لگتا ہے اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔“

”تو آپ اس سے زیادہ نہیں بتائیں گے جو روپ سہائے تایا تھا۔“ ٹھاکر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”روپ سہائے میرا سب سے گیانی چیلا ہے ٹھاکر جی...“ یال نے فخریہ لہجے میں کہا اور روپ سہائے کا سینہ چوڑا ۔ ”پرنتو میں آپ کو جو کچھ بتا سکتا ہوں، بتلاؤں گا۔ ٹے ٹھاکر کی زندگی کئی بار خطرے میں پڑے گی۔ مگر خطرے ائیں گے اور چھوٹے ٹھاکر لمبا جیون پائیں گے اور چھوٹے پریم کریں گے... دو بار۔ اور وہ سچا پریم ہوگا۔ دونوں میں کل ہوں گے۔ چھوٹے ٹھاکر کے بھاگیہ میں بدیشی سفر نہیں مگر ان کا دیہانت اپنے دیس میں نہیں ہوگا۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟“ ٹھاکر جھنجلا گیا۔ ”جب بھاگیہ میں بدیشی سفر ہے ہی نہیں تو دیہانت بدیش میں کیسے ہوگا؟“

پنڈت رام دیال نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ جو دیکھ رہا ہوں، سمجھ رہا ہوں، وہی بتا رہا ہوں۔ سمجھ میں تو میری بھی نہیں آتا۔ پرنتو کنڈلی یہی بتاتی ہے اور ٹھاکر جی بڑے گیانی ہوں گے۔ ودیارتھی ہوں گے۔ پرنتو ان کا پریم زیادہ بڑا ہوگا۔“ وہ کہتے کہتے رُکا۔ چند لمحے وہ جنم کنڈلی کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس میں اتر رہا ہو۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور بولا۔

”ٹھاکر جی، ہوتا یوں ہے کہ منش جیون میں بہت کچھ کماتا ہے۔ دولت، عزت، شہرت۔ پر جب وہ مرتا ہے تو کیول راکھ رہ جاتا ہے۔ سب کچھ ختم۔ چھوٹے ٹھاکر کو جیون میں سب کچھ ملے گا، دولت بھی، عزت بھی اور شہرت بھی۔ پر وہ ہر چیز سے بھاگیں گے... پریم کی تلاش میں وہ ہر چیز کو ٹھکرا دیں گے۔ اور جب ان کا سمے آئے گا تو موت ہی انھیں سب کچھ دے گی۔ وہ مرنے کے بعد بڑا مقام پائیں گے۔ ان کی بڑائی ان کے جینے سے بڑھ کر ان کے مرنے میں ہوگی۔“

ٹھاکر کو اکلوتے بیٹے کے مرنے کی باتیں بہت گراں گزر رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر درشتی ابھر آئی۔ مگر اسے یاد تھا۔ پنڈت رام دیال نے شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کو لمبا جیون ملے گا۔

”اب میں ذرا آپ کی اور سورگ باش ٹھاکرائن کی کنڈلی دیکھ لوں۔“ پنڈت نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”ہماری کنڈلیاں کیوں دیکھتے ہیں مہاراج۔ ٹھاکرائن تو جاچکی۔ اور میرا ابھی کیا ہے...“ ٹھاکر نے اعتراض کیا۔

”بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ جب کوئی کنڈلی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے لیے ماتا پتا کی یا پتر کی کنڈلی دیکھی جاتی ہے...“ پنڈت نے وضاحت کی۔ ”میں چھوٹے ٹھاکر کی کنڈلی کو ان دونوں کنڈلیوں سے سمجھوں گا تو زیادہ سمجھ سکوں گا۔“

ٹھاکر خاموش ہوگیا۔ پنڈت دونوں کنڈلیوں کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہرے وچار کا تاثر تھا۔ مگر پھر اچانک اس نے جھرجھری لی اور بری طرح چونکا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ اس نے سر اٹھایا، ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں۔ مگر فوراً ہی جھکالیں۔ ”شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ پرنتو میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔“

ٹھاکر اسے بہ غور دیکھتا رہا تھا۔ اس نے پنڈت کے

چہرے کے تاثر کی تبدیلی دیکھی تھی۔ اس نے جان لیا کہ کوئی بہت بڑی بات سامنے آئی ہے اور وہ بات ایسی ہے کہ پنڈت بتانا نہیں چاہتا... جب کہ وہ جاننا چاہتا تھا۔ ”مہاراج، آپ کو بتانا ہوگا۔ میں بے خبر نہیں رہنا چاہتا۔“

پنڈت نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ٹھاکر جی جو بتانے کے قابل ہو۔“

”بتانے کے قابل نہیں، تب بھی بتائیں۔ میں اپنے پتر کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔“

”یہ بات چھوٹے ٹھاکر کے متعلق نہیں۔ میرا وشواس کریں ٹھاکر جی۔“

اس پر ٹھاکر کا تجسس اور بھڑک اٹھا۔ یعنی بات اس کے یا رنجو کے متعلق تھی۔ ”تب تو ضرور بتائیں مہاراج۔“

”میں شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔“ پنڈت نے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔

”آپ اتنا بچ کیوں رہے ہیں مہاراج؟“

پنڈت واضح طور پر ہچکچا رہا تھا۔ جیسے یہ سوچ کر الجھ رہا ہو کہ کچھ بولے یا نہیں۔ لیکن تجسس تو اسے بھی تھا۔ اور وہ تجسس اسے اُکسا رہا تھا کہ جو دل میں ہے، کہہ دے۔ بالآخر تجسس جیت گیا۔ ”بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ آپ کی اور ٹھاکرائن کی کنڈلی دیکھ کر میری وڈیا نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جو سننا آپ کو اچھا نہیں لگے گا اور میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔“

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا پھر بولا۔ ”میں وچن دیتا ہوں کہ آپ سے ناراض نہیں ہوں گا۔ اور پھر یہ تو علم کی بات ہے۔ علم آپ کو کچھ بتاتا ہے تو آپ کی ذاتی بات تو نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ٹھاکر جی، پر...“ پنڈت اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ اور روپ سہائے پریشان نظر آ رہا تھا۔

”آپ چنتا نہ کریں مہاراج۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں برا نہیں مانوں گا۔“

پنڈت ہچکچایا۔ مگر پھر اس کے چہرے پر استقلال نظر آنے لگا۔ ”میں آپ سے ایک بات پوچھوں، ٹھاکر جی؟“

”ضرور پوچھیں مہاراج؟“

”چھوٹے ٹھاکر آپ کے اپنے پتر تو نہیں ہیں؟“

ٹھاکر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لگا، پنڈت نے اسے گالی دی ہے۔ شدتِ غیظ و غضب سے وہ اندر ہی اندر لرزنے لگا۔ لیکن ایسے میں بھی اسے یاد رہا کہ وہ ناراض نہ ہونے کا وچن دے چکا ہے۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”وہ لے پالک تو نہیں؟ آپ نے کسی کا بچہ لے ہو۔ اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہو۔“

ٹھاکر کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کا پتر... ٹھاکر اوتار سنگھ... بھگو کا اشیرباد... بھگوان کا سب سے بڑا تحفہ۔ وہ یہ کیسے گوارا کر دنیا میں ایک شخص بھی اس تحفے کو کچھ اور سمجھے... اس کے با میں کچھ اور گمان کرے۔ مگر اسے اپنے وچن کا بھی احساس چناں چہ اسے اپنے لہجے پر بھی قابو رکھنا تھا۔ بڑی مشکل سے نے اپنی آواز اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم راج اپنے خون پر بہت ناز کرتے ہیں مہاراج۔ ہم اپنے خون ملاوٹ گوارا نہیں کر سکتے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اُداس ہو گیا۔ ا یاد تھا کہ پتر تو اوتار سنگھ اس کا اور رنجو کا تھا۔ پر دودھ اس نے ا کا پیا تھا۔ خون میں ملاوٹ تو ہوئی تھی۔

”جانتا ہوں ٹھاکر جی۔ پر کوئی اصل راجپوت بچہ بھی سکتا ہے...“

”یہ خیال آپ کو کیسے آیا مہاراج۔“

”آپ کے اور سورگ باشی ٹھاکرائن کے بھاگیہ میں ا ہے ہی نہیں۔ جنم کنڈلیاں یہی بتاتی ہیں ٹھاکر جی۔“

ٹھاکر کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ ”آپ سے کوئی تو نہیں ہوئی ہے مہاراج؟“

”میں نے بڑی احتیاط سے کام کیا ہے ٹھاکر جی۔“

ٹھاکر کا غصہ غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ عاجزی لے لی۔ ”اوتار سنگھ میرا ہی پتر ہے مہاراج۔ اس کی پیدائش پہلے میں نے اور ٹھاکرائن نے ایک ہی رات ایک جیسا دیکھا تھا۔ اس سپنے میں ہمیں خوش خبری ملی تھی۔ اور وہ نو ما پتنی کی کوکھ میں رہا اور اس کی کوکھ سے جنم لیا۔ میرے پاس اس پورا ریکارڈ موجود ہے۔ پورا گاؤں گواہ ہے اس کا۔“

”میرے لیے آپ کا کہنا ہی کافی ہے ٹھاکر جی“ پنڈت رام دیال نے کہا۔ ”پرنتو یہ کوئی بڑی بات نہیں بھاگیہ لکھتا ہے وہ اسے کبھی بدل بھی دیتا ہے اور ہمیں پ چلتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ پرارتھنا میں بڑی شکتی ہے۔ سے بھاگیہ بھی بدل جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔ اور دیکھتا ہوں۔“

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مزید کھوج کرے۔ مگر اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

پنڈت سر جھکائے کنڈلیوں میں الجھا رہا۔ پھر اچانک اٹھایا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”آپ کی پتنی کا تین ورش پہلے... ہوا تھا۔“ اس نے تاریخ تک بتاتے کہا۔

ٹھاکر وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ تو اس کے دل پر لکھا اس نے اُداسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پنڈت نے کنڈلیوں کو مزید چند لمحوں تک بہ غور دیکھا ا۔ ”یہ سچ ہے کہ کنڈلی کے حساب سے آپ دونوں کے میں اولاد نہیں۔ لیکن آپ کی کنڈلیوں میں چھوٹے ٹھاکر کی گواہی ملتی ہے۔“

ٹھاکر نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”چھوٹے ٹھاکر کے جنم کے ساتھ آپ کا اور آپ کی پتنی دور شروع ہوا۔ آپ کے جیون کی دشا بدل گئی۔ آپ کا بدل گیا۔ آپ کی پتنی کے لیے تو یہ آسان نہیں تھا۔ لیکن نے ہنسی خوشی اسے مان لیا۔ بلکہ آپ خود ہی نئے راستے بچے۔“

ٹھاکر گھبرا گیا۔ پنڈت رام دیال خطرناک حد تک سچی بتا رہا تھا۔ ٹھاکر جانتا تھا کہ وہ تبدیل ہوا ہے۔ مگر پنڈت جانتا تھا کہ تبدیلی کا اصل عمل اب شروع ہوگا۔ اس نے ی ایسی بتائی ہے۔ بچہ نہ اس کے بھاگیہ میں تھا نہ رنجو کے۔ والے نے اسے اوتار سنگھ دیا۔ اس پر کتنی بڑی دیا کی۔ نے اپنا لکھا ہوا اس کا بھاگیہ بدل دیا۔ تو کیا وہ نہ بدلے۔ بدلتا ہے... ہنسی خوشی!

”آپ لوگ اب آرام کریں...“ ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے ”صبح آپ کے درشن ہوں گے۔“

ٹھاکر نے اگلے روز انہیں بہت کچھ دے کر رخصت یا۔

* * *

مصروفیت بہت زیادہ ہو تو وقت کے پَر لگ جاتے ہیں۔ نگھ کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ سال کب اور کیسے بیت گیا۔ کا آخری پرچہ دے کر آیا تو اس نے بڑی بے یقینی سے ارے، امتحان ختم!

پھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ خود دہلی آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی کا یہ اہم مرحلہ ہے۔ اب اس کے بیٹے کو کالج تھا۔ وہ آیا تو اسے کالج میں داخلہ دلانے کے لیے تھا لیکن بہت بڑا تھا۔ بیٹے سے لپٹ کر سونے کے لیے اسے کئی ل گئیں۔ کیسی شانتی تھی اس کے ساتھ!

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ اوتار سنگھ نے امتیازی نمبروں سے امتحان پاس کیا۔ اس دوران ٹھاکر پرتاپ سنگھ کالجوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کوئین میری کالج کو اپنے بیٹے کے لیے چن لیا۔ داخلہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اوتار سنگھ کے نمبر ایسے تھے کہ اسے کہیں بھی داخلہ مل سکتا تھا۔

اوتار سنگھ کا کالج میں داخلہ ہُوا۔ پھر وہ کالج جانے لگا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن اسے واپس تو جانا ہی تھا۔ فصلوں کا حساب کتاب، گاؤں کی دیکھ بھال کا کام وہ کیدار ناتھ پر چھوڑ کر آیا تھا۔ اور کیدار ناتھ پر اسے بھروسا نہیں تھا۔

چناں چہ وہ واپس چلا گیا!

اوتار سنگھ کو اس نئی تبدیلی کو قبول کرنے میں کچھ دن لگے۔ وہ تبدیلی تھی بھی بہت بڑی۔ اب وہ کالج کا اسکول سے موازنہ کرتا تو ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے تالاب سے نکل کر ایک بڑے دریا میں آ گیا ہے۔ اسکول میں رہ کر کالج کا جو تصور اس نے قائم کیا تھا، حقیقت میں کالج اس سے یکسر مختلف تھا۔ اسکول میں ہر پیریڈ لینا ضروری تھا۔ جب کہ کالج میں وہ آزاد تھا۔ یہاں خالی پیریڈ بھی ہوتے تھے جنھیں طالب علم اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ چاہے وہ لائبریری میں جا بیٹھے اور مطالعہ کرے۔ چاہے وہ کامن روم میں چلا جائے اور کھیل لے۔ چاہے وہ لان میں جائے اور دوسرے طلبا کے ساتھ گپ شپ کرے۔ بلکہ کالج میں وہ تو اپنی مرضی سے کوئی پیریڈ چھوڑ بھی سکتا تھا۔ یعنی وہ آزاد تھا۔

ایک اَور اعتبار سے بھی کالج بڑا دریا تھا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ یہی نہیں، طلبا اور طالبات کی اس کمیونٹی میں تمام رنگ موجود تھے۔ مذہب کے اعتبار سے بھی اور زبان اور علاقے کے اعتبار سے بھی۔ انگریز، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، مدراسی... اور نہ جانے کیا کیا۔

ایک اَور بات بھی تھی۔ اوتار سنگھ کو اسکول میں دوست بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ سنجیدہ طالب علم تھا۔ کلاس میں جان پہچان تو ہوئی مگر باقاعدہ دوستی نہیں ہوئی۔ صرف اسے ہاف ٹائم میں موقع ملتا تھا لیکن وہ وقت وہ وصال دین کے ساتھ گزارتا تھا۔

اب معاملہ مختلف تھا۔ کالج میں سوشل لائف ضروری تھی۔ اور وصال دین وہاں تھا نہیں۔ پھر اوتار سنگھ کی فطرت میں تجسس

دوسروں سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اب اسے مختلف لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور بہت کچھ جاننے کا موقع مل رہا تھا تو اسے کیسے ضائع کرتا۔ اس کے لیے موقع اسے فوراً ہی مل گیا۔ کالج کی یونین کے الیکشن ہو رہے تھے۔ وہاں پہلی بار اسے پتا چلا کہ سیاست کیا ہوتی ہے... نیچے سے اوپر تک۔ کالج میں ایک اور کام کا رویہ اسے ملا جو اسکول میں نہیں تھا اور وہ تھا اختلافِ رائے۔ ابتدا ہی میں اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اختلافِ رائے سے معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

کالج لائف میں آتے ہی پہلے تو اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ لڑکیوں کے لیے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ ایف اے سالِ اوّل کی تمام لڑکیاں اس سے دوستی کی... اس کی قربت کی متمنی تھیں۔ بلکہ سالِ دوم کی بھی کئی لڑکیوں نے اس سے دوستی کی کوشش کی۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ لڑکیوں کے اس کی طرف کھنچنے کی وجہ سے لڑکے بھی اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یعنی لڑکے ان لڑکوں سے دوستی کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں جن کی طرف لڑکیاں کھنچتی ہوں۔

بہت جلد اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ صحیح معنوں میں تعلیم اب شروع ہو رہی ہے۔ اس کے لیے جاننے اور سیکھنے کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ وہ سوالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور یہاں سب کے جواب موجود تھے۔

اوتار سنگھ بہت خوب صورت اور وجیہہ لڑکا تھا۔ وہ بے حد متناسب الاعضا تھا۔ ساکت رہتا، تب بھی جسم توانائی کا پاور ہاؤس نظر آتا۔ پھر وہ خوش لباس بھی تھا... اور اس کا لباس اس کے تموّل کا مظہر تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ساری زندگی اس نے کبھی ”نہ“ نہیں سنی تھی۔ اس کی کوئی بات کبھی ٹالی نہیں گئی تھی... رد نہیں کی گئی تھی۔ اس نے خود کو کبھی کسی سے کم تر نہیں جانا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کی فطرت میں عاجزی تھی، انکسار تھا... لیکن بہت پُراعتماد انکسار!

ابتدا میں ہی اس نے دیکھا کہ سب لوگ اس کی دوستی کے خواہاں ہیں... کیا لڑکے، کیا لڑکیاں۔ یعنی اس کے پاس دوست منتخب کرنے کے لیے بڑی ورائٹی تھی۔ اور وہ کوئی سطحی انداز میں دیکھنے اور سوچنے والا لڑکا نہیں تھا۔ چناں چہ لپکنا تو درکنار، اس نے گرم جوشی تک نہیں دکھائی۔ وہ اپنے دوستوں میں کچھ خوبیاں ضرور سمجھتا تھا اور اس کے لیے پرکھنا ضروری تھا۔

دہلی میں تین سال گزارنے کے باوجود بنیادی طور پر وہ گاؤں کا لڑکا تھا۔ مطالعہ اس کا وسیع تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ سے خوب واقف تھا۔ لیکن موجودہ سیاسی منظر سے وہ اتنا باخبر نہیں تھا۔ کالج میں اس کی سمجھ میں بہت کچھ آنے لگا۔

اسے معلوم تھا کہ ہندوستان پر انگریز حکومت کر رہے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کیوں کہ کورس کی کتابوں میں جنگِ آزادی کا تذکرہ نہیں تھا۔ ان میں اسے غدر کہا جاتا تھا... بغاوت! اور وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، وہاں انگریزوں کی مذمت نہیں کی جاتی تھی۔ تاہم وہ اپنے طور پر اس بات پر غور کرتا تھا کہ انگریز اتنی دور سے یہاں آئے اور اب اتنے بڑے ملک پر اتنی بڑی آبادی پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ اس ملک کے لوگ نااہل ہیں؟ ان میں اس ملک سنبھالنے کی، اسے چلانے کی اہلیت نہیں؟ اور ان میں غیرت بھی نہیں؟ وہ یہ نہیں سوچتے کہ دوسرے باہر سے... اتنی دور سے آئے، ان کے ملک پر قابض ہوئے اور ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں غدر کا تصور بھی مختلف تھا۔ بغاوت! کیسی بغاوت؟ بنیادی طور پر انگریزوں کو یہاں حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اگر کچھ لوگوں نے ان کا اقتدار ختم کرنے کی کوشش کی تو وہ بغاوت کیسے ہوئی۔ وہ تو اپنا حق [illegible] کی جائز کوشش تھی۔ اور جنھوں نے کوشش کی، وہ غیرت مند لوگ تھے۔ انھیں مجرم تو نہیں کہا جا سکتا۔

یہ سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب کالج میں یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے فضا موجود تھی۔ چند دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ملک میں آزادی کے لیے تحریک چل رہی ہے۔ یہی نہیں، انگریز بھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ یونین کے الیکشن میں مقابلہ دو پارٹیوں کے درمیان تھا اور دونوں پارٹیوں کا اختلاف نظریاتی تھا۔ درحقیقت وہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کی ذیلی جماعتیں تھیں۔ ایک کانگریس تھی جس میں سبھی مذاہب کے لوگ تھے۔ دوسری مسلم لیگ تھی جو صرف مسلمانوں کی جماعت تھی۔ کانگریس ملک کی آزادی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ جب کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مسلمان مملکت چاہتی تھی۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں مسلمانوں کی منطق نہیں آئی۔ اگر مذہب کی بنیاد پر الگ الگ مملکتیں بنائی جاتیں تو ہندوستان میں سکھ بھی تھے، عیسائی بھی اور پارسی بھی۔ تاریخ بتاتی تھی کہ ملک پر سیکڑوں برس سے مسلمان حکومت کر رہے تھے۔ حالاں کہ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس وقت ہندوستان ایک تھا تو اب

ں ہو؟

تی اور تعلقات کے معاملے میں اوتار سنگھ کی کچھ تھیں۔ اسے ذہین، علم دوست اور متجسس لوگ اچھے ۔ اسی اعتبار سے اس نے اپنے لیے دوستوں کا انتخاب ۔ اس کے دوستوں میں سبھی لوگ تھے... انگریز، ہندو، ں اور سکھ۔ ذہانت، علم کی لگن اور تجسس ان سب کے قدرِ مشترک تھا۔

ن سب کے درمیان بہت شدید نظریاتی اختلافات تھے کے درمیان تند و تیز بحثیں ہوتیں۔ کبھی تو ایسا لگتا کہ اب ہو جائے گی۔ لیکن ذہین، علم دوست اور متجسس لوگوں میں ہی ہوتی ہے کہ وہ روشن خیال ہوتے ہیں۔ اختلاف اپنی وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔

کالج یونین کا الیکشن ہوا اور کانگریس کی ذیلی جماعت ۔ اوتار سنگھ نے انھی کو ووٹ دیا تھا۔

لیکشن کے بعد اس روز وہ لان میں بیٹھے تھے۔ وجہ یہ تھی پیریڈ خالی تھے۔ رام گوپال نے محمود کو چھیڑ دیا۔ ”دیکھا ۔ اس الیکشن نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ...“ اس نے فاتحانہ لہجے میں محمود سے کہا۔ ”اس ملک اکثریت ہوش مندوں کی ہے، جو آزادی چاہتے ہیں۔ تقسیم کرنا نہیں چاہتے۔“

”میں تم سے اتفاق نہیں کرتا...“ محمود نے دھیمے لہجے میں دیا۔ ”یہ کالج کی یونین کا الیکشن تھا اور بس۔“

”او یار، یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ انگور کھٹے تھے...“ فتح سنگھ یہ بات تھی تو الیکشن کیوں لڑا تم نے؟“

یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمارے لوگ اس موقف کی تائید کرتے ہیں۔ دوسرے ہم رائے عامہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔“

”تو تمھیں پتا چل گیا کہ لوگ تمھارے ساتھ نہیں “ رام گوپال نے کہا۔ ”اس شکست نے تمھاری ں کھول دیں؟“

”ہاں، ہمیں پتا چل گیا کہ قوم جاگ رہی ہے۔“ محمود کا بھی نرم تھا۔ ”کالج میں 58 طلبا اور طالبات مسلمان ہیں 56 ووٹ ملے۔“

رام گوپال کا مُنھ اُتر گیا۔ ”یہ تو تنگ نظری ہے تمھاری۔ ں نے تمھیں جتوا تو نہیں دیا۔“

”یہ تنگ نظری نہیں، حقیقت پسندی ہے۔ ہمیں اپنی کا اندازہ ہونا چاہیے۔“

تب اوتار سنگھ نے پہلی بار مداخلت کی۔ ”ویسے محمود! میری سمجھ میں تم لوگوں کی منطق نہیں آتی۔ اصل مسئلہ آزادی ہے۔ ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”یہ فہم و فراست کی بات ہے۔ جب ایک جنگ سے کام چل سکتا ہے تو پے در پے دو جنگیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”کیا مطلب؟“ رچرڈ پارسن نے بھویں اُچکائیں۔

”بھئی ابھی ہم آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں اور آزادی کے فوراً بعد ہمیں علیحدگی کے لیے لڑنا ہوگا۔ تو یہ کام ابھی کیوں نہ کر لیں۔“

”بنیادی سوال یہ ہے کہ علیحدگی کی ضرورت کیوں ہے؟“ رام گوپال بولا۔

”ضرورت اس لیے ہے کہ ہمیں اپنا دینی اور قومی تشخص برقرار رکھنا ہے۔“ محمود نے جواب دیا۔

”یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ رام گوپال نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ”تمھارا قومی تشخص کیا ہے؟ یہی نا کہ تم ہندوستانی ہو۔“

”نہیں۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہیں۔ ہمارا قومی تشخص دینی تشخص سے جڑا ہوا ہے۔“ محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم اگر صرف ہندوستانی رہ گئے تو گویا ہم نے اپنی شناخت کھو دی۔ اور یہ ہم گوارا نہیں کر سکتے۔“

”تو بھائی، اتنی صدیوں سے جو تم اسی ہندوستان میں رہ رہے ہو، پہلے کبھی تمھیں یہ فکر نہیں ہوئی۔ نہ تم اپنی شناخت سے محروم ہوئے۔“ رام گوپال نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”قسم واہگورو کی رامو، تُو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ ابے اتنی صدیوں یہ صرف حکومت ہی تو کرتے رہے ہیں۔ یہ فکر کیوں ہوتی انھیں۔“ فتح سنگھ بولا۔

”یہ ہوئی نا بات۔“ رام گوپال کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ ”جب تک حکومت کرتے رہے، یہ پریشانی نہیں رہی۔ اب ہماری باری آئی تو دم نکل رہا ہے ان کا۔“

”ہاں یہی بات ہے۔ اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی کہہ دیا۔“

اوتار سنگھ کی توقع کے برعکس محمود کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ ورنہ وہ تو سمجھا تھا کہ اس دلیل کے بعد محمود مدافعانہ انداز اختیار کرے گا مگر وہ تو اس دلیل کی تائید کر رہا تھا۔

اب وہ سب محمود کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”اب ذرا اس کی وجہ بھی تو بتاؤ کہ ہماری حکومت آنے سے پہلے ہی... تجزیہ ہونے سے پہلے ہی مسلمان عدم تحفظ کا شکار

کیوں ہوگئے۔"

"اسے کہتے ہیں، قبل از مرگ واویلا!" فتح سنگھ نے چوٹ کی۔

"اور یہ ضروری ہے۔ ورنہ بعد میں کوئی ماتم کرنے والا بھی نہیں ملتا۔" محمود نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"بھیا ہم ٹھیرے جاہل اور ناسمجھ۔ وجہ بھی تم ہی بتادو۔" رام گوپال نے جل کر کہا۔

"مسلمانوں نے صدیوں یہاں حکومت کی۔ مگر ہمارا قومی اور مذہبی تشخص تو خطرے میں نہیں پڑا۔"

"حکمرانوں کے معاملے میں ظرف، رواداری اور وسیع النظری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ سب مسلمانوں میں تھا۔ اسی لیے مندر سلامت رہے۔ سب کو پوجا پاٹ کی آزادی تھی۔"

"کیا بات کرتے ہو۔" رام گوپال تنک کر بولا۔ "رواداری، ظرف، وسیع النظری، سب کہنے کی باتیں ہیں۔ محمود غزنوی نے..."

"محمود غزنوی نے کبھی ہندوستان پر حکومت نہیں کی۔ وہ کبھی ہندوستان کا حکمران نہیں رہا۔ اکبر کے عہد کی تاریخ بھی یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے۔ اور اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ بھی یاد ہے ہمیں۔" رام گوپال اب تلخ ہو رہا تھا۔

"اورنگ زیب ویسا مسلمان تھا جیسا مسلمان کو ہونا چاہیے۔ اس سے تو شکایتیں مسلمانوں کو بھی ہیں۔ بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ڈھادیے اس نے۔ وہ مزار پرستی برداشت نہیں کرسکتا تھا، بت پرستی تو بہت آگے کی بات ہے۔ اور میری بات کی سچائی اس سے ثابت ہے کہ کئی صدیوں تک مسلمان حکومت کرتے رہے۔ لیکن آج بھی ہندوستان میں ہندو بھاری اکثریت میں ہیں۔"

"کروڑوں ہندوؤں کو مسلمان کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اس دیس میں کروڑوں مسلمان کہاں سے آئے؟"

"اسلام میں تو زبردستی ہے ہی نہیں۔" محمود پھر مسکرایا۔ "یہ سب حسنِ اخلاق کا، محبت کا، سلوک کا کمال ہے۔ محمد بن قاسم سندھ میں کتنا کم عرصہ رہا۔ لیکن لوگ اس کی پوجا کرنے لگ گئے تھے۔ کیوں؟ ایک طاقت ور کا اتنے کم وقت میں دل جیت لینا سمجھ میں آتا ہے؟ جو مسلمان ہوا، اپنی خوشی سے ہوا۔ کردار اور اخلاق دیکھ کر ہوا۔ تم نے تو شودروں کو جانوروں سے بدتر بنا رکھا تھا۔ زندگی عذاب تھی ان کی۔ وہ مسلمان ہوئے عزت ملی۔ برابری کا درجہ ملا۔ سب مسلمان بھائی بھائی برتری ہے تو صرف اعمال کی ہے۔ یہ اسلام کا کمال ہے لیے تو اسے پھیلنے سے نہیں روکا جاسکا۔ تو بھائی، میں رواداری اور وسیع النظری کی بات یونہی نہیں کررہا ہوں۔"

"تمہارے خیال میں ہندوؤں میں یہ خوبیاں نہیں ان کی حکومت ہوئی تو تم اپنی پہچان کھو بیٹھوگے؟"

"ہاں۔ یہی بات ہے۔ اسی لیے پاکستان ضروری ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات ہے۔ تم ثابت کر دکھاؤ۔" رام گوپال نے چیلنج کیا۔

"ثابت کرنا کیا مسئلہ ہے۔" محمود نے کہا۔ "یہ تحریک کون چلا رہا ہے؟ ہندو ہی چلا رہے ہیں نا..."

"وہ تو انتہا پسند ہندو ہیں۔" رام گوپال نے تلملا کر کہا۔

"ہیں تو ہندو نا۔ اور ابھی تو ان کے پاس اقتدار بھی ہے۔ اقتدار آئے گا تو کیا کچھ نہیں کریں گے وہ۔ مسلمان ذبح کرتے ہیں، ہندوؤں کے لیے گائے ماں کے برابر اب بتاؤ، جھگڑا ہوگا کہ نہیں۔ ارے خون کی ندیاں بہہ گی۔ مسلمان اس خطے میں امن کی خاطر پاکستان کا کررہے ہیں۔"

"بات تو سچ ہے۔" رچرڈ پارسن نے دھیرے سے کہا۔

"تم تو سچ ہی کہوگے۔" رام گوپال رچرڈ پر اُلٹ پڑا۔ "انگریزوں کو یہ اقتدار مسلمانوں سے ہی تو ملا ہے۔ ورنہ یہ کی چڑیا تمہارے ہاتھ کہاں آتی۔"

"ہاں، یہ سچ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مسلمان حکمرانوں کم زوری کے نتیجے میں انگریز تجارت کے بہانے یہاں اور پورے ہندوستان پر قابض ہوگئے۔" محمود نے کہا۔ "یہ تو بتاؤ کہ ان کم زور حکمرانوں کو ہٹا کر ایک مضبوط حکومت قائم نہ کرنا کس کی کم زوری تھی۔ جس میں جتنی تھی، اسی حساب سے وہ کوئی علاقہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مرکزیت کی تو پورے ہندوستان کی تھی۔ صرف مسلمانوں کو قصوروار زیادتی ہے۔"

بات طول پکڑتی۔ لیکن ان کا پیریڈ شروع ہونے والا یہ بات فتح سنگھ نے یاد دلائی۔ وہ اٹھ گئے۔ محمود نے طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا دوست، مائنڈ نہ پھر کبھی بات ہوگی۔"

رام نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "نہیں، کبھی نہیں میں تم سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"ارے نہیں۔ دوستوں میں یہ جھگڑے اچھے نہیں ہوتے۔" اوتار سنگھ نے مداخلت کی۔ "دیکھو نا، یہ تو ایک علمی گفتگو تھی۔ نالج بڑھانے کے لیے ذہن کو وسعت..."

"مجھے یہ پسند نہیں۔" رام نے تنک کر کہا۔

"او کم آن۔ تم میں اسپورٹس مین اسپرٹ نہیں ہے رام۔ اِٹ واز آل اِن گڈ اسپرٹ۔" رچرڈ بولا۔ "اور بات شروع تو تمہی نے کی تھی۔"

"اور کیا۔ یاروں کے بیچ کوئی بات فرق نہیں ڈال سکتی۔" فتح سنگھ سے بھی نہیں رہا گیا۔

لیکن رام گوپال بدستور اکڑا ہوا تھا۔ بالآخر محمود نے زبردستی اسے گلے لگالیا۔

"اب مسکرا بھی دو۔" رچرڈ نے کہا۔

رام گوپال مسکرایا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے کینہ توزی جھلک رہی تھی۔ اوتار سنگھ اُسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

* * *

اوتار سنگھ کے دماغ میں نئے نئے دریچے کھل رہے تھے! دوستوں کے اس گروپ میں لڑکیاں بھی تھیں۔ ریٹا پارسن رچرڈ کی بہن تھی۔ پُشپا تھی جو ایک دولت مند ہندو گھرانے سے تھی۔ نادرہ تھی جو ایک پڑھے لکھے اور آزاد خیال مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

تینوں لڑکیاں حُسن و جمال میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ پُشپا اور نادرہ دوستوں کے اس گروپ میں اس لیے شامل ہو پائیں کہ ان کی ریٹا سے دوستی ہوگئی تھی... اور ریٹا رچرڈ کی بہن تھی۔ تینوں بے حد حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ذہین بھی تھیں اور سوچنے والی بھی تھیں۔

دوستوں کے اس گروہ سے ملنے کے بعد اوتار سنگھ کی سوچ کا منظر بہت وسیع ہوگیا تھا۔ بہت کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا، اب اس کے علم میں آرہا تھا۔ اس کے بعض نظریات کی تردید ہو رہی تھی اور بعض کی اصلاح۔ ان میں ایک نظریہ وہ تھا جو اس نے مسلمانوں کے بارے میں قائم کررکھا تھا۔

مسلمانوں کی اس کے لیے بڑی اہمیت تھی۔ ماتا جی اور پتا جی کو چھوڑ کر اس کے سب سے پسندیدہ انسان، سب کے سب مسلمان تھے۔ اماں، جو اس کے لیے ماتا جی سے کم نہیں تھیں۔ اصال دین، جو اس کے لیے بھائی تھا اور چاچا جمال دین، جس کی وہ پتا جی جیسی عزت کرتا تھا۔ پھر بعد میں اس میں مولوی صاحب بھی شامل ہوگئے جو اسے عربی پڑھا رہے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ماسٹر کانتی پرشاد کو اس نے کبھی اس درجے میں شمار نہیں کیا۔

اماں، چاچا اور وصال دین کو وہ اس وقت سے دیکھ رہا تھا جب اس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اسی لیے وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ان کے مزاج سے خوب واقف ہے۔ اور ان تینوں کے حوالے سے اس نے مسلمانوں کے بارے میں ایک نظریہ قائم کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمان بہت صلح جُو، بہت نرم خُو اور بہت منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ وہ کم سے کم اظہار کے قائل ہوتے ہیں۔ اپنی بات پر زور نہیں دیتے۔ اصرار نہیں کرتے۔ بحث سے گریز کرتے ہیں۔ بے حد تابع دار اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔

اس نے مسلمانوں کو ایسا ہی دیکھا تھا۔ اماں سب سے زیادہ کُھل کر بات کرتی تھیں۔ مگر بات کرتے کرتے اچانک چپ ہوجاتیں... گھبرا کر بات نامکمل چھوڑ دیتیں۔ اور پھر کہتیں کہ ٹھاکر جی کو پتا چل گیا تو وہ ان سب کو ختم کرادیں گے۔ اس کے بعد وہ لاکھ کریدنے کی کوشش کرتا، ان کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا۔ اور چاچا جمال دین اور ویر جی دونوں ایک سے تھے۔ پتا جی چاچا کی کتنی عزت کرتے۔ لیکن چاچا کے انداز کی عاجزی وہی رہتی۔ چاچا اور ویر جی میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں اپنے خیالات کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ ان کا عمومی رویّہ یہ تھا کہ جو کہا جاتا، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیتے۔ حالاں کہ چاچا جی کا کوئی بات سمجھانے کا طریقہ بے حد سادہ اور حد درجہ دل نشیں تھا۔ اوتار سنگھ کو آج بھی یاد تھا کہ انھوں نے لکڑی کے گھوڑے کو نظرانداز کرنے کے بارے میں اسے کیسے موثر انداز میں سمجھایا تھا اور پھر وہ اس کا گھوڑا بنے تھے۔ اسے پیٹھ پر بٹھا کر دالان میں دوڑتے رہے تھے۔ اس روز انھوں نے اسے وفاداری کا سبق ایسے دل نشیں انداز میں سکھایا تھا کہ وہ آج تک نہیں بھولا تھا۔ انھوں نے کہا تھا... ہاتھ تھام کر چھوڑتے نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔

اوتار سنگھ کو اس دن کی ایک ایک بات آج بھی یاد تھی۔

چاچا جی نے کہا تھا کہ ہر چیز کی ایک اوقات ہوتی ہے۔ کسی سے محبت کرتے وقت اس کی اوقات ضرور دیکھنی چاہیے۔ اس کے باوجود بھی محبت ہوجائے تو محبت ضرور کرو۔ لیکن جب محبت نہ رہے تب بھی یہ بات اس پر ظاہر نہ ہونے دو۔ کیوں کہ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔

اس سے پتا چلتا تھا کہ چاچا جی عقل والے ہیں۔ لیکن وہ دبّو بھی تھے۔ اپنی عقل کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ جمال دین اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھا۔ اس کے بارے میں تو اوتار سنگھ عقل مندی کا گمان کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کبھی ایسی کوئی علامت ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی۔

مگر اب کالج میں محمود کو دیکھنے کے بعد اوتار سنگھ کو مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ محمود جرأت مند بھی تھا اور سلجھے ہوئے ذہن کا مالک بھی۔ جس طرح ٹھنڈے دل اور دماغ سے اس نے اپنے موقف کا دفاع کیا تھا، وہ قابلِ رشک تھا۔

لیکن اس بحث نے اوتار سنگھ کو الجھا بھی دیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے تھے۔ یہ احساس بھی ہوا تھا کہ ملک کے سیاسی منظر نامے سے وہ ناواقف ہے۔ یہ تو پتا چل گیا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے لیے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی طے تھا کہ انگریز ہندوستان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی ہے... اور وہ بھی مرکزیت کے ساتھ... پورے ہندوستان پر!

اوتار سنگھ نے اسی بات پر غور کیا تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگیا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اتنی بھاری اکثریت پر اقلیت کا حکومت کرنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ یوں تو انگریز بھی اقلیت میں ہونے کے باوجود مدت سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ بتاتی تھی کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں امن وامان تھا، خوش حالی تھی۔ لوگوں کو انصاف ملتا تھا اور طوائف الملوکی پھیلنے سے پہلے رعایا مسلمان حکمرانوں سے محبت کرتی تھی۔ اس حکومت میں طاقت تو تھی لیکن جبر نہیں تھا۔ جب کہ انگریز بہ جبر حکومت کر رہے تھے۔ انھیں ایک بہت بڑی اور ملک گیر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا جسے انھوں نے بڑی سختی اور بے رحمی سے کچل دیا تھا۔ اوتار سنگھ کے خیال میں اسے بغاوت کہنا زیادتی تھی۔ ہندوستانی لوگ... کیا ہندو، کیا مسلمان... بجا طور پر اسے تحریکِ آزادی کہتے تھے۔

اوتار سنگھ کے لیے مسلمانوں کی کشش اور بڑھ گئی۔ ان میں خوبیاں ہوں گی تبھی تو انھوں نے اتنے طویل عرصے حکومت کی تھی۔ شیر شاہ سوری نے صرف پانچ سال میں اتنی اصلاحات کی تھیں۔۔۔ اور اتنی بڑی اور اہم اصلاحات کہ اس کے مختصر دور کو بلاشبہ سنہرا دور کہا جاسکتا تھا۔

گذشتہ بحث کے بعد اوتار سنگھ کے اندر کا طالب علم بری طرح بھڑک چکا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد سب کچھ جان لینا اور سمجھ لینا چاہتا تھا۔ گذشتہ بحث میں دو فریق تھے... محمود اور رام گوپال۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دونوں سے الگ الگ گفتگو کرے گا۔

پھر اسے رام گوپال سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اسے کینٹین میں لے گیا۔ چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے مطلب کی بات چھیڑی۔ "اس روز تمھاری اور محمود کی جو بحث ہوئی، وہ مجھے بڑی دل چسپ لگی۔"

"کچھ بھی ہو، مُسلا تو مُسلا ہی رہے گا۔" رام نے بے حد نفرت سے کہا۔ "اور یہ مُسلے سالے ہوتے ہی مطلبی ہیں۔"

رام کے لہجے کی نفرت نے اوتار سنگھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ بظاہر تو وہ معمولی سا اختلاف رائے تھا۔ لیکن یہ اتنی شدید نفرت اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ "ایسے تو نہ کہو رام۔ آخر وہ ہمارا دوست ہے۔" وہ بولا۔

"ارے کاہے کا دوست۔" رام نے بے زاری سے کہا۔ "چھپا دشمن کہو اسے۔"

"تم اوور ری ایکٹ کر رہے ہو رام۔ وہ محض ایک نظریاتی بحث تھی۔"

"نظریہ... ہُنہہ!" رام کے لہجے میں حقارت تھی۔ "یہ ہندوستان جغرافیہ ہے، کوئی نظریہ نہیں۔ وہ نظریاتی بحث نہیں تھی، جغرافیائی بحث تھی۔ یہ ہماری دھرتی ہے، ہمارا دیش ہے۔ جو نظریہ اس کے ٹکڑے کرنے کی بات کرے، میں اسے نہیں مانتا۔ نظریے کو جغرافیہ تبدیل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ذرا سوچو، اس دھرتی پر ان مُسلوں کا کیا حق ہے۔ یہ باہر سے آئے اور ہندوستان پر قابض ہوگئے۔ اکثریت کو غلام بنالیا... انگریز کی طرح۔"

"میرے خیال میں تو فرق ہے دونوں میں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "مسلمانوں نے حکومت کی، غلام نہیں بنایا۔ یہاں بہت کچھ کیا انھوں نے۔ اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ اس کی ترقی اور خوش حالی کے لیے کوشش کی۔ انگریزوں کا معاملہ اور ہے۔ وہ یہاں رہ کر بھی برطانیہ کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ وہ یہاں کی دولت برطانیہ منتقل کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"مسلمان بھی یہاں بیٹھ کر اسلام کی عظمت کے گن تے ہیں۔"

"تو یہ تو نظریاتی بات ہوئی، جغرافیائی نہیں۔" اوتار سنگھ "مسلمانوں نے ہندوستان کو انگریزوں کی طرح بدیش... ادی نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ ے اپنا دیش سمجھتے ہیں۔"

"سمجھنے سے یہ ان کا دیش ہوگا نہیں۔" رام گوپال نے ے لہجے میں کہا۔ "اب انگریز یہاں سے جانے والے ۔ دیش آزاد ہوگا۔ اور یہاں وہ لوگ حکومت کریں گے، کا حق ہے۔ ان مُسلوں کی ہوا خراب ہو رہی ہے تو صرف ای وجہ سے۔ یہ ہماری حکومت میں رعایا بن کر نہیں رہنا چاہتے۔"

اوتار سنگھ نے دل میں اس بات کی معقولیت کو تسلیم کیا۔ گر وہ اپنے ڈر کی وجہ بھی تو بیان کرتے ہیں۔"

"ڈر ان کا سچا ہے۔" رام گوپال مسکرایا۔ "اب ہماری ی ہے اور ہم ان سے گن گن کر بدلے لیں گے۔ انھوں نے صدیوں ہم پر حکومت کی اور ہمیں دبا کر رکھا۔ اب ہماری باری ہے۔ یہ تو سمے کا چکر ہے۔ تو اب وہ ڈرتے کیوں ہیں۔ جو انھوں نے کیا، اب انھیں سہنا ہوگا۔"

"اور یہ شدھی تحریک کیا ہے؟"

"اس کی بنیاد اس پر ہے کہ ہندوستان میں صرف ہندوؤں کو رہنا ہے۔ یہ دھرتی ہندوؤں کی ہے۔ تو مسلمانوں کی بہتری کے لیے انھیں شدھی کیا جارہا ہے تاکہ وہ اس دھرتی پر رہ سکیں۔"

"شدھی کیا جارہا ہے کا مطلب' ہندو بنایا جارہا ہے انھیں؟"

رام گوپال بڑی بے رحمی سے ہنسا۔ "ہندو بنایا نہیں جاتا۔ ہم خالص لوگ ہیں۔ ماں کے پیٹ سے ہندو پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ تصور نہیں۔ اسی لیے یہ شودروں کو بھی مسلمان بنا لیتے ہیں اور برابری کا درجہ دیتے ہیں۔"

اوتار سنگھ اس بات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت اتنی مہلت نہیں تھی۔ اس نے سوچا، اس پر بعد میں غور کرے گا۔ "تو ہندو نہیں بنایا جاسکتا انھیں۔ پھر شدھی کرنے کا کیا مطلب ہُوا؟"

"یہ ایک مرحلہ ہے۔ وہ مسلمان نہیں رہتے اور شودر جیسے ہوجاتے ہیں۔ ہاں اگلے جنم میں وہ ہندو پیدا ہوں گے۔"

اوتار سنگھ کو اندازہ ہوگیا کہ خود رام گوپال کو بھی پوری علومات نہیں ہیں۔ تاہم اس نے بات آگے بڑھائی۔ "یہ تو لم ہے، زیادتی ہے۔"

"ہرگز نہیں، ذرا سوچو تو۔ ہم تو اپنے ہندوؤں کو دوبارہ ان کے دھرم میں واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"مگر شدھی تو مسلمانوں کو کیا جارہا ہے۔" اوتار سنگھ الجھنے لگا۔

"وہ مسلمان جو پہلے ہندو تھے۔ ارے مسلمان آئے تو ان کی تعداد ہی کیا تھی۔ انھوں نے زور زبردستی سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ ورنہ آج مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کیسے ہوتی!"

اوتار سنگھ کے لیے یہ بات بھی قابلِ غور تھی۔ لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔ "تو تمھارے خیال میں شدھی تحریک جائز ہے؟" اس نے رام گوپال سے پوچھا۔

"بالکل۔"

"مگر اس دن تم کہہ رہے تھے کہ وہ انتہا پسند ہندوؤں کی تحریک ہے۔ ایک طرح سے تم نے اس سے بے تعلقی ظاہر کی تھی۔"

"ارے یار اسے ڈپلومیسی کہتے ہیں۔" رام گوپال آنکھ مارتے ہوئے مسکرایا۔ "ورنہ ہر ہندو انتہا پسند ہے۔" پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ "اس دھرتی پر بڑے پاپ کیے ہیں ان مُسلوں نے۔ اب یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ ہم گئو ماتا کی رکھشا کریں گے۔"

بات ختم ہوگئی کیوں کہ ان کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔

اس گفتگو سے اوتار سنگھ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رام گوپال تنگ نظر بھی ہے اور مکار بھی۔ لیکن بہ ہرحال، وہ فرد تھا۔ ضروری نہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت ایسی ہی ہو۔ آخر وہ خود بھی تو ہندو ہی تھا۔ لیکن نہیں... اس نے سوچا۔ 'میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں بُتوں کو نہیں پوجتا۔ میں انھیں مانتا بھی نہیں۔ میں تو اس مہان ہستی کی کھوج میں ہوں جس نے یہ دنیا بنائی، اس کا مربوط نظام قائم کیا۔'

اس کے بعد کافی دنوں تک اسے محمود سے تنہائی میں گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ تاہم اس دوران اس نے متعدد ہندو طلبا سے بات کی۔ ان کا نکتۂ نظر بالکل وہی تھا جو رام گوپال کا تھا۔ اس بات نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔

* * *

پارسن فیملی طویل عرصے سے ہندوستان میں تھی۔ رچرڈ اور ریٹا یہیں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر لوگ انھیں جڑواں بہن بھائی سمجھتے تھے۔

جیمز پارسن دہلی کی انتظامیہ میں ایک کلیدی عہدے پر فائز

تھے۔ دونوں بچوں کو تعلیم کے لیے انھوں نے نینی تال بھجوا دیا تھا جہاں وہ پڑھتے تھے۔ وہ ایک بڑا کانونٹ اسکول تھا۔ وہاں اکثریت انگریزوں کی تھی۔ لیکن مسلمان اور ہندو بھی بہ ہر حال موجود تھے۔

رچرڈ اور ریٹا' دونوں کو ہندوستان بہت پُرکشش لگتا تھا۔ ہندوستان کی رنگا رنگ ثقافت ان کے لیے مسحور کُن تھی۔ انھیں یہاں کی زبان میں بھی شروع ہی سے دل چسپی تھی۔ یہ دل چسپی ہی کی بات تھی کہ انھوں نے اِدھر اُدھر سے سیکھ سمجھ کر اردو میں اچھی خاصی استعداد بنالی تھی۔

اسکول میں عام طور پر انگریز بچوں کا رویّہ ایسا تھا کہ وہ بس ایک دوسرے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی ان کی اکثریت تھی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی بچے سب سے الگ تھلگ، ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر کچھ بچے ایسے بھی تھے جو فطرت کے اعتبار سے گھلنے ملنے والے تھے۔ وہ انگریز بچوں کی طرف بڑھتے تھے۔ مگر رچرڈ اور ریٹا کے سوا ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ رچرڈ اور ریٹا کے لیے اپنے ہم نسلوں سے بڑھ کر ان میں کشش تھی۔ اور ان سے وہ بہت کچھ سیکھتے تھے۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ پھر یہی نہیں، انھیں جب بھی موقع ملتا، وہ اسکول سے نکلتے اور مقامی لوگوں میں گھلتے ملتے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ مقامی لوگ بہت سادہ اور ملنسار ہیں۔

دونوں بہن بھائیوں کو ہندوستان سے گہری دل چسپی تھی۔ وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں سوچتے تھے۔ ان کا مشاہدہ بھی بہت اچھا تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ چند اِکا دُکا افراد کو چھوڑ کر ہندوستانیوں میں ایک اجتماعی احساسِ کم تری تھا۔ یہ فطری تھا۔ وہ باہر سے آنے والے اور خود سے ہر اعتبار سے مختلف' انگریزوں کی رعایا تھے۔ کچھ انگریزوں کا حد سے بڑھا ہُوا احساسِ برتری بھی ان کے احساسِ کم تری کو اُور بڑھا دیتا تھا۔

بہ ہر حال، رچرڈ اور ریٹا نے اسکول میں بھی خود کو اپنے ہم نسلوں تک محدود نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ہندوستانیوں سے بھی دوستی کی۔

اسکول کی تعلیم مکمل ہوئی تو جیمز پارسن نے انھیں دہلی واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔ حالاں کہ وہ نینی تال میں مزید پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ایک تو وہ اور الزبتھ اپنے بچوں کو بہت زیادہ مس کرنے لگے تھے۔ اور دوسرے سیاسی صورتِ حال بہت تیزی سے بدل رہی تھی۔ انگریزوں کا ہندوستان سے رخصت ہوا اب نوشتۂ دیوار تھا۔ جیمز پارسن کے بس میں ہوتا تو وہ ابھی انگلینڈ واپس چلا جاتا۔ ایسے میں وہ کم از کم یہ تو کر سکتا تھا کہ اپنے بچوں کو اپنے پاس واپس بلالے تاکہ انگلینڈ واپسی کا فیصلہ ہو تو کوئی پیچیدگی نہ ہو۔

دہلی بڑا شہر تھا۔ وہاں انگریزوں کی اپنی سوشل لائف تھی۔ اب بچے جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے۔ چناں چہ جیمز اور الزبتھ نے انھیں کلب لے جانا شروع کیا اور انھیں ان کے ہم نسلوں سے متعارف کرانے لگے۔ لیکن رچرڈ اور ریٹا کو کلب میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

ریٹا بالخصوص پیدائشی رومینٹک تھی۔ اس کی جمالیاتی حس بڑی توانا تھی۔ وہ نازک طبع، نازک خیال اور آرٹسٹک تھی۔ وہ اتنی رومان پرست تھی کہ بچپن ہی سے اس نے اپنا ایک آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ اس کے خوابوں کا ایک شہزادہ تھا جس کی وہ راہ تکتی تھی۔

کلب میں لوگوں نے جس طرح اس کی پذیرائی کی، وہ اسے اچھا نہیں لگا۔ جبلّی طور پر ہر عورت بوالہوس نگاہوں کو پہچان لیتی ہے۔ وہ تو پھر ایسی لڑکی تھی جسے مشرقیت اچھی لگتی تھی اور وہ رومان پسند بھی تھی۔ چناں چہ وہ کلب سے بے زار ہوگئی۔

کالج کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ خوش تھی۔ کالج میں نئے دوست ہوں گے' نئی دل چسپیاں ہوں گی۔ اچھا وقت گزرے گا اور کون جانے...

لیکن ابتدا میں اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ کالج میں ہندوستانیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نینی تال کے مقابلے میں یہاں ہندوستانیوں کا احساسِ کمتری بڑھا ہُوا تھا اور جو لوگ اس سے محفوظ تھے وہ انگریزوں کو غاصب سمجھتے تھے۔ یہاں دوست بنانا زیادہ دشوار ہوگیا۔ ریٹا حیرت سے سوچتی، جذباتی اعتبار سے یہ کتنے غیر متوازن لوگ ہیں۔ یا تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں گے... یا اپنے بدیسی حکمرانوں کے ہر ہم نسل سے نفرت کریں گے جیسے وہ بھی اپنے ہم نسلوں کے ساتھ شریکِ استحصال ہو، جیسے وہ بھی ان کے جرمِ حکمرانی میں برابر کا شریک ہو۔

مگر پھر دھیرے دھیرے رچرڈ کے دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ اور اس حلقے میں ہر رنگ موجود تھا۔ قدرتی طور پر وہ ریٹا کا حلقہ بھی تھا۔ اس میں پشپا، نادرہ اور امرتا بھی تھیں اور محمود، رام گوپال، اوتار سنگھ اور فتح سنگھ بھی تھے۔ پہلی بار وہ خوش ہوئی۔

اور جب پہلی بار اس نے اوتار سنگھ کو دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ مگر اس نے پہلی نظر کے اس تاثر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک آدمی کی ظاہری شخصیت سے زیادہ اہم اس کی باطنی شخصیت تھی اور باطنی شخصیت ذرا دیر میں ہی کھلتی ہے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی شخصیت کے سحر میں الجھتی گئی۔ اوتار سنگھ ظاہری طور پر جتنا خوب صورت تھا، باطنی طور پر اس سے زیادہ خوب صورت تھا۔ اس کی شخصیت غیر معمولی طور پر متوازن تھی۔ وہ بنیادی طور پر طالب علم تھا... زندگی کا طالب علم۔ کالج کا چپڑاسی ہو یا لیکچرار، اپنا کوئی ہم جماعت ہو یا دوست، وہ سب کی بات ایسی توجہ سے سنتا کہ لگتا عبادت کر رہا ہے۔ جیسے ہر اہم، غیر اہم بات سے وہ کچھ سیکھ رہا ہے۔ اس کے مزاج میں عجیب سا انکسار اور عاجزی تھی۔ لیکن وہ ڈرپوک نہیں تھا۔ جس بات کو درست سمجھتا، اس کا برملا اظہار وہ کسی کے بھی سامنے کر سکتا تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی نہیں تھی۔ مگر وہ بات نظریں جھکا کر کرتا تھا۔ اس کی نگاہیں نہ چور کی نگاہیں تھیں اور نہ ہی کسی بوالہوس کی۔ ان میں عجیب سی پاکیزگی، معصومیت اور جستجو تھی۔ وہ ایک طالب علم کی متجسس نگاہیں تھیں۔ ایسا طالب علم جو سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

مگر ایک بات تھی۔ دوستوں کے حلقے میں بھی وہ بہت ریزرو رہتا تھا۔ کبھی بہت زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ اُس سے اس کے بارے میں بات کی جائے تو وہ اُس سے بچے۔ نہیں... اپنے بارے میں وہ کھل کر بات کرتا تھا۔ البتہ دوسروں کے معاملے میں وہ پرائیویسی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ کسی کی نجی زندگی کے بارے میں تجسس نہیں کرتا تھا۔ اس کا تجسس خالصتاً علمی تھا۔

ریتا کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ کب وہ اسے مختلف نظر سے دیکھنے لگی۔ جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو اسے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی۔ وہ مغرب کی لڑکی تھی۔ اپنی زندگی کے فیصلے کرنا، اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنا اس کا حق تھا۔ بس اہمیت اس بات کی تھی کہ اوتار سنگھ کے نزدیک بھی اس کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔

اس معاملے میں اسے مایوسی ہوئی۔ اوتار سنگھ سب سے ایک طرح سے ملتا تھا۔ بلکہ کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ دوستوں میں اس کے نزدیک جنس کی تفریق تھی ہی نہیں۔ وہ بہت خوش اخلاق تھا، مہذب تھا۔ اس کے اندر رکھ رکھاؤ تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

وہ مایوسی وقتی تھی۔ ریتا نے سمجھ لیا کہ اوتار سنگھ ایک ایسا لڑ ہے جس نے ابھی جوانی کی سرحد میں قدم نہیں رکھا ہے اور ابھی وہ جوانی کے تقاضوں سے ناآشنا ہے۔ وہ اسے اہمیت نہیں، تو کوئی بات نہیں۔ اسے خود کوشش کرنی ہوگی کہ وہ اسے اہم لگے۔ وہ بہت خوب صورت اور شاداب لڑکی تھی۔ اسے خود پر بہت بھروسا تھا۔ کلب میں وہ دیکھ چکی تھی کہ مرد کیسے دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے ہیں۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس سلسلے میں اسے کچھ کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس پر ایک دھماکا خیز انکشاف ہو گیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ وہ تو ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہے۔ اس معاملے میں لڑکیوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس نے دیکھ لیا کہ دوستوں کے اس حلقے میں تمام لڑکیاں صرف اور صرف اوتار سنگھ کی تمنائی ہیں۔ کیا پشپا، کیا امرتا اور کیا نادرہ۔ گو مقابلہ بہت سخت تھا۔ مگر ریتا کو یقین تھا کہ جیت اُسی کی ہوگی۔

* * *

اوتار سنگھ کو اکیلے میں محمود سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس دوران ایک اور اہم واقعہ ہو گیا۔ ہفتے کے روز خالی پیریڈ میں وہ مل بیٹھے۔ چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر رچرڈ نے کہا۔ ”آج ریتا کا برتھ ڈے ہے۔“

اس پر سب نے چونک کر ریتا کو دیکھا۔ ریتا مسکرائی۔ اسے سب کی توجہ کا مرکز بننا بہت اچھا لگتا تھا۔ سب نے اسے ہپی برتھ ڈے کہا۔

”نہیں... مجھے یہ مبارک باد نہیں چاہیے۔“ ریتا نے کہا۔ ”ہر چیز کا، ہر بات کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ یہاں بتایا اور یہیں وِش کر دیا۔“

”تو پھر؟“ محمود نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ریتا کو احساس تھا کہ محمود اسے خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہ مسکرائی۔ ”اب یہ تو تم سوچو۔“ اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

”چلو... میں تمہیں تحفہ دوں گا تب وِش کر لوں گا۔“ محمود بولا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ رچرڈ نے مداخلت کی۔ ”آج ہمارے گھر پر ریتا کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ تم سب کو آنا ہے۔“

”برتھ ڈے پارٹی!“ رام گوپال نے فکرمندی سے کہا۔

’پھر وہی احساسِ کمتری!‘ ریتا نے سوچا۔

”اس پارٹی میں ہم دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا نے وضاحت کی۔

”اوہ... وری گڈ!“ پشپا نے چہک کر کہا۔

رام گوپال نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بہت سادے لوگ ہوں گے... بے شمار انگریز۔ ”کیوں ہم ضرور آئیں گے۔“

”پارٹی کا وقت کیا ہے؟“ محمود نے پوچھا۔

”رات آٹھ بجے ڈنر، دس بجے۔ پھر ڈانس اینڈ میوزک!“ بولی۔

”یہ تو لمبا پروگرام ہے۔“ نادرہ کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

”تو کیا؟ آج سیٹر ڈے ہے۔ کل کالج کی چھٹی ہوگی۔ اچھا ہے۔“ رچرڈ نے کہا۔

”نہ بابا... میں رات بھر نہیں رُک سکتی۔“ نادرہ بولی۔ ”تو پارٹی میں شرکت کی اجازت بھی آسانی سے نہیں ملے ہم لوگ ایسے آزاد خیال نہیں ہیں۔“

”او کم آن۔ ڈونٹ بی سو ویک ورڈ۔“ ریتا نے کہا۔

”نادرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ محمود نے تائید کی۔ ”میں بھی جانا چاہوں گا۔“

رچرڈ نے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا ان کے موقف میں لچک نہیں ہوگی۔ ”او کے۔ یہ میرا وعدہ کہ جب تم کہو گے، میں تم دونوں کو گاڑی میں تمہارے گھر کرا دوں گا۔“

”تب تو ٹھیک ہے۔“ نادرہ نے کہا۔

ریتا نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ ”تم نے کچھ نہیں کہا۔ کیا بات آؤ گے نا؟“

”ضرور آؤں گا۔ میں تو آزاد آدمی ہوں۔“ اوتار سنگھ نے ”اور اچھا لگا تو پوری رات بھی رُک سکتا ہوں۔“

”میں بھی۔“ فتح سنگھ اور امرتا نے بہ یک آواز کہا۔

”میں بھی آؤں گی اور پوری رات رُکوں گی۔“

”بس تو طے ہو گیا۔ آج رات آٹھ بجے۔“

* * *

حور بانو اُن دونوں بہت پریشان تھی!

پہلے تو استانی صاحبہ کی پڑھائی نے اس کا معمول تبدیل پھر اوپر چھوٹے ٹھاکر کا معمول بھی بدل گیا۔ اس نے کے بعد اوپر کوٹھے پر آنا اور دیر تک بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ ؟ اس نے اس پر سوچا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اتفاق جی نے چھٹی کی تو اسے پتا چلا کہ چھوٹا ٹھاکر عربی پڑھ رہا ہے۔ یہی نہیں، وہ اپنے مولوی صاحب سے قرآن پاک کی تلاوت بھی سنتا ہے۔

اس انکشاف نے حور بانو کے سامنے امکانات کی ایک روشن دنیا لا کر رکھ دی۔ خوش فہمی کے سرسبز باغ اسے نظر آنے لگے۔ اسے لگا کہ نہ جانے کیسے... مگر چھوٹا ٹھاکر بھی اُس سے محبت کرنے لگا ہے اور اسی کی خاطر وہ عربی سیکھ رہا ہے۔ اور تلاوت سننے کے بعد اگلا مرحلہ تو قبولِ اسلام ہی کا ہے۔

معصوم لڑکی اس معاملے میں نہ کسی کو رازدار بنا سکتی تھی، نہ کسی سے مشورہ لے سکتی تھی۔ آپ ہی آپ سوچتی، اندازے لگاتی اور خوش ہوتی۔ اور عربی پڑھنے والی بات سے تو وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے چھوٹے ٹھاکر کی دید سے محرومی پر بھی صبر کر لیا تھا۔ بڑے کام کے لیے بڑی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ یہ دید سے محرومی تو بہت چھوٹی بات تھی۔

لیکن ایک صبح اسے بڑا دھچکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ وصال دین اکیلا اسکول جا رہا ہے۔ وہ پریشان ہو گئی۔ کہیں چھوٹے ٹھاکر کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟ وہ بے چین رہی۔ چھٹی کے وقت وہ پھر دروازے پر پہنچ گئی۔ وصال دین اسکول سے اکیلا ہی واپس آیا تھا۔

اس معمول کو ایک ہفتہ ہو گیا۔ حور بانو کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر زیادہ ہی بیمار ہے۔ لیکن اوپر بہ ظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کافی دنوں سے رنجنا بھی نیچے نہیں آئی تھی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ حور بانو نے ایک ہفتے تک چھوٹے ٹھاکر کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ اس شام وہ پڑھائی کے دوران پانی پینے کے بہانے سے اٹھی اور برآمدے میں چلی آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکر اپنے مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا تھا۔

حور بانو کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہاں سے ہٹے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو شبہ ہو۔ چناں چہ وہ پانی پی کر واپس چلی آئی۔ اسے یہ اطمینان تو ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر بیمار نہیں ہے۔ لیکن یہ الجھن برقرار رہی کہ وہ اسکول کیوں نہیں جا رہا ہے۔

اس روز رنجنا نیچے آئی تو حور بانو ہر احتیاط بھول بیٹھی۔ ”اتنے دن بعد آئی ہو؟ کیا بات ہے؟“ اس نے رنجنا سے پوچھا۔

”بس موقع ہی نہیں ملا۔“

”سب خیریت ہے نا؟“ حور بانو نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں... سب ٹھیک ہے۔"

اس سے زیادہ پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔ رنجنا بیٹھ کر اماں سے بات کرتی رہی اور حور بانو بے تاب سی اِدھر سے اُدھر پھرتی رہی۔ رنجنا جانے لگی تو حور بانو اس کے پیچھے برآمدے تک چلی آئی۔ "رنجنا... تمھارے چھوٹے ٹھاکر نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟" اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ بات سرسری نہیں ہے۔

رنجنا بہت بری طرح چونکی پھر بولی۔ "لو... انھیں تو پڑھنے کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہے۔ ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہیں۔"

"تو گھر پر ہی پڑھتے ہیں؟ اسکول چھوڑ دیا کیا؟"

"نہیں تو... روز جاتے ہیں۔" رنجنا نے کہا۔ پھر بہت غور سے اسے دیکھا۔ "پر تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟"

حور بانو چور سی ہو گئی۔ مگر اب پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھی۔ "آ کا میاں کہہ رہے تھے کہ اب وصال دین اسکول اکیلا جاتا ہے۔"

"ارے ہاں... وہ چھوٹے ٹھاکر تو پاس ہو گئے نا۔" اچانک رنجنا کو خیال آیا۔ "اب وہ اسکول نہیں... وہ کیا کہتے ہیں... ماسٹر جی بتا رہے تھے... ہاں' کالج! اب چھوٹے ٹھاکر کالج جاتے ہیں۔"

"یہ کالج کیا ہوتا ہے؟" حور بانو نے مزید ٹٹولا۔

"ماسٹر جی کہہ رہے تھے، بڑا اسکول ہوتا ہے... بہت بڑا۔" رنجنا نے دونوں ہاتھ آخری حد تک پھیلاتے ہوئے بتایا۔ "اور ماسٹر جی یہ بھی بتا رہے تھے کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔"

"ہائے اللہ!" حور بانو نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تو آ کا میاں کے سوا کبھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔"

"وہاں تو انگریز لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ صبح چھوٹے ٹھاکر ذرا دیر سے جاتے ہیں اور واپسی کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی جلدی بھی آ جاتے ہیں... لیکن زیادہ تر دیر ہی ہوتی ہے۔ کبھی تو شام بھی ہو جاتی ہے۔ پھر واپس آ کر بھی پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ سوکھ کے کانٹا ہو گئے ہمارے چھوٹے ٹھاکر۔ ارے میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی زمین داری ہی سنبھالنی ہے نا انھیں۔ اچھا... اب میں چلتی ہوں۔"

رنجنا چلی گئی۔ حور بانو دیر تک بُت بنی وہیں کھڑی رہی۔ ایک مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ یعنی اب وہ چھوٹے ٹھاکر کو جا آتے دیکھنے کی کوشش تو کر سکتی تھی۔ لیکن دوسری پریشانی لا ہو گئی۔ کالج میں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ بات اس کے دل کا بوجھ بن گئی۔ اب مسئلہ یہ تھا اس بوجھ کو کسی کی سامنے ہلکا کیسے کرے۔ خود ہی سوچنے سے تو اُلجھن اور بڑھ جاتی ہے۔

اگلے روز اسے موقع مل گیا۔ استانی جی پردے کی اہ کے متعلق ایک حدیث شریف پڑھا رہی تھیں۔

"مگر استانی جی، میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔" اس نے بات نکالی۔

"ہاں، یہ انگریزوں کی لائی ہوئی لعنت ہے۔" استانی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اب ہندوؤں کے ہاں تو پردہ ہے لیکن وہ بھی آنکھیں بند کر کے انگریزوں کے پیچھے چل پڑے ہیں یہ تو بے حیائی ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکیاں پوڈر لگا کر جاتی ہیں' بے حیائی کے کپڑے پہنتی ہیں اور لڑ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتی ہیں۔" استانی جی نے تو آگ پر تیل کا چھڑکاؤ کر دیا۔

"مگر استانی جی، سنا ہے کہ کالجوں میں مسلمان لڑکیاں پڑھتی ہیں۔" حور بانو نے کہا۔

"کچھ سوئے مسلمان ہیں جو انگریزوں کے ٹوڈی پھرتے ہیں۔" استانی جی بھنا کر بولیں۔ "ان کی اولادیں ایسے کالجوں میں پڑھتی ہوں گی۔ وہ کم بخت اپنی پہچان کھو بیٹھے۔ بس کلمہ پڑھنے کے مسلمان رہ گئے ہیں وہ۔"

"پھر بھی استانی جی، ہیں تو وہ مسلمان ہی۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" استانی جی نے سرد آہ بھر کے کہا پھر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "صحبت کا اثر تو ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسی لیے مسلمان پاکستان بنا رہے ہیں... تاکہ وہاں پوری آزا سے اپنے طریقے سے زندگی گزار سکیں۔ کسی کی نقالی کریں۔ اچھے مسلمان بن کر رہیں۔"

استانی جی سے بات کر کے حور بانو اور پریشان ہو گئی۔ کالج اس کے لیے تو سوہانِ روح بن گیا۔

اگلی صبح وہ وصال دین کے جانے کے بعد دروازے منڈلاتی رہی۔ بالآخر اس نے چھوٹے ٹھاکر کو جاتے دیکھا وہ انگریزوں کی طرح سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت اچھا لگ تھا۔ اسے دیکھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اور بڑا ہو گیا ہے۔

چند روز میں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اسے کالج سے آتے نا بہت مشکل ہے۔ اس کی واپسی کا کوئی وقت ہی نہیں تھا۔

اب رات کے وقت حور بانو سونے کے لیے لیٹتی تو تصور میں اسے کالج نظر آتا۔ حالاں کہ کالج اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کالج میں بس وہ ایک ہی منظر دیکھتی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں چھوٹے ٹھاکر کے سوا کوئی لڑکا نہیں ہے اور وہ اسے بھانت بھانت کی لڑکیوں میں گھرا نظر آتا۔ لڑکیاں جو عجیب و غریب لباس پہنے ہوتیں اور چھوٹے ٹھاکر کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتیں۔ وہ بے چارہ انھیں جھٹکتا رہتا۔

لیکن تصور سے ہٹ کر جب وہ سوچتی تو خوف زدہ ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ چھوٹا ٹھاکر کتنا ہی اچھا سہی' ہے تو انسان۔ کب تک ان لڑکیوں سے بچے گا۔ جب کہ وہ لڑکیاں تو ہیں ہی بے حیا۔ اور چھوٹا ٹھاکر لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی نہ کوئی لڑکی اسے لبھا ہی لے گی۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی ایک کو چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری کے چکر میں پڑ جائے۔ اور اسے بھول جائے تو کیا وہ اتنی آسانی سے اسے کھو بیٹھے گی۔

اس آخری بات پر اسے خود بھی ہنسی آ گئی۔ لو ٹوٹ نہ کیا پاس اور مجلا ہے سے قسم لیتھا۔ اسے بھولنے کا کیا سوال، جب کہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ کہیں کوئی حور بانو بھی ہے جو اس سے محبت کرتی ہے۔ اس نے تو اس کی ایک جھلک بھی کبھی نہیں دیکھی۔ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں اور کھونے کا کیا سوال! جب کہ وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ اس مقابلے میں وہ تو کہیں ہے ہی نہیں۔

اس سوچ کے بعد بس وہ اس فکر میں لگ گئی کہ کس طرح چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آ جائے... وہ اسے دیکھ لے۔ تب شاید وہ اس بے حیا لڑکیوں سے محفوظ رہ سکے۔

براہِ راست چھوٹے ٹھاکر کے سامنے جانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں، وہ چلمن کے پیچھے سے یا جالیوں کے عقب سے اسے اپنی جھلک دکھا سکتی تھی۔ سو اُس نے اس کا اہتمام کر لیا۔

اُس روز اس نے اپنا سرخ کامدانی کا جوڑا پہنا۔ چھوٹا ٹھاکر دو بجے سے پہلے کبھی کالج سے نہیں آتا تھا۔ چناں چہ وہ دو بجے تیار ہو کر ڈیوڑھی میں آ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کتنا انتظار کرنا ہو گا۔ وہ تمام وقت کیا، زیادہ دیر بھی ڈیوڑھی میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ چناں چہ وہ بہ مشکل پانچ منٹ کھڑی ہوتی اور پھر ہٹ جاتی۔ پھر پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ ڈیوڑھی میں چلی جاتی اور اس دوران اسے یہ اُلجھن ستاتی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر آ کر اوپر جا بھی چکا ہے... اس دوران جب وہ گھر میں تھی۔

خوش قسمتی سے چھوٹا ٹھاکر اس روز کالج سے جلدی آ گیا۔ ورنہ حور بانو پر نہ جانے کیا بیتتی۔ اور خوش قسمتی سے اس وقت وہ ڈیوڑھی میں آئی تھی... یہی سوچتی ہوئی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر اوپر جا چکا ہو گا۔

آتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کی پہلی جھلک دیکھی تو حور بانو کا دل سینے میں یوں دھڑ دھڑایا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اور سانسیں اتنی تیز ہوئیں کہ ان کے شور سے اسے خود بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا جسم یوں سنسنا رہا تھا جیسے رگ رگ میں کوئی برقی رو دوڑ رہی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں کیا، پورا جسم کانپ رہا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کو آتے جاتے اس نے بارہا دیکھا تھا۔ مگر اس کا یہ حال پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آج جو کرنے کا اس نے ارادہ کیا تھا، وہ پہلے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ آج وہ چاہتی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر اُسے دیکھے۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب موقع ملا تو وہ پریشان کھڑی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے! ایسا کیا کرے وہ؟ کیسے کرے؟ اس کے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلمن کی طرف بڑھی۔ لیکن ٹانگوں کی لرزش اتنی بڑھ گئی کہ اسے لگتا تھا، وہ گر جائے گی۔

اور وہ صرف چند لمحوں کا کھیل تھا۔ اس موقع کی طوالت نہ ہونے کے برابر تھی اور اختصار ایسا تھا کہ مشکل سے چار بار پلکیں جھپکی جا سکتی تھیں۔

چھوٹا ٹھاکر دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ بید مجنوں کی طرح لرزاں تھی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور اب ایک پل کی بات تھی۔ پل گزرتا اور وہ آگے نکل جاتا۔

حور بانو سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ وہ گنگ تھی۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ اس نے آواز نکالنے کی کوشش کی۔ مگر آواز بھی جیسے غائب ہو گئی تھی۔ اور پل نکلنے ہی والا تھا۔ اس نے پھر بولنے کی کوشش کی... اور اُسے پھندا لگ گیا!

چھوٹے ٹھاکر نے آواز سن کر نظر اٹھائی۔ لیکن پوری طرح اٹھنے سے پہلے ہی اس کی نظر جھک گئی۔ اور پھر وہ آگے نکل گیا۔

حور بانو کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی نظر اضطراری طور پر اٹھ رہی تھی۔ مگر درمیان

میں ہی اس نے خود پر قابو پالیا تھا اور نظر جھکا لی تھی۔ معصوم لڑکی نہیں جانتی تھی کہ وہ نظر بھر کر دیکھ لیتا تو بھی اسے نہ دیکھ پاتا۔ باہر دھوپ تھی اور اندر اندھیرا۔ پھر درمیان میں چلمن۔ ایسے میں چھوٹے ٹھاکر کو متحرک سرخ رنگ کے سوا کیا نظر آ سکتا تھا۔

اس رات وہ بستر پر لیٹی یہی کچھ سوچتی رہی۔ وہ منظر اس کے تصور میں بار بار آتا... چھوٹے ٹھاکر کا اضطراری طور پر نظر اٹھانا... اور فوراً ہی ٹھٹک کر نظر جھکا لینا۔ اچانک اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ ارے... یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں۔ یہ تو چھوٹے ٹھاکر کی شرافت کا ثبوت ہے۔ وہ تو نگاہ سنبھالنے والا آدمی ہے۔ اس رویے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کالج میں وہ کس طرح رہتا ہوگا۔ حور بانو کے دل کو ایک اطمینان سا ہوگیا۔

لیکن محبت میں خطرے کا احساس بہت توانا ہوتا ہے۔ اس کا سکون محض وقتی تھا۔ بعد میں اس نے مختلف انداز میں سوچا تو بے سکون ہوگئی۔ وہ تو چلمن کے پیچھے تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے اٹھتی نظر پر قابو پالیا۔ لیکن کالج میں تو بے حجاب لڑکیاں دھڑ سے اس کے سامنے آ جاتی ہوں گی۔ تب تو نظر جھکتے جھکتے بھی پڑ ہی جاتی ہوگی۔ اور پھر یہ معمول ہو تو کیا کوئی ہر وقت... بار بار نظریں جھکاتا رہے گا۔ نہیں... یہ تو ممکن نہیں۔

کچھ بھی ہو، حور بانو نے یہ تسلیم کرلیا کہ اس کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں۔ وہ کچھ بھی کر لے، کبھی چھوٹے ٹھاکر کے سامنے نہیں آ سکے گی۔ اور اسے ایک اور خیال آیا۔ اس نے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس پر سوچا۔ یہ حقیقت تھی۔ بہت بڑی سچائی تھی کہ اس محبت پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ اس نے کی نہیں تھی، اسے خود بہ خود ہوئی تھی۔ اس میں اُس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ تو یہ محبت اللہ نے اس کے دل میں ڈالی تھی۔

تب اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہوئی کہ چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آنے کی، خود کو دکھانے کی کوشش اس کی اپنی تھی اور بلا ارادہ تھی۔ یہی نہیں، اس کا ارادہ اور اس کی کوشش اللہ کے حکم سے متصادم تھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے اور وہ خود کو چھوٹے ٹھاکر کو دکھا دے، تب بھی اس بات کی ضمانت نہیں کہ چھوٹا ٹھاکر کالج میں بے پردہ لڑکیوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔ یہ ضمانت تو وہی دے سکتا ہے، جس نے اس کے دل میں چھوٹے ٹھاکر کی محبت ڈالی ہے۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اس سوچ کے بعد بس یہ ہوا کہ وہ کئی دن تک اللہ سے توبہ کرتی رہی۔ پھر اس کے دل کو سکون ہوگیا۔ جس نے اس کے دل میں وہ محبت ڈالی ہے، وہی جانے۔ وہی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اب اسے کچھ نہیں کرنا۔ جو ہو سو ہو۔

* * *

پارٹی میں شریک ہونے کے لیے وہ سبھی ٹھیک وقت پر پہنچے۔ سب سے پہلے آنے والا محمود تھا اور امرتا سب سے آخر میں آئی تھی۔ اوتار سنگھ سب سے زیادہ پُراعتماد تھا۔ ورنہ اس کے علاوہ سبھی کو یہ خیال تھا کہ وہاں بہت سے انگریز مہمان ہوں گے۔ بلکہ وہ تو ریٹا اور رچرڈ کے والدین کا سامنا کرتے ہوئے بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے۔ جب کہ اوتار سنگھ کو اس سے غرض نہیں تھی کہ وہاں کون کون ہوگا۔

لیکن وہاں پہنچ کر ان سب کے دل خوش ہوگئے۔ اس پارٹی میں سوائے ان لوگوں کے کوئی اور شریک نہیں ہو رہا تھا۔ رچرڈ کے ممی اور ڈیڈی بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔ وہاں نوکروں کی سوا کوئی نہیں تھا۔ ان سب کی جھجک دُور ہوگئی۔ وہ پُرسکون اور خوش نظر آنے لگے۔

پھر بھی ایک پھانس دلوں میں چبھ رہی تھی۔ مسٹر اور مسز پاربن نہ جانے کب آ جائیں۔ اوتار سنگھ ان سب کی اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ان کے اندر چھپے احساسِ کمتری سے تو پہلے ہی واقف تھا۔ اور وہ اس پر غور کرتا رہتا تھا۔

پھر وہ پھانس بھی نکل گئی!

"تمھارے ممی ڈیڈی کہاں گئے ہیں؟" امرتا نے ریٹا سے پوچھا۔

"کلب گئے ہیں۔" ریٹا نے جواب دیا۔

"واپس کب آئیں گے؟" نادرہ نے سوال اٹھایا۔

"آج سیٹر ڈے نائٹ ہے۔" ریٹا مسکرائی۔ "آدھی رات کے بعد ہی واپسی ہوگی۔"

اجتماعی طور پر سکون کی سانس لی گئی۔

"تو کیک کاٹنے کے لیے تم ان کا انتظار کرو گی؟" فتح سنگھ نے پوچھا۔

"ارے نہیں، یُو سِلی!" ریٹا نے آنکھیں نکالیں۔ "میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ یہ ایک پرائیویٹ پارٹی ہوگی۔ صرف ہمارے منتخب دوست اس میں شریک ہوں گے اور کیک تو ابھی ذرا دیر میں کاٹا جائے گا۔"

اس کے بعد ماحول ہلکا پھلکا ہوگیا۔ سب کے سب بے حد خوش مزاج ہوگئے۔ کالج کی پڑھائی کی، کالج کے ساتھیوں کی باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بٹلر کیک لے آیا۔ پارٹی کی گئی۔ کیک کے گرد سولہ موم بتیاں روشن کردی گئیں۔

ریٹا نے کیک کاٹا۔ سب نے اسے مبارک باد دی تحفے پیش کیے۔ کیک کاٹنے اور اس سے نمٹنے کے بعد کھولنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک دوسرے کے تحفوں پر ے چست کیے گئے۔

"ارے واہ... رام نے تاج محل کا ماڈل دیا ہے۔" ہ بولی۔

رام گوپال کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"اوہ... اِٹس بیوٹی فل!" ریٹا نے مسحور ہو کر کہا۔

"اینڈ اِٹ اِز آ سمبل آف لَو۔" امرتا نے وضاحت کی۔

رام گوپال بری طرح کھسیا رہا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں ہا تھا کہ کیا دوں۔" وہ بولا۔ "اور یہ مجھے بہت خوب صورت لگا۔"

"ایسے صفائی کیوں پیش کر رہے ہو جیسے تم نے کوئی جرم کیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"مجھے تو یہ بہت اچھا لگا ہے۔" ریٹا بولی۔

رام گوپال کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ تحفہ کھلنے کے بعد پہلی بار اس نے سکون کی سانس لی تھی۔

اس کے بعد پارٹی اگلے دور میں داخل ہوگئی۔ بٹلر نے ف میں لگی شیمپین کی بوتلیں اور جام لا کر میز پر رکھ دیے اور باہر چلا گیا۔ تب رچرڈ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں شیمپین کی تل لیے کھڑا ہوا اور اعلان کرنے والے انداز میں بولا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین، آج کی یہ خوب صورت شام میری سویٹ ہن ریٹا کے نام۔ اور اس شام کا آغاز ہم شیمپین کی بوتل سے کریں گے۔ کہتے ہیں کہ شیمپین کی بند بوتل جوانی کے جوش کی مائندگی کرتی ہے۔ جیسے جوان آدمی زندگی کے جوش کو دبائے بیٹھا ہوتا ہے، ویسے ہی کارک ہونے تک شیمپین کی بوتل بھی اپنا ابال چھپائے رہتی ہے اور کارک ہٹتے ہی..." اس نے بوتل کا کارک کھول دیا۔ شراب یوں اُچھل کر، مچل کر نکلی جیسے اس کا ضبط جواب دے گیا ہو۔

وہ سب تالیاں بجانے لگے۔ وہ منظر انھیں خوب صورت لگا تھا۔

رچرڈ جام بھرنے میں مصروف ہوگیا۔ پھر اس نے پہلا جام ریٹا کو پیش کیا۔ "ناؤ کم آن... ایوری باڈی۔" اس نے دعوت دی۔

جام اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور اوتار سنگھ نہیں تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ نے جام اٹھا لیے۔

رچرڈ کی نظروں میں الجھن تھی۔ "کیا ہوا؟ تم لوگ شامل نہیں ہو گے؟" اس نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو رچرڈ۔ ہم شراب نہیں پیتے۔" محمود نے کہا۔

"اور تم اوتار سنگھ؟ تمھارا مذہب تو تمھیں منع نہیں کرتا۔" رچرڈ نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔

"ہاں... مگر مجھے یاد ہے، پتا جی نے ایک بار مجھے سمجھایا تھا اور میں کبھی نہیں بھولا۔" اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پتا جی کہتے ہیں، دنیا میں سب سے قیمتی چیز آدمی کی عزت ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا تھا، آدمی نشے میں ہوش و حواس گنوا بیٹھتا ہے۔ نہ اسے اپنی عزت کا خیال رہتا ہے، نہ بے عزتی کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح اسے دوسروں کی عزت کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ بس اسی لیے پتا جی نے کبھی شراب نہیں پی... اور میں بھی کبھی نہیں پیوں گا۔"

اس دوران سب اسے غور سے دیکھتے رہے تھے۔ سب کے تاثرات مختلف تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ کی نگاہوں میں استہزا تھا۔ نادرہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ محمود کی نگاہوں میں اس کے لیے عزت تھی۔ ریٹا سحر زدہ سی نظر آ رہی تھی اور اس کی نگاہوں میں دلچسپی تھی۔ رچرڈ کا انداز ایسا تھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو۔

"رَبش... بکواس!" رام گوپال بڑبڑایا۔

"یہ تو امرت رس ہے ٹھاکر جی۔" فتح سنگھ نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بہرحال، وہ سب اپنے اپنے جام ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔

رچرڈ نے ابھی تک جام نہیں اٹھایا تھا۔ "بہرحال، یہ تو مہمان نوازی کے اصول کے خلاف ہوگا کہ ہم پییں اور تم دیکھتے رہو۔" رچرڈ نے کہا۔

"تو ہم باہر چلے جاتے ہیں۔" نادرہ بولی۔

"ارے نہیں... تم غلط سمجھ رہی ہو۔" رچرڈ نے بے ساختہ مسکرایا۔ "میرا مطلب ہے، تم لوگوں کو تمھارے ذوق کے مطابق کچھ ملنا چاہیے۔" یہ کہہ کر اُس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔

چند لمحوں کے بعد بٹلر اندر آیا۔ "کیا حکم ہے صاحب؟"

"اورنج جوس لے کر آؤ... بڑے جگ میں۔"

اور نج جوس آیا تو رچرڈ نے ان تینوں کے لیے گلاسوں میں جوس انڈیلا اور انھیں دیا۔ ”تھینک یو رچرڈ۔“ نادرہ نے کہا۔

اب رچرڈ نے اپنے لیے جام اٹھایا اور اسے فضا میں بلند کیا۔ ”لیٹ اس ٹوسٹ ناؤ... ریتا کی صحت اور خوشیوں کے نام۔“

سب نے گھونٹ لیے اور پارٹی شروع ہو گئی۔ جوس والے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہے تھے۔ جب کہ شراب والے کھل کر پی رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب تیسرے جام پر پہنچ گئے۔ چہرے تمتمانے لگے۔ آوازیں لڑکھڑانے لگیں۔

”اب یہ دیکھو رچرڈ...“ رام گوپال نے کہا۔ ”یہ میرا بے وقوف دوست ملک کا بٹوارا اس لیے چاہتا ہے تا کہ یہ آزادی کے ساتھ شراب نہ پیے۔“ اس کا اشارہ محمود کی طرف تھا۔ ”اب بتاؤ، کیا ہم نے اس کے ساتھ زبردستی کی؟ بھئی نہیں پیتا تو نہ پیے۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ اتنی سی بات کے لیے ملک کا بٹوارا... یہ تو کوئی بات نہیں۔“

اس نے بات اس انداز میں کی تھی کہ سب ہنسنے لگے۔ لیکن محمود سنجیدہ تھا۔ ”تم غلط سمجھے ہو رام۔ ہم پاکستان اس لیے بنا رہے ہیں کہ وہاں اسلامی قانون ہو۔ نہ کوئی شراب پیے، نہ کسی دوسرے کو شراب کی ترغیب دے۔ ہم اس لیے پاکستان بنا رہے ہیں تا کہ تم ہندوستان میں آزادی سے شراب پیو اور ہم پاکستان میں شراب نہ پئیں۔“

”شراب پینے والے تو پھر بھی پئیں گے... دیکھ لینا، پاکستان میں بھی پئیں گے۔“ فتح سنگھ نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں چیلنج تھا۔

لیکن رام گوپال نے جیسے محمود کی بات سنی ہی نہیں۔ ”اب ہمارے ہندو بھائی اوتار سنگھ کو ہی دیکھ لو۔“ وہ بولا۔ ”اسے تو دھرم منع نہیں کرتا... مگر اس کے پتاجی منع کرتے ہیں۔ یہ نہیں پی رہا ہے تو کیا ہم نے اسے مجبور کیا؟ نہیں کیا۔ اور کیا ہم نے کسی کی بے عزتی کی یا اپنی عزت کا خیال نہیں رکھا؟ نہیں... ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہم نے۔ اس لیے کہ اب ہمارا ہندوستان سیکولر ہوگا اور یہاں جمہوریت ہوگی۔“

اوتار سنگھ مسکراتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم خاموش ہو اوتار سنگھ۔ کچھ بولتے کیوں نہیں؟“ فتح سنگھ نے اسے اُکسایا۔

”میں وقت آنے پر بولوں گا۔“ اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اور مجھے لگتا ہے کہ آج میرے پتاجی کی بات درست ثابت ہو جائے گی۔“

”اب یہ سوچو دوست کہ میرا دھرم مجھے شراب پینے سے نہیں روکتا۔“ رام گوپال رچرڈ سے مخاطب تھا۔ ”اور تمھارا دھرم بھی تمھیں نہیں روکتا۔ مگر محمود کا دھرم کچھ عجیب ہے... یہ زندگی کو انجوائے کرنے سے روکتا ہے۔“

محمود نے کچھ کہا نہیں۔ لیکن رچرڈ پارسن کو ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ ”نہیں رام، تمھارا خیال غلط ہے۔“ رچرڈ نے نظریں جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”شراب کی ممانعت تو ہمارے مذہب میں بھی ہے۔“

رام گوپال چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ نظر آئی۔ ”تو یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا دھرم سب سے بہتر ہے۔“ اس نے کہا۔

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ رچرڈ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے محمود کو دیکھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پروائی اور درگزر تھا۔

اوتار سنگھ اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ آج اسے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اسے کئی مذاہب کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔ یہ موقع اس کے لیے خوش آئند تھا۔

رام گوپال نے بڑھ کر اپنے لیے ایک اور جام بنایا۔ ”تو آپ سب نے میری بات کی سچائی کو تسلیم کر لیا۔“ اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

رچرڈ نے محمود کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ محمود نے کندھے جھٹک دیے۔ ”میرا مذہب مجھے دوسروں کے مذہب پر تنقید کرنے سے بھی روکتا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں میزبان ہونے کے خیال سے خاموش تھا۔“ رچرڈ رام گوپال کی طرف متوجہ ہوا۔ ”لیکن اب بولنے پر مجبور ہوں۔ ورنہ تمھارا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔“

”کیا مطلب؟ کس نقصان کی بات کر رہے ہو تم؟“

”تم اپنے دھرم کے بارے میں بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ گے۔“ رچرڈ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”تم جسے بڑے فخر سے اپنا دھرم کہتے ہو، وہ ہمیں عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم لگتا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اسے حماقتوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ اس بیسویں صدی میں جب کہ دنیا ترقی

ی ہے، تم لوگ اپنی دیومالا میں الجھے ہوئے ہو۔ پر فخر کرتے ہو تم لوگ...“

”پلیز رچرڈ... اوتار سنگھ کا اور دوسروں کا تو خیال کرو۔“ ریتا نے بھائی کو ٹوکا۔ وہ اوتار سنگھ کو معذرت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”نو... اِٹس آل رائٹ۔ آئی ڈونٹ مائنڈ۔ بلکہ مجھے اچھا

اعلانِ گم شدگی

آپ ریڈیو سے آئے دن بچوں کی گم شدگی کے اعلانات سنتے رہتے ہوں گے۔ یہ اعلانات پولیس اسٹیشن سے رپورٹ کی کاپی ملنے کے بعد کیے جاتے ہیں، یعنی جس کا بچہ کھو جائے، وہ پہلے پولیس میں رپورٹ کرے۔ اُس رپورٹ کی کاپی لے کر ریڈیو اسٹیشن آ کر گم شدگی کا فارم رے۔ اس کے بعد اُسے نشر کر دیا جاتا ہے، اور پولیس رپورٹ کی کاپی اور گم شدگی کے اعلان کا فارم فائل کر دیا جاتا ہے۔ یہ اعلانات صرف بارہ سال تک کی عمر کے بچوں کی گم شدگی پر نشر کیے جاتے ہیں۔

بارہ سال سے زیادہ عمر کے صرف اُن اشخاص کی گم شدگی کے اعلانات کیے جاتے ہیں جن کا ذہنی توازن درست نہ ہو، اس لیے پولیس کی پورٹ کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی لانا لازمی ہوتا ہے۔ اس پس منظر کے بعد وہ واقعہ سنیے، جو مجھ پر بیتا۔

”مصطفیٰ زیدی کے ایک دوست ہیں، حامد صاحب۔ بزرگ اور سنجیدہ آدمی، ایک پریس کے مالک اور کئی جوان بچوں کے باپ، بلکہ دادا۔ زیدی کی وجہ سے میرے بھی اچھے تعلقات تھے۔ ایک روز اُنھوں نے مجھے فون کیا۔ ”مظفر صاحب! میرے ایک دوست دو تین دن سے لاپتا ں۔ اُن کا ذہنی توازن خراب ہے۔ وہ بغیر بتائے گھر سے کہیں چلے گئے ہیں۔ آپ گم شدگی کا اعلان کر دیجیے۔“

اُنھوں نے مجھے اپنے دوست کا پورا نام پتا بتایا اور میں نے وہ اعلان نشر کر دیا، محض اُن کے کہنے پر۔ نہ کوئی رپورٹ لی، اور نہ ڈاکٹر کا فکیٹ۔ ہاشمی صاحب نے مجھ پر بھروسا کر کے اجازت دے دی۔

اُس وقت مجھے خوشی ہوئی کہ میں کسی کے کام آ سکا۔

دوسرے روز زیدی نے مجھ سے دریافت کیا: ”تم نے کل کوئی گم شدگی کا اعلان حامد صاحب کے کہنے پر نشر کیا تھا؟“

میں نے بے تابی سے دریافت کیا: ”کیا وہ صاحب مل گئے؟“

زیدی نے بتایا: ”خاصا ہنگامہ ہوا اُس اعلان پر۔ وہ حامد صاحب نے اپنے دوست سے مذاق کیا تھا۔ اُن کے دوست نے اپنے بارے میں ول پنڈی میں جب وہ اعلان سنا تو فوراً پنڈی سے پشاور روانہ ہو گئے۔ اُن صاحب کے بیٹے دوڑے دوڑے اپنے والد کے دوست حامد صاحب کے پاس آئے اور اعلان کا ذکر کیا۔ حامد صاحب نے کہا، تم فکر نہ کرو، میں معلوم کرتا ہوں۔ شام تک حامد صاحب کے دوست پنڈی سے آ گئے۔ ن کے بیٹوں نے بتایا کہ حامد صاحب معلوم کر رہے ہیں۔ اِدھر اُن صاحب کے تمام عزیز و اقارب اُن کے گھر آنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں ان کی مزاج پرسی کے لیے آتے، اُتنا ہی زیادہ غصہ اُنھیں آتا، اور کیفیت کچھ ایسی ہوتی کہ مارے غصے کے، وہ سچ مچ آپے سے باہر ہونے ۔ وہ فوراً حامد صاحب کے پاس آئے، اور کہا: ”تم نے ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کے بارے میں کیا معلوم کیا؟“

حامد صاحب نے اُن کے لیے چائے منگوائی، کچھ ہلکی مذاق کرنے کی کوشش کی، مگر اُن کا غصہ کسی طرح کم نہ ہوتا تھا، آخر کار حامد صاحب نے بتا دیا کہ یہ سب کچھ مذاق تھا۔

حامد صاحب کے دوست یہ سب سن کر بھڑک اٹھے: ”میں اعلان کرنے والے کو نوکری سے نکلوا کر چھوڑوں گا۔ میرے گھر میں لوگوں کا مجمع ہے۔ سب لوگ ان ہو کر میری خیریت دریافت کرنے چلے آ رہے ہیں۔ میں چھوڑوں گا نہیں اُس کو جس نے میرے بارے میں ایسا بے ہودہ اعلان نشر کیا ہے؟“

حامد صاحب نے بڑی مشکل سے اپنے دوست کا غصہ ٹھنڈا کیا اور انھیں میری شکایت نہ کرنے پر راضی کر لیا۔

اس تمام واقعے میں ایک قانونی پہلو تھا جس کا مجھے کوئی علم نہ تھا، ورنہ میں کسی صورت بھی، بغیر پولیس رپورٹ اور ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے، ایسا شدگی کا اعلان ہرگز نہ کرتا۔

قانونی پہلو یہ تھا کہ اگر کسی صاحبِ جائیداد شخص کو عدالت میں پاگل ثابت کر دیا جائے تو عدالت اُسے اُس کی جائیداد سے محروم کر کے اُس وارثوں میں تقسیم کر سکتی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ حامد صاحب کے وہ دوست غصے سے پاگل ہوتے نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا درست تھا۔ حامد صاحب مجھ سے بہت شرمندہ تھے اور بار بار معذرت کرتے تھے۔ اُس دن میں نے پہلی مرتبہ اپنے آپ سے یہ عہد کیا کہ است کے معاملے میں کوئی مروت، کوئی دوستی یا کسی کا کوئی لحاظ نہ کروں گا اور میں آخر دم تک اپنے اس عہد پر قائم رہا۔

”عرض و سماع“ از سید مظفر حسین ✿ تعاون: اشتیاق خان

لگ رہا ہے۔" اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔ "علمی تبادلۂ خیال بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس سے نالج بڑھتا ہے۔ رچرڈ پلیز... اپنی بات جاری رکھو۔"

رام گوپال سناٹے کی کیفیت میں تھا۔ اس کا نشہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نشے میں اس سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اس نے آقاؤں کو چھیڑ دیا تھا۔

"تھینک یو اوتار سنگھ! بے شک یہ علمی تبادلۂ خیال ہے۔" رچرڈ نے کہا۔ پھر وہ رام گوپال کی طرف مڑا۔ "رام... تم اپنے دیوی دیوتاؤں کی درست تعداد بتا سکتے ہو؟"

رام گوپال مُنہ کھولے کھڑا تھا۔ اسے کچھ سُوجھ نہیں رہا تھا۔ وہ تو محمود کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن رچرڈ سے اُلجھ بیٹھا تھا۔

"نہیں معلوم... تمہیں بھی نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے، ان کی تعداد ہزاروں میں تو ہو گی... بلکہ شاید لاکھ سے اوپر ہو۔ تو تمہارے دھرم میں کوئی اپنے دھرم پر پورا اتر ہی نہیں سکتا۔ تمام دیوی، دیوتاؤں کی پوجا کرنا تو دور کی بات ہے، کسی کو سب کے نام بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ ہر جانور کو... ہر چیز کو تو تم نے دیوتا بنا رکھا ہے۔ گائے، بندر، ہاتھی، سورج، چاند، درخت اور نہ جانے کیا کیا۔ اگر تم اپنے تمام دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگو تو زندگی میں پوجا کے سوا کچھ کر ہی نہ سکو۔ گندگی اور غلاظت کا یہ عالم ہے کہ گائے کے گوبر اور پیشاب کو تم مقدس کہتے ہو۔ میں نے تو سنا ہے کہ پی بھی لیتے ہو... شراب کی کیا بات کرتے ہو۔ اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ بیواؤں کو ان کے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیتے ہو۔ علم کے فروغ کی اس صدی میں تم اس جہالت کو دھرم کہتے ہو۔ اس دور میں بھی تم لوگ زندہ انسانوں کو دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہو۔ تم غار کے زمانے کی طرح جی رہے ہو اور تمہیں درست اور غلط کا احساس ہی نہیں۔"

رچرڈ خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ اوتار سنگھ سوچ رہا تھا... جو کچھ رچرڈ نے کہا تھا، وہی سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب رچرڈ نے کہہ دیا تھا اور کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

اور یہاں اس کے سامنے دو مذاہب آئے تھے... دو مختلف طرزِ عمل۔ رچرڈ کرسچن تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس کا مذہب شراب کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ شراب پیتا ہے۔ دوسری طرف محمود تھا... مسلمان۔ اس کا مذہب بھی شراب کو منع کرتا ہے اور وہ اس کی پابندی بھی کرتا ہے۔ اور اس نے کہا کہ اس کا مذہب اسے دوسروں کے مذہب پر تنقید سے روکتا ہے۔ یہ ہوئی ناروا داری۔ اور اس کے نتیجے میں انسان تحمل سیکھتا

اس سے اوتار سنگھ اپنے دھرم سے پوری طرح بیزار ہو لیکن اب اسے دوسرے مذاہب کو سمجھنا تھا۔

"یہ کیا باتیں لے بیٹھے تم لوگ۔" اچانک ریٹا خاموشی کو توڑا۔ "تمہیں یہ احساس بھی نہیں کہ یہ میری برتھ پارٹی ہے۔"

"سوری ریٹا۔" رام گوپال نے جلدی سے کہا۔

"کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو اس کے لیے معافی ہوں۔" رچرڈ نے نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ سچ ہے کہ ایک کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور مشتعل ہونے کے بعد برقرار رکھنا بہت مشکل۔ بہ ہرحال، جو ہُوا اسے بھول جائیں آفٹر آل، ہم سب دوست ہیں۔ چلیں... اب پارٹی شرو کرتے ہیں۔" رچرڈ کونے میں رکھے گراموفون کی طرف اور ایک ریکارڈ منتخب کر کے لگا دیا۔

کمرے میں مدھر موسیقی کی آواز بھر گئی۔ رچرڈ ریٹا طرف بڑھا اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "کم آن ڈیئر، لیٹ اس ڈانس۔"

وہ دونوں ناچنے لگے۔ باقی سب لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان میں لڑکیاں نہیں تھیں۔ وہ سب چوری چوری چھپکے اوتار سنگھ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کی قربت کے خواب تھے۔

ریکارڈ ختم ہُوا تو رچرڈ اور ریٹا الگ ہو گئے۔ رچرڈ ر تبدیل کرنے کے لیے گراموفون کی طرف بڑھ گیا۔ ر اوتار سنگھ کی طرف چلی آئی۔ "آؤ میرے ساتھ رقص کرو۔" اس نے کہا۔

اوتار سنگھ گڑبڑا گیا۔ "لیکن مجھے تو رقص کرنا نہیں آتا۔"

"اوہ کم آن۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ میں سکھا دوں گی۔"

اس دوران دوسرا ریکارڈ بجنے لگا تھا۔ ریٹا اوتار سنگھ کا ہاتھ تھام کر کھلی جگہ کی طرف چل دی۔ دوسری طرف رچرڈ پشپا رقص کی درخواست کر رہا تھا۔ "میں اور ریٹا آج تم سب کو سکھا دیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب ایک کی جگہ دو جوڑے میدان میں تھے۔

ریٹا نے اوتار سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر کمر پر رکھا۔ "دوسرا ہاتھ لاؤ اور مجھے اس طرح تھام لو۔" اس نے کہا۔ اوتار سنگھ نے جھجکتے اس کی ہدایت کی تعمیل کی۔ ریٹا نے اپنے دونوں ہاتھ دھوں پر رکھ دیے۔ "اب موو کرو... ایسے۔" اس نے سٹیپ لے کر دکھائے۔

اوتار سنگھ کو چند لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ ڈانس کرنا کچھ کل نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ رقص کرنا اسے اچھا نہیں لگ ہا تھا۔ وہ بس مروتاً ریٹا کا ساتھ دے رہا تھا۔ کیوں کہ وہ اس کی ی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ لمحے بڑے بھرپور تھے۔ اس درجہ نسوانی قربت کا تجربہ اس کے لیے نیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ بے حد مختلف اور ساد کیفیات سے گزر گیا۔ بنیادی طور پر بہ ہرحال، 17 سال کا جوان لڑکا تھا۔ نسوانی لمس کا وہ پہلا تجربہ اپنی ابتدا میں اس کے لیے بے حد سنسنی خیز تھا۔ اس کا پورا وجود مرتعش ہو گیا تھا۔ ریٹا بے حد حسین لڑکی تھی... قد میں اس سے تھوڑی سی کم۔ ان کے چہروں کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ تھا اور ریٹا اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

قربت کے ابتدائی لمحوں میں وہ مسحور ہو گیا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک اس کی سماعت میں وہ نسوانی واز گونجی جس کی وجہ سے اس نے عربی پڑھنی شروع کی تھی۔ وہ آواز جسے سُن کر اسے آواز والی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس پر اسے محبت کا خیال آیا۔ محبت جس کی اسے کب سے جستجو تھی۔ پھر اسے محبت کے بارے میں اپنے اسکول کے دو کے استاد کی گفتگو یاد آئی...

وہ ابتدائی سحر ایک سے زیادہ مرحلوں میں ٹوٹا تھا۔ سب پہلے تو اس لڑکی کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہ اس پاکیزہ محبت ہے۔ اس لمحے اسے احساس ہُوا کہ بہت عرصے سے اس نے وہ آواز بھی نہیں سنی اور آواز والی کے ے میں سوچا بھی نہیں۔ اس کے باوجود وہ محبت ابھی تک سی ہی تازہ اور توانا ہے بلکہ سماعت میں وہ آواز ابھری تو کا دل ویسے ہی دھڑکا جیسے اس آواز کو پہلی بار سُن کر دھڑکا تھا۔ اور قربت کا وہ سحر ٹوٹ گیا جس نے چند لمحوں میں اسے سر کر لیا تھا۔ اچانک اسے ریٹا پارسن بری لگنے لگی۔ اس کے اس سے اسے کراہت آنے لگی۔

پھر اسے خوشی ہوئی کہ اس کی پہلی محبت سچی ثابت ہوئی ہے۔ مائش کے ان لمحوں میں سُرخ رُو ہوئی ہے۔ جسمانی قربت جگہ ایک بڑی سچائی سہی لیکن وہ پاکیزہ آواز، جس کے الفاظ کو وہ نہیں سمجھ سکتا، مفہوم تک سے ناواقف ہے، آج بھی اتنی انگیز ہے کہ اس سچائی کی بدصورتی کا احساس دلا سکتی ہے، اسے رد اور بے معنی کر سکتی ہے۔ اس کی محبت اردو کے استاد کی بیان کردہ تعریف پر پوری اتری تھی۔ وہ محبت ہی تھی، ہوس نہیں۔ بلکہ اس نے تو ہوس کے امکان کو بھی باطل کر دیا تھا۔

اس کے ہاتھ وہیں رہے جہاں تھے لیکن اس کی نگاہوں کا تاثر بدل گیا۔ ریٹا نے بھی وہ تبدیلی دیکھ لی۔ لیکن وہ جس کیفیت میں تھی، اس میں اس تبدیلی کی معنویت کو وہ نہیں سمجھ سکی۔ اسے تو آج پہلی بار اظہارِ محبت کا موقع ملا تھا۔ وہ اسے گنوا نہیں سکتی تھی۔ "کیوں اوتار سنگھ، تمہیں یہ اچانک کیا ہو گیا؟" اس نے سرگوشی میں اوتار سنگھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، مجھے کیا ہو گا!"

"نہیں۔ تم اچانک دُور سے ہو گئے۔"

"وہ... یہ... دراصل تمہارا لباس اچھا نہیں لگا مجھے۔"

"اوہ... مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی۔ آئندہ میں..." ریٹا کچھ اور بھی کہتی۔ مگر اسی لمحے ریکارڈ ختم ہو گیا۔ اچانک خاموشی کی وجہ سے وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

اوتار سنگھ نے اپنے ہاتھ اس کی کمر سے ہٹا لیے۔ لیکن ریٹا نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "اتنی جلدی کیا ہے اوتار سنگھ! آج میرا برتھ ڈے ہے۔ ابھی تم میرے ساتھ رہو... اور کچھ دیر۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اسی لمحے رام گوپال ان کی طرف چلا آیا۔ "مے آئی ہیو دی آنر..."

ریٹا نے اوتار سنگھ کے ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لیے۔ "یو وِل ہیو ٹو ویٹ فور سم ٹائم۔" اس نے رام گوپال سے کہا۔ "پلیز... ڈونٹ مائنڈ۔"

رام گوپال کا چہرہ کھسیاہٹ سے سیاہ ہو گیا۔ چند لمحے وہ وہیں ساکت کھڑا رہا پھر پلٹ گیا۔

اسی وقت رچرڈ نے دوسرا ریکارڈ لگا دیا۔ وہ بہت رومان انگیز سلوٹیون تھی۔ رچرڈ کے ساتھ اب امرتا تھی۔ لیکن اس کی نظروں کا مرکز اوتار سنگھ اور ریٹا تھے۔ دوسری طرف رام گوپال کے پاس بیٹھی ہوئی پشپا بھی انہی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ریٹا ٹھاکر جی کو چھوڑ ہی نہیں رہی ہے۔" اس نے سرسری انداز میں کہا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" رام گوپال بولا۔ "تم یہ بتاؤ تم کس میں انٹرسٹڈ ہو؟"

"میں صرف خود میں انٹرسٹڈ ہوں۔" پشپا نے نخوت سے کہا۔

"بہتری بھی اسی میں ہے۔ سراب کے پیچھے بھاگنے

والوں کو پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔“

”تمھیں یہ بات ریتا سے کہنی چاہیے۔ اوتار سنگھ کے تاثرات دیکھ رہے ہو۔ وہ بے چارہ بس مروت کر رہا ہے۔“

”اوتار سنگھ کو میں نے کبھی کسی لڑکی میں دل چسپی لیتے نہیں دیکھا۔“ رام گوپال نے سرد لہجے میں کہا۔

”دیکھتے رہو۔ جونک پتھر میں بھی لگتی ہے۔“

”وہ مجھے پتھر نہیں لگتا اور تم بھی جونک نہیں لگتیں۔“ رام گوپال نے سادگی سے کہا۔

”پلیز... تم خاموش ہی رہو۔“ پشپا نے بھنّا کر کہا۔ ”آج پہلے ہی تم بہت شرمندہ کرا چکے ہو۔“

اُدھر ریتا نے بھی اوتار سنگھ سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے اوتار سنگھ۔“ اس نے مخمور آواز میں کہا۔ ”مجھے کبھی کسی کے ساتھ رقص کرنا اتنا اچھا نہیں لگا۔ جانتے ہو، میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں۔“

”میں بھی تمھیں پسند کرتا ہوں۔ یو آر اے گڈ فرینڈ۔“

”مگر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ وہ محبت جو ایک عورت ایک مرد سے کرتی ہے۔ وہ محبت میں نے پہلی بار تم سے کی اور اب کسی اَور سے کبھی نہیں کر سکوں گی۔ میں تمھارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں اوتار سنگھ۔ میں خود کو بدل بھی سکتی ہوں۔“

بات اس قدر اچانک اور اتنی صاف گوئی اور دوٹوک انداز میں کی گئی تھی کہ اوتار سنگھ ششدر رہ گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ سوچنے... کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ”سوری ریتا، وہ محبت تو مجھے بھی پہلے ہی ہو چکی ہے کسی سے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب میں کبھی کسی سے اس طرح محبت نہیں کر سکوں گا۔“ اس نے کہا۔

ریتا کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ ”مائی لک!“ اس نے آہ بھر کے کہا۔ پھر بولی۔ ”کون ہے وہ خوش نصیب، بہت... بہت خوب صورت ہوگی۔“

”پتا نہیں۔ میں نے کبھی اسے دیکھا نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ریتا کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔ ”دیکھا نہیں تو محبت کیسے ہو گئی؟“

”میں نے بس اس کی آواز سنی ہے۔“

ریتا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”تب تو اس محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ کبھی تم اسے دیکھو اور وہ تمھیں اچھی نہیں لگی تو تمھاری محبت ختم ہو جائے گی۔“

”میں بھی یہی سوچتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔“ اوتار سنگھ نے کہا۔

”اسے دیکھے بغیر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں حُسن پرست ہوں۔ خوب صورتی ہر روپ میں اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے مجھے شبہ ہوتا تھا کہ اگر وہ خوب صورت ہوئی تو میری محبت ختم ہو جائے گی۔ لیکن ریتا، میں سچ کہہ ہوں کہ تم بہت خوب صورت ہو۔ اس کے باوجود مجھے تم محبت نہیں ہوئی۔ تو میں نے سمجھ لیا کہ محبت میں کوئی شر ہوتی۔ وہ تو بس ہو جاتی ہے... اور ہو گئی۔ اب تو مجھے اس کی آ سنے ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔ لیکن وہ آواز اب بھی میری سا میں گونجتی ہے اور اسے سُن کر میری اب بھی وہی کیفیت ہو ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو شاید آج میں تمھاری محبت کا جوا محبت سے دیتا۔“

”تم بہت عجیب، بہت انوکھے آدمی ہو اوتار سنگھ۔“

”اور ریتا... اصل میں تو محبت میں کسی اور سے کرنا چا تھا۔“ اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”بہت برسوں سے میں اس دنیا کے نظام پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ کوئی کامل قوت ہے جس نے یہ سب کچھ بنایا اور مکمل نظام ترتیب دیا۔ وہ قوت والی ہستی واحد ہے... مطلق العنان اور خودمختار۔ اس جیسا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بہ مہربان ہے... ماں سے زیادہ شفیق... باپ سے زیادہ عنای کرنے والی اور ضرورت پوری کرنے والی۔ میں نے بہ غور کیا اور سمجھا کہ میرے پاس جو کچھ بھی اچھا ہے... میر ماں باپ سمیت، وہ اس کا دیا ہوا ہے۔ میں والدین ک مہربانیوں کے جواب میں ان کا شکر گزار ہوتا ہوں اور اس کے اظہار کے لیے ان سے محبت کرتا ہوں۔ تو ان سے زیادہ... سب سے زیادہ شکر گزاری اور محبت تو اس کا حق ہے۔ مگر سمجھ تو محبت نہیں ہوتی... یا مجھے نہیں ہو سکی۔ چناں چہ میں اسے کی جستجو میں لگ گیا۔ اب درمیان میں مجھے یہ محبت ہو گئی میرے بس میں ہوتا تو میں اس محبت کو ختم کر دیتا کیوں کہ میر اصل منزل تو وہ بڑی محبت ہے۔“

ریتا سحر زدہ سی ہو کر سُن رہی تھی۔ ”مجھے یقین نہیں آ اس نے کہا۔ ”تمھیں ہمارے مذہب کے بارے میں بھ چاہیے۔ میں تمھیں بتاؤں گی۔“

اسی وقت ریکارڈ ختم ہو گیا۔ رچرڈ نے کہا۔ ”اب ذرا کرلیں۔“

وہ چاروں واپس آ گئے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد دوبارہ سلسلہ شروع ہُوا تو اس بار میدان میں تین جوڑے تھے۔ اوتار سنگھ اور امرتا، رچرڈ اور پشپا، رام گوپال اور ریتا۔ نادرہ اور محمود نے رقص میں دل چسپی ہی نہیں لی۔ اس پر رام گوپال زہریلے انداز میں مسکرایا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے ان پر مذہب کے حوالے سے طنز کرنا چاہتا ہو۔ لیکن پچھلے تجربے کے پیشِ نظر اسے تبصرے کی ہمت نہیں ہوئی۔

رقص کا سلسلہ کافی دیر چلتا رہا۔ اوتار سنگھ نے محض مروتاً ایک ایک راؤنڈ امرتا اور پشپا کے ساتھ رقص کیا اور پھر اپنی جگہ فتح سنگھ کو دے دی۔ اس دوران محمود رچرڈ سے اجازت لے کر اس کی لائبریری میں چلا گیا تھا۔ نادرہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اوتار سنگھ اس کے پاس چلا گیا۔ اسے وہ رات بہت طویل لگ رہی تھی۔ امرتا اور پشپا نے بھی رقص کے دوران اس سے اظہارِ محبت کیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے ریتا کی طرح ان سے تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ بس یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ پہلے ہی کسی سے محبت کرتا ہے۔

"کیا بات ہے، تم نے رقص نہیں کیا؟" اوتار سنگھ نے نادرہ سے پوچھا۔

"مجھے دل چسپی نہیں ہے۔" نادرہ نے جواب دیا۔

"تمھارا مذہب تمھیں اس سے روکتا ہے؟"

"ہاں، روکتا ہے۔ لیکن ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اس وقت میرے انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ مجھے رقص میں کوئی دل چسپی نہیں ہے۔"

"اللہ تمھیں کن کن باتوں سے روکتا ہے؟"

"اب تمھیں کیا بتاؤں۔ بہ ہر حال، سب سے بڑا گناہ شرک ہے... اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔"

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ، جو تم اللہ کے منع کرنے کے باوجود کرتی ہو؟" اسے احساس ہُوا کہ وہ بار بار اللہ کہہ رہا ہے۔ اور اللہ کہنا اسے اچھا بھی لگ رہا ہے۔

مگر اس سوال پر نادرہ کھسیا گئی۔ "بہت ساری باتیں ہیں۔ ہم کوئی بہت اچھے مسلمان تو نہیں ہیں۔ ماحول ہم پر اثر انداز ہوتا ہے، ہمارے ایمان کی کم زوری کی وجہ سے۔ اب اسی وقت دیکھ لو۔ میں اس محفل میں شریک ہوں۔ حالاں کہ اللہ نے مرد اور عورت کے اختلاط کو منع فرمایا ہے۔"

اس جواب سے اوتار سنگھ کو لمبی ڈور کا وہ سرا مل گیا جسے تھام کر اس کے اندر کا متجسس انسان دُور تک جا سکتا تھا۔ "اس میں کیا برائی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"عورت اور مرد جتنا قریب ہوں گے، بے حیائی اور گناہ کا امکان یقین کی حد تک بڑھ جائے گا۔"

"مگر دونوں کے درمیان کشش تو قدرتی ہے، فطری ہے۔" اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

"اس کے لیے شادی ہے۔ شادی گناہ اور بے حیائی کا راستہ بند کر دیتی ہے۔"

"اور محبت کے بارے میں تمھارا مذہب کیا کہتا ہے؟"

"محبت پاکیزگی کے ساتھ ہو تو برائی نہیں۔ مگر حل شادی ہی ہے۔"

اوتار سنگھ کا دماغ روشن ہو گیا۔ اسی وقت اسے ایک بات یاد آ گئی۔ اس کا مشاہدہ شروع ہی سے غیر معمولی تھا۔ محسوس تو اس نے پہلے ہی کیا تھا لیکن آج اسے پختہ یقین ہو گیا تھا "ایک بات بتاؤ تمھیں!" اس نے کہا۔ "رچرڈ تم میں غیر معمولی دل چسپی رکھتا ہے۔"

نادرہ کچھ محجوب ہو گئی۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ "میں جانتی ہوں۔ وہ مجھے بتا چکا ہے۔" وہ بولی۔

"اب یہ تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تم سے کچھ پوچھ نہیں سکتا۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

"مگر میں تمھیں بتا سکتی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں۔" نادرہ بولی۔ "اور اگر ایسا کچھ ہوتا تو بھی میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتی کیوں کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟" اوتار سنگھ نے پوچھا۔ "مذہب کے فرق کی وجہ سے؟"

"ہاں۔ مشرکوں سے شادی کرنا ناجائز ہے۔ یہ لوگ اہلِ کتاب ہیں۔ لیکن شرک کرتے ہیں۔"

مشرک کے بارے میں نادرہ نے شروع میں بھی کہا تھا اور وضاحت بھی کی تھی۔ لیکن یہ اہلِ کتاب کی اصطلاح اوتار سنگھ کے لیے نئی تھی۔ "اہلِ کتاب کا مطلب؟"

"وہ لوگ جن کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے۔ ایسی تین ہی قومیں موجود ہیں۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان۔"

"تینوں کے پاس اللہ کا کلام ہے تو وہ الگ الگ کیوں ہیں؟"

"یہ بہت لمبی بحث ہے۔ چھوڑو اسے۔ بہ ہر حال، میں مشرک سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"لیکن محبت تو ہو سکتی ہے تمھیں!"

نادرہ یوں چونکی جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ پھر سنبھل کر بولی۔ "ہاں... ہو سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں میں اس محبت سے لڑوں گی۔ اسے دل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی اور دعا کروں گی کہ وہ مسلمان ہو جائے۔"

"کوئی مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دو کلمے ہیں ہمارے ہاں۔ ایک ناپاکی کو دور کرنے والا کلمہ ہے... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ اور دوسرا گواہی دینے والا... اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد انّ محمد عبدہ ورسولہ۔ آدمی دل کی گہرائیوں سے ایمان لائے، زبان سے یہ کلمے پڑھے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے اللہ کے احکامات پر عمل کرنا ہوتا ہے جو اللہ کی کتاب میں موجود ہیں۔"

اوتار سنگھ چونکا۔ "یہ تو عربی زبان میں ہیں؟"

"ہاں۔ اللہ کا کلام بھی عربی زبان میں ہی نازل ہُوا ہے۔"

اوتار سنگھ کا حافظہ بلا کا تھا۔ دونوں کلمے اسے یاد ہو گئے۔ اب وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی اس کی استعداد اتنی نہیں تھی اور پھر مشق بھی نہیں تھی۔ اس نے اٹک اٹک کر ترجمہ کیا۔ "اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں۔ اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور دوسرا... میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا..." وہ اٹک گیا۔

نادرہ اسے بہت غور سے... بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔" اس نے جملہ پورا کیا۔ وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ "تم غیر معمولی آدمی ہو اوتار سنگھ۔ کاش... تم..." یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔

اوتار سنگھ اتنا نا سمجھ نہیں تھا کہ اس کا جملہ مکمل نہ کر پاتا۔ اس رات وہ چوتھا اظہارِ محبت تھا جو اس سے کیا گیا۔ لیکن یہ آخری اظہار مشروط تھا۔

اسی وقت رقص کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ وہ سب یکجا ہو گئے۔ "بس، ذرا دیر سستا لیں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔" رچرڈ نے اعلان کیا۔

* * *

وہ پارٹی اوتار سنگھ کو سوچنے کے لیے بہت کچھ دے گئی۔ سچی بات، اس نے اُس آواز والی کی محبت کو پھر سے توانا کر دیا۔ بات نہیں کہ وہ محبت کبھی ہلکی پڑی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ مصروفیات نے اسے دبا دیا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے اب وہ اس آواز سے محروم بھی ہو چکا تھا۔

نادرہ کی بات سنتے ہوئے اسے احساس ہُوا تھا اور اب وہ اس پر سوچ رہا تھا۔

محبت ایک آفاقی جذبہ تھا۔ اس کے بے شمار روپ تھے۔ ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت، دوستوں کی محبت، بھائی بہن کی محبت، ماں باپ کی محبت، اولاد کی محبت اور سب سے بڑھ کر مخلوق کی اپنے خالق سے محبت۔ یہ سب محبتیں ہیں جو انسان کرتا ہے... کرتا رہے گا۔ غور کرو تو ان میں سے کوئی بھی محبت بے غرض نہیں ہے۔ انسان کتنا ہی بے غرض ہو مگر کسی دوسرے انسان سے محبت کرتے ہوئے مکمل طور پر بے غرض نہیں ہو سکتا۔ کوئی غرض نہ ہو تو تنہائی دور کرنے کی غرض تو ہے۔ اکیلا تو کوئی نہیں رہ سکتا۔ انسان معاشرتی جانور ہے تو تعلق رکھنے کی غرض تو ایک بڑی سچائی ہے۔ دوستی کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی ہم خیال جو اچھا بھی لگتا ہو اس سے مل کر... بات کر کے دل خوش ہوتا ہے۔ غرض تو ہوئی نا! اور اختلاف ہو جائے... سنگین نوعیت کا اختلاف تو آدمی اس دوست کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی اور دوست تلاش کر لیتا ہے۔ بھائی بہن کی محبت کا اسے تجربہ نہیں تھا۔ یہ نعمت اسے ملی ہی نہیں تھی۔ لیکن وصال دین کے حوالے سے وہ اسے سمجھ سکتا تھا۔ بھائی دوست سے بڑی ضرورت ہوتا ہے۔ ایک بہت اپنا جو ہر کڑے وقت میں ساتھ رہے... ہمارا دکھ بانٹے... ہمیں تسلی دے۔ اب اولاد کی محبت کو لیں۔ تو ماں باپ سے تو اولاد کی غرض ہوتی ہی ہے۔ بلکہ اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ آدمی کو اتنا کچھ ملتا ہے ماں باپ سے۔ وہ ان سے محبت نہ کرے تو کیا کرے۔ اور خدا کی محبت! وہ تو ہے ہی محتاج کی محبت جو وہ اس سے کرتا ہے، جو اس کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کر خیال رکھنے والا، ضرورتیں پوری کرنے والا ہے۔ بس ماں باپ کی اولاد سے محبت سب سے مختلف ہے۔ مگر نہایت بے غرض ہونے کے باوجود غرض سے بالکل پاک وہ بھی نہیں ہے۔ باپ کو اولاد سے ایک معصوم سی غرض ہوتی ہے کہ وہ اس کی نسل کو آگے بڑھائے، مرنے کے بعد بھی اس کے نام کو زندہ رکھے۔ ہاں ماں کی محبت شاید بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ اس کا بس چلے تو اولاد کا ہر دکھ خود لے لے اور اُسے اس دکھ سے محفوظ کر دے۔

ماں باپ کی محبت پر اس نے سوچا تو اسے سب کچھ بنانے والے کی... خالق کی اپنی مخلوق کے لیے محبت کا خیال آیا۔ وہی سب سے خالص، سب سے بے غرض اور پاک محبت ہے۔ کیوں کہ اسے تو کسی سے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ جو سب کچھ بنانے

والا ہے، ہر چیز کا مالک ہے۔ کوئی اسے کچھ دے نہیں سکتا اور اسے ضرورت بھی نہیں۔ اس پر سوچتے ہوئے اوتار سنگھ کو ماں باپ کی محبت میں اس عظیم ہستی کی محبت کی جھلک نظر آئی۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ غرض کا مارا، مطلبی انسان خود تو ایسی محبت کر ہی نہیں سکتا۔ تو کیا یہ محبت اسے اس طرح سونپی گئی ہوگی جیسے اس خالق نے سائنس دانوں اور موجدوں کو خیال سونپا جس کے نتیجے میں ایجادات ہوئیں۔ ضرور یہی بات ہے کیوں کہ یہ تو طے ہے کہ وہ جو بھی ہے، اس کی ذات محبت کا سرچشمہ ہے۔ دوسری نعمتوں کی طرح وہ انسانوں کو ایک دوسرے کے لیے محبتیں بھی عطا کرتا ہے۔ اس نے ماں باپ کو اولاد کے لیے اپنے جیسی محبت عطا کی کیوں کہ اس کا بنایا ہوا سسٹم ہے کہ بچہ بے بس' لاچار اور کم زور ہوتا ہے۔ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ عاقل و بالغ ہونے تک برے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ نہیں سمجھ سکتا کہ کون سی چیز سود مند ہے اور کون سی ضرر رساں۔ کہاں خطرہ ہے، اسے نہیں معلوم ہوتا۔ تو اگر اس نے ماں باپ کو وہ محبت نہ دی ہوتی تو انسانی نسل تو ختم ہو چکی ہوتی۔

اور پھر خدا کی محبت کیسی ہے۔ وہ سب کچھ ایسے دیتا ہے کہ مخلوق کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اسے دے رہا ہے۔ وہ تو سوچتا ہے کہ فصل میں نے محنت کر کے اُگائی۔ اماں نے کہا تھا نا کہ بارش نہ ہو تو محنت کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ گھٹا چھائی رہے، دھوپ نہ نکلے تو گندم پک نہیں سکتی۔ مگر اس بات پر غور کون کرتا ہے۔ اور اس مہان ہستی کو اس کی پروا بھی نہیں۔ شکر ادا نہ کرو، تب بھی وہ دیتا ہی رہتا ہے۔ وہ نہیں کہتا کہ میری بات نہیں مانو گے تو تمہیں کھانا نہیں ملے گا۔ وہ تو بس نوازتا ہی رہتا ہے۔

برسوں سے اوتار سنگھ یہ بات سوچتا رہا تھا کہ وہ اس مہان ہستی کو سمجھے گا... اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانے گا۔ تاکہ دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر وہ اس مہان ہستی سے محبت کر سکے۔ مگر اب تک وہ کچھ بھی نہیں جان سکا تھا اور محبت کا وہ ارادہ تو رکھا رہ گیا۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی... صرف اس کی آواز سن کر!

بہت پہلے وہ اس محبت کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ اس نے خوب ٹٹول لیا تھا کہ اسے لڑکی سے کوئی غرض نہیں۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ بدصورت ہو، تب بھی اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ اس محبت کا انت کیا ہے... یہ کہاں تک جائے گی؟

اب نادرہ کی گفتگو نے اس کے لیے اور دروازے کھول دیے تھے۔ مرد اور عورت کی اس محبت کا منطقی انجام شادی ہوتا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ، ایک دوسرے کے قریب رہیں اور مل کر اپنی نسل آگے بڑھائیں۔ اور اب وہ محبت اور ہوس کے فرق کو سمجھ سکتا تھا۔ اسکول میں اردو کے استاد نے شاعری کے حوالے سے محبت اور ہوس کا جو فرق سمجھایا تھا، وہ اتنی وضاحت سے اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا۔ قربت شادی کے بغیر ہو تو پاپ ہے۔ محبت اور ہوس میں وہی فرق ہے جو پاپ اور پُن میں ہے۔

اور اوتار سنگھ نے یہ بھی سمجھ لیا کہ محبت آدمی اوپر والے سے کرے یا اس کی کسی مخلوق سے، وہ عبادت ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ پاک ہو اور محبت کرنے والا ہر پل یہ یاد رکھے کہ اسے اور اس کے محبوب کو اوپر والے نے بنایا... احسان کیا۔ اور یہی نہیں، ان کے دلوں میں محبت بھی ڈالی، ورنہ وہ یک جا نہیں ہو سکتے تھے۔ تو یہ اوپر والے کا احسان ہے۔ اس خیال کے ساتھ محبت عبادت ہوگی۔ اور اس کے بغیر ہوس!

پہلی بار وہ مطمئن ہُوا کہ اس نے محبت اور ہوس میں فرق کرنا سیکھ لیا ہے... اور اب اس سلسلے میں کبھی دھوکا نہیں کھائے گا۔

اس نے پہلے کبھی اس آواز والی کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب سوچ رہا تھا۔ شادی کے بارے میں وہ کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اب اس کا جی چاہا کہ اس کی شادی اسی لڑکی سے ہو۔ مگر نادرہ کی طرح وہ لڑکی بھی مسلمان تھی۔ اور یقیناً وہ نادرہ سے اچھی مسلمان ہوگی۔ اور مسلمان لڑکی کسی مشرک سے شادی نہیں کر سکتی۔ جب کہ ہندو مشرک ہوتے ہیں!

'کیا میں مشرک ہوں؟' یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا۔

مشرک کون ہوتا ہے، یہ نادرہ نے اسے بتایا تھا۔ اس نے خود کو اس تعریف پر پرکھا۔ اس اعتبار سے وہ مشرک نہیں تھا کیوں کہ اس نے از خود یہ نتیجہ نکالا تھا کہ کائنات کا یہ مربوط نظام قوت کے ارتکاز کے بل پر قائم ہے۔ اقتدار ایک سے زیادہ قوتوں کے پاس ہوتا تو اس میں خلل پڑتا۔ اس نے ہمیشہ اس مہان ہستی کو ایک مانا تھا۔ وہ بلا شرکت غیرے یہ نظام چلا رہا تھا... تو وہ مشرک تو نہیں۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے تو ماں کی موت والے دن مورتی کو چیلنج کیا تھا۔ اسے بھگوان ماننے سے انکار کیا تھا۔ بلکہ وہ تو بتوں کی پوجا کے سلسلے میں بہت پہلے سے ماتا جی سے بحث کیا کرتا تھا۔

اب وہ پوری طرح سمجھ گیا کہ بتوں کی پوجا کرنا شرک

ہے۔ تو وہ مشرک تو نہیں۔

لیکن یہ سچ ہے کہ وہ ہندو تھا... اور ہندو مشرک ہوتے ں۔ پہلی بار اس نے سوچا' وہ بتوں کو نہیں مانتا، ان کی پوجا نہیں نا اور وہ ایک مہان ہستی پر یقین رکھتا ہے۔ تب تو اسے ہندو دھرم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مگر کیا دھرم یونہی چھوڑا جا سکتا ہے۔

اس لڑکی کو تو اب تک شاید اس کے وجود کا علم بھی نہیں ہوگا۔ اس کی محبت کا تو خیر گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کسی طرح اسے معلوم ہو بھی جائے تو وہ اس سے محبت تو نہیں کر سکتی۔ بھی نادرہ کی طرح یہی سوچے گی کہ میں کسی مشرک سے محبت کیسے کر سکتی ہوں۔ اور اگر اوپر والا اپنی عنایت سے اس کے دل ں اس کی محبت ڈال دے، تب بھی وہ یہ دعا کرے گی کہ میں سلمان ہو جاؤں۔

تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں، اس نے سوچا۔ بس وہ کلمہ ہی تو ڑھنا ہوگا۔ اس نے دل میں دونوں کلمے دُہرائے۔ وہ اسے چھی طرح یاد تھے پھر اس نے ان کے معنی دُہرائے۔ اسے معنی ی یاد تھے۔

تو کیا میں مسلمان ہو گیا؟ یہ دونوں کلمے پڑھ لیے میں نے۔ یا آدمی اتنی آسانی سے ایک دھرم چھوڑ کر دوسرا دھرم اپنا لتا ہے۔ کیا مسلمان ہونا اتنا آسان ہے؟

مگر فوراً ہی اس کے اندر ایک بے چینی اُبھری۔ میرا مقصد مسلمان ہونا تو نہیں۔ میں تو اس مہان مہربان ہستی کو ھوج رہا ہوں۔ میرا مقصد تو اس سے محبت کرنا ہے۔ م میرا مسئلہ نہیں۔ میں اس لڑکی کی خاطر مسلمان جاؤں تو یہ تو بے ایمانی ہوگی۔

وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ ہب کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔ لفظ اللہ کے ے میں اسے تجسس تھا۔ اسے زبان سے ادا کرنا اسے اچھا... ہت اچھا لگتا تھا۔ بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ اللہ سوچتا ہی تو اس کے اندر بڑے خوب صورت جذبے جاگتے تھے۔ یہ یا ہے... کون ہے... کیسا ہے؟

وہ اٹھا اور کوٹھے پر چلا گیا۔ اس کے اندر ایک عجیب سا راب مچل رہا تھا۔ کوٹھے پر آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر اس کمر کے بل جھکتے ہوئے، آسمان کا تصور کر کے بڑی عاجزی پکارا۔ "تو جو کوئی بھی ہے... اے سب کچھ بنانے والے! ں تیرا اعتراف کرتا ہوں اور تیرے سامنے خود کو جھکاتا ہوں۔ تیری جستجو کر رہا ہوں' تو مجھے مل جا۔ مجھے اپنا راستہ دکھا دے۔ مجھے اپنا بنا لے کہ میں تجھ سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔"

خدا کے سپرد

جنگِ آزادی کے بعد میرزا غالب کی معاشی حالت دو برس تک دگرگوں رہی۔ آخر نواب یوسف علی خان، رئیس رام پور نے سو روپیا ماہانہ تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا۔ نواب کلبِ علی خان نے بھی اس وظیفے کو جاری رکھا۔ نواب یوسف علی خان کی وفات کے چند روز بعد نواب کلبِ علی خان لیفٹیننٹ گورنر سے ملنے بریلی روانہ ہوئے تو چلتے وقت میرزا صاحب سے کہنے لگے، "خدا کے سپرد۔"

مرزا صاحب نے کہا، "حضرت! خدا نے مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُلٹا مجھے خدا کے سپرد کرتے ہیں!؟"

عاطف احمد کا مطالعہ

یہ اس کی پوجا تھی... اور ماتا جی کے دیہانت کے بعد سے اب تک یہ اس کا معمول رہا تھا۔ اس روز یہ پوجا کر کے اس نے سر اٹھایا تو وہ مطمئن تھا۔ بے حد مطمئن! بھلے وہ ہندو ہو... لیکن وہ مشرک ہرگز نہیں ہے۔

* * *

پڑھائی کا شیڈول بہت سخت تھا۔ اس پر مستزاد عربی کی پڑھائی جسے اوتار سنگھ کورس سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ پھر مولوی صاحب نے اسے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی پہلی کہانی لا کر دی جو عربی زبان میں تھی۔ اوتار سنگھ بہت خوش ہُوا۔ مگر اسے پڑھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی وہ عربی کو پوری طرح سمجھنے کی اہلیت سے بہت دُور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قواعد بڑی مضبوط تھی۔ لیکن اس کا ذخیرۂ الفاظ فی الحال بہت محدود تھا۔ لیکن اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ وہ ذخیرۂ الفاظ ایسی کہانیاں پڑھنے سے بنے گا۔ اور جوں جوں ذخیرۂ الفاظ بڑھے گا، اس کی عربی کی استعداد بھی بڑھتی رہے گی۔

مذاہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی اس کی خواہش شدید ہو گئی تھی۔ لیکن کسی سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ خالی پیریڈز میں سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تھے۔ زیادہ ہوتا تو پڑھائی پر بات ہو جاتی۔ بہ ہر حال، اوتار سنگھ موقع نکالنے کی تلاش میں تھا۔

پہلا موقع اسے رچرڈ سے بات کرنے کا ملا۔ اس روز خالی پیریڈ میں وہ سب لائبریری میں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ امتحان قریب آ رہے تھے اور سب بڑی سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف تھے۔

اچانک رچرڈ نے کہا۔ "میرے سر میں شدید درد ہورہا ہے۔ کسی کا کافی پینے کا موڈ ہے؟"

سب نے انکار کردیا۔ "میں چلتا ہوں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

"تو آؤ... چلیں۔"

وہ دونوں لائبریری سے نکلے اور کینٹین کی طرف چل دیے۔ کینٹین میں رچرڈ نے کافی کا آرڈر دیا۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ پھر اس نے بلاواسطہ بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ "رچرڈ... مجھے اپنے مذہب کے بارے میں بتاؤ۔"

رچرڈ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "یہ خیال کیسے آگیا تمھیں؟"

"اس روز پارٹی میں تم نے ہندو دھرم کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ میں بہت پہلے سے سوچتا رہا ہوں۔"

"ہر معقول آدمی کو سوچنا چاہیے۔" رچرڈ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "میں غور کرتا ہوں تو تم لوگوں کا دھرم مجھے مذہب کہیں سے نہیں لگتا۔ ہاں اسے ثقافت کہا جاسکتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو، پتھر کے بُتوں کی پوجا کرنا، انھیں بھینٹ دینا اس عہد کے شایانِ شان تو نہیں۔ تم لوگ اتنے وہمی اور ضعیف الاعتقاد ہو کہ درختوں تک سے اولاد مانگتے ہو۔"

اوتار سنگھ کو یاد آیا کہ اس کے ماتا اور پتا نے اس کے لیے برگد کے درخت پر منت مانی تھی اور وہ پیڑ ہی سوکھ گیا تھا۔ "میں اس سلسلے میں بہت شروع سے سوچتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی دل سے پوجا نہیں کی اور چار سال سے تو میں نے مورتیوں کو ماننا ہی چھوڑ دیا۔"

"تم مجھے شروع ہی سے غیر معمولی لگے تھے۔" رچرڈ کے لہجے میں ستائش تھی۔

"مگر رچرڈ، یہ کائنات کا نظام خود بہ خود تو نہیں چل رہا ہے۔ کوئی تو ہے جو اسے چلا رہا ہے۔"

"بے شک۔ اور وہ خدا ہے جس نے چھ دن میں یہ نظام قائم کیا۔"

"تو تم اسے خدا کہتے ہو۔ کیوں؟"

"آسمانی کتاب میں یہی نام ہے اس کا... گاڈ... خدا۔ اس نے اپنے بیٹے مسیحؑ مصلوب کو دنیا میں اپنی کتاب دے کر بھیجا کہ انسانوں کو محبت کی تعلیم دے اور دکھوں سے نجات کا راستہ دکھائے۔"

اوتار سنگھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "خدا کا بیٹا بھی ہے! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"اسے مقدس کنواری ماں نے جنم دیا تھا... پاک ماں میری نے۔ چرچ کے باہر بڑی صلیب پر تم نے ان کا [illegible] دیکھا ہوگا اور ورجن میری کی شبیہ بھی دیکھی ہوگی... کم سن بیٹا گود میں لیے ہوئے۔ چہرے کے گرد نور کا ہالا۔"

اوتار سنگھ نے دونوں چیزیں دیکھی تھیں۔ "میں نے دیکھا ہے۔" وہ بولا۔ "یہ بتاؤ کہ یہ کتنی پرانی بات ہے؟"

"ہمارا سنِ عیسوی مسیحؑ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ یہ 19 صدی پہلے کی بات ہے۔"

"تو تمھیں کیسے معلوم کہ مقدس ماں اور مسیحؑ ایسے تھے؟" اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

"اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس زمانے میں کوئی مصور ہوگا جس نے انھیں دیکھ کر ان کی تصویر بنالی ہوگی۔"

اوتار سنگھ کی تسلی نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ خدا اس کے تصور کے خدا سے بہت مختلف تھا۔ اس پر یہ شبیہ اور مورتی والی بات۔

"تمھارا مذہب ہم سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں۔" اس نے کہا "بت تو تم بھی بناتے ہو۔"

"مگر ہم بُت پرست نہیں ہیں۔" رچرڈ نے سخت برا مان کر کہا۔

"پہلے بُت بنتا ہے۔ پھر بت پرستی ہی ہوتی ہے۔"

"میں ایسی باتیں نہیں سن سکتا۔" رچرڈ بدمزہ ہوگیا۔

"کیوں؟ میں نے جب پہلی بار بھگوان کی مورت دیکھی تھی تو اپنی ماتا جی سے یہی سوال کیا تھا۔ اور ان کے جواب سے مجھے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے کبھی بھگوان کو دل سے نہیں مانا۔ تم کیوں برا مانتے ہو۔ میں تو ایک معقول بات کہہ رہا ہوں۔"

"خیر... چھوڑو اس بات کو۔"

"اور یہ تمھیں کیسے پتا چلا کہ مسیحؑ خدا کے بیٹے تھے؟"

"ہمارے پاس آسمانی کتاب بائبل ہے نا۔"

"اس میں یہ لکھا ہے؟"

رچرڈ گڑبڑا گیا۔ "ظاہر ہے، اس میں لکھا ہوگا۔ تبھی تو ہم یہ بات مانتے ہیں۔"

"تم نے نہیں پڑھی بائبل؟"

"نہیں۔" رچرڈ کچھ شرمندہ نظر آرہا تھا۔ اس نے کافی کی پیالی خالی کرکے ہٹادی۔ "آؤ... اب چلیں۔ پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔"

اوتار سنگھ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب اس کے پاس سوچنے کو کافی کچھ تھا۔ کئی دن تک وہ سوچتا رہا۔ اس کا جو خدا کا تصور تھا، وہ رچرڈ کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا خدا سب سے الگ، سب سے منفرد اور مختلف اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا تھا۔ یہ اولاد والا معاملہ تو اسے بہت برا لگا۔ کیا خدا نے شادی بھی کی ہوگی؟ اور اگر کی ہوگی تو کس سے...؟ کسی عورت سے؟ اپنی مخلوق سے؟ یا اپنی ہی جیسی کسی ہستی سے؟

دونوں ہی امکان اس تصور سے متصادم تھے۔ اس کے نزدیک خدا جیسا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہوتا تو اس کی انفرادیت ختم ہوجاتی۔ اور اگر مسیحؑ خدا کے بیٹے تھے تو یہ تو طے ہے کہ وہ انسان تھے۔ ان کی ماں انسان ہی ہوگی۔ خدا تو انسان نہیں ہوسکتا۔

اسے ہندوؤں پر ترس آنے لگا۔ ہندو مشرک تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی... بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس لیے انھیں مشرک کہا جاتا ہے اور شرک کا جو مطلب نادرہ نے اسے بتایا تھا اس کے مطابق تو عیسائی بھی مشرک تھے۔ انھوں نے خدا کی فیملی بنادی تھی۔ اور مورتیاں تو وہ بھی بناتے تھے۔ مگر نادرہ کا کہنا تھا کہ وہ اہلِ کتاب ہیں۔ تو کسی کے پاس آسمانی کتاب ہو تو شرک کرنا اس کے لیے جرم نہیں رہتا۔ یہ تو بے انصافی ہے۔

اور یہ آسمانی کتاب والا معاملہ بھی وہ پوری طرح نہیں سمجھ پایا تھا۔ کیا وہ کتاب خدا کی لکھی ہوئی تھی؟ خدا کی تحریر تھی؟ اور ایسی کتنی کتابیں ہیں دنیا میں؟ ہندوؤں کو کوئی کتاب کیوں نہیں ملی؟ سوچنا ختم ہوا تو اس کے پاس سوال ہی سوال تھے۔ جواب اسے تلاش کرنے تھے۔

* * *

وصال دین کے امتحان بھی ہوچکے تھے اور نتیجہ بھی نکل آیا تھا۔ وہ پاس ہوگیا تھا۔

"مبارک ہو ویر جی۔ تمھیں تو آزادی مل گئی۔" اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔

"آزادی کیسی؟ میں تو تمھارے ساتھ ہی آزاد ہوں گا۔" وصال دین نے کہا۔

"نہیں ویر جی۔ اب یہ ممکن نہیں۔" اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "دیکھو نا... اب تمھاری دو مہینے کی چھٹیاں شروع ہورہی ہیں اور میرے امتحان میں ابھی بیس دن باقی ہیں۔ مجھے تو کوئی ڈیڑھ ماہ بعد آزادی ملے گی۔ اس کے بعد امتحان کا نتیجہ آنے تک چھٹیاں ہوں گی۔ لیکن میری آزادی کے چند دنوں کے بعد ہی تمھارا اسکول کھل جائے گا اور تمھیں واپس آنا پڑے گا۔"

وصال دین کی سمجھ میں یہ پیچیدہ حساب نہیں آیا۔ "میں نہیں سمجھا بھائی۔ کیا اس بار ہم گاؤں صرف دس بارہ دن کے لیے جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ گھبراؤ نہیں ویر جی۔ تم ابھی گاؤں چلے جاؤ گے۔ میں ڈیڑھ ماہ بعد گاؤں آؤں گا۔ ہم دس بارہ دن ساتھ رہیں گے پھر تم دہلی واپس آجاؤ گے اور میں وہیں رکوں گا رزلٹ آنے تک..."

"تو ہم صرف دس بارہ دن ساتھ رہیں گے۔" وصال دین نے تاسف سے کہا۔ "ڈیڑھ مہینے تم یہاں اکیلے رہو گے۔ نہیں بھائی، میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمھارے ساتھ ہی گاؤں چلوں گا۔"

اوتار سنگھ کو اس پر پیار آگیا۔ "نہیں ویر جی۔ یہ زیادتی ہوگی۔ وہاں اماں اور چاچا تمھارا انتظار کریں گے۔ ان کی خوشیوں کے یہ اتنے سارے دن میں تم سے نہیں چھین سکتا۔ تمھیں جانا ہوگا۔"

وصال دین نے اماں اور ابا کے بارے میں سوچا اور کشمکش میں پڑ گیا۔ وہ اوتار سنگھ کو اکیلا بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اماں اور ابا کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ "نہیں بھائی، میں تمھارے ساتھ ہی رہوں گا۔"

اس لمحے وصال دین کی خالص محبت کو اوتار سنگھ نے اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "تم بہت اچھے ہو ویر جی... اور مجھے بہت پیارے ہو۔ لیکن یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔ تمھیں جانا ہی ہوگا۔"

اوتار سنگھ کا لہجہ فیصلہ کن تھا اور وصال دین نے کبھی اس کی بات نہیں ٹالی تھی۔ "بھائی... صرف تمھاری خاطر میں نے پڑھائی میں دل چسپی لی۔ ورنہ میرا دل نہیں لگتا تھا پڑھنے میں۔" اس نے اُداس لہجے میں کہا۔ "لیکن اب میں پچھتا رہا ہوں۔ کاش میں نے پڑھائی میں دل چسپی لی ہوتی تو آج یوں تمھیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔ یہ سزا ملی ہے مجھے بے دلی کی۔"

"میں سمجھا نہیں ویر جی۔"

"میں دل لگا کر پڑھتا تو کالج میں تمھارے ساتھ ہوتا نا۔" یہ بھی اس کی محبت تھی۔ اوتار سنگھ کا دل خوش ہو گیا۔ "اب پچھتائے کیا ہووت ویر جی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن بھائی، میں اکیلا تو گاؤں جا بھی نہیں سکتا۔" وصال دین نے کچھ سوچ کر کہا۔ "مجھے تو راستے بھی نہیں معلوم۔"

"تو تم اکیلے تھوڑا ہی جاؤ گے۔ رگھو ساتھ جائے گا اور تمھیں گاؤں چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔"

"مگر پھر یہاں رگھو کا کام کون کرے گا؟" وصال دین پریشان ہو گیا۔

"تم فکر بہت کرتے ہو ویر جی۔ ارے ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

وصال دین نے ذہن تو بنا لیا۔ لیکن جاتے وقت وہ اوتار سنگھ سے لپٹ کر اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ "میں تمھارے بغیر کیسے رہوں گا بھائی۔ میرا وہاں دل نہیں لگے گا۔" وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو بھی رونا آ رہا تھا۔ لیکن اس نے آنسو پی لیے۔ جانتا تھا کہ وہ رو دیا تو وصال دین کو گاؤں نہیں بھیج سکے گا۔ وہ جائے گا ہی نہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اس کا بھی برا حال تھا۔ آج تک وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہی نہیں تھے۔

"تم اماں سے میری باتیں کیا کرنا ویر جی۔ اور ہاں میرے پتا جی کا بہت خیال رکھنا۔ وہ بہت اکیلے ہیں۔ ان کے پاس روز جایا کرنا۔" اوتار سنگھ نے اسے گاؤں جانے کا گویا ایک اور مقصد بھی دے دیا۔ "پتا جی کو تمھاری صورت میں میری صورت نظر آیا کرے گی۔"

"یہ تو میں کروں گا ہی بھائی۔ یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔"

یوں وصال دین گاؤں چلا گیا۔ اگلے روز رگھو اسے چھوڑ کر واپس آیا تو ٹھاکر کے تحفوں سے لدا پھندا تھا جو اس نے اوتار سنگھ کے لیے بھیجے تھے۔ مگر اوتار سنگھ کو سب سے قیمتی چیز وہ حلوہ لگا جو اماں نے اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنا کر بھیجا تھا۔

جب سے اوتار سنگھ کالج میں گیا تھا۔ اس کا وصال دین سے ملنا بہت کم ہو گیا تھا۔ کالج کا طویل دورانیہ پھر زیادہ پڑھائی کی وجہ سے مصروفیت۔ اتوار کو چھوڑ کر بس وہ کھانے پر ہی ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن اب وہ چلا گیا تو اوتار سنگھ کو گھر سونا سونا لگنے لگا۔ امتحانوں کی وجہ سے پڑھائی کی بہت زیادہ مصروفیت نہ ہوتی تو شاید وہ بہت تڑپتا۔ جدائی کی پہلی رات وہ اپنے کمرے کی تنہائی میں جی بھر کے رویا۔ اس نے وہ آنسو بھی بہا دیے جو وہ ویر جی کے سامنے نہیں بہا سکا تھا۔ پھر بہ ہر حال، پڑھائی نے جدائی کے اس احساس کو کم... بہت ہی کم کر دیا۔

* * *

وصال دین گاؤں پہنچا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات ابا سے ہوئی جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اس نے ابا کو سلام کیا۔ رگھو نے انھیں پرنام کیا۔

"کب آیا وصال دین؟" جمال دین نے پوچھا۔

"ابھی آ رہا ہوں ابا۔"

جمال دین کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکیں۔ پھر ان میں مایوسی اور حیرت کا تاثر ابھرا۔ "چھوٹے ٹھاکر کہاں ہیں؟"

"وہ تو نہیں آئے ابا۔ ابھی تو ان کے امتحان بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مہینا ڈیڑھ کے بعد آئیں گے وہ۔"

"تب تو تجھے بھی نہیں آنا چاہیے تھا وصال دین۔ تو چھوٹے ٹھاکر کو اکیلا چھوڑ آیا۔" جمال دین نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں نہیں آ رہا تھا ابا۔ چھوٹے ٹھاکر نے زبردستی بھیجا ہے مجھے۔" وصال دین نے ندامت سے کہا۔ "چاہے رگھو سے پوچھ لو ابا۔"

جمال دین نے سوالیہ نظروں سے رگھو کو دیکھا۔ "وصال دین ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا۔" رگھو نے کہا۔

لیکن جمال دین کے رویے میں نرمی نہیں آئی۔ "اور تو رگھو کو بھی لے آیا۔ انھیں بالکل اکیلا کر دیا تو نے۔"

"میں تو چاچا وصال دین کو چھوڑنے آیا ہوں۔ کل واپس چلا جاؤں گا۔" رگھو نے کہا۔

"تجھے تو بالکل نہیں آنا چاہیے تھا رگھو۔" جمال دین بیٹے کی طرف مڑا۔ "اب پہلے گھر نہ جانا۔ ٹھاکر جی کے پاس جانا۔"

"میں وہیں جا رہا ہوں ابا۔"

جمال دین نے پہلی بار بیٹے کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ بڑا جوان ہو گیا تھا۔ قد بھی اونچا ہو گیا تھا اور جسم بھی بھر گیا تھا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کے جسم کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ سر سے اُترا۔ لیکن کندھے تک آتے آتے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "بس تو اب چلا جا۔ یہاں دیر نہ کر۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

وصال دین سال بھر کے بچھڑے باپ سے لپٹنا چاہتا تھا

اس نے خود کو روک لیا۔ باپ کا حکم ماننے کی عادت جو تھی۔ وہ کے ساتھ حویلی کی طرف چل دیا۔ جمال دین نہ کہتا تو بھی وہ حویلی ہی جاتا۔ اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی۔

جمال دین اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا... شکر اور مسرت جھلکتی آنکھوں سے۔ اس کا وصال دین اب مرد بن چکا ۔ اے اللہ... تیرا شکر ہے۔ اس نے زیر لب کہا۔ یہ سب تیرا مل ہے۔ تیری عنایت ہے۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیوان خانے میں تھا۔ منیم جی اسے کچھ ب کتاب بتا رہے تھے۔ وصال دین کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ "پتر وصال دین، کب آئے؟ کیسے ہو؟" اس نے وصال کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں ٹھاکر جی۔" وصال دین نے جواب دیا۔ وہ امید کر رہا تھا کہ ٹھاکر بھائی کے بارے میں حیرت سے ے گا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔

"اوتار سنگھ تو امتحان کی تیاری میں لگا ہوگا۔" ٹھاکر نے حیران کر دیا۔

وصال دین کو احساس جرم ہونے لگا۔ کاش وہ نہ آیا ہوتا۔ "میں آ رہا تھا ٹھاکر جی پر بھائی نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے معاف..."

"ارے کیسی بات کرتے ہو پتر!" ٹھاکر نے اس کی ت کاٹ دی۔ "یہ تو زیادتی ہوتی تمھارے ساتھ۔ دیکھو اوتار سنگھ دیر میں آئے گا تو دیر سے جائے گا بھی۔ ہاں اتنے ہی دن رُکے گا وہ۔ جب کہ تمھیں جانا بھی اس ے پہلے ہی ہوگا۔ اس نے اچھا کیا کہ تمھیں بھیج دیا۔ یہ ... وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"جی ٹھاکر جی۔ ٹھیک ہیں۔ بس آج کل فرصت نہیں ہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ پر اِس کا پھل بھی اچھا ملے گا اُسے۔ ھا وصال دین آؤ بیٹھو تو۔"

"جی... میں... میں یہیں ٹھیک ہوں ٹھاکر جی۔"

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ بیٹے کیسے باپ پر تے ہیں۔ جمال دین بھی بیٹھنے سے گھبراتا تھا۔ اس نے ا۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔ "ارے وصال دین، تم ر بھی گئے ہو یا نہیں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"سیدھا یہیں آیا ہوں ٹھاکر جی۔"

"حمیدہ بہن سے نہیں ملے؟ جمال دین سے نہیں..."

"ابا سے تو کھیت میں ملاقات ہو گئی تھی۔"

"او... پر پہلے ماں سے ملنا تھا نا۔" ٹھاکر نے تڑپ کر کہا۔ "بس تم فوراً گھر جاؤ اپنے۔"

"جاتا ہوں ٹھاکر جی۔ پر ایک بات کرنی ہے آپ سے۔"

"بولو... کیا بات ہے؟"

"مجھے اجازت دے دیں کہ میں ہر روز کچھ دیر کے لیے آپ کے پاس آ جایا کروں۔"

ٹھاکر کھِل اٹھا۔ "اجازت کی کیا بات ہے پتر۔ یہ تمھارا گھر ہے۔ جب چاہے، آ سکتے ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک کسی خیال سے سنجیدہ ہو گیا۔ "پر اپنے ماں باپ کا حق نہ مارنا۔ وہ کب سے ترس رہے ہیں تمھیں۔"

"جی ٹھاکر جی... میں خیال رکھوں گا۔"

"بس اب جاؤ تم۔" ٹھاکر نے شفقت سے کہا۔

وصال دین چلا گیا۔ مگر ٹھاکر دیر تک دروازے پر نظریں جمائے رہا۔ 'کیا میرا اوتار سنگھ بھی ایسا ہی بڑا ہو گیا ہوگا۔' وہ سوچ رہا تھا۔ پچھلی بار جب وصال دین کو دیکھا تھا تو وہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ اس کا دل مچلنے لگا اوتار سنگھ کو دیکھنے کے لیے۔ پھر اس نے سوچا۔ 'تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔ امتحان ختم ہوں گے اور وہ آ جائے گا۔'

اس کا جی چاہا کہ دہلی چلا جائے اور اوتار سنگھ کو جی بھر کر دیکھے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ لیکن امتحان کے دنوں میں مناسب نہیں تھا۔ وہ بھی پیاسا رہ جاتا اور اوتار سنگھ کی پڑھائی میں بھی خلل پڑتا۔

اس نے چونک کر سر گھمایا تو رگھو پر نظر پڑی۔ "میرے لیے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو پہنچا کر آ ؤں۔ اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔"

"نہیں۔ تم کل صبح واپس جانا۔ اب جاؤ اور شانتا کو یہاں بھیج دو۔" ٹھاکر نے کہا۔

رگھو نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "جو حکم اَن داتا۔"

باہر وصال دین گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اُڑ کر ماں کے پاس پہنچ جائے۔

کوکھ سے گھر پیدا ہونے والے ٹھاکر اوتار سنگھ کی کہانی
کے من میں ایک چنگاری تھی جو شعلہ بننے کے لیے بے تاب تھی
ظر اور بے قرار آنکھوں کے لیے اس معجوب داستان کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔

زنانہ

اختر شہاب

ایک مردانہ ماحول کے پچھتاوے کا قصہ، ایک واقعہ اس کے ساتھ ایسا پیش آیا کہ اسے اپنے مرد ہونے پر شک ہونے لگا

دُرّانی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اردگرد کا ماحول اچانک بدل گیا ہے۔ جیسے وہ کسی نئی دنیا میں آ گیا ہے جو وقت، حالات اور زمانے کے لحاظ سے اس کی موجودہ دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ ایسا شاید وہاں پر موجود کسی ان دیکھی ٹائم مشین کی وجہ سے ہوا ہے جس نے اچانک اسے اس نئی دنیا میں پہنچا دیا ہے۔ ایسی دنیا جو اس کی نہیں ہے۔ جو شاید ماضی قریب یا ماضی بعید کا کوئی منظر ہے۔ یا پھر یہ مستقبل کا کوئی وقت ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ منظر یا یہ واقعہ اس کے ملک میں وقوع پذیر ہو رہا ہے یا ہندوستان میں۔ یہ عراق کا منظر ہے یا صومالیہ کا... یا پھر تیسری دنیا کے کسی اور ملک کا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے بٹن دبا کر اسے سینما ہال میں چلتی کسی تشدد آمیز فلم کا حصہ بنا دیا ہو، یا پھر وہ 'یوٹیوب' پر موجود کسی کلپ کا کیریکٹر ہو۔

محض چند گز کے فاصلے اور چند لمحوں کے گزرتے ہی ایک دم ایک نئی دنیا اور اک نئے ماحول میں داخل ہونے والے احساس کا تجربہ دُرّانی کو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

*

دُرّانی کو اس دن کا منظر یاد آ رہا تھا جب کریم آباد پُل سے اترتے ہی اک لرزہ خیز منظر اس نے دیکھا تھا۔

پُل سے اُترتے ہی دُرّانی کو لوگوں کا اک ہجوم نظر آیا تو تجسس نے اسے موٹر سائیکل روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تحقیق کرنے پر اسے معلوم ہوا تھا کہ ایک لوڈر سوزوکی کا پچھلا ٹائر پنکچر ہو گیا سوزوکی کا ڈرائیور جیک لگا کر ٹائر بدلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پیچھے سے آنے والی کار اسے بری طرح زخمی کرتے ہوئے نکل گئی تھی۔ اس بے حس کار ڈرائیور نے رکنے کی زحمت بھی نہ کی تھی مگر لوگوں کا ہجوم زخمی کی مدد کو جمع ہو گیا تھا۔ خاص طور پر وہاں سے گزرنے والا ہر موٹر سائیکل سوار رُک کر حالات کا جائزہ لیتا اور مدد میں مقدور بھر اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کرتا۔

اس وقت بھی کوئی زخمی کے سر پر کپڑا لپیٹ رہا تھا، کوئی اس کے زخمی بازو پر پٹی باندھنے میں لگا ہوا تھا۔ کوئی آنے جانے والی گاڑیوں کو روک کر زخمی کو اسپتال لے جانے کی درخواست کر رہا تھا۔ کوئی زخمی سے اس کے رشتے داروں کا پتا پوچھ رہا تھا اور موبائل نمبر معلوم کر رہا تھا تاکہ اس کے رشتے داروں کو اطلاع دے سکے۔ کوئی زخمی کے سات آٹھ سالہ بچے سے ہمدردی کر رہا تھا۔ ہر شخص یوں پریشان تھا جیسے اس کا کوئی قریبی عزیز زخمی ہو گیا ہو۔

دُرّانی نے بھی اس کارِ خیر میں شامل ہونے کی کوشش کی اور جب ان کے روکنے کے باوجود کوئی گاڑی والا اس زخمی کو اسپتال لے جانے پر رضامند نہ ہوا تو دُرّانی نے ایمبولنس کو فون کیا۔ آن کی آن میں ایک ایمبولنس آئی اور زخمی کو لے کر روانہ ہو گئی۔ زخمی کے جانے کے بعد ایک موٹر سائیکل سوار زخمی کے بیٹے کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر اُس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے دو اور موٹر سائیکل سوار بھی اس کی مدد کے لیے روانہ ہو گئے۔ دُرّانی بھی مطمئن ہو کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دُرّانی کے لیے یہ منظر، یہ ماحول، یہ ہجوم کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ یہ اس کا اپنا ماحول تھا۔ یہ اس کی اپنی دنیا تھی۔ یہ اس کے اپنے لوگ تھے۔

وہاں سے روانہ ہوتے وقت دُرّانی کو خیال آیا کہ ایک بار اس کے ایک دوست نے اس سے سوال کیا تھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ کراچی میں سب سے بڑی، سب سے متحد اور سب سے ہمدرد برادری کون سی ہے... یا وہ کون سی این جی او ہے جو رنگ، نسل اور مذہب کا خیال کیے بغیر سب کی مدد کرتی ہے۔ لہٰذا اگر پولیس کی چیرہ دستیوں کا خیال نہ ہو تو وہ مدد کے مستحق لوگوں کو ان کے گھروں تک بہ حفاظت پہنچا کر آئے۔"

دُرّانی نے بہت سوچا، بہت سی برادریوں کے نام لیے مگر اس کے دوست نے سب کو مسترد کر دیا۔

"اچھا، اب خود ہی جواب بھی دے دو۔" دُرّانی نے تنگ آ کر کہا۔

"وہ ہے کراچی کی موٹر سائیکل برادری!" اس کے دوست نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ "تم نے خود بھی مشاہدہ کیا ہو گا کہ سڑک پر اگر کسی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو، کوئی زخمی ہو، کسی کی گاڑی خراب ہو یا کوئی حادثہ ہو جائے تو ہر گزرنے والا موٹر سائیکل سوار رُک کر حسبِ مقدور مدد کر کے اور پھر مطمئن ہو کر ہی وہاں سے آگے روانہ ہوتا ہے۔"

یہ بات تو واقعی دُرّانی کے مشاہدے میں آئی تھی کہ موٹر سائیکل سوار سڑک پر کوئی مسئلہ دیکھتے ہی رُکنے لگتے تھے۔ ایسا ایک واقعہ تو خود دُرّانی کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔

اس دن دُرّانی اپنے چھوٹے بیٹے کو موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھا کر اور درمیان میں ایک خالی سوٹ کیس رکھ کر اپنے گھر لا رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے بجائے دُرّانی کو پکڑنے کے سوٹ کیس کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ اپنے معمول کی رفتار سے گھر کی طرف رواں تھا کہ اچانک برابر سے گزرنے والی تیز رفتار بڑی بس کے ایک جھونکے نے اس کا توازن خراب کر دیا اور دُرّانی کا بیٹا سوٹ کیس کو سنبھالنے کی کوشش میں موٹر سائیکل سے پھسل کر سڑک پر جا گرا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ جب وہ گرا تو سوٹ کیس اس کے نیچے آ گیا لہٰذا وہ چوٹ اور خراشوں سے محفوظ رہا۔ مگر پیچھے سے آتی ہوئی ٹریفک کے بارے میں سوچ کر دُرّانی خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے فوراً بریک لگا کر موٹر سائیکل روکی۔ پھر مڑ کر دیکھا تو پیچھے کا منظر دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ منظر ہمیشہ کے لیے، اس کی آنکھوں میں منجمد ہو گیا تھا۔

دُرّانی نے دیکھا، اس کے پیچھے آنے والے ایک اُدھیڑ عمر مہندی رنگی ڈاڑھی والے شخص نے اس کے بیٹے کے قریب موٹر سائیکل روک لی تھی اور موٹر سائیکل پر بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہو کر اس کے بیٹے کو بچانے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ یوں پھیلائے ہوئے تھے جیسے خالی ہاتھوں سے وہ پیچھے سے آنے والی تمام ٹریفک کو روک لے گا۔ یہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ٹریفک ہلکی تھی ورنہ اس کے بیٹے کو بچاتے ہوئے شاید وہ بھی مارا جاتا۔

اس شخص کی ہمدردی اور انسانیت دیکھ کر دُرّانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ دُرّانی موٹر سائیکل سے اتر کر اپنے بیٹے کو سنبھالتا، دو تین موٹر سائیکل سوار رُک چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے آ کر اس کے بیٹے کو اٹھا لیا تھا اور اسے سائیڈ میں فٹ پاتھ پر لے آیا تھا لہٰذا دُرّانی بھی اپنی موٹر سائیکل سائیڈ پر لے آیا۔

ڈرّانی کے موٹر سائیکل کھڑی کرتے کرتے دس بارہ موٹر سائیکل سوار اور دوسرے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ ہر شخص اس کے بیٹے کا حال پوچھ رہا تھا، اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس سے معلوم کر رہا تھا کہ اسے چوٹ تو نہیں لگی۔ اسے چکر تو نہیں آ رہے۔ اسے متلی وغیرہ تو نہیں ہو رہی ہے۔

یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ڈرانی کا بیٹا سو فیصد ٹھیک ہے' لوگ وہاں سے روانہ ہونے لگے مگر ان میں سے ایک شخص اس وقت تک وہاں رُکا رہا جب تک ڈرّانی اپنے بیٹے کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر وہاں سے روانہ نہ ہو گیا۔

یہ واقعہ ڈرّانی کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ لوگ، یہ ماحول' یہ منظر، یہ دنیا... سب اس کی اپنی تھی۔ وہ ان میں شامل تھا۔

* * *

آج ڈرّانی اپنے گھر سے اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا تھا کہ اپنی مردانگی اور غیرت کا بھرم رکھتے ہوئے' آج چاہے اسے اپنے قرض نادہندہ کا گریبان ہی کیوں نہ پکڑنا پڑے، وہ اس سے اپنی رقم وصول کر کے لائے گا۔ کیوں کہ گھر میں اس کی بیوی نے طعنے دے دے کر اس کا کلیجا چھلنی کر دیا تھا۔ وہ اس کی شرافت اور نیک نیتی کو بزدلی کہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا۔

"جب تمھارے دوست کو پیسے لوٹانے کی شرم نہیں تو تم بھی بے شرم بن جاؤ اور اپنے پیسے واپس لاؤ۔"

"اگر اس کے پاس گنجائش ہو گی تو وہ خود ہی دے دے گا۔" ڈرّانی ہمیشہ یہی جواب دیا کرتا تھا۔ "مجھے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"تمھیں پیسے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے اور مجھے تمھاری اس پھٹیچر موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی ہے۔" اس کی بیوی کہتی۔ "میرے تمام رشتے داروں میں تم ہی ایک واحد شخص ہو جو موٹر سائیکل پر آتے جاتے ہو ورنہ آج کل تو معمولی آدمی کے پاس بھی کار ہے۔ تم دراصل اس سے پیسے مانگنے سے ڈرتے ہو... ارے، مرد بنو، مرد! اور اپنا حق وصول کر کے لاؤ..."

بات اس کی بیوی کی بھی صحیح تھی۔ جاوید نامی وہ شخص ڈرّانی کا دوست تھا مگر اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ اس قدر مطلبی اور خود غرض نکلے گا کہ قرض وصول کر کے ادا کرنے کا نام ہی نہ لے گا۔

جاوید جب اس سے اُدھار مانگنے آیا تھا تو واقعی بہت مصیبت میں تھا، یعنی اس کے بیٹے کے دل کا آپریشن تھا جس کے لیے اسے پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ ڈرّانی نے انھی دنوں کار خریدنے کے لیے دفتر سے دو لاکھ روپے ایڈوانس طور پر حاصل کیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں کچھ ا ملا کر ایک معقول سی سیکنڈ ہینڈ کار خریدی جا سکتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں چند ایک کاریں دیکھ بھی چکا تھا۔ بلکہ ایک کار اسے پسند بھی آ گئی تھی جو سنگل ہینڈیڈ بھی اور بہت کم چلی ہوئی تھی۔ کا مالک اسے بیچ کر امریکا جا رہا تھا۔

ڈرّانی کا خیال تھا کہ آج کل میں مکینک بلا کر اور کار کی ٹرائی لے کر اسے خرید لے گا مگر درمیان میں جاوید آ گیا۔ ڈرّانی نے اپنی ضرورت کو پسِ پشت ڈال کر دوست کی ایمر کا خیال کرتے ہوئے وہ دو لاکھ روپے اسے دے دیے تھے۔

اس بات کو دو سال ہو چکے تھے۔ جاوید کا بیٹا نہ صرف صحت یاب ہو چکا تھا بلکہ جاوید کا کاروبار بھی اچھا خاصا چل ر تھا۔ مگر مانگنے کے باوجود بھی جاوید آج کل آج کل کر کے ٹالے جا رہا تھا اور پیسے واپس کرنے کا نام نہ لیتا تھا۔

آج ڈرّانی اسی خیال سے گھر سے نکلا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ اپنی مردانگی کے زور پر جاوید سے پیسے وصول کر کے لائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جاوید کو اس کی دکان پر ہی پکڑے گا اور دو چار لوگوں کے سامنے اس کی بے عزتی کرے گا اور پیسے لے کر ہی اٹھے گا۔ مگر گلشن کا پُل کراس کر کے وہ جونہی گلشن چورنگی کے پاس پہنچا' اس کی نگاہوں کے سامنے سارے منظر دھندلا گئے۔

رُکا تو ڈرّانی حسب عادت ہجوم دیکھ کر کسی کی مدد کرنے کے خیال سے تھا مگر جیسے ہی اس نے اپنی موٹر سائیکل روکی' ایک شخص ہجوم سے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور خون بہہ کر اُس کی گردن سے ہوتا ہوا اس کی قمیص کو رنگین کر رہا تھا۔

"کیا ہوا...؟" ڈرّانی نے پوچھا۔

"وہ... وہ... ہمیں ایسے ہی مار رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ اور اس سے پہلے کہ ڈرّانی اس سے کچھ اور پوچھتا' وہ بھاگ کر دور جا کھڑا ہوا۔

'شاید پولیس والوں نے لاٹھی چارج کیا ہے۔' ڈرّانی نے سوچا اور اپنی موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ہجوم میں گھس گیا۔

وہاں منظر ہی دوسرا تھا۔ سڑک کے تقریباً درمیان میں مرغی سپلائی کرنے والا ایک ٹرک کھڑا تھا۔ اس کی چھت پر دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے زرد تھے۔ وہ بھی اترتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ سڑک کی بائیں جانب ایک کار کھڑی تھی جس میں کچھ افراد بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ اُتر ر ے۔ جب کہ سڑک کے درمیان ایک بیس بائیس سالہ لڑکا پڑا تھا جو شاید مرغی والے ٹرک کا ڈرائیور تھا اور جسے کوسٹر سے والے افراد مکّوں اور لاتوں سے بری طرح مار رہے ے۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا، مار کھاتا اور پھر گر پڑتا۔ اس لڑکے کا پھٹ گیا تھا، دانت ٹوٹ گئے تھے اور خون سے رنگین اس کا بہت خوف ناک نظر آ رہا تھا۔

ڈرّانی کو یہ منظر دیکھا بھالا لگا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس نے یٹ پر ایک ویڈیو دیکھی تھی جس میں ہندو انتہا پسند ایک لمان لڑکے کو ایسے ہی مار رہے تھے۔ وہ اسے اس بری طرح رہے تھے جس طرح یہ لڑکا یہاں مار کھا رہا تھا۔

ڈرّانی نے ماحول کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا زرد اور سُتے ئے چہروں والے لوگ جیسے مجسموں کی طرح کھڑے تھے۔ ئی بھی اس لڑکے کو بچانے کے لیے آگے نہیں آ رہا تھا۔ اس بجائے یہ لوگ دُور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ قرونِ وسطیٰ کے لوگ ہیں جو ایک نور کے مرنے کا تماشا دیکھ رہے ہیں... یا پھر یہ خود کو روم ائر کے ایک اسٹیڈیم میں کھڑا محسوس کر رہے ہیں جہاں ایک م کو سزا کے طور پر بے دردی سے مارا جا رہا ہے اور ان کے موجود زمانہ قدیم کا وحشی انسان اس نظارے سے تسکین حاصل کر رہا ہے۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے جسموں سے طاقت نچوڑ لی ی ہے۔ وہ جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ کسی فلم کے کردار ہیں جو یکٹر کی مرضی کے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جیسے ان کا کردار متعین اور وہ اس کی حدود سے باہر نہیں جا سکتے۔ یا پھر وہ انسان کے ے محض جانور رہ گئے ہیں جو اپنے ہم جنس دوسرے جانور کو شکار ے دیکھ کر اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے دوسرے جانور کا سمجھ کر دور سے بے بس نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ اور شاید یہ چتا رہتا ہے کہ اس کی باری کبھی نہیں آئے گی۔

موب کریٹنٹی... یعنی ظلم ہجوم! ڈرانی کو کہیں پڑھی ہوئی صطلاح یاد آ گئی۔

"شاید یہی ہجوم کا ظلم ہے جس میں زیادہ لوگ کسی اکیلے ص کو مار مار کر ادھ مُوا کر دیتے ہیں' مٹی کا تیل ڈال کر جلا تے ہیں۔ یا پھر موب کریٹنٹی اس ردِعمل کا نام ہے جس میں کوئی شخص اپنے اوپر یا اپنے ہم دردوں پر ہونے والے م یا زیادتی سہتے سہتے جب کسی کم زور مجرم مثلاً کسی جیب ے یا پھر نہتے ڈاکو کو بے بس دیکھتا ہے تو ان مظالم کا بدلہ لینے کے لیے، اپنی تسکین کے لیے اس مجرم کو ایک آدھ لات رسید کر دیتا ہے' ایک آدھ مُکا تو جڑ دیتا ہے۔

پر یہ تو موب کریٹنٹی کا کیس نہیں تھا کیوں کہ ہجوم تو خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا... جب کہ مارنے والا گروہ چند افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ مار کھانے والے نہ تو جیب کترے تھے نہ ڈاکو۔ وہ نہ تو دوسرے فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور نہ ہی دوسرے مذہب سے۔ وہ تو انھی کی نسل کی اور ان کے ہم مذہب لوگ تھے۔ بلکہ یہ تو موب کی بے حسی کا کیس تھا۔ کیوں کہ اگر تمام لوگ مل کر ان مار کھانے والوں سے ہم دردی کرتے تو ان مظلوموں کو بچایا جا سکتا تھا۔

مار کھانے والوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ غریب مرغی والے ٹرک ڈرائیور سے کوسٹر کو ذرا سی سائیڈ لگ گئی تھی۔ کوسٹر والے چوں کہ تعداد میں زیادہ تھے اور سفید پوش تھے لہٰذا انھوں نے کوسٹر سے اتر کر ان غریبوں کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے کلینر تو زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا اور دور کھڑا بے بسی سے آنسو بہا رہا تھا جب کہ ڈرائیور جو اُن کے ہتھے چڑھ گیا تھا، زمین پر پڑا مار کھا رہا تھا۔

ڈرّانی نے دیکھا کہ مار کھانے والا شخص بالکل انٹرنیٹ کی فلم کی طرح چپ چاپ پڑا مار کھا رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر لڑکھڑا کر گر گیا۔ کیوں کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ پھر سڑک پر لیٹ گیا۔ بالکل اس زخمی ہرن کی طرح جسے کتے شکار کر رہے ہوں۔

وہ لوگ اسے مکّوں سے، لاتوں سے اور ڈنڈے سے مار رہے تھے مگر وہ چیخ نہیں رہا تھا، چلّا نہیں رہا تھا۔ کسی سے مدد کی درخواست نہیں کر رہا تھا۔ بچاؤ، بچاؤ نہیں پکار رہا تھا۔

شاید اسے بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس وقت اس کی مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ اسے یوں ہی مار کھانی ہے اور مار کھاتے کھاتے مر جانا ہے۔ اس نے ساری امیدیں چھوڑ دی تھیں۔ تبھی تو وہ اپنے آپ کو نہیں بچا رہا تھا۔ بس بے جان لوتھڑے کی طرح زمین پر پڑ گیا تھا۔ ہر نیا مُکا یا لات اس میں کچھ حرکت پیدا کرتی، اور وہ پھر وہیں ڈھے جاتا۔

اس کے اطوار سے لگ رہا تھا کہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ اس وقت اپنے جیسے انسانوں کے درمیان نہیں بلکہ چلتے پھرتے مجسموں کے درمیان ہے جو مردانگی اور غیرت سے عاری ہوتے ہیں۔ وہ محض ایسے تماشائی ہیں جو یہ تماشا بغیر پیسے خرچ کیے مفت میں اور 'لائیو' دیکھ رہے ہیں۔ بعد میں نہ صرف وہ اپنے

اپنے گھروں، دفتروں یا دکانوں پر جا کر اس منظر کی تفصیل سنا کر اس کی سنسنی خیزی کا مزہ لیں گے بلکہ اپنے جذبۂ خفت کی تسکین بھی کریں گے۔

ڈرّانی نے یہ بھی دیکھا کہ ایک شخص موبائل آن کیے ہوئے اس منظر کی فلم بنا رہا تھا۔ شاید اپنے لیے، شاید میڈیا کے لیے... یا انٹرنیٹ پر یوٹیوب پر جاری کرنے کے لیے!

''ارے کم بختو! یہ کیا کرتے ہو!'' ڈرّانی سے نہ رہا گیا اور وہ حوصلہ کر کے آگے بڑھا۔ مگر جب ان میں سے ایک شخص نے جس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا' اسے گھور کر دیکھا تو وہ سہم گیا اور وہیں رُک گیا۔

کوسٹر میں اب دو چار ہی لوگ بیٹھے تھے۔ زیادہ تر لوگ نیچے اتر آئے تھے اور نہ صرف حسبِ استطاعت لڑکے کو لاتوں' مکّوں یا گالیوں سے نواز رہے تھے بلکہ ٹرک کے ڈرائیور کیبن کی اوپری چھت پر محصور دو افراد کو بھی ڈرا دھمکا رہے تھے' انھیں نیچے اترنے کو کہہ رہے تھے۔

چھت پر موجود دونوں افراد ہچکچا رہے تھے جیسے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ نیچے اتر کر اپنے ساتھی کی مدد کرنے کی کوشش میں زخمی ہوں یا پھر اوپر ہی رہ کر اپنی جان بچائیں۔ نیچے اترنے میں نقصان تھا۔ زخمی ہونے کا، ہڈیاں ٹوٹنے کا بلکہ جان سے جانے کا خدشہ تھا۔ جب کہ اوپر رہنے میں شرمندگی تھی' بزدلی کا طعنہ تھا' اپنے ساتھی کی مدد نہ کرنے کی خفت تھی اور بعد میں جگ ہنسائی تھی۔

''ارے چھوڑ دو اسے۔ نہ مارو اسے... ارے بھائی' کیا کرتے ہو! یہ بھی کسی کا بیٹا ہے' تمھارا بھائی ہے...'' یہ مدد کی پہلی آواز تھی جو ڈرّانی نے سنی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دو بوڑھی عورتیں دُور سے ہی چلا کر ان کوسٹر والوں کو ظلم سے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ڈرّانی آگے بڑھا اور مارنے والے ایک شخص کو دھکا دے کر نیچے پڑے شخص کے اوپر سے ہٹایا۔ پیچھے سے کسی دوسرے شخص نے ڈرّانی کو ایک مکا جڑا تو وہ بلبلاتا ہُوا پیچھے ہٹ گیا۔

پیچھے ہٹ کر اس نے ایک بار پھر ماحول کا جائزہ لیا۔ ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ تجسس میں دوسرے لوگوں کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ سب کے سب تماشائی! کسی میں اس بات کا حوصلہ نہ تھا کہ آگے بڑھ کر مظلوم کا ساتھ دیتا۔

شاید ان کے لاشعور میں یہ بات موجود ہو کہ کہیں وہ دوسرے کو بچاتے بچاتے خود اس کیس میں نہ پھنس جائیں۔ ان کی دکان کھلنے سے نہ رہ جائے، ان کی دیہاڑی نہ ٹوٹ جائے یا پھر انھیں دفتر سے دیر نہ ہو جائے۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا جب کہ مار کھانے والا بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ مارنے والے بھی کچھ ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور تواتر سے مارنے کے بجائے تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر ایک آدھ لات رسید کرنے پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔ جب کہ باقی لوگ اوپر چھت پر رہ جانے والے کو للکار رہے تھے کہ نیچے اترو تمھارا بھی یہی حشر کرتے ہیں۔

ڈرّانی نے ایک بار پھر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس دفعہ ہجوم کے دھکے سے سڑک پر گرا۔ گرنے سے نہ صرف اس کی کہنیاں چھل گئیں بلکہ پینٹ بھی گھٹنے سے پھٹ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا مگر اتنے سارے لوگوں میں وہ دھکا دینے والے کو کیسے شناخت کرتا۔

ڈرّانی اس دھکے سے اتنا بدحواس ہُوا کہ کچھ دیر کو سدھ بدھ ہی بھول گیا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ جب اُس کے حواس بہ حال ہوئے تو اسے محسوس ہُوا کہ جیسے منظر بدل سا گیا ہے۔ نہ صرف پولیس موبائل آ گئی ہے اور پولیس والے ان مارنے والوں کو پکڑ رہے ہیں بلکہ ایمبولنس بھی آ گئی ہے جس میں سے رضاکار اتر کر اس لڑکے کو اسٹریچر پر لٹا کر ایمبولنس میں ڈال رہے تھے۔ جو نہ جانے بے ہوش تھا یا مر چکا تھا۔ جب کہ وہ خود ان بوڑھی عورتوں کے ساتھ کھڑا چلائے جا رہا تھا۔

''ہائے، ہائے کیا کرتے ہو! بس کرو ظالمو۔ اب مار کے ہی دم لو گے۔ ظالمو چھوڑ دو اسے...''

پولیس مجرموں اور ایمبولنس زخمیوں کو لے کر چلی گئی تو ہجوم چھٹنے لگا۔ ڈرّانی وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے مجرم ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' ایک انسان میری نظروں کے سامنے مر گیا اور میں اس کی جان بچانے کے بجائے اپنی جان بچاتا رہا۔ تف ہے میری مردانگی پر۔ شاید میں حوصلہ کر کے آگے بڑھتا تو میری دیکھا دیکھی اور بھی لوگ آ جاتے... تو اس لڑکے کا یہ حال نہ ہوتا! میری بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ میں شاید مرد نہیں ہوں۔ جبھی تو محض ان عورتوں کی طرح زنانی آوازیں ہی نکالتا رہا۔ مردوں کی طرح ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ نہیں کر سکا!

اسے محسوس ہُوا کہ نہ صرف ان عورتوں بلکہ ساری قوم کی طرح وہ زنانہ ہو گیا ہے اور اب ساری زندگی تالیاں ہی پیٹتا رہے گا۔

بڑبولا

رچرڈ ہارڈنگ ڈیوس / محمد عباس ثاقب

ایڈونچر کے دلدادہ، ایک بڑبولے... اور اس کے حقیقت شناس
دوست کی شوقیہ مہم جوئی
اُن کے سنسنی خیز ایڈونچر کی ابتدا اتنی اچانک ہوئی کہ
انھیں کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا

میں نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ آئندہ اپنی سالانہ طیلات مہم جوئی پر مبنی سرگرمیوں میں صرف کروں گا۔

مجھ میں جرأت یا جوش و جذبے کی کمی ہے، نہ ہی میں کے اس حصے میں پہنچا ہوں جہاں لہو گرم رکھنے کے لیے ن مصنوعی ذرائع کا محتاج ہو جاتا ہے۔ میں چند ماہ پہلے ہی سال کا ہُوا ہوں۔ میری الجھن یہ ہے کہ میری اب تک کی ی ہیجان اور ہنگامہ خیزی سے عاری، بہت سیدھی سادی اور ار گزری تھی اور میری شدید خواہش تھی کہ مجھے بھی زندگی ایڈونچر درپیش ہوں۔

کینٹ کا خیال ہے کہ اپنی اس روکھی پھیکی زندگی کا میں ے دار ہوں۔ اس کا اصرار ہے کہ اگر آپ ایڈونچر کے ش مند ہیں تو آپ کو خود ان کے تعاقب میں جانا ہوگا۔

کینٹ میرا شریک کار ہے۔ اونی ملبوسات تیار کرنے لے ادارے جوائس اینڈ کوربی میں وہ میرے ساتھ والی ست پر بیٹھتا ہے۔ میں اسٹینوگرافر ہوں اور وہ کلرک۔ ہم وں مسز شا کے بورڈنگ ہاؤس میں الگ الگ کمروں میں م ہیں۔ کینٹ مجھ سے صرف ایک سال بڑا ہے لیکن وہ کسی نہ کسی ایڈونچر سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ میں رات تک قانون کی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ کیوں کہ میری ہش ہے کہ مستقبل میں وکالت کا امتحان پاس کر کے الت میں مقدمات کی پیروی کروں اور وکلا کی تنظیم میں لیت اختیار کروں۔ اکثر میں مطالعے میں مشغول تا ہوں کہ کینٹ دروازے پر دستک دیتا ہے۔ وہ اپنے ھ پیش آنے والا کوئی حیرت انگیز واقعہ سناتا ہے۔ کبھی وہ ک بجھانے والی گاڑی کے تعاقب میں آتش زدگی کے م تک پہنچتا ہے اور کئی لوگوں کی جان بچاتا ہے، یا کسی والے کو بدمعاشوں کے نرغے سے بچ نکلنے میں تا ہے۔ کبھی وہ ہوٹل بکر میں کسی اجنبی کو دوست تا ہے اور بے تکلفی بڑھنے پر پتا چلتا ہے کہ وہ شخص کوئی شہرۂ آفاق ادیب یا ارب پتی تاجر ہے۔ جب کہ خواتین، خصوصاً حسینائیں تو ہمیشہ ٹیکسی میں کینٹ کا پیچھا کرتی رہتی ہیں تاکہ اس سے مدد حاصل کر سکیں۔ اگر وہ لوگوں کو نہ بتائے کہ وہ وہی شخص ہے جو اپنی ذہانت اور بہادری سے لوگوں کو مشکلات سے نجات دلاتا ہے، تو کوئی کینٹ کو دیکھ کر کبھی یقین نہ کرے۔ کوئی اپنے مصائب کے حل کے لیے کسی مدقوق دُنحنی ہستی سے کیوں رجوع کرے گا! آپ سوچیں گے کہ پریشانی سے دوچار خواتین نے کسی جسیم فرد یا کم از کم کسی پولیس والے سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ اس کے برعکس خواتین... اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، حسینائیں ہمیشہ کینٹ کا گھیراؤ کیے رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے، اور جیسا کہ کینٹ کا کہنا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نیویارک جیسے ہنگامہ پرور شہر میں پیدا ہُوا اور یہیں پلا بڑھا ہے۔ لہٰذا اپنے نین نقش، حلیے اور چال ڈھال سے خالصتاً نیویارک کا فرزند لگتا ہے۔ جب کہ میں نے اب سے ایک سال پہلے تک کی اپنی ساری زندگی فیئر پورٹ میں گزاری ہے۔ فیئر پورٹ ایک خوب صورت بندرگاہ ہے۔ تاہم وہ جگہ ایڈونچر کی تربیت مہیا کرنے کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے۔

ہم دونوں نے ایک ہی موقع پر، ایک ساتھ چھٹیاں لینے کا اہتمام کر رکھا تھا اور ایسا کینٹ کے اصرار پر ہُوا تھا۔ اب مجھے بے چینی سے تعطیلات کا انتظار تھا اور میرے لیے یہ احساس ہی بے حد خوش کن تھا کہ کم از کم کچھ دنوں کے لیے جوائس اینڈ کوربی اور مسز شا کی اقامت گاہ سے جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن جب کینٹ نے ایک ساتھ تعطیلات پر جانے کی تجویز پیش کی تو میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ بے رخی کا مظاہرہ کیے بغیر کیسے اس کی پیش کش مسترد کروں۔ پھر جب اس نے نشان دہی کی کہ ایڈونچر کی تلاش کی مہم میں مجھے اس سے بہتر رہنما کوئی نہیں ملے گا تو مجھے لگا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔

''بعض اوقات مجھے لگتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کہ میرے

ئے ہوئے ان واقعات میں سے صرف نصف پر تم یقین کر تے ہو۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟"

مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرا جواب اس کے جذبات مجروح کردے۔ میں تذبذب کی کیفیت میں تھا لیکن اس نے سب معمول میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ "تو اس تفریحی دورے کے دوران میں 'تم کینٹ کو اپنی آنکھوں سے مصروف مکمل دیکھ لو گے۔ تمھیں میری زبان پر جانے کی ضرورت س پڑے گی۔ تم دیکھو گے کہ کس طرح ایک کے ہد دوسرا ایڈونچر خود چل کر میری طرف آئے گا اور میرے قصوں انجام کو پہنچے گا۔"

ہماری تعطیلات کا آغاز یکم ستمبر سے ہونا تھا لیکن ہم نے یل سے ہی منصوبہ بندی شروع کردی تھی جس کا سلسلہ یارک سے ہماری روانگی سے ایک رات پہلے تک جاری رہا۔ اری مشکل یہ تھی کہ میں نیولندن کے شمال میں واقع فیئر پورٹ ں پروان چڑھا تھا اور اب مجھے نمک کی مہک سے لب ریز احلی ہوا، ٹھاٹھیں مارتے سمندر اور بحری جہازوں کی یاد بری طرح ستا رہی تھی۔ اگرچہ وہاں لنگر انداز ہونے والے اکثر بحری ازسینٹ ڈھونے پر مامور ہوا کرتے تھے لیکن میں سمندر کے کنارے نیم دراز ہو کر ان کا نظارہ کرنے اور اپنی ایک مستول الی بادبانی کشتی میں، موجوں سے زور آزمائی کے لیے بے تاب تھا۔ کینٹ نے احتجاج کیا کہ وہ جگہ چھٹیاں گزارنے یا ہم ولی کے لیے موزوں منزل نہیں ہے۔ وہ فیئر پورٹ کا ذکر سننے وبھی تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھونگھوں اور سیپیوں کی تلاش کہانیاں اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتیں۔ اسے اندیشہ تھا کہ میری ماہی گیری کی کشتی کی غرق آبی یا کیکڑوں سے لدا جزا لوٹنا... فیئر پورٹ میں ہمارے لیے ایڈونچر سے ہم کنار نے کے بس یہی مواقع ہوں گے۔ اس کا اصرار تھا کہ ہمیں پہاڑوں کی طرف جانا چاہیے جہاں قدم قدم پر ایڈونچر ہمارا ستقبال کریں گے۔

جون، جولائی اور اگست کی بے خواب اور حبس زدہ تیں ہم نے اسی طرح کے اختلافات اور تعصبات پر بحث یں میں گزار دیں۔ نیویارک سے پانچ سو میل کے ے میں کوئی ایسا گرمائی سیاحتی مقام نہیں تھا جس پر ہم غور و خوض نہ کیا ہو۔ کینٹ نے معلومات کی فراہمی کے آگز اور نیویارک سے نکلنے والی تمام ریل کمپنیوں کے ٹوں سے حاصل کردہ ریل کے نظام الاوقات، نقشوں اور تصویری کتابچوں وغیرہ کی پوری لائبریری تیار کرلی۔ ہمارے پاس گرمائی اقامت گاہوں، گولف کلبز، ٹینس کورٹس اور بوٹ ہاؤسز کی دل کش تصاویر کا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ وہ دست یاب کمروں اور سوئٹس کے کرایوں کے موازنے کے لیے ان اقامت گاہوں کے مالکان سے دو ماہ تک خط کتابت کرکے بے پناہ تسکین حاصل کرتا رہا۔

"جہاں تک آؤٹ لک ہاؤس کا سوال ہے۔" وہ اعلان کرتا۔ "وہ کمرے، نشست گاہ اور نجی غسل خانے کے چوبیس ڈالر مانگ رہے ہیں۔ جب کہ بالکل اسی طرح کی اقامتی سہولیات، کارٹر ہوسٹل صرف بیس ڈالر میں پیش کرتا ہے۔ تاہم کارٹر ہوسٹل میں کوئی ٹینس کورٹ نہیں ہے لیکن دوسری طرف آؤٹ لک ہاؤس والوں کے پاس گیراج کی سہولت نہیں ہے۔ جب کہ وہاں پالتو کتے کمروں میں ساتھ لانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔"

میں جانتا تھا کینٹ ٹینس کھیلنا نہیں جانتا جب کہ ہمارے پاس گاڑی تھی نہ کتے اور نہ ہی چوبیس ڈالر۔ لہٰذا مجھے یہ تفصیلات انتہائی فضول اور بے جا لگتی تھیں لیکن کینٹ کو یہ سمجھانے کی کوشش کچھ زیادہ صحت افزا نہ ہوتی۔ کیوں کہ اس کے کہنے کے مطابق اس کی قوتِ تخیل اتنی زرخیز تھی کہ وہ خود کو ذہنی طور پر یقین دلا سکتا تھا کہ ایسی ہر چیز اس کے پاس موجود ہے جس کی اس کی زندگی میں کمی ہے۔ نہ صرف یقین دلا سکتا ہے بلکہ اس کی ملکیت کے احساس سے لطف اندوز بھی ہوسکتا ہے۔

کینٹ اپنے لباس پر بے پناہ توجہ دیتا تھا۔ یہ سوال اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا کہ ان تعطیلات کے لیے اسے کس طرح کے ملبوسات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جب میں نے کہا کہ میرے خیال میں اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، تو وہ پھٹ پڑا۔

"تمھیں ضرورت نہیں ہوگی۔" اس نے کہا۔ "اگر میں تمھاری طرح ماہی گیری کی کشتی کھیتے پروان چڑھا ہوتا، میری جلد کی رنگت بھی ریڈ انڈین لوگوں کی طرح چمک دار تانبے جیسی اور بال گندم کے پکے ہوئے خوشوں کی طرح سنہری ہوتے تو مجھے بھی لباس کی پروا نہ ہوتی۔ مسز شا کہتی ہے کہ تم بالکل کسی ایسے انگلستانی نواب جیسے دکھتے ہو، جس نے عام آدمی کا بھیس اپنا رکھا ہو۔"

میں نے کبھی کوئی انگلستانی نواب نہیں دیکھا، بھیس میں اور نہ بھیس کے بغیر۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے دیکھنے

کا اشتیاق ضرور تھا۔

"آخر مسز شا کے اس ہوسٹل میں مقیم سب لڑکیاں ماچس ادھار لینے کے لیے صرف تمہارے کمرے میں کیوں دوڑی چلی آتی ہیں؟" کینٹ نے جواب کا تقاضا کیا۔ "کیا اس لیے کہ وہ تمہارے لباس کو سراہتی ہیں؟ اگر وہ ملبوسات ہی کی دیوانی ہیں تو ماچس مانگنے میرے پاس کیوں نہیں آتی ہیں؟"

"تم ہر روز رات گئے واپس آتے ہو نا!" میں نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ یہ درست جواب نہیں ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔ "اچھا یہ بتاؤ، دفتر کی ٹائپسٹ لڑکیاں پنسل شارپ کرانے، گڑھوانے اور مشکل الفاظ کے ہجے دریافت کرنے کے لیے ہمیشہ تمہارے پاس ہی کیوں جاتی ہیں؟ دفتر کے کیفے ٹیریا کی خادمائیں ہر روز پہلے تمہیں کھانا کیوں پیش کرتی ہیں؟ کیا اس لیے کہ وہ تمہارے پیرہن سے مسحور ہوتی ہیں؟"

"اچھا؟" میں نے پوچھا۔ "میں نے کبھی دھیان نہیں دیا اس بات پر۔"

کینٹ نے نتھنے پھڑکاتے ہوئے ہاتھ فضا میں لہرائے۔

"آہا، جناب نے کبھی دھیان نہیں دیا" اس نے میرا جملہ دہرایا۔ "کبھی دھیان ہی نہیں دیا!"

کینٹ نے ان تعطیلات کے لیے ایک استعمال شدہ سوٹ کیس خریدا جس پر فرانس اور سوئزرلینڈ کے ہوٹلوں کے لیبل چسپاں تھے۔ "جو، اگر تم یہ سوٹ ساتھ لے کے گئے تو چلتا پھرتا جھوٹ دکھائی دو گے۔"

کینٹ کا پورا نام جوزف فوربز کینٹ ہے لیکن اس نے اپنا ابتدائی نام جو ترک کر دیا ہے کیوں کہ اس کے مطابق اعلیٰ سماجی حلقوں میں یہ نام بہت کم سننے میں آتا ہے اور آج کل صرف قدیم صحیفوں میں پایا جاتا ہے۔ اس نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ اسے فوربز کے نام سے پکارا کروں۔ لیکن چوں کہ میں اسے شروع سے جو کہا کرتا تھا، لہٰذا اکثر یہ بات بھول جاتا ہوں۔

"میرا نام جوزف نہیں ہے۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور مجھے استعمال شدہ سوٹ کیس استعمال کرنے کا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا نئے کا۔ یہ سوٹ کیس کہتا ہے کہ یہ یورپ ہو کر آیا ہے، یہ سوٹ کیس یہ نہیں کہتا کہ میں، یعنی فوربز وہاں جا چکا ہوں۔" "لیکن غالباً تم یہ بات لوگوں سے کہہ کر رہو گے، اور اگر کوئی ایسا شخص تمہیں مل گیا جو وہاں جا چکا ہو تو..."

"میری بات غور سے سنو۔" کینٹ نے حکم دیا۔ "اگر تم ایڈونچر کی خواہش رکھتے ہو تو اس کے لیے تمہارا کوئی اہم ہستی ہونا ضروری ہے۔ کوئی بھی شخص بیس ڈالر فی ہفتہ کمانے والے کلرک جو کینٹ کو اپنے ایڈونچر میں شریک نہیں کرے گا۔ لیکن یورپ پلٹ سوٹ کیس اور ہارورڈ یونیورسٹی کا ربن لپٹے ہیٹ والے فوربز کینٹ..."

"اوہ، تو تمہارے ہیٹ کے گرد لپٹا زرد ربن ہارورڈ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کا عکاس ہے؟"

"ہاں!" کینٹ نے اعلان کیا۔ "اور میرے پاس یالے یونیورسٹی اور ایک گالف کلب کے ربن بھی ہیں۔" اس کا لہجہ گرم ہوتا جا رہا تھا۔ "مزید سنو، میں نے ٹینس کا ایک ریکٹ اور گالف اسٹکس سے بھرا ہوا ایک بیگ بھی مستعار لیا ہے۔ اور تم اپنے کام سے کام رکھو، مجھ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہ کیا کرو۔"

"مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تم ہمیں زبردست مشکلات میں پھنسانے والے ہو۔"

"میں سوچ رہا تھا۔" کینٹ نے قدرے تفکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر پہلے ہفتے تم میرے سیکریٹری بن کر رہو اور دوسرے ہفتے میں تمہارا تو ہمیں اپنے مقاصد کے حصول میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔"

بعض اوقات مسٹر جوائس کاروباری دورے پر جاتے ہوئے مجھے پرائیویٹ اسٹینوگرافر کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور دفتری معمولات سے یہ تبدیلی میرے لیے کافی خوش گوار ہوتی ہے، تاہم مجھے اس تجویز میں کوئی وزن نظر نہیں آیا کہ اپنی تعطیلات کا ایک ہفتہ میں کینٹ کی خط کتابت کرتے گزار دوں۔

"تمہیں خط نہیں لکھنے پڑیں گے۔" اس نے وضاحت کی۔ "لیکن جب میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ تم میرے پرائیویٹ سیکریٹری ہو تو اس طرح مجھے خود بہ خود ایک خاص اہمیت حاصل ہو جائے گی۔"

"اگر تمہیں اس سے خوشی مل سکتی ہے۔" میں نے دریا دلی دکھائی۔ "تو تم لوگوں کو بتا سکتے ہو کہ میں ایک انگلستانی نواب ہوں اور میں نے بھیس بدل رکھا ہے۔"

"اس طرح طنز بازی کی کیا ضرورت ہے؟" کینٹ نے احتجاج کیا۔ "میں تو تمہیں ایڈونچر کی طرف پیش قدمی کا ایک راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"یہ راستہ تو ضرور ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایڈونچر کا نہیں، جیل کا!"

اگست کا آخری ہفتہ آ گیا اور ہم ابھی تک فیصلہ نہیں ۓ تھے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اس کا ملہ قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔ "سب سے پہلی چیز ہے، اس نعتی شہر سے دور جانا۔" میں نے نشان دہی کی۔ "اور دوسری ئز ہے کم سے کم خرچ میں روانگی۔ آؤ ہم ان تمام گرمائی فریحی مقامات کے ناموں کی پرچیاں بناتے ہیں جہاں تک ریل یا بحری راستے سے دو ڈالر میں پہنچا جا سکتا ہو۔ پھر ان پرچیوں کو ایک ہیٹ میں ڈال کر اس جگہ کے نام کی قرعہ اندازی کرتے ہیں جہاں ہمیں ہفتے کی سہ پہر روانہ ہونا ہے۔ یہ آئیڈیا بھی جگہ ایڈونچر سے بھرپور ہے۔"

کینٹ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد آمادہ ہو گیا۔ اسے سب ے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ نیویارک کے قریب ایسی جگہ جہاں اتنی م رقم خرچ کر کے پہنچا جا سکتا ہو، اس کے خاطر خواہ حد تک یشن ایبل ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ "مجھے شدید اندیشہ ہے کہ اتنی محدود مالی استطاعت کے ساتھ ہڈسن دریا کے پار رسی کا اسبری پارک ہی ہماری منزل ثابت ہو گا۔"

جمعے کی رات تک ہم روانگی کی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ اسی شب کو ہم نے قرعہ اندازی کا انعقاد کیا۔ ہم نے گتے کے ڈبے میں بیس پرچیاں ڈالیں جن میں سے ہر ایک پر کسی گرمائی سیاحت گاہ کا نام درج تھا۔ ان میں سے دس کا انتخاب میں نے کیا تھا۔ جب کہ باقی دس نام کینٹ نے تجویز کیے تھے۔ کینٹ نے ڈرامائی انداز میں آستینیں چڑھائیں اور ڈبے میں ہاتھ ڈال کر ایک پرچی نکالی۔ اس نے بلند آواز میں نام پڑھا۔ "نیو بریڈفورڈ" بذریعہ نیو بریڈفورڈ اسٹیم شپ لائن۔"

یہ میری منتخب کردہ سیاحت گاہ تھی۔

"نیو بریڈفورڈ!" کینٹ چلایا۔ اس کے چہرے سے شدید مایوسی عیاں تھی۔ "یہ تو ایک صنعتی قصبہ ہے۔" وہ بلبلا رہا تھا۔ "سوت کے کارخانوں سے لبریز!"

"صنعتی قصبہ ہے تو کیا ہوا؟" میں نے احتجاج کیا۔ "وہ بڑی جاذب نظر بندرگاہ بھی تو ہے' امریکا کی قدیم ترین بندرگاہوں میں سے ایک! تم وہاں کی گودی پر وہیل کے شکار پر جانے والے بحری جہاز' ان کے مستک پر کندہ چوبی مجسمے اور وہیل گیری کے نیزے..."

"کیا ہم کسی مدفون شہر کی کھدائی کی مہم پر روانہ ہو رہے ہیں؟" کینٹ نے مداخلت کی۔ "یا یہ تفریحی دورہ ہے؟ مجھے گیری کے نیزے دیکھنے کا شوق ہے نہ وہیل مچھلیوں کے قتل کو جانے والے جہازوں سے کوئی دل چسپی! میں تو زندگی کی رنگینیاں کھوجنے جا رہا ہوں۔"

بگ ایرو نامی دخانی جہاز شام چھ بجے لنگر اٹھانے والا تھا لیکن ہم نیویارک سے جان چھڑانے کے لیے اتنے اتاؤلے ہو رہے تھے کہ پانچ بجے ہی سوار ہو گئے۔ ہمارا دو برتھوں والا کیبن بیرونی رُخ پر تھا۔ ہم نے اپنے سوٹ کیس رکھے اور اسٹیمر کے اوپری عرشے کے ایک ٹھنڈے گوشے میں، تہہ ہونے والی دو کرسیاں بچھا کے نیم دراز ہو گئے۔ کینٹ سہ پہر کے تمام اخبارات خرید لایا تھا اور ایک خبر میں خاص دل چسپی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس خبر کے مطابق آئرستانی ریاست آئیوی کا نوجوان ولی عہد بالآخر سرزمین امریکا پر قدم رکھ چکا تھا۔

گذشتہ چند ہفتوں سے مقامی اخبارات غیر ضروری طور پر نوجوان آئرستانی نواب زادے اور اس مقامی لڑکی مس آلڈرچ کی خبروں کو نمایاں جگہ دے رہے تھے جس سے شادی کے لیے وہ امریکا آنے والا تھا۔ کینٹ نے سہ پہر کے اخبارات سے اخذ کیا کہ وہ نواب زادہ اپنے خاندانی نام 'میہان' کے ساتھ آج صبح نیویارک شہر کی بندرگاہ پر اُترا تھا۔ اس کی بہن لیڈی مویا بھی اس کے ہم راہ تھی۔ لیکن جب تک اخباری رپورٹرز ان کی کھوج لگا پاتے' وہ دونوں بندرگاہ سے غائب ہو گئے۔

"مختلف ہوٹلوں سے معلومات حاصل کی گئیں..." کینٹ ازحد مشتاق لہجے میں پڑھ رہا تھا۔ "لیکن تمام کوششیں ناکام رہیں۔ معزز مہمانوں کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ قیاس لگایا جا رہا ہے کہ وہ دونوں فوری طور پر بہ ذریعہ ٹرین مس آلڈرچ کے آبائی قصبے نیوپورٹ روانہ ہو گئے تھے۔"

کینٹ نے مرعوب انداز میں ماریطانیہ نامی بحری جہاز کے سرخ پرچموں کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ لوگ اس کے ذریعے امریکا آئے تھے۔ کاش، ہم لوگ نیو بریڈفورڈ کے بجائے نیوپورٹ کا رُخ کرتے۔ کیسی کیسی سربرآوردہ شخصیات اس شادی میں شریک ہوں گی۔ یہ اس موسم گرما کی اہم ترین سماجی تقریب ہو گی۔"

میں جہاز میں سامان لادے جانے کا منظر دیکھنے لگا۔ جب کہ کینٹ عرشے کے جنگلے پر جا کھڑا ہوا۔ اس کی پُرشوق نظریں جہاز میں سوار ہونے والے مسافروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے انتہائی غور و خوض کے بعد لباس کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے یالے یونیورسٹی کا سرخ ربن لپٹا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ لیکن جب اس نے ایک انتہائی خوش پوش نوجوان کو ہارورڈ یونیورسٹی کا زرد ربن لپٹا ہیٹ پہنے جہاز میں سوار ہوتے دیکھا تو

وہ تیزی سے اپنے کیبن کی طرف لپکا۔ واپس لوٹا تو اس کے سر پر بھی زرد ربن لپٹا ہیٹ تھا۔

چند منٹ بعد میں نے کینٹ کو آرام کرسیوں پر اس نوجوان سے محوِ گفتگو پایا۔ تاہم صاف لگ رہا تھا کہ باتوں کی بیش تر ذمے داری کینٹ نے اپنے شانوں پر اٹھا رکھی ہے اور وہ نوجوان اس کی باتوں پر ذرہ برابر توجہ دینے پر آمادہ نہیں۔ اس کے بجائے' اس کی نظریں مسافروں کے جہاز پر سوار ہونے کے پل پر جمی ہوئی تھیں اور جب اس نے اپنے ہم عمر ایک نوجوان کو ایک لڑکی کے ساتھ جہاز میں آتے دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا لیکن پھر کینٹ پر ایک محتاط نظر ڈال کر وہ دوبارہ کرسی میں دھنس گیا۔

وہ لڑکی بلا کی خوب صورت تھی۔ قدرتی حسن کا شاہ کار! ایسی کہ جو دیکھے' دیکھتا رہ جائے۔ فاختئی رنگ کی آنکھیں' کندن جیسی زلفیں۔ مجھے لگا۔ اس کے رعبِ جمال سے میرا دل رُک جائے گا۔

قدرے توقف کے بعد اصلی ہارورڈ ربن والے ہیٹ کا مالک نوجوان اٹھا اور سر کی جنبش سے کینٹ کو الوداع کہہ کر عرشے سے نیچے اتر گیا۔ میں بھی اپنی نشست سے اٹھا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ میں سنہری زلفوں والی اس حسینہ کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ مجھے یہ مطلوب نہیں تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھے۔ میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا... لیکن اس سے پہلے کسی نے مجھے اتنی بری طرح متاثر بھی تو نہیں کیا تھا۔ اس کی تلاش میں مجھے جہاز کے ایک سرے سے دوسرے تک سرگرداں ہونا پڑا لیکن وہ نہ مل سکی۔ اس دوران میں مجھے ادراک ہوا کہ میرا طرزِ عمل کتنا غیر شریفانہ تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی میں اس ارادے سے تیز قدموں سے اوپری عرشے پر پہنچا کہ خود کو کتاب کے مطالعے میں غرق کر دوں گا۔ اس سے وہ حسین چہرہ میرے ذہن سے اوجھل نہ بھی ہوا تو کم از کم میری گستاخ نظریں اس کے لیے موجبِ اضطراب تو نہیں بنیں گی۔

میں اس خوش پوش نوجوان کی چھوڑی ہوئی آرام کرسی سنبھالنے ہی والا تھا کہ کینٹ نے مجھے ٹوکا۔ "ٹھیرو' وہ مجھ سے گفتگو میں گہری دل چسپی لے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ واپس آئے۔"

مجھے حقیقت معلوم تھی' تاہم میں کرسی پر نہیں بیٹھا۔

"اگر یہ نوجوان کوئی رئیس زادہ ثابت ہوا تو مجھے قطعاً حیرت نہیں ہوگی۔" اس نے کہا۔ "وہ ہارورڈ کا پڑھا ہوا ہے اور اس کے اطوار انتہائی مہذب ہیں۔" اس نے مزید وضاحت کی۔ "ایک خاندانی رئیس کو اسی طرح پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کی باتوں میں تکبر نہیں ہوتا۔ ان کی سماجی حیثیت اتنی مستحکم ہوتی کہ یہ جو دل کہے' کر گزرتے ہیں۔ مثال کے طور پر' کیا تم توجہ دی کہ وہ پائپ پی رہا تھا؟"

میں نے کہا کہ میں نے اس بات پر توجہ نہیں دی۔

کینٹ نے ان تعطیلات کے لیے سگاروں کا بکس خریدا تھا جو اس کی مالی استطاعت سے کہیں زیادہ مہنگا تھا۔ وہ اس وقت بھی ایسا ہی ایک سگار پی رہا تھا اور جیسے جیسے وہ جل کر چھوٹا ہو رہا تھا' کینٹ اس کے جلتے سرے کے نزدیک لپٹا سنہرا گھیرا احتیاط سے نیچے کھسکا تا رہا تھا' تاہم اب اس نے اپنے سگار کو بیزار نظروں سے دیکھا اور اسے عرشے کے فرش پر پھینک دیا۔

"میری کرسی سنبھالے رکھو' میں کیبن سے پائپ لے کر آتا ہوں۔"

میں نے کرسی پر بیٹھ کر کتاب پر نظریں گاڑ دیں۔ لیکن مجھے تحریر سمجھ آ رہی تھی اور نہ صفحات دکھائی دے رہے تھے۔ بس وہ من موہنی صورت مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھی۔ میں نے جھنجلا کر نظریں کتاب سے اٹھائیں تو ہکا بکا رہ گیا۔ وہی لڑکی عین میرے مقابل موجود تھی' بہ مشکل دو فٹ کی دوری پر! کسی ان جانی قوت نے مجھے کرسی سے اٹھا کر کھڑا کر دیا' کسی پُراسرار کشش کے تحت میں اس کی طرف بڑھا... لیکن میں نے بروقت خود کو سنبھال لیا اور سر سے ہیٹ اتار کر تعظیماً سر جھکا۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن اس حسینہ کی نظروں نے مجھے رُکنے کا حکم دیا۔

میری حیران نظریں دیکھ رہی تھی کہ اس کے چہرے پر حیرت اور التفات کے ملے جلے تاثرات ہیں۔ جیسے وہ مجھے جانتی ہو یا میری شکل اسے کسی ایسے شخص کی یاد دلاتی ہے جس سے وہ برسوں سے آشنا تھی۔ اگر بعد والا معاملہ تھا تو وہ شخص اس کا دوست رہا ہوگا کیوں کہ اس کی نظروں میں یگانگت تھی۔ اس نے نیویارک کی ایک فلک بوس عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں اس عمارت کا کیا نام ہے؟"

اگر اس کا سوال ثابت نہ کرتا تو اس کا لہجہ بتا دیتا کہ وہ نہ صرف اجنبی' بلکہ آئرستانی بھی ہے۔ اس کا لہجہ نرم' دھیما اور دل آویز تھا۔ اس کا پوچھا ہوا سادہ سا سوال نغمہ بن کر میرے کانوں تک پہنچا تھا۔ میں نے اسے عمارت کا نام بتایا اور مطلع کیا کہ دریا میں کچھ فاصلہ طے کرنے پر وہ اس سے بھی زیادہ بلند اور عالی شان عمارت دیکھ سکے گی۔ وہ اشتیاق سے میری بات سنتے ہوئے دل چسپی بھری' چمک دار آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ مجھے شرمندگی سی ہونے لگی اور اس خوف سے کہ کہیں میں مخل نہ ہو رہا ہوں' میں نے وہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھایا لیکن اس نے ایک اَور سوال کر کے مجھے روک لیا۔ مجھے اس کے ایسا کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی لیکن لگ بھگ یہی لگا کہ جیسے اس نے صرف مجھے روکے رکھنے کے لیے سوال کیا ہو۔

"اور وہ عجیب سی کشتی کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "جو دریا میں پانی پھینک رہی ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ وہ آگ بجھانے والی کشتی ہے جس کا عملہ اپنے پائپوں اور ٹونٹیوں کی آزمائش کر رہا ہے۔ جیسے جیسے جہاز دریا میں آگے بڑھنے لگا' میرے اعتماد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور میں نے اسے مجسمۂ آزادی' گورنر کے جزیرے اور بروکلین کے پل سے متعارف کرایا۔

یہ حقیقت بظاہر اس کے لیے قطعاً پریشان کن نہیں تھی کہ وہ ایک اجنبی سے ہم کلام ہے۔ جیسے پورا یقین ہو کہ لوگ اس سے اکھڑ رویہ اپنا ہی نہیں سکتے' نہ ہی اس کی بے تکلفی سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے۔

میں نے اسے اپنا نام بتانے کے بارے میں سوچا۔ پہلے تو یہ خیال حسبِ تہذیب محسوس ہوا۔ پھر مجھے لگا کہ یہ خود کو اس پر ٹھونسنے کے مترادف ہوگا کیوں کہ وہ صرف نیویارک کے رہنما کی حیثیت سے مجھ میں دل چسپی لے رہی ہے۔

بروکلین نیوی یارڈ سے گزرتے ہوئے میں نے وہاں لنگر انداز جنگی جہازوں کے بارے میں اتنے پُرجوش انداز میں' تفصیل سے معلومات نقل کیں کہ محترمہ کو لگا میں سمندر میں ہی پلا بڑھا ہوں۔ "کیا تم بحری فوج میں ملاح ہو؟"

یہ ذاتی نوعیت کا پہلا سوال تھا۔

"میں ماہی گیری کی کشتی چلایا کرتا تھا۔" میں نے بتایا۔

"میں جوائکس اینڈ کاربی کمپنی کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔"

مجھے لگا، میرے جواب نے اسے تذبذب اور حیرانی سے دوچار کر دیا ہے۔ اس نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تم دفتر میں کام کرتے ہو؟" اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں جیسے اُس نے میری چوری پکڑ لی ہو۔ "تو تم خود کو اتنا توانا اور چاق چوبند کیسے رکھتے ہو؟" اس نے بلا جھجک پوچھ لیا جیسے کوئی مرد کسی دوسرے مرد سے پوچھا کرتا ہے۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ یہ سوال کرتے ہوئے اس کی نظریں میرے جسم کی پیمائش کر رہی ہیں... جیسے اندازہ لگا رہی ہوں کہ مضبوط شانوں والا یہ اسپِ تازی کتنا وزن کھینچنے کی استطاعت رکھتا ہے۔

"میں نے کچھ ہی عرصہ پہلے دفتری کام شروع کیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "اس سے پہلے میرا زیادہ تر وقت بیرونِ خانہ سرگرمیوں میں گزرتا تھا۔ کشتی رانی' سیپیوں کی تلاش میں غوطہ خوری' پیراکی اور فٹ بال سمیت تمام کھیل۔"

میں دیکھ سکتا تھا کہ میری وضاحت اس حسینہ کے لیے کوئی خاص معنی نہیں رکھتی لیکن اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہہ پاتا' میں نے اس نوجوان کو اس طرف آتے دیکھا جس کے ساتھ یہ خاتون جہاز میں سوار ہوئی تھی۔ ایک اجنبی کے ساتھ اسے محوِ گفتگو پا کر وہ ذرا بھی چراغ پا نہیں ہوا بلکہ وہ رُک کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ خوش گوار لیکن مکمل طور پر مبہم اور پراگندہ تھی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے چند منٹوں کے دوران میں مجھے ایسی کوئی علامت نہیں ملی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مجھ سے مل کر دلی طور پر مسرور ہوا ہے۔ یہ مسکراہٹ اس کے

مزاح پارے

1980

بیٹی: "ماں! میں جینز پہنوں گی۔"
ماں: "نہیں بیٹا، لوگ کیا کہیں گے!"

2008ء

بیٹی: "ماں! میں منی اسکرٹ پہنوں گی۔"
ماں: "پہن لو بیٹی! کچھ تو پہن لو!"

☆...☆...☆

"ڈاکٹر صاحب! میرا علاج کریں۔ میرے ہاتھ بہت زیادہ کانپتے ہیں۔"
"کیا تم بہت زیادہ شراب پیتے ہو؟"
"نہیں، زیادہ تر گر جاتی ہے۔"

☆...☆...☆

"میرا جگری دوست آ رہا ہے۔ یہ سونے کی چین کہیں اندر چھپا دو!"
"کیوں، کیا تمہارا دوست چور ہے؟"
"نہیں، وہ اِسے دیکھے گا تو پہچان لے گا!"

☆...☆...☆

"آپ تو آج ڈاکٹر کے پاس جانے والے تھے!"
"یار! کل جاؤں گا... آج ذرا طبیعت ناساز ہے۔"

تعاون ✿ ڈاکٹر احمد نصیر

جذبات کا اظہار نہیں، محض چہرے کا ایک رسمی تاثر تھی جیسے کسی فوٹوگرافر نے کہا ہو "ذرا مسکرائیے۔" اور وہ مسکرا دیا ہو۔

وہ ہمارے پاس پہنچا تو خاتون سے اس کے تعلق کے خیال سے میں نے سر سے ہیٹ اتارا لیکن وہ شاید اس طرح کا رسمی اظہارِ تعظیم ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے ہاتھ بدستور پتلون کی جیبوں میں رہنے دیے، نہ ہی تمباکو نوشی میں تعطل آنے دیا۔ حسینہ سے مخاطب ہو کر اس نے جو جملہ کہا وہ مجھے چونکانے کے لیے کافی تھا۔ "کیا تمہارے کمرے میں موجود مسہری پیتل کی ہے؟" خاتون نے اثبات میں جواب دیا۔

"میرے کمرے میں بھی ہے۔ یہ لوگ اچھی آسائش فراہم کرتے ہیں، ہیں نا؟ وہ بھی صرف تین ڈالر میں! یہ کتنی رقم بنتی ہے؟"

"تین کا چار گنا، بارہ ہوا..." لڑکی نے حساب لگایا۔ "بارہ شلنگ!" اس نے گویا موضوع بدلنے کے لیے نوجوان کو میڈیسن اسکوائر سے بلند ہو کر آسمان کو چھوتی دودھیا عمارت کی طرف متوجہ کیا۔ "یہ نیویارک کی سب سے بلند عمارت ہے اسٹمپس!"

وہ مسکرایا، گویا کسی اجنبی سے اس کی پہلی ملاقات کرائی جا رہی ہو۔ تاہم اس نے دلچسپی کا قطعاً اظہار نہیں کیا۔ "اچھا!" اس کے لہجے سے لگ رہا تھا، اگر خاتون نے 'وہ ایک خرگوش ہے' کہا ہوتا، تب بھی اس کا یہی ردِعمل ہوتا۔

اسی اثنا میں اصلی ہارورڈ ربن والا نوجوان اچانک آن نکلا۔ اس کا مزاج خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اسٹمپس نے سنہری زلفوں والی حسینہ پر نظر ڈالتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ "اوہ خدایا!" وہ چلایا۔ "یہ اب کس بات پر بھنایا ہوا ہے؟ اس نے کہا تھا کہ جہاز چلنے کے بعد میں عرشے پر آسکتا ہوں۔"

حسینہ میری طرف مڑی اور میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ سرخم کر کے اسٹمپس کو ساتھ لیے اس نوجوان سے ملاقات کے لیے آگے بڑھی۔ وہ انھیں اپنی طرف آتا دیکھ کر ٹھہر گیا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہ ان سے خاصی ناراضی بھرے لہجے میں بات کرنے لگا اور مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ وہ اس دوران میں کھا جانے والی نظروں سے مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا۔

عین اسی وقت کینٹ نے میرا بازو کھینچا۔ "نیچے چلو۔" جوش اور ہیجان کی شدت سے اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔

"ہمارے سنسنی خیز ایڈونچر کا آغاز ہو چکا ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

* * *

کینٹ جانے کس سنسنی خیز ایڈونچر کے بارے میں بتانے والا تھا، میرا ایڈونچر تو پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس حسین خاتون سے ملاقات میری زندگی کا سب سے ولولہ انگیز واقعہ تھا اور اگرچہ کینٹ اور میں نے ایک دوسرے کو ہر ایڈونچر میں شامل کرنے کا وعدہ کیا تھا تاہم میں اس معاملے کے بارے میں اسے ایک لفظ بھی بتانے کا روادار نہ تھا۔ مجھے بس تنہائی کی شدید طلب ہو رہی تھی جہاں میں اس سرخوشی سے پوری طرح محظوظ ہو سکوں۔ اپنے ذہن میں وہ ساری گفتگو دہرا سکوں کہ اس نے کیا کہا تھا، اور میں نے کیا جواب دیا تھا۔ میں کسی کو اس میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب بہت ہی سحر انگیز تھا، انتہائی مقدس!

لیکن کینٹ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا ہمارے کیبن میں لے گیا اور دروازہ مقفل کر دیا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں۔" اس نے بات شروع کی۔ "لیکن میں تمھیں اس ایڈونچر میں شریک نہیں کر سکتا۔" اس کا یہ فقرہ میری سوچ سے اتنا مشابہ تھا کہ اچانک میرے دل میں یہ ناپسندیدہ خیال پیدا ہوا کہ شاید وہ بھی اس حسین خاتون میں دلچسپی لے رہا ہے، تاہم اس نے فوراً ہی میری غلط فہمی دُور کر دی۔

"میں نے کچھ سراغ رسی کی ہے۔" اس کی آواز دھیمی اور لرزش آمیز تھی۔ "اور میں نے ایک حقیقی ایڈونچر کی کھوج لگائی ہے۔ کچھ وجوہ کی بنا پر میں تمھیں اس میں شریک نہیں کر سکتا لیکن یہ جیسے جیسے آگے بڑھے گا، تم اس سے آگاہ ہوتے جاؤ گے۔" وہ شاید نہ چاہتے ہوئے بھی بولے جا رہا تھا۔ "آدھے گھنٹے پہلے میں اپنا پائپ لینے آیا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ باہر وہ ہارورڈ پٹے والا امریکی لڑکا موجود تھا جس نے مجھ سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ عین اسی وقت وہ سنہرے بالوں والی انگلستانی حسینہ اس دوسرے لڑکے کو ساتھ لیے وہاں آگئی۔" کینٹ نے اچانک اپنے آپ کو روکا۔ "تم ابھی اسی سے بات کر رہے تھے نا؟"

کینٹ کی زبان سے اس لڑکی کا ذکر مجھے کھل رہا تھا لہٰذا اس کی زبان بند کرنے کے لیے میں نے مختصراً کہا۔ "وہ مجھ سے سنگر بلڈنگ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"

"اچھا؟ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، یہ دونوں اشخاص ہمارے کیبن کی کھڑکی کے قریب کھڑے تھے۔ میں نے اپنے پائپ کی تلاش کے دوران میں اس امریکی لڑکے کی آواز سنی، وہ کافی غصے اور جوش میں کہہ رہا تھا۔ 'میں نے تمھیں بتایا ہے نا، ہر کشتی، جہاز اور ریلوے ٹیشن کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ تم لوگ اس وقت تک محفوظ نہیں جب تک نیویارک سے دور نہیں چلے جاتے۔ فوراً اپنے کیبنوں میں پہنچو اور وہیں تک محدود رہو۔' اس پر انگلستانی لڑکے نے کہا۔ 'میں اس آنکھ مچولی سے تنگ آچکا ہوں۔'"

کینٹ نے اپنی بات میں ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کے لیے توقف کیا۔

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "تو پھر اس میں کیا ہے؟"

"تم پوچھ رہے ہو اس میں کیا ہے؟" وہ رحم بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے چلایا۔ "اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں مگر تم کبھی ایڈونچر سے دوچار نہیں ہوتے۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ یہ لوگ مفرور مجرم ہیں۔ خصوصاً یہ انگلستانی لڑکا جسے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

مجھے صرف اس پیاری سی لڑکی کی فکر تھی، تاہم میں نے پوچھا۔ "تمھارا مطلب وہ آئرستانی جسے اسٹمپس کہتے ہیں؟"

"اسٹمپس!" کینٹ تقریباً چیخ پڑا۔ "کتنا عجیب نام ہے؟ اتنا عجیب کہ یہ حقیقی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سراسر جعلی نام ہے۔"

کینٹ کی طرف سے آئرستانی خاتون کے ساتھیوں پر الزام تراشی مجھے بہت بری لگی۔ ان کی جگہ کسی اور کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا تو میں فوری طور پر اس کی مخالفت کرتا، لیکن کینٹ سے برافروختہ ہونا آسان نہیں تھا۔ میں کیسے فراموش کر سکتا تھا کہ وہ بیچارہ خود اپنے تخیل کا غلام ہے جو اس کے ساتھ شعبدے بازی کرتا ہے اور اسے دوڑاتا رہتا ہے۔ اب اگر وہ اسے معصوم لوگوں کے مجرم ہونے کا یقین دلاتا ہے تو دوسری طرف زیرِ زمین ٹرین میں کسی خاتون کے لیے اپنی نشست چھوڑنے والے کینٹ کو یہ اعتقاد بھی عطا کرتا ہے کہ وہ خاتون دراصل ایک عظیم ہستی، ایک سماجی رہنما ہے جو غربت زدہ علاقوں کے دکھ درد بانٹنے کے لیے جا رہی ہے۔

"یار جو!" میں نے احتجاج کیا۔ "وہ لوگ مجرم نہیں ہیں۔ میں نے اس آئرستانی لڑکے سے بات کی ہے۔ اس میں اتنی عقل نہیں ہے جو کسی کو مجرم بننے کے لیے درکار ہوتی ہے۔"

"ہر ریلوے اسٹیشن کی نگرانی کی جا رہی ہے۔" کینٹ نے دہرایا۔ "کیا کسی دیانت دار شخص کو اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ ریلوے اسٹیشنوں کی نگرانی کی جا رہی ہے یا نہیں؟ کیا مجھے پروا ہے؟ کیا تم پروا کرتے ہو؟ اور کیا تم نے توجہ دی کہ تمھیں اسٹمپس کے ساتھ محوِ گفتگو پا کر وہ امریکی چھوکرا کتنا ناراض ہو گیا تھا؟"

بلاشبہ میں نے اس بات پر توجہ دی تھی، اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اسٹمپس نے اس حسینہ کو کہا تھا۔ "یہ اب کس بات پر بھنایا ہوا ہے؟ اس نے کہا تھا کہ جہاز چلنے کے بعد میں عرشے پر آسکتا ہوں۔"

یہ الفاظ انھی باتوں کی تصدیق کر رہے تھے جو کینٹ نے سنی تھیں لیکن میں وہ سب بتا کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "ہو سکتا ہے، وہ عدالت میں طلبی کا حکم نامہ وصول کرنے سے بچنا چاہتا ہو۔" میں نے رائے پیش کی۔ "شاید وہ بہ حیثیت گواہ مطلوب ہو۔ ممکن ہے، یہ دیوانی استغاثہ ہو یا اس کے ڈرائیور نے کسی کو ٹکر مار دی ہو۔"

کینٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "معاف کرنا۔" اس نے کہا۔ "لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم قوتِ تخیل سے بے بہرہ ہو۔ وہ دونوں افراد بدمعاش ہیں۔ خطرناک مجرم، اور وہ عورت ان کی ساتھی ہے۔ میں نہیں جانتا، انھوں نے کس واردات کا ارتکاب کیا ہے لیکن میں پہلے اتنا کچھ جان چکا ہوں جو انھیں مشکوک کرداروں کی حیثیت سے گرفتار کرانے کے لیے کافی ہے۔" لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "سنو! ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنا عالی شان کمرا ہے۔ امریکی کے کمرے کا نمبر چوبیس ہے۔ اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور بستر پر ایک سوٹ کیس رکھا تھا۔ اس سوٹ کیس پر مالک کے نام کے ابتدائی الفاظ ایچ پی اے درج تھے۔ میں نے اپنے فرضی دوست کی تلاش کے بہانے جہاز کے مہتمم کے پاس موجود مسافروں کی فہرست کا جائزہ لیا تو چوبیس نمبر کمرے میں مقیم شخص کا نام جیمز پریسٹن درج تھا۔ اب تم بتاؤ۔" اس نے مطالبہ کیا۔ "ان میں سے ایک، فرضی نام کے عقب میں اپنی شناخت کیوں چھپا رہا ہے اور دوسرا لوگوں کی نظروں میں آنے سے کیوں بچنا چاہتا ہے؟" اس نے حسبِ معمول میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ "میں مسٹر ایچ پی اے عرف پریسٹن سے بات کرتا رہا ہوں۔" اس نے بات جاری رکھی۔ "میں نے پریسٹن کے سامنے اپنے آپ کو ایک اہم شخصیت ظاہر کیا ہے۔ میں نے اشارتاً بتایا کہ میرے پاس بہت دولت ہے۔ اس کا مقصد..." اس نے جلدی سے بات آگے بڑھائی۔ "یہ ہے کہ میں ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر اپنے ہتھکنڈے آزمائیں، مجھے لوٹنے کی کوشش کریں تاکہ میں ثبوت حاصل کر سکوں۔ مزید یہ کہ..." اس نے قدرے شرمندگی سے بتایا۔ "میں نے اسے بتایا کہ تم بھی خاطر خواہ امیر اور قدرے اہم شخصیت ہو۔"

مجھے اس لڑکی کا خیال آیا اور شرمندگی نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔

"تم نے بہت غلط حرکت کی۔" میں چلایا۔ "تمھیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمھاری غلط بیانی ہم دونوں کو کسی ناخوش گوار صورتِ حال سے دوچار کر سکتی ہے۔"

"تم کسی بھی طرح اس معاملے میں ملوث نہیں ہو۔" کینٹ نے احتجاج کیا۔ "نیو بریڈفورڈ پہنچنے پر تم جہاز سے کھسک جانا اور ہوٹل میں میرا انتظار کرنا' ان بدمعاشوں سے نمٹ کر میں تم سے آن ملوں گا۔"

"نمٹ کر؟" میں چلایا۔ "تم ان کے ساتھ کیا کرنے والے ہو؟"

"انھیں گرفتار کرواؤں گا۔" کینٹ نے ٹھوس لہجے میں بتایا۔ "جیسے ہی ہم گودی پر پہنچیں گے' پولیس ان کی منتظر ہو گی۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے!" میں نے کہا۔

"میں ایسا کر چکا ہوں!" کینٹ نے جواب دیا۔ "انھیں گرفتار سمجھو۔ میں نے نیو بریڈفورڈ کے پولیس چیف کو اطلاع بھیج دی ہے..." اس کے لہجے میں بلا کا تفاخر تھا۔ "کہ گودی پر مجھ سے ملو۔ میں نے وائرلیس کا استعمال کیا ہے۔ یہ رہا میری طرف سے بھیجا گیا پیغام!"

اس نے جیب سے ایک رُقعہ برآمد کیا اور بلند' ڈرامائی لہجے میں پڑھنے لگا۔ "بگ ایرو جہاز کی آمد کے وقت گودی پر مجھ سے ملو۔ نیویارک پولیس سے فرار ہونے والے دو معروف مجرم جہاز پر موجود ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان کے خلاف الزامات عائد کروں گا۔ فوربز کینٹ۔"

میں حیرانی کے ریلے سے ابھرا تو سخت احتجاج کیا۔ میں نے صاف صاف کہا کہ اس کا طرزِ عمل حد درجہ نامعقول اور اشتعال انگیز ہے اور اس طرح کے سطحی ثبوتوں کی بنیاد پر اتنے سنگین الزامات عائد کر کے وہ تادیبی کارروائیوں کو دعوت دے رہا ہے۔

یہ سب سُن کر وہ ذرا بھی نہ گھبرایا۔ "تو میں یہ سمجھوں۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "کہ تم ان کے خلاف کارروائی میں حصہ نہیں لینا چاہتے!"

"ان حماقتوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمھیں اس نیک دل خاتون کو پریشان کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اپنی خیریت چاہتے ہو تو ابھی پولیس کو تار بھیج دو کہ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں ان محترمہ کو گرفتار کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" کینٹ نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے اپنے پیغام میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر تم اپنے طور پر ایک ایڈ[illegible] خواہش رکھتے ہو تو اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے دوران [illegible] اسے فرار ہونے میں مدد دے سکتے ہو۔"

"تمھاری طرف سے اس کے لیے مجرموں کی ساتھی [illegible] اصطلاح استعمال کرنے پر مجھے سخت اعتراض ہے۔" میں چیخا۔ "اور بالفرضِ محال' اگر وہ لوگ مجرم ہیں بھی تو انھیں گرفتار کرانے سے تمھیں کیا فائدہ ہو گا؟"

کینٹ کی نظریں جوش سے چمک اٹھیں۔ "ذرا اخبارات کے بارے میں سوچو' اس گرفتاری کی خبروں سے بھرے ہوئے ہوں گے۔" اس کا تخیل اسے اخبارات کی شہ سرخیاں دکھا رہا تھا۔ "ذہانت آمیز کارنامہ... نیویارک پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہونے والا مجرموں کا مشہور گروہ فوربز کینٹ کی حاضر دماغی کے نتیجے میں گرفتار!" اس کے لہجے میں حسرت نمایاں تھی۔ "ہو سکتا ہے، وہ میری تصویر بھی چھاپ دیں۔"

مجھے کینٹ پر شدید غصہ آنا چاہیے تھا لیکن درحقیقت مجھے اس کی ذہنی کیفیت پر رحم آ رہا تھا۔ میں اسے ایک سال سے جانتا تھا اور اس دوران میں مجھے ادراک ہُوا تھا کہ اس کی [illegible] آزمائی ہمیشہ معصوم ہُوا کرتی ہے۔

"جو!" میں نے کہا۔ "تم اپنے آپ کو بہت بڑی مشکل میں ڈالنے والے ہو۔ اگرچہ میں تمھارے اس ایڈونچر میں شامل نہیں ہوں' تاہم تم جانتے ہو کہ اگر میں تمھاری کوئی مدد کر سکا تو ضرور کروں گا۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ہم دونوں نے جہاز کی طعام گاہ کا رُخ کیا۔ وہاں ہمیں ایک قریبی میز پر وہ حسینہ' اسٹیپس اور امریکی نوجوان سمیت براجمان نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی تاہم اب اس کے تبسم میں شک وشبے کی جھلک تھی۔ جب کہ اس کے برعکس امریکی نوجوان کے ذہن میں کسی بھی طرح کا اشتباہ باقی نہیں تھا۔ وہ دانت نکوسے' خوں خوار نظروں سے مجھے اور کینٹ کو گھور رہا تھا جیسے موقع ملتے ہی پھاڑ کھائے گا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کینٹ میرے روکنے کے باوجود امریکی نوجوان سے گپ شپ کرنے پہنچ گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کرے گا۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ میں انھیں ایک ساتھ بیٹھا چھوڑ کر اپنے کیبن میں آ گیا۔

لگ بھگ ایک گھنٹے بعد جب میں کیبن میں تنہا تھا' جہاز کے ایک اہل کار نے پیغام دیا کہ جہاز کا مہتمم مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں مہتمم کے دفتر پہنچا تو اسٹیپس' اس کے امریکی دوست' جہاز کے شبینہ نگہ دار اور مہتمم کو وہاں جمع پایا۔ میرے پہنچنے پر ادھیڑ عمر مہتمم نے سر ہلا کر امریکی نوجوان کو بولنے کا اشارہ کیا۔

"میرا نام ہنری فلپ آلڈرچ ہے۔" اس نے جوشیلے اور اکھڑ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "کیا تم اپنا نام بتاؤ گے؟"

اس کا لہجہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ جب کہ ایک اجنبی کی طرف سے باز پرس کے لیے یوں مجرم کی طرح مہتمم کے دفتر میں طلب کیا جانا بھی مجھے سخت گراں گزرا تھا۔ "آخر کیوں؟"

"کیوں کہ..." آلڈرچ نے کہا۔ "ہمیں پتا چلا ہے کہ تم کئی ناموں کے مالک ہو۔ جن میں سے ایک نام اس معزز شخص کا بھی ہے۔" اس نے اسٹیپس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم ان کا نام کیوں استعمال کر رہے ہو؟"

میں نے اسٹیپس کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے اسی مبہم مسکراہٹ سے نوازا جو وہ عادتاً چہرے پر سجائے رکھتا۔ لیکن آلڈرچ کی طرف سے سرزنش بھری نظروں سے گھورے جانے پر اس نے غصے سے ہونٹ سکوڑ لیے۔

"میں نے اپنے ذاتی نام کے علاوہ کبھی کوئی اور نام استعمال نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "اور مزید یہ کہ..." میں نے خوش گوار لہجے میں بات آگے بڑھائی۔ "اگر مجھے کوئی نام ہتھیانا بھی ہوتا تو وہ کم از کم اسٹیپس جیسا مضحکہ خیز نام ہرگز نہ ہوتا۔"

آلڈرچ کا تو جیسے کسی نے سانس کھینچ لیا ہو۔ "ان کا نام اسٹیپس نہیں ہے!" وہ برہمی سے چیخا۔ "یہ آئیوی ریاست کے جانشیں ہیں۔"

اسے توقع رہی ہو گی کہ میں یہ سُن کر بھونچکا رہ جاؤں گا' اور مجھے واقعی حیرت ہوئی تھی۔ میں نے دل چسپی بھری نظروں سے آئرستانی نواب زادے کو دیکھا۔ آلڈرچ نے میری خاموشی کا غلط مطلب نکالا اور فاتحانہ لہجے میں جس میں خوش گواری کی جھلک تک نہیں تھی' مجھے جھڑکا۔ "تو کچھ سمجھ میں آیا تمھارے؟" اس نے اپنے مخصوص انداز میں دانت نکوسے۔ "اگر تمھیں آئیوی کے ولی عہد کا نام ہی چرانا تھا تو کم از کم جہاز تو کوئی اور منتخب کرنا چاہیے تھا۔"

معاملہ اتنا عجیب وغریب تھا کہ میرے غصے پر حیرت غالب آ گئی۔ میں نے تحمل سے کہا۔ "لیکن مجھے لارڈ آئیوی کا نام اپنانے کی ضرورت کیا ہے؟"

"مجھے ہولناک اور تباہ کن ہتھیار نظر آ رہے ہیں"

"ہم یہی تو جاننا چاہتے ہیں۔" آلڈرچ نے دانت کٹکٹا کر کہا۔ "بہ ہر حال، ہم نے آج رات کے لیے تم لوگوں کا ناٹک روک دیا ہے۔ تم کل پولیس کے سامنے اپنی صفائی پیش کر سکتے ہو! اور وہ تمھارا دوست..." اس نے طعن بھرے لہجے میں کہا۔ "وہ اس جہاز پر ہر ایک سے کہتا پھر رہا ہے کہ تم لارڈ آئیوی ہو۔ خود اپنے بارے میں بھی اس نے بے تحاشا دروغ گوئی کی ہے۔ جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ خود بھی جعل ساز ہے۔"

میری سمجھ میں پوری بات آ گئی تھی' دل چاہ رہا تھا کہ اپنے گھونسوں سے معاملہ نمٹاؤں لیکن وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس احمق کینٹ کی جان بچانے کے دماغ استعمال کروں۔ میں نے بظاہر بے فکری سے قہقہہ لگایا اور مہتمم کی طرف مڑا۔ "اوہ' اچھا تو یہ بات ہے! مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ کینٹ کا کیا دھرا ہے۔" تب میں آلڈرچ کی طرف مڑا۔ "میرا دوست ہمیشہ مجھے عملی مذاق کا نشانہ بناتا رہتا ہے۔ وہ آپ سے بھی مذاق کر رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آپ لوگ کون ہیں۔"

"کیا واقعی؟" آلڈرچ دھاڑا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک پُرزہ نکالا۔ "یہ دیکھو۔" وہ اسے میری طرف لہراتے ہوئے چیخا۔ "یہ اس وائرلیس پیغام کی نقل ہے جو میں نے ابھی نیو بریڈفورڈ کے پولیس چیف کو بھیجا ہے۔"

وہ اطمینان بھرے لہجے میں' بہ آوازِ بلند پڑھنے لگا۔ "اس جہاز پر دو جعل ساز موجود ہیں جن میں سے ایک خود کو میرے ہونے والے بہنوئی لارڈ آئیوی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے جب کہ دوسرا اس کا سیکرٹری بنا ہُوا ہے۔ جب کہ عزت مآب لارڈ آئیوی بذاتِ خود جہاز پر موجود ہیں۔ جہاز کے کنارے لگتے ہی ان ٹھگوں کی گرفتاری یقینی بنائی جائے۔ ہم خود استغاثہ دائر کریں گے۔ ہنری فلپ آلڈرچ۔"

مجھے ادراک ہُوا کہ یکے بعد دیگرے دو عدد سنسنی خیز پیغامات کی وصولی اور علی الصباح چھ بجے بستر چھوڑ کر گودی پر جہاز کے استقبال کی زحمت نے پولیس چیف کی ذہنی حالت اتنی ابتر کردی ہوگی کہ کسی کو بھی گرفتار کر کے جیل میں پھینکنے سے گریز نہیں کرے گا۔ اور اس حوالے سے اس کا انتخاب یقیناً میں اور کینٹ ہوں گے۔ لاکھ احمقانہ سہی لیکن یہ سب ہمارے لیے شدید شرمندگی کا باعث بن سکتا تھا۔ لہٰذا میں لارڈ آئیوی سے مخاطب ہُوا۔ "یہ سب سراسر غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ آپ مسٹر کینٹ کو بلوائیں' تب تک میں معاملے کی وضاحت کرتا ہوں۔"

لارڈ آئیوی نے' جو اس دوران میں شدید بیزاری کا شکار ہو چکا تھا' مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ لیکن آلڈرج کوئی گنجائش چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔ "مسٹر کینٹ اپنے کیبن میں ہیں جب کہ ایک اہل کار دروازے اور کھڑکی کی نگرانی کر رہا ہے۔ تم کل پولیس کے سامنے وضاحت کر سکتے ہو۔"

میں برہم ہو کر مہتمم کی طرف مڑا۔ "کیا تم نے مسٹر کینٹ کو کیبن میں قیدی بنا کر رکھا ہُوا ہے؟ کیا تم جانتے ہو حبس بے جا کے بارے میں قانون کیا کہتا ہے؟"

"انھیں وہاں پابند نہیں کیا گیا ہے۔" مہتمم نے دفاعی لہجے میں کہا۔ "جب انھیں پتا چلا کہ اہل کار ان کا پیچھا کر رہے ہیں تو وہ اپنے کیبن میں چلے گئے۔"

"میں ابھی جا کر اس سے ملتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور اگر میں نے کسی کو اپنا پیچھا کرتے پکڑ لیا تو اٹھا کر پانی میں پھینک دوں گا۔"

کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ انھیں بہ خوبی علم تھا کہ میں فرار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ لوگ تو میری روانگی سے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ میں کیبن میں پہنچا۔ کینٹ برتھ کے کنارے پر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک دل سوز آہ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتی مسکینی چیخ چیخ کر التجا کر رہی تھی کہ میں اس پر غصہ نہ اتاروں۔ اس نے فریاد کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بات شروع کی۔ "مجھے کیا غیب سے پتا چلتا کہ وہ سرخ بالوں والا چھچھوندر لارڈ آئیوی اور وہ لمبی لڑکی لیڈی مویا ہے؟"

"آخر ہُوا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

کینٹ نے اس وقت بھی ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے وہ سر سے اتار کر زمین پر پٹخ دیا۔ "یہ سب اس لعنتی ہیٹ کا کیا دھرا ہے۔" وہ چلایا۔ "یہ درست سہی کہ یہ ربن ہارورڈ یونیورسٹی کا ہی ہے' لیکن مجھے یہ کون بتاتا کہ اسے یونیورسٹی کی کشتی رانی کی ٹیم کے ارکان ہی پہن سکتے ہیں؟ میں نے بھانپ لیا کہ آلڈرج اسے الجھن بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے اور جب اس نے کہا۔ 'اچھا، تو تم یونیورسٹی کی کشتی رانی کی ٹیم میں ہو؟' تو میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے کہنے کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا۔ 'میں پچھلے سال کی ٹیم میں تھا' میری بدقسمتی دیکھو، خود گزشتہ سال کی ٹیم میں نہ صرف شامل تھا' بلکہ اس کا کپتان تھا۔ اس بات نے اسے مشکوک کر دیا اور کھانے کے بعد اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ میرے جوابات غیر اطمینان بخش رہے ہوں گے' کیوں کہ وہ اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا اور مجھے دھوکے باز اور جعل ساز جیسے القابات سے نوازنے لگا۔ میں نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود مجرم ہے اور میں ایک سراغ رس، نیز میں نے اس کی گرفتاری کے لیے بذریعہ وائرلیس نیو بریڈفورڈ پیغام بھجوا دیا ہے۔ اس نے مجھے چیلنج کیا کہ میں سراغ رس ہونے کا ثبوت پیش کروں' جو ظاہر ہے' میں پیش نہیں کر سکا۔ اس نے دو اہل کار طلب کر کے انھیں مجھ پر نگاہ رکھنے کو کہا اور خود مہتمم کے پاس چلا گیا۔ نگرانی میں رہنا میری طبیعت پر گراں گزرتا ہے' لہٰذا میں یہاں چلا آیا۔"

"تم نے اسے کب کہا کہ میں لارڈ آئیوی ہوں؟"

وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کراہا۔ "یہ جہاز کی روانگی سے پہلے کی بات ہے۔" اس نے بتایا۔ "یہ محض ایک مذاق تھا۔ وہ میری باتوں میں دل چسپی نہیں لے رہا تھا' میں نے سوچا کہ اگر میں خود کو لارڈ آئیوی کا دوست بتاؤں تو یہ رعب میں آ جائے گا۔ اسی وقت تم میرے سامنے سے گزر رہے تھے' لہٰذا مجھے یاد آیا مسز شا کہا کرتی ہے کہ تم انگلستانی نواب زادے لگتے ہو۔ چناں چہ میں نے تمھاری طرف اشارہ کر کے کہا۔ 'یہ ہے میرا دوست 'لارڈ آئیوی!' میں نے خود کو تمھارا سیکرٹری بتایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اب میری بات گہری دل چسپی سے سُن رہا تھا' اور...' اس نے مضمحل لہجے میں بات آگے بڑھائی۔ "میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے' تمھیں خواہ مخواہ شدید مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اچانک اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی۔ "لیکن اگر ہم فرار ہونے میں کام یاب ہو جائیں تو جان بچ سکتی ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

یہی کچھ میں بھی سوچ رہا تھا لیکن یہ خیال خاصا بے ڈھنگا تھا اور ناقابلِ عمل بھی۔ میں جانتا تھا ہم طلوعِ آفتاب تک ایک

رک جیل میں مقید ہیں' جس کے بعد ہمیں ایک بے حد شرم ک اور توہین آمیز تجربے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اخبارات آئیوی سے متعلق کسی بھی بات کو خبر کا روپ دے کر نمک ی لگا کر شائع کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ بھیانک شہ خیاں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ فیئر پورٹ میں ے والدین کیا سوچیں گے' میرے دوست کیا رائے قائم کریں گے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جوائس اینڈ کاربی والے کیا کارروائی عمل میں لائیں گے؟ جعل ساز کی حیثیت سے گرفتاری کے بعد میرے ماہرِ قانون اور وکلا کی انجمن کا رُکن بننے کے بھلا کتنے امکانات باقی بچیں گے؟ تاہم مجھے احساس ہوا کہ مجھے فی الوقت سب سے زیادہ قلق اس بات کا ہے کہ وہ دل نشین خاتون مجھے چال باز' یا کم از کم بے وقوف سمجھے گی۔ اس خیال نے مجھے شدتِ اضطراب سے آہ بھرنے پر مجبور کر دیا۔

رات گرم اور کہر زدہ تھی۔ اگر کینٹ کو پیچھے چھوڑ جانا ممکن ہوتا تو میں جہاز سے چھلانگ لگا دیتا اور تیرتا ہُوا کنارے تک پہنچ جاتا۔ بچپن سے جوانی تک کا تمام عرصہ، کسی بطخ کی طرح پانی میں گزارنے والے مجھ جیسے شخص کو یہ مختصر سفر صبح کا غسل محسوس ہوتا۔ لیکن میں کینٹ سے پہلوتہی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"کیا تم تیر سکتے ہو؟" میں نے موہوم امید کے سہارے پوچھا۔

"ہرگز نہیں!" اس نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ مزید برآں، ہمارے سوٹ کیسوں پر ہمارے اصل نام درج ہیں' ہم انھیں ساتھ نہیں لے جا سکتے اور انھیں پتا چل جائے گا کہ ہم کون ہیں۔" اچانک اس کے لہجے میں جوش و بے تابی جھلکی۔ "لیکن اگر ہم جہاز کی دو کرینوں سے منسلک جان بچانے والی کشتیوں میں سے کوئی ایک چُرا سکیں... ہم اپنے سوٹ کیس اس میں چھپا دیں گے' اور جب سب لوگ سو جائیں گے تو ہم اسے پانی میں اتار کے..."

جہاز پر موجود سب سے چھوٹی کشتی بھی پچیس افراد کا بوجھ اٹھانے کی استطاعت رکھتی تھی اور کرین چلا کر اسے پانی میں اتارنے کا مطلب پورے جہاز کو بیدار کرنا تھا۔ میں نے کینٹ کو اپنا خدشہ بتایا۔

"اعتراضات نہ اٹھاؤ۔" کینٹ نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی سیمابی فطرت ایک بار پھر بیدار ہو رہی تھی۔ شدید خطرے کے احساس نے گویا اس میں نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ "سوچو!" اس نے حکم دیا۔ "کوئی ایسی ترکیب' کوئی ایسا راستہ جس کے ذریعے ہم نیو بریڈفورڈ پہنچنے سے پہلے جہاز سے فرار ہو سکیں۔ ہر صورت میں! ہمیں کسی قیمت پر گرفتار نہیں ہونا ہے۔ یہ ہمارے لیے بے حد تباہ کن ہوگا۔"

تبھی اس نے ہیجان آمیز نعرے کے ساتھ اپنی ہی بات کاٹ دی۔ "مجھے راستہ مل گیا۔" اچانک اس کی چیخ سرگوشی میں بدل گئی۔ "میں آگ لگنے کا الارم بجا دوں گا' عملے کے ارکان رہائشی کمروں کی طرف دوڑ پڑیں گے' کشتیاں پانی میں لٹکائی جائیں گی۔ ہم ان میں سے ایک کی رسی کاٹ کر پانی میں گرا دیں' وہ جہاز سے الگ ہو کر بہنے لگے گی۔ افراتفری میں..."

اس کی قوتِ تخیل خدا جانے کیا نقشہ کھینچنے والی تھی لیکن عین اسی وقت جو کچھ رونما ہُوا' وہ افراتفری سے بھی کچھ بڑھ کے تھا۔ پہلے تو ہم نے ایک دہشت بھری انسانی چیخ سنی۔ پھر بہت سے چیختے چلاتے' واویلا مچاتے لوگوں کے دوڑتے قدموں کا شور ابھرا۔ پھر جہاز کو اتنے زور کا دھچکا لگا کہ ہم فرش پر گر پڑے۔ تبھی دھات اور لکڑی کے ٹکرانے' رگڑ کھانے اور ٹوٹنے کی مہیب کڑکڑاہٹ' چرچراہٹ اور گڑگڑاہٹ سارے شور پر غالب آ گئی۔ یوں لگا کوئی جلتی ہوئی بلند عمارت زمیں بوس ہو گئی ہو۔ اگلے ہی لمحے کسی جہاز کے اگلے سرے پر نصب ضخیم چوبی بانسا کھڑکی کے راستے ہمارے کیبن میں گھس آیا۔ کیبن میں بس اتنی جگہ باقی بچی تھی کہ میں کینٹ کو دبوچ کر دروازے سے نکل سکوں۔ وہ ابھی تک گھٹنوں کے بل پڑا تھا۔ میں اسے کھینچ کر راہ داری میں لے گیا۔ اس نے ایستادہ ہوتے ہی دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "میرا ہیٹ کہاں ہے؟" وہ چلایا۔

میں سُن سکتا تھا کہ جہاز کے زیریں عرشوں میں پانی بھرتا جا رہا ہے اور اپنی راہ میں آنے والے سامان اور ٹرنکوں کو دھکیلتا آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک جنگلے میں بندھا گھوڑا بالکل کسی انسان کی طرح چلا رہا تھا۔ جب کہ بہت سے انسان بالکل جانوروں کی طرح چیخ پکار کر رہے تھے۔ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے اسی دل آرام حسینہ کا خیال آیا۔ میں نے کینٹ کا بازو جھنجوڑا۔ شور و غوغا اتنا بلند تھا کہ اس کے کانوں تک آواز پہنچانے کے لیے مجھے بھی چیخنا پڑا۔ "لارڈ آئیوی کا کیبن کہاں ہے؟" اس نے نہ سمجھنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "تم نے بتایا تھا کہ اس کی بہن کے کیبن کے ساتھ ہے۔ مجھے وہاں لے چلو۔"

کینٹ نے ہاں میں سر ہلایا اور ایک راہداری میں دوڑنے لگا جو ایک برآمدے میں کھلتی تھی۔ سامنے تین کیبن دکھائی دیے۔ تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری اندر جھانکا۔ میں نے دیکھا کہ کیبن خالی ہیں اور کسی نے بستروں کو چھوا تک نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ابھی تک اوپری عرشے پر ہوگی۔ مجھے ہر قیمت پر اسے ڈھونڈنا تھا۔ ہم دونوں عرشے پر جانے والے ایک زینے کی طرف دوڑے۔

"سب سے پہلے خواتین اور اطفال" کینٹ آواز لگاتا جا رہا تھا۔ "خواتین اور بچوں کا پہلا حق ہے۔" ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، وہ مشینی انداز میں دہرائے جا رہا تھا۔ عین اسی وقت برقی قمقمے بجھ گئے۔ تیل کے لیمپوں کے علاوہ پورے جہاز پر اندھیرا چھا گیا۔ بہت سے افراد جو بستر پر جا چکے تھے، اب عجیب و غریب حلیوں میں اپنے کیبنوں سے برآمد ہو رہے تھے۔ انھوں نے زندگی بچانے والی جیکٹیں اور کپڑوں سے بھرے بیگ ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ ایک شخص نے بائیں ہاتھ میں اسفنج کا گھیرا اور دائیں ہاتھ میں چھتری اٹھا رکھی تھی جس سے وہ راستے میں حائل مسافروں کو پیٹتا ہُوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک خاتون کے سر پر ضرب لگائی تو مجھ سے برداشت نہ ہُوا۔ میرے گھونسے نے اسے ڈھیر کر دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر واویلا کرنے لگا۔

ہم بالائی عرشے پر پہنچے تو وہاں قیامتِ صغریٰ بپا تھی۔ جہاز کے دُنبالے پر مسافروں کا ہجوم پرچم بردار بلّی سے چمٹا ہوا تھا۔ جہاز کا عملہ کرینوں کی مدد سے کشتیوں کو دونوں طرف کے جنگلوں کے اوپر سے اٹھا کر جہاز کے پہلوؤں سے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تمام کشتیوں کو جنونی افراد کے غول کے غول گھیرے میں لیے کھڑے تھے۔ وہ دیوانہ وار آپس میں ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی میں مگن تھے۔

جہاز کے عرشے کے داہنی جنگلے کے اوپر چار مستولوں والے ایک مال بردار جہاز کا سامنے والا حصہ سایہ فگن تھا۔ وہ دیو قامت جہاز پورے زور سے ہمارے جہاز سے ٹکرایا تھا اور اس کے اگلے حصے میں اتنا بڑا سوراخ دکھائی دے رہا تھا جس سے اچھی خاصی بڑی کشتی گزاری جا سکتی تھی۔ اس رخنے سے پانی تیزی سے جہاز میں داخل ہو رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے غرق ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اس کا عقبی دنبالہ پہلے ہی جھکنے لگا تھا۔

اس جہاز پر لہراتی ایک لالٹین کی روشنی میں مجھے عملے کے تین ارکان ایک چھوٹی کشتی عرشے سے پانی میں اتارتے دکھائی دیے۔ انھوں نے چپوؤں کی دو جوڑیاں اور بادبان کشتی میں پھینکا اور ان تینوں میں ایک پھسل کر اترنے لگا۔ عین اسی وقت مال بردار جہاز نے مست ہاتھی کی طرح زوردار ہچکولا کھایا۔ تینوں ملاح بری طرح بدحواس ہو گئے اور انھوں نے ہمارے جہاز کے زیریں عرشے پر چھلانگ لگا دی۔ ان کی اتاری ہوئی کشتی لاوارث ہو کر دونوں جہازوں کے درمیان ہلکورے لینے لگی۔ میرے ساتھ یہ منظر دیکھنے والے کینٹ نے میرا بازو جکڑ لیا۔ "یہی ہے!" اس نے ہیجان آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔ "یہی ہے ہمارے فرار ہونے کا موقع!"

میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کشتی دو تو کیا، تین افراد کا بوجھ بھی بآسانی سہار سکتی ہے اور میں پہلے ہی ذہن بنا چکا تھا کہ وہ تیسرا مسافر کون ہوگا۔

"تم یہیں ٹھیرو۔" میں نے کہا۔

بگ ایرو جہاز پر بہت سے غیر ملکی پناہ گزیں بھی سوار تھے جنھیں اسی سہ پہر حراست سے رہا کیا گیا تھا۔ وہ کشتیوں کے جہاز سے اتارے جانے سے پہلے ہی ان پر قابض ہو چکے تھے۔ کشتیاں صرف خالی حالت میں ہی پانی میں اتاری جا سکتی تھیں، لہٰذا جہاز کے عملے نے انھیں کشتیوں سے اتارنا چاہا۔ حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر وہ یہ سمجھ کر آمادۂ پیکار ہو گئے کہ دیگر مسافروں کی جان بچانے کے لیے انھیں قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جان بچانے کے لیے لڑ رہا تھا۔ تبھی میں نے دیکھا کہ دو خواتین اس کھینچاتانی کے درمیان زمیں بوس ہو چکی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچل کر ہلاک ہو جاتیں، میں نے انھیں کھینچ کر باہر نکال لیا۔ تاہم ان دونوں میں سے کوئی بھی وہ ہستی نہیں تھی جسے میں تلاش کر رہا تھا۔ نیم تاریکی میں میری نظر ایک ہٹے کٹے پناہ گزیں پر پڑی جو اپنی ایک ہم وطن خاتون سے لائف جیکٹ چھیننے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں جہاز کے انجن میں کوئلہ ڈالنے والا ایک مشٹنڈا کہیں سے دوڑتا آیا اور ان دونوں سے لائف جیکٹ اُچک کر جنگلے کی طرف لپکا۔ میں نے آگے بڑھ کے جیکٹ اس سے چھین لی۔ وہ مجھ سے طاقت آزمائی کرنے لگا۔ وہ اس دوران میں مسلسل چلا رہا تھا۔ "اپنا بچاؤ، سب کی اپنی ذمے داری!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے غصے اور جوش سے کہا۔ "تو اپنے آپ کو بچاؤ۔" اگلے ہی لمحے میرا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔

جیکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔

عین اسی وقت مجھے بہت قریب سے کسی کا دھیما لیکن وش قہقہہ سنائی دیا۔ "شان دار نشانہ، عین ہدف پر۔ تمھیں یہ دفتر میں سیکھنے کا موقع کبھی نہ مل پاتا۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو چند قدم کے فاصلے پر لیڈی یا دکھائی دی۔ میں نے لائف جیکٹ پناہ گزیں خاتون کی ف اچھال دی اور ایسی بے باکی سے جیسے میں ساری ی سے اسے جانتا ہوں، لیڈی مویا کا بازو پکڑا اور اسے عرشے کی طرف کھینچ کر لے جانے لگا۔ "تم میرے چلو۔" مجھے احساس ہُوا کہ میں لرز رہا ہوں کر کا بھاری بوجھ جس کا مجھے ادراک بھی نہیں تھا، میرے ندھوں سے اتر گیا ہے۔ اور یہ کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ ہے جسے میں بھینچے جا رہا ہوں۔ "خدا کا شکر ہے!" میں نے کہا۔ "میں سمجھا تھا میں تمھیں کھو بیٹھا ہوں۔"

"مجھے کھو بیٹھے ہو!" لیڈی مویا نے میری بات ہرائی۔ تاہم اس نے مزید تبصرہ نہیں کیا۔ "مجھے اپنا بھائی ش کرنا ہے۔"

"تمھیں ہر صورت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" میں نے حکم لگایا۔ "تم زیریں عرشے پر مسٹر کینٹ کے پاس پہنچو۔ میں ایک شتی کھے کر عقبی دنبالے کے نیچے لاؤں گا، تمھیں اس میں ہلانگ لگانی ہوگی۔"

"میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" لیڈی مویا نے لچک لہجے میں کہا۔ اس کی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پس میں گتھم گتھا بے ہنگم ہجوم نے اچانک لارڈ آئیوی عرف مپس کو اگل کر ہماری طرف دھکیل دیا۔ اس کی بہن کے حلق سے اطمینان بھری چیخ برآمد ہوئی۔

اسٹمپس نے اپنا توازن بحال کیا اور بھیگے بلّے کی طرح ر جھری لی۔ "میں تو سمجھا تھا کہ زندہ نکل نہیں پاؤں گا۔" اس نے سہل انگاری سے تبصرہ کیا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین وہاں مبہم مسکراہٹ کھیل رہی ہوگی۔

اس کی بہن نے کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ شریف ی اس کشتی کو یہاں لا کر ہمیں یہاں سے نکال لے جائے ا۔" اس نے کہا۔ "ہمیں جلد از جلد جہاز چھوڑ دینا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک!" اسٹمپس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "کین فل کا کیا ہوگا؟ وہ میرے آس پاس ہی کہیں تھا۔"

اسٹمپس کا جملہ پورا ہوتے ہی چند گز کے فاصلے سے ایک چنچناتی آواز سنائی دی۔ "میں کہے دیتا ہوں،" کوئی چیخ رہا تھا۔ "تم لوگوں کو لارڈ آئیوی کو تلاش کرنا ہوگا۔ اگر لارڈ کو کچھ ہُوا..."

"بھاڑ میں گیا تمھارا لارڈ۔" کسی نے اکھڑ امریکی لہجے میں کہا۔

لیڈی مویا ہنس پڑی۔

"نچلے عرشے پر چلیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "میں کشتی لینے جا رہا ہوں۔" میں نے جنگلے سے اترتے ہوئے لارڈ آئیوی کی آواز سنی۔ "میں فل کو تلاش کر کے تمھیں ملتا ہوں۔"

میں جنگلے کے راستے نچلے عرشے پر اترا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ دو چار لمبے ہاتھ مار کے میں کشتی تک پہنچ گیا اور جسم جھلا کر بازوؤں کے زور پر اس کے اندر اتر گیا۔ میں نے چپو سنبھالے اور اسے بگ ایرو کی طرف کھینے لگا۔ میں عقبی دنبالے کے نیچے پہنچا تو کینٹ کی للکار سنائی دی۔ "خواتین پہلے۔ میرا مطلب ہے، عزت مآب خاتون پہلے۔" اس نے اپنی تصحیح کی۔

اپنے خیال کے مطابق ایک ڈوبتے جہاز سے رخصت ہوتے ہوئے بھی کینٹ اخلاقی آداب فراموش نہیں کر سکا تھا لیکن عالی نسب آلڈرج بظاہر اپنی اقدار پس پشت ڈال چکا تھا۔ میں نے اسے بے قراری سے چیختے سنا۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں ان کی لائی ہوئی کشتی پر۔"

میں نے لیڈی مویا کے ہنسنے کی آواز سنی۔ "اگر نہیں جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے۔" اس نے کہا۔ میں نے جنگلے پر ایک سیاہ ہیولا معلق دیکھا۔ "کشتی کو ساکت رکھو۔" اگلے ہی لمحے وہ کسی ہلکی پھلکی گلہری کی طرح کشتی میں کودی اور لڑکھڑا کر میری بانہوں میں سما گئی۔

ایک بار پھر آلڈرج کی غصے بھری آواز سنائی دی۔ "ان

عشق یا ورزش

ایلس فیض سے ہم نے ایک دفعہ یہ ضرور پوچھا تھا کہ اپنے میاں کو ہر وقت حسیناؤں اور مداحوں کے جھرمٹ میں دیکھ کر وہ رشک و حسد کا شکار تو ضرور ہوتی ہوں گی مگر ان کا کہنا تھا "حمید! شاعر عشق نہیں کرے گا تو کیا ورزش کرے گا؟"

پرسشِ احوال از حمید اختر ✿ مطالعہ: اسلم ملک

کے ساتھ جانے سے تو بہتر ہے کہ میں ڈوب ہی جاؤں۔" لارڈ آئیوی نے غیر متوقع جوش کے ساتھ اسے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے' تو پھر ڈوب جاؤ۔ پانی نیم گرم ہے' تم انتہائی خوش گوار موت سے ہم کنار ہوگے۔" اس کے ساتھ ہی وہ جہاز سے کود کر میرے قدموں میں ڈھیر ہوگیا۔

"آرام سے کودنا کینٹ۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "کہیں ہمیں ڈبو نہ دینا۔"

"میں احتیاط رکھوں گا۔" اس نے جواب دیا۔ اگلے ہی وہ میرے شانوں سے ٹکرایا۔ میں نے اسے لارڈ آئیوی پر اچھال پھینکا۔

"میرے اوپر سے ہٹو' فضول آدمی!" لارڈ آئیوی چیخا۔

کینٹ نے نہایت عاجزی سے' باری باری سب سے معذرت کی۔

"مغل' میں آخری بار پوچھتی ہوں۔ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں؟" لیڈی مویا نے آواز لگائی۔

"ان ٹھگوں کے ساتھ تو ہرگز نہیں!" آلڈرج چلایا۔ "میرا خیال ہے' تم دونوں پاگل ہوگئے ہو۔ میں ڈوبنے کو ترجیح دوں گا۔"

کچھ دیر کے لیے وہاں تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔ میری پوزیشن بہت نازک اور کٹھن تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں' لہٰذا میں خاموش رہا۔

"اگر کوئی شخص ڈوب رہا ہو۔" لیڈی مویا نے چیخ کر کہا۔ "تو اسے اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ ڈوب رہا ہے؟"

"مغل' تم ایک نالائق گدھے ہو۔" لارڈ آئیوی اچانک پھٹ پڑا۔

"کشتی آگے بڑھاؤ۔" لیڈی مویا نے حکم دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا اصل مخاطب میں نہیں' آلڈرج ہے۔ اس کی یہ مہمیز کارگر رہی۔ اسی لمحے پانی میں زوردار چھپاکا ہوا۔ لارڈ آئیوی نے ناگواری سے ناک چڑھائی اور لاتعلقی سے بولا۔ "اوہو' یہ ڈوبنے کو ترجیح دے رہا تھا۔"

آلڈرج ہانپتا' پھنکارتا پانی کی سطح پر ابھرا اور کشتی میں چڑھ آیا۔ اس دوران ہم کشتی کو متوازن رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

"یہ بات سمجھ لو۔" وہ ہانپتے ہوئے چلایا۔ "میں احتجاج کے تحت یہاں آیا ہوں' وہ بھی تمھاری اور اسٹمپس کی حفاظت کی خاطر۔ میں کسی کا مرہونِ احسان نہیں ہوں۔ میں..."

"کیا تم چپو چلا سکتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ سوال اپنے ساتھی سے پوچھو۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "یہ گذشتہ سال یونیورسٹی کی کشتی رانی کی ٹیم میں شامل تھا نا!"

"مغل!" لیڈی مویا چیخی۔ اس کے لہجے میں بلا کا غضب تھا۔ "تم کشتی کھینا شروع کردو یا پھر کشتی سے اتر کر چلے پھرتے نظر آؤ۔" اس نے حکم دیا۔ "چپو سنبھالو اور تہذیب کے دائرے میں رہو۔"

لیڈی مویا نے کشتی کے دنبالے پر بیٹھ کر پتوار سنبھال لی۔ اسٹمپس... اور ابھی تک گھٹنوں پر جھکے کینٹ کو کشتی کے اگلے ے میں بھیج دیا گیا۔ میں نے آلڈرج کے ساتھ مل کر چپو سنبھال لیے۔

"ہم کنیکٹیکٹ کے ساحل کی طرف سفر کریں گے۔" میں نے کہا اور کشتی کو بگ ایرد کے نیچے سے نکال کر آگے دیا۔ چند ہی منٹوں میں جہاز ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا اور اس کی سیٹی کے علاوہ سب شور و غل بھی پیچھے رہ گیا جب کہ ہم خود بھی دھند میں مدغم ہوگئے تھے۔ کشتی پر ایک بار پھر سناک شرم سار سناٹا چھا گیا۔ مجھے جہاز پر موجود افراد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اگر وہ بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کو روند ڈالتے تو اور بات تھی' ورنہ ان کے ڈوب کر مرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جہاز کی روانگی سے پہلے میں نے عملے کے ارکان کو وائرلیس پر مدد طلب کرتے سنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ دریائے ہڈسن میں سفر کرنے والے درجنوں چھوٹے بڑے جہاز اور کشتیاں جا حادثہ پر پہنچنے والی ہوں گی۔ جب کہ برج پورٹ سے نیو ہا کے درمیان موجود تمام گودیوں سے امدادی ٹیمیں روانہ ہو ہوں گی۔ دریائے ہڈسن خواہ کتنی بھی طویل و عریض آ ہو' وہ ٹھاٹیں مارتا سمندر ہرگز نہیں تھی۔ تاہم تحفظ کا دائرہ جو میرے حساب سے تمام مسافروں کے لیے بہت وسیع اس حسین خاتون کے لیے ہر لحاظ سے ناکافی تھا۔ سے پٹا ہوا عرشہ اس کے لیے قطعاً موزوں جگہ نہیں تھی۔ خوش تھا کہ میں نے بچاؤ کی امکانی کارروائیوں کا کیا۔ اس کشتی میں وہ محفوظ تھی۔ پانی پُرسکون تھا اندازے کے مطابق کنیکٹیکٹ تین میل سے زیادہ فاصلے تھا اور اگر دھند ہمیں گم راہ نہ کرپاتی تو ہم گھنٹے بھر میں لیتے۔ میں پُریقین تھا کہ یہ مہ جبین بہ خیر و عافیت خشکی سکے گی۔ یہ ایک طرح سے خود غرضی تھی لیکن میں کیا میں اس جہاز سے جان چھڑانے پر بہت مسرور تھا۔

لیے جا رہا تھا جہاں قدم رکھتے ہی ہم پولیس کو اپنا منتظر پاتے۔ آلڈرج کی شکل میں ایک منتقم مزاج غنیم اب بھی سر پہ سوار تھا لیکن اس کی ہمیں نقصان پہنچانے کی استطاعت زائل ہوچکی تھی۔ میں اپنے آپ کو اس کامیابی پر داد دے رہا تھا کہ اچانک اس نے میری خوش فہمیوں کا جالا تار تار کر ڈالا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کینٹ اور میرے حوالے سے اپنے لائحہ عمل پر غور کرتا رہا تھا اور بالآخر ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ اس کے اعلان کے لیے بے تاب تھا۔

"میں دہرانا چاہوں گا۔" وہ اچانک چیخا۔ "کہ میں کسی کا احسان مند ہوں' نہ کسی کو جواب دہ۔" اس نے بے دھڑک بات آگے بڑھائی۔ "میں صرف اپنے دوستوں کی وجہ سے ان لوگوں پر انحصار کرنے پر مجبور ہوں جنھیں جیل میں ہونا چاہیے۔ اور میں یہ بات صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں کنارے پر اترتے ہی پولیس کے پاس جاؤں گا اور ان دونوں کو گرفتار کرادوں گا۔"

ہمیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کردینے والی دھند سے ابھرتے اس کے الفاظ انتہائی عجیب و غریب اور حقیقی لگ رہے تھے۔ ہر طرف مکمل سناٹا تھا اور ہم سب کو یقین ہو چلا تھا کہ ہم راستہ کھو بیٹھے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں تھانے کا خیال ہمارے لیے فی الوقت اتنا تشویش ناک نہیں تھا۔ لہٰذا ہم میں سے کسی نے کچھ نہ کہا اور اس کے الفاظ دھند میں دھندلا کر معدوم ہوگئے۔ تاہم مجھے اس کے زبان کھولنے سے خوشی ہوئی۔ کم از کم میں پہلے سے خبردار تو ہوگیا۔ اب مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ میں فرار نہیں ہو پایا ہوں اور یہ کہ کینٹ اور میں ابھی تک خطرے کی زد پہ ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہماری کشتی کنیکٹیکٹ کے ساحل کے کسی دور دراز گوشے میں کنارے لگے گی جہاں پولیس تھانہ کیا' انسانی آبادی بھی دور دور نہیں ہوگی۔

ہماری کشتی جیسے جیسے بگ ایرد سے دور ہٹتی گئی اور ہم اس کی وں کی حدِ سماعت سے باہر نکلے' ہم مکمل طور پر سمتوں کا تعین کھو بیٹھے۔ ممکن ہے' لیڈی مویا نے پتوار سنبھالنے میں اناڑی پن کا ثبوت دیا ہو۔ ہو سکتا ہے' آلڈرج اس قسم کی کشتی کے چلانے کی مشق نہ رکھتا ہو اور اس نے اپنے دائیں طرف وہ زور لگائے رکھا ہو' وجہ جو بھی رہی ہو' بہت جلد ہم پوری طرح گم ہوچکے تھے۔ مزے کی بات یہ کہ اس دوران میں ہم تنہا نہیں تھے۔ رات کے اندھیرے میں وقفے وقفے سے دھند میں انتباہ کرنے والے ہارن' سیٹیاں' گھنٹیاں نیز لانچوں اسٹیمروں کے انجنوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے جاتی تھی لیکن وہ ایک بار بھی ہمارے اتنے قریب نہیں ہو پائے کہ ہم انھیں اپنی طرف متوجہ کر پاتے اور جب ہم نے ان کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو وہ سناٹے کی گود میں سو گئے۔

دو گھنٹے بعد کینٹ اور اسٹمپس چپو سنبھالنے پر اصرار کرنے لگے۔ لیڈی مویا کشتی کے اگلے حصے کی طرف چلی گئی۔ ہم نے اسے اپنے کوٹ پیش کیے' اس نے ان کا گدا بناتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ سو رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ سو پائی یا نہیں لیکن وہ خاموش پڑی رہی۔ تین بے زار کن' تھکا دینے والے گھنٹے مزید گزر گئے۔ ہم باریاں بدلتے اور اونگھتے رہے جب کہ ہماری کشتی پانی کے رخ پر بے سمت بہتی رہی۔ اب صبح کے پانچ بج رہے تھے اور دھند پھیکی پڑنے لگی تھی۔ اب ہم ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ سکتے تھے۔ وقفے وقفے سے ہارن بجاتے جہاز اور کشتیاں اب بھی ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ لیکن ہماری نظروں سے بہ دستور مخفی تھے۔ آلڈرج اس صورتِ حال سے حد درجہ برہم ہوچکا تھا۔ وہ ہر بار زور زور سے چیخ پکار کر کے ان جہازوں کو متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا جب کہ لیڈی مویا اور اسٹمپس بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ تاہم اس شور و غوغا میں میری اور کینٹ کی شرکت کچھ زیادہ قابلِ ذکر نہیں تھی۔ ہم بھلا کیوں اس طرح "بچائے جانے" کے آرزومند ہوتے؟ جو بھی جہاز یا کشتی ہمیں اٹھاتی' وہ ہمیں کسی نہ کسی معروف گودی پر اتارتی' جہاں ہم اس کینہ پرور شخص آلڈرج کے رحم و کرم پر ہوتے۔ ہمارے لیے اس کشتی میں میسر آزادی اور دھند کی تحفظ بھری چادر زیادہ قابلِ ترجیح تھی۔ ہماری خاموشی آلڈرج سے مخفی نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر سے لیڈی مویا سے کانا پھوسی میں مصروف تھا۔ بالآخر وہ چلا اٹھا۔ "میں نے کہا تھا نا! ان لوگوں نے اس کشتی میں اس لیے راہِ فرار اختیار کی تھی کہ یہ ڈوبنے سے نہیں' مجھ سے خوف زدہ تھے۔ اگر انھیں ڈر نہ ہوتا تو انھیں اس دھند میں' ہمیں رات بھر اِدھر اُدھر بھٹکائے رکھنے میں اتنی گہری دل چسپی کیوں ہوتی؟ یہ دونوں ان جہازوں کو روکنے میں ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟"

لارڈ آئیوی اچانک پھٹ پڑا۔ "بکواس!" وہ گرجا۔ "یہ اگر تم سے خوف زدہ ہوتے تو تمھیں اپنے ساتھ چلنے کو کیوں کہتے؟"

"انھوں نے مجھے نہیں کہا۔" آلڈرج بجا طور پر فاتحانہ لہجے میں چیخا۔ "انھوں نے لیڈی مویا اور تمھیں اغوا کیا تھا۔ کیوں کہ یہ سوچ رہے تھے اس طرح تم سے برابری کی بنیاد پر معاملات آگے بڑھا سکیں گے۔ لیکن یہ میری موجودگی کے خواہش مند نہیں تھے۔"

میرے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ "ہم اب بھی تمہاری موجودگی کی خواہش نہیں رکھتے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے ..." میں خود پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ "کہ ہم لارڈ آئیوی بلکہ تمہارے سامنے بھی معاملے کی وضاحت کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔ لیکن ہم پولیس کے سامنے صفائی پیش نہیں کرنا چاہتے۔ میرا دوست تم لوگوں کو چوری چھپے فرار ہونے کی کوشش میں مصروف مجرم سمجھا تھا۔ جب کہ تم لوگ ہمیں مفرور مجرم سمجھتے رہے۔ تم دونوں..."

آلڈرچ نے تضحیک بھرے لہجے میں بات کاٹ دی۔ "اچھی کہانی گھڑی ہے۔ لیکن تم اسے پولیس کے سامنے دہرانے کی جرأت نہیں رکھتے۔"

کشتی کے اگلے حصے سے للکار سنائی دی' لیڈی مویا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بل' مجھے تم سے سخت چڑ محسوس ہو رہی ہے۔" وہ چپو چلانے میں مصروف کینٹ کی طرف بڑھی۔ "اپنی جگہ مجھے دے دو میں اپنے بھائی کے ساتھ اکثر کشتی چلاتی ہوں۔"

اب وہ میرے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک سکتی تھی۔ وہ چپو چلانے کے لیے جھکتے ہوئے مسکرائی۔ "اب ہمیں پوری بات بتاؤ۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا' اس کے عقب میں اچانک تیز روشنی نمودار ہوئی جیسے کوئی پردہ کھینچ کر ایک طرف کر دیا گیا ہو' پانی سے ابھرتے قرمزی سورج نے دھند چیر کر دنیا کو جگمگا دیا۔ مسرت اور استعجاب کے مارے لیڈی مویا چیخ پڑی۔ باقی لوگوں کی بھی کچھ ایسی کیفیت تھی۔ لیڈی مویا نے میرے عقب کی طرف اشارہ کر کے خوشی سے تالی بجائی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ہم سے پچاس گز سے بھی کم فاصلے پر ایک اُتھلا ساحل تھا اور پتھروں سے بنائی گئی ایک چھوٹی سی گودی۔ گودی سے تیس چالیس قدم آگے انگور کی بیلوں سے ڈھکا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کی چمنی سے نکلنے والا بل کھاتا دھواں ہمیں زندگی کا نشان لگا۔ دیہی طرز کے مکان کے عقب میں قدرے فاصلے پر نیم دائرے کی شکل میں بچھے ساحل کے ساتھ ساتھ موسموں کی مار کھائے' کھپریل کی چھتوں والے چھوٹے بڑے مکانوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھی۔ میل بھر کے فاصلے پر جہازوں کی رہنمائی کے لیے ایستادہ ایک قرمزی مینارۂ نور دکھائی دے رہا تھا۔

گودی پر لگی کشتی میں تمباکو نوشی کرتے ایک ماہی گیر اور اسی کی طرح دھواں اگلتے مکان کے علاوہ پورا گاؤں خوابیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ چہار اطراف امن' قناعت اور قدرتی حسن کی فراوانی تھی۔ "واہ!" لیڈی مویا خوشی سے چلا اٹھی۔ "کتنی دل آویز جگہ ہے۔ سحر انگیز!"

منزل کو اپنے قریب پا کر ہم دیوانہ وار چپو چلانے لگے سبھی کشتی سوار جوش و مسرت بھرے نعرے لگا رہے تھے دھند چیر کر ابھرتی' یہ پُراسرار آوازیں سن کر ماہی گیر چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ معمر لیکن لمبا تڑنگا' ہٹا کٹا آدمی تھا۔ بھاری ڈاڑھی اور دھوپ سے سکی ہوئی تانبے جیسی رنگت۔ وہ اسے تعجب سے ہمیں گھور رہا تھا جیسے اس نے جال میں کوئی جل پری پکڑ لی ہو۔ اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "تم لوگ یہاں ایرو کے مسافر ہو نا؟"

ہم سب نے یک زبان ہو کر اس کی تائید کی۔ لارڈ آئیوی نے اس کی کشتی کے پہلو میں اپنی کشتی لگا دی۔ اس اثنا میں وہ شخص گھر کی طرف رخ کر کے' ہتھیلیوں کا بھونپو بنا کر پکار رہا تھا۔ "مارتھا... مارتھا' ڈوبنے والے جہاز کے کچھ مسافر آئے ہیں۔ کافی تیار کرو... اور انڈے' گوشت... تمام کمبل بھی نکال لو۔"

"خدا اس پر رحمت رکھے۔" لیڈی مویا محبت بھرے لہجے میں بولی۔ تاہم آلڈرچ نے کچھ کہنے کے بجائے ہیجان اور اشتیاق کے عالم میں جیب سے ایک نوٹ نکال کر لہرایا۔ "کیا تم دس ڈالر کمانا چاہو گے؟" اس نے ماہی گیر سے پوچھا۔ "بھاگ کر جاؤ اور گاؤں کے کانسٹیبل کو بلا لاؤ!"

لیڈی تلخ لہجے میں ہنکاری' لارڈ آئیوی نے زیر لب گالی دی' کینٹ نے ایک سرد آہ بھری اور میرے بازوؤں میں ڈھیر ہو گیا۔

"اب یہ سب بے فائدہ ہے مسٹر آلڈرچ۔" میں نے دنبالے پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ میں باقی لوگوں کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے ماہی گیر کی نظروں سے بچا رہا تھا لیکن اب اٹھ کھڑا ہوا تو اس نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے اس کے بازو پر آویزاں دھاتی بلّے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ خود گاؤں کا کانسٹیبل ہے۔" میں اپنی حسین ہم سفر کی طرف متوجہ ہوا۔ "لیڈی مویا' ان سے ملو' یہ میرے والد ہیں۔" اس کے بعد میں نے انگور کی بیلوں سے ڈھکے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ "اور وہ ہے میرا گھر!" اس کے بعد میں نے غنودہ گاؤں کی طرف رُخ کیا۔ "وہ رہا میرا گاؤں فیئر پورٹ جس کا بیشتر حصہ میرے والد کی ملکیت ہے۔ میں آپ سب کو تہہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔"

گنجی چڑیا

فاروقی سرور

ایک غریب الوطن کی کیفیات، ایک چڑیا اس کی ہمراہ نما تھی...
چڑیا جو کبھی اپنا وطن نہیں چھوڑتی
بستی آدمی کے گھر رہتی ہے

نفیسہ کا ٹیلی فون ہر رات مجھے خوف زدہ کرتا ہے۔ میں جب بھی رات کو اپنے کام سے تھکا ہوا واپس آتا ہوں تو اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی پر میری جان نکل جاتی ہے۔ اکثر میں سوچتا ہوں کہ اسے آئندہ ٹیلی فون کرنے سے منع کر دوں گا... لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا بیشتر اوقات یہ بات بھی میرے دل میں آتی ہے کہ میں ریسیور ہی نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن پھر میں یہ سوچ کر ایسا نہیں کرتا کہ کہیں یہ فون اس اسٹور کے مالک کا نہ ہو جہاں میں کام کرتا ہوں۔ اور پھر میں کبھی ریسیور نہ بھی اٹھاؤں تو نفیسہ اس وقت تک فون کرنا نہیں چھوڑتی جب تک میں اسے جواب نہ دوں۔

اس وقت میں اٹلی میں قیام پذیر ہوں۔ یہاں میں اپنی رہائش پر آیا ہوں۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں مجھے اپنی مناسبت لے آئی تو بھی مجھے انکار نہیں۔ کیوں کہ وطنِ عزیز میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ وہ غیروں کے قبضے میں تھا۔ ٹینک، کلاشنکوف، سنسناتی ہوئی گولیاں، لاشیں، آنسو، لوٹ مار، عزت دار لوگوں کی عزتوں سے کھیلنا... یہ تمام برے رنگ وہاں پھیلے ہوئے تھے۔ ان تمام نے مل کر مجھے خوف زدہ کر دیا۔ دوسرے ہم وطن تو پناہ کی خاطر ہمسایہ ملکوں کا رُخ کر رہے تھے لیکن میں یہاں اٹلی چلا آیا۔ اب یہاں میں سکون سے بھی ہوں اور میں اپنے ہمسایہ ممالک میں بنے ہوئے مہاجر کیمپوں کی بدحالی اور شدید ترین سردی کا شکار بھی نہیں۔ یہاں میں کسی کے آگے دامن بھی نہیں پھیلاتا کہ مجھے آٹا، چینی یا کمبل دو۔ نہ ہی یہاں اس اذیت کا شکار ہوں کہ میرے کسی ہم وطن کا بچہ سردی یا بیماری سے مر رہا ہو اور مجھے اس کی بے بسی کا دکھ ہو۔ بلکہ یہاں تو میری شاہانہ زندگی ہے۔ اور پھر میں یہاں ہر لحاظ سے مطمئن ہوں۔

اچھی ملازمت اور رہنے کے لیے اچھا فلیٹ۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔ میرے اسٹور کا مالک پشتو بولنے والا ایک سفید ریش شخص ہے جسے ہم سب حاجی آغا کہتے ہیں۔ حاجی آغا اور اس کی بیوی بہت عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ دونوں بہت مہربان ہیں، مل کر اپنا سٹور چلاتے ہیں۔ انھیں مجھ پر بہت زیادہ بھروسا ہے۔ اپنے کام کے متعلق مجھ سے مشورے بھی لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں تو میں خوابوں کی دنیا میں رہ رہا ہوں۔

اب نفیسہ کے کابل سے آنے والے ٹیلی فونوں کے ساتھ ساتھ ایک اور عذاب مجھے آلیتا ہے۔ حالات مجھے کسی لٹو کی طرح گھماتے ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے یہاں مجھ پر زندگی تنگ ہوتی جارہی ہے۔ کیوں کہ یہاں کی پولیس اب مجھے آئے دن طلب کرتی ہے۔ مجھ سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کئی کئی روز تک مجھے پولیس اسٹیشن میں قید رکھتی ہے۔ بلکہ شروع کے دنوں میں تو مجھ پر تشدد بھی کیا گیا۔ مجھے برف پر لٹایا، اُلٹا لٹکایا، سونے نہیں دیا گیا اور نوچنے سے میرے جسم سے بال اور گوشت نوچا گیا۔ جو بدترین عذاب مجھ پر گزرا ہے، اس کا اندازہ صرف میرے خدا ہی کو ہوگا۔

پولیس کا کہنا ہے کہ تم دہشت گرد ہو لیکن ان کے پاس اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ بہ ہرحال، اب یہ ایک معمول ہے کہ وہ لوگ مجھے طلب کرتے ہیں اور میں فوراً وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں مجھ سے بہت ساری باتیں پوچھی جاتی ہیں اور میں مجبوراً ہر سوال کا جواب دیتا ہوں۔ میں جب بھی پولیس اسٹیشن جاتا ہوں تو اس پریشانی کا بھی شکار ہوتا ہوں کہ یہ لوگ آج پھر کیا بات پوچھیں گے اور میرے کیا جوابات ہوں گے۔ اور خدانخواستہ اگر میں کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا تو کیا میں واقعی ان کا مجرم بن جاؤں گا؟

میرا قصور یہ ہے کہ میرے فلیٹ کا ساتھی بم دھماکے کے الزام میں پکڑا گیا۔ اگرچہ وہ عرب تھا اور میں غیر عرب، ہمارے درمیان ماسوائے سلام دعا کے' کوئی شناسائی بھی نہیں تھی۔ پھر میں اپنے کام پر دن کو جاتا تھا اور وہ رات کو۔ ہمیں ملنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا اور ہم دونوں کو یکجا بھی فلیٹ کی بوڑھی مالکن نے کیا تھا جو ہم سے اس کمرے کا علیحدہ علیحدہ کرایہ لیتی تھی۔ جب کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ عرب بے گناہ تھا۔ البتہ اسے فلسطینیوں کی حالتِ زار کا دکھ تھا اور اس کا کمرا ان بے شمار فلسطینی بچوں کی تصویروں سے بھرا تھا جو اسرائیلی مظالم کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ مظلوموں سے ہم دردی رکھنا کوئی جرم نہیں۔ لیکن پولیس نے اسے تفتیش کے دوران جان سے مار دیا۔ وہ اس کے کمرے سے ان تمام بچوں کی تصویریں بھی لے گئے۔ مجھے خبر نہیں کہ وہ کیا راز تھے جو پولیس اس سے پوچھ رہی تھی اور وہ انھیں نہیں بتا رہا تھا۔ اب پولیس اس کے قتل کو مانتی ہے نہ اس کے جسم پر تشدد کے بہت سارے نشانات کو۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اس نے تو حوالات میں خودکشی کی اور چوں کہ وہ دہشت گرد تھا، اس لیے اس کا جسم لڑائی جھگڑے کے زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ بہ ہرحال، اب پولیس کو یہ شک ہے کہ میں اس کا ساتھی تھا، اس کے بہت سارے رازوں کو جانتا ہوں اور ہمارا تعلق تیسری دنیا کی ایک خاص دہشت گرد تنظیم سے ہے۔

نفیسہ کا فون اب بھی ہر رات کو آتا ہے اور میری پریشانی میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ نفیسہ تو پیار کرنے والی بہن ہے، میں کیسے اس کا دل توڑوں۔ اگرچہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹی ہے لیکن اس کے خلوص کا کوئی جواب نہیں۔ اٹلی آنے سے پہلے جب میں گاؤں میں تھا تو وہ پاگل پن کی حد تک میرا خیال رکھتی اور پھر جب اس کی شادی ہوگئی تو بھی میری فکر اسے لاحق رہتی اور جب میں اٹلی آرہا تھا تو اس نے اپنا سارا زیور فروخت کر کے اور میرے بہنوئی کو مقروض بنا کر میرے ٹکٹ اور باقی اخراجات کا بندوبست کیا۔ میں اپنے بہنوئی کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا جس نے یہاں آنے میں میری بھرپور مدد کی۔

افغانستان کی طویل لڑائی کے باوجود ہمارا گاؤں پہلے جنگ سے بچا ہوا تھا لیکن اب نفیسہ کہتی ہے کہ طیارے آئے، انھوں نے آسمان سے آگ برسائی اور ہمارے ایک عزیز کے بچے اس میں مر گئے۔ یہ کیا... طیارے اب ہر رات ہمارے گاؤں پر بمباری کرتے ہیں اور اس میں لاتعداد لوگ مرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ماں اور میرے چھوٹے بھائی اب تک محفوظ ہیں۔ یہ تمام امریکی طیارے ہوتے ہیں۔ نفیسہ کہتی ہے کہ ماں ہر وقت روتی ہے اور کہتی ہے' یہ نہ ہو کہ میں تمھیں دیکھے بغیر مر جاؤں۔ کاش' ایک بار دیدار ہوجائے۔ نفیسہ امریکا کو بھی بددعائیں دیتی ہے کہ اسی کی وجہ سے ہمارے پُرامن دیس میں جنگ آئی۔ اسی کی سازشوں کی وجہ سے یہ خوب صورت دیس کھنڈرات میں بدلا اور اب ان برے حالات میں بھی وہ ہمیں سکون سے جینے نہیں دیتا۔ آخر ان مصیبت زدہ لوگوں کی امریکا سے کیا دشمنی ہے کہ وہ انھیں اتنے بڑے اور خوف ناک وزنی بموں سے ہلاک کر رہا ہے۔ میں نفیسہ کو سمجھاتا ہوں کہ یہ جنگ آخرِ کار ختم ہو جائے گی۔ کیوں کہ بڑی طاقتیں اس وقت اس بات پر متفق ہیں کہ اس خونی کھیل کو اب ختم ہونا چاہیے جس نے لاکھوں انسانوں کی جان لی۔ اس لیے اب یہ قومیں اس مشکل کام کو ختم کر کے ہی چھوڑیں گی اور ان کے علاوہ کوئی اور یہ کام کر بھی نہیں سکتا۔

ایک صبح ایک میٹھی سی آواز پر میری آنکھ کھلی۔ کیا دیکھتا ہوں' میرے فلیٹ کی کھڑکی میں ایک ننھی سی چڑیا بیٹھی ہے جو بہت ہی دل کش انداز میں چہچہا رہی ہے۔ یہ چڑیا مجھے جانی پہچانی لگی۔ اس کے خاکی پَر مجھے کچھ یاد دلاتے محسوس ہوئے۔ میں فوراً اپنے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔

"کہیں یہ گنجی چڑیا تو نہیں؟" میں نے خود سے سوال کیا۔ مجھے فوراً اپنا گاؤں یاد آگیا۔ میں جب چھوٹا تھا تو میری چڑیوں سے سخت دشمنی تھی۔ میں ان کے گھونسلوں پر حملے کرتا۔ چڑیوں کے یہ گھونسلے ہمارے گھر، محلے کے درختوں، ہمارے کمروں کی چھتوں کی درزوں اور گاؤں کے اندھے کنوؤں میں ہوتے۔ میں پتھروں اور چھڑیوں کی مدد سے انھیں مارتا، ہلاک کرتا۔ اس خونی اور وحشی کھیل میں مجھے بہت مزہ آتا۔ انھی چڑیوں میں ایک گنجی چڑیا بھی ہوا کرتی جو کبھی بھی میرے ہاتھ نہیں آتی۔ میں اس کے درپے رہتا کہ یہ کب میرے ہاتھ آئے۔ گنجی چڑیا پہلے گنجی نہیں تھی۔ وہ تو بہت ہی نازک، خوب صورت اور مست چڑیا ہوا کرتی تھی لیکن ایک دن میرا پھینکا ہوا پتھر اس کے سر کے قریب سے ایسا گزرا کہ وہ تو بچ گئی لیکن اس کے سر کے تمام بال اُڑ گئے۔ یوں وہ گنجی ہوگئی۔ یوں سارا دن ہمارا خوف ناک کھیل جاری رہتا۔ میرے ہاتھ میں غلیل ہوتا۔ کبھی میں اس کے پیچھے چھت پر چڑھتا، کبھی درختوں پر اور کبھی دیوار پر۔ لیکن اس کے پروں میں ایسی طاقت تھی کہ وہ ہر مرتبہ میرے وار سے بچ جاتی۔ حالاں کہ میں گاؤں کے لڑکوں میں سب سے اچھا نشانہ باز ہوا کرتا۔ اس طرح میرے بڑے ظالمانہ خیالات ہوتے۔ میں خود کو طاقت ور اور فرعون سمجھتا اور تمام چڑیوں کو کمزور۔ یوں گنجی چڑیا پر مجھے غصہ بھی سخت آتا کہ طاقت ور تو میں ہوں، یہ مجھ سے کیسے بچ جاتی ہے اور میرے ہاتھ کیوں نہیں آتی۔

"کہیں یہ سچ مچ ہمارے گاؤں کی چڑیا تو نہیں! اور اگر واقعی ایسا ہے تو یہ اب تک زندہ کیسے ہے اور پھر یہاں کیسے آگئی؟" میں سخت حیرت کا شکار تھا۔

میں غیر محسوس انداز میں چڑیا کے قریب پہنچا اور اسے غور سے دیکھا۔ وہ واقعی گاؤں کی گنجی چڑیا جیسی تھی۔ وہی گنجا سر، وہی خاکی پر... اور پروں پر ویسے ہی کالے داغ! مجھے اپنے قریب دیکھ کر وہ ڈر گئی اور فوراً اُڑ گئی۔ میری نظریں دیر تک اُس کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ بڑی اور اونچی عمارتوں کے درمیان اڑتی رہی' دور ہوتی رہی۔ اس کا وجود بہ تدریج چھوٹا ہوتے ہوتے' آخرِ کار نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اُس چڑیا کی وجہ سے بہت عرصے کے بعد مجھے اپنا گاؤں بُری طرح یاد آیا تھا۔ نہ جانے کیوں میں بہت بے چین ہوگیا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل بہہ نکلے۔

اچانک فلیٹ کے دروازے پر خوف ناک دھڑ دھڑاہٹ ہوئی۔ یہ پولیس تھی جو کسی طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی تھی۔ ایک بار پھر میرے گھر کے چپے چپے کی تلاشی لی گئی اور اسے خوب کھنگالا گیا۔ کوئی اور شے تو ان کے ہاتھ آئی نہیں۔ البتہ امریکی ہوائی حملوں سے ہلاک ہونے والے افغان بچوں کی تصویریں جنھیں میں نے اپنے کمرے کی دیواروں پر آویزاں کیا ہوا تھا' ان کی نظروں میں آگئیں۔ اُن سب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی بم بناتا ہوا پکڑا گیا ہوں یا کسی دہشت گرد کو پناہ دینے کا جرم کیا ہو۔ وہ مجھے تصویروں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گئے۔

اُس دن پولیس کا رویہ میرے ساتھ بہت سخت تھا۔ اُن کی پوچھ گچھ میں بہت جارحیت تھی۔ وہ مسلسل مجھ سے پوچھتے رہے کہ ان بچوں کی تصویریں تمھارے پاس کیوں آئیں؟ اور تمھارے امریکا کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟ میں نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں نہ اختلافات، مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ رات گئے گلوخلاصی کے بعد جب میں دوبارہ اپنے فلیٹ پہنچا تو میری آنکھوں سے نیند بالکل غائب تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس پولیس آفیسر کا غصے بھرا سرخ اور بدنما چہرہ گھوم رہا تھا جو اس سے پہلے ایک بار مجھ پر تشدد بھی کر چکا تھا۔ میرے دل میں خوف پیدا ہوگیا کہ میرے فلیٹ کے ساتھی کی طرح کہیں یہ لوگ مجھے بھی قتل نہ کر دیں۔ کیوں کہ اسے بھی ان لوگوں نے ناکامی کی صورت میں مارا تھا۔ میں سنجیدگی سے اس بات پر غور کرنے لگا کہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں پھولوں کے اس دیس سے کیسے جاؤں جہاں ہر پتی سے میرے خوابوں اور آرزوؤں کی تتلیاں چمٹی رہتی ہیں۔ بہت عرصہ پہلے ہمارے گاؤں کا ایک شخص اٹلی میں رہا کرتا تھا، وہ جب بھی گاؤں آتا تو میں اس سے روم کے تاریخی شہر کے بارے میں سوالات پوچھتا۔ یوں میں یہاں کی تاریخی عمارتوں کے خواب دیکھتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں ہزاروں سال پہلے کے قدیم روم کا باسی ہوں اور یہاں سنگِ مرمر اور خوب صورت پتھروں کے محلات میں گھوم رہا ہوں جو سرسبز درختوں، رنگین اور خوش بودار پھولوں اور فواروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہی میرا وطن ہے اور میں یہاں کی تاریخ اور ثقافت کا حصہ ہوں۔ اسی لیے یہ جگہ میرے خوابوں کا مرکز تھی... اور اب میں حیران تھا کہ اس جنت سے کیسے علیحدہ ہوں گا۔ مجھے اپنے چاروں طرف اندھیرا نظر آرہا تھا۔

آج رات نفیسہ نے مجھے یہ خبر سنائی کہ طیاروں کے حملے میں

ہمارے گاؤں کے ایک اور شخص کا گھر تباہ ہُوا اور اس میں اس کے دو جوان بیٹے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اور یہ کہ افغان ایک بار پھر ایک دوسرے کو بے دردی سے قتل کرنے لگے ہیں اور جنگجو سردار پھر سے امریکی ڈالر اور اسلحے سے مال دار ہوگئے ہیں۔ آج ماں نے بھی مجھ سے فون پر بات کی۔ وہ اِن دنوں نفیسہ کے گھر کابل آئی ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے رو رو کر کہہ رہی تھی کہ میں فوراً گھر پہنچوں۔

"خدا غارت کرے یورپ کو! لعنت ہو ان سفید فاموں پر، ہم سب کو انھوں نے تباہ کیا۔ ہمیں انھوں نے ہی اسلحہ لاکر دیا، انھوں نے ہی ہمیں ورغلا کر آگ میں جھونکا۔ اور تم ہو کہ ابھی تک ان کے قدموں میں بیٹھے ہو... گھر ہی نہیں آرہے۔"

پھر کچھ دیر بعد خود ہی کہتی ہے۔ "ابھی گھر مت آنا۔ اس وقت وطن جلتی ہوئی دوزخ کی طرح ہے۔ اور کوئی بھی ماں یہ نہیں چاہتی کہ اس کی اولاد آگ میں جلے۔"

ماں کی یہ ذہنی کیفیت اور پاگل پن مجھے حیران کردیتا ہے۔ میں اسے سمجھاتا ہوں اور تسلی دیتا ہوں کی یہ جنگ آخر کار ختم ہو ہی جائے گی۔ آپ خود دیکھیں گی کہ بڑی بڑی طاقتیں اس جنگ کو کیسے ختم کرتی ہیں۔ لیکن ماں پوچھتی ہے کہ کب؟ ہمیں تو مدتوں سے یہ سبز باغ دکھائے جارہے ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں۔

اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بہت خوف زدہ تھا۔ پھر جب بہ دقت تمام مجھے نیند آئی تو کئی بار میری آنکھ کھُل کھُل۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے روم کے تاریخی شہر میں‘ وہاں کے قدیم بادشاہوں کی ناراض روحیں میرے سرہانے کھڑی ہیں۔ سفید کفن پہنے‘ وہ اپنے مکروہ چہروں، بھیڑیوں جیسے لمبے تیز دانتوں اور آدم خوروں کی طرح خونی آنکھوں سے جہاں مجھے ڈرا رہی ہیں‘ وہاں ہزاروں انسانوں پر روا رکھے گئے‘ اپنے ظلم اور زیادتی پر ماتم بھی کررہے ہوں۔ اور اس وقت تو میرے خوف کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے خواب میں دیکھا کہ اچانک روم کے شہر کو آگ لگ جاتی ہے۔ سرخ سرخ شعلے آسمان تک بلند ہونے لگتے ہیں اور وہ خوف ناک روحیں زیادہ شدت سے چیخنے اور چلانے لگتی ہیں۔

* * *

اگلے دن پھر میں چڑیا کی آواز پر جاگا۔ دیکھا تو وہی کل والی چڑیا کھڑکی میں بیٹھی گا رہی تھی۔ میں اس کمزور اور نازک چڑیا کو بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ مجھے پریشانی لاحق ہوگئی کہ اس میں اور ہمارے گاؤں کی چڑیا میں اتنی زیادہ مماثلت کیوں ہے۔

حاجی آغا کو پوری صورتِ حال کا علم تھا۔ اُس روز جب میں نے اسے بتایا کہ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے، کیوں نہ میں کسی وکیل سے قانونی مشورہ لوں... تو اُنھوں نے کہا۔

"تم خاموشی سے اٹلی سے نکل جاؤ۔ تم خوش قسمت ہو کہ اب تک بچے ہوئے ہو اور ابھی تک کسی کیس میں گرفتار نہیں کیا گیا۔ امریکا اس وقت ساری دنیا میں اپنے مفادات کا کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ غریب اور کمزور ملکوں کے تیل، وسائل اور زمینوں پر قبضہ کرکے انھیں لوٹنا چاہ رہا ہے۔ جب کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے وہ اسے دہشت گردی سے جنگ کا نام دے رہا ہے۔ اور یوں اس لوٹ مار میں اٹلی بھی اس کا ساتھی بنا ہُوا ہے۔ اسی لیے تو یہاں کی پولیس تم سے اتنی زیادہ پوچھ گچھ کررہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس تمھیں امریکا کے حوالے نہ کردے۔ پھر تم ساری زندگی امریکیوں سے اپنی جان نہیں چھڑا سکو گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تم پر اتنا زیادہ تشدد کریں کہ تم جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمھیں کیوبا کے نزدیک اپنے مخصوص جزیرے میں قید کردے۔ یوں اگر تم وہاں مر بھی جاؤ تو کسی کو تمھاری موت کا پتا نہیں چل سکے گا۔"

میں سچ مچ پریشان ہوگیا۔ میں اٹلی سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن سخت مجبوری کے عالم میں کچھ عرصے کے لیے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کرلیا۔ جس وقت میں اپنے فلیٹ کو چھوڑ رہا تھا تو میرا دل بہت دکھ رہا تھا۔ اُس وقت شہر کی سڑکوں پر بڑے بڑے جلوس نکل رہے تھے۔ ان میں ہزاروں لاکھوں لوگ شامل تھے۔ ان سب نے ہاتھوں میں امریکا مخالف پلے کارڈز اُٹھا رکھے تھے اور امریکا کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کررہے تھے... تیسری دنیا سے متعلق اس کی لوٹ مار کی پالیسی پر احتجاج کررہے تھے... امریکا کو افغانستان پر قبضے کے بعد اب عراق پر حملے اور قبضے سے منع کررہے تھے۔ بہت سوں کے پاس امریکی صدر کے خوف ناک اور ڈراؤنے ماسک بھی تھے... لوگوں کا خون پینے والا امریکی صدر!

میں قریبی ملک اپنے ایک گہرے دوست کے گھر جانے کے لیے زمین دوز ریل گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سفر کے دوران میں اُس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ریل گاڑی میں بھی اُس چڑیا کو موجود پایا۔ وہ یہاں بھی کھڑکی میں بیٹھی مجھے تک رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ یہاں کیسے آگئی! ایک اور تعجب خیز بات یہ تھی کہ کسی بھی مسافر کو اس کی پروا نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور کو نظر ہی نہ آرہی ہو۔ 'کیا صرف میں ہی ننھی چڑیا کو دیکھ سکتا ہوں؟' میں نے سوچا۔ 'کیا یہ صرف مجھے ہی نظر آرہی ہے؟'

مجھے اس سے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ پھر لمحہ بھر میں وہ چڑیا یوں غائب ہوگئی جیسے اس نے سلیمانی ٹوپی پہن لی ہو۔

اس رات روم کا شہر پھر مجھے خواب میں نظر آیا جو سرخ شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ البتہ اب کے وہاں لوگوں کا ایک جمِ غفیر اس آگ کو بجھانے کی خاطر اس پر پانی پھینک رہا تھا لیکن آگ بجھنے کے بجائے شعلے مزید بلند ہورہے تھے۔ اس آگ میں بے شمار ننھے منے بچے جل رہے تھے جو درد، جلن، زخموں اور دہشت سے بلبلا رہے تھے۔ ایک نظارہ اس سے بھی زیادہ عبرت اثر تھا! دور ایک شخص ان تمام باتوں سے بے نیاز بیٹھا ری بجا رہا تھا۔ روم جل رہا تھا لیکن اس شخص کو اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ مجھے اس شخص کی بے حسی پر بہت غصہ آیا۔

* * *

اپنے دوست کے فلیٹ میں جب میں سو کے اُٹھا‘ وہاں بھی اس چڑیا کو دیکھا۔ 'یہ کیا اسرار ہے؟' میں نے خود سے پوچھا۔ 'کیسا جادو ہے؟ یہ چڑیا کیوں میرا پیچھا کررہی ہے؟' میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ چڑیا آج مجھے عجیب ہی انداز سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھ پر ہنس رہی ہو‘ طنز کررہی ہو۔

'یہ کیوں ایسا کررہی ہے؟' میرے اندر سے ایک چیخ اُبھری۔

آج مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چڑیا بول رہی ہو۔ مجھے میرا بچپن یاد دلا رہی ہو اور پوچھ رہی ہو کہ اُس وقت تو تمھیں اپنی بہادری اور طاقت پر ناز تھا۔ اب بتاؤ کہ بہادر تم ہو یا میں؟

* * *

بالآخر ماں کی منتوں نے مجھے مجبور کردیا کہ میں گھر روانہ ہوجاؤں۔ وہ کہتی ہے 'میں نہ آیا تو مجھے اپنا حق نہیں بخشے گی۔' اصل روم میں بسنے والے‘ ہمارے گاؤں کے چند لوگوں نے ابل میں اپنے رشتے داروں کو ٹیلی فون پر یہ بتایا تھا کہ پولیس مجھے تلاش کررہی ہے تاکہ مجھے گرفتار کرکے مجھ پر مقدمہ لائے۔ ان لوگوں سے یہ بات کسی نہ کسی طرح ماں تک پہنچ گئی۔ دوسری طرف خود میں بھی خوف زدہ تھا... اور پھر اخبار کی اس خبر نے تو مجھے مزید پریشان کردیا تھا کہ اٹلی کی پولیس ان ایشیائی دہشت گردوں کو یورپ بھر میں ڈھونڈے گی جو اب اٹلی سے فرار ہوگئے ہیں۔

مجبوراً میں نے اُس محبت کو اپنے دل سے دُور پھینک دیا جو میں اٹلی سے محسوس کرتا تھا... اور وطن واپسی کا ارادہ کیا۔

جس جہاز میں میں سوار تھا اُس میں بھی مجھے چڑیا کے ں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ پھر یکایک وہ میری سیٹ کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اب میں اور وہ ایک دوسرے کو مسلسل دیکھ رہے تھے۔ آج مجھے چڑیا پر بہت پیار آرہا تھا۔

"پیاری چڑیا!" میں نے اُس سے کہا۔ "بابا خوب کہتے تھے... سائبیریا کی سرد ترین ہوائیں چل رہی ہوں یا مئی‘ جون جولائی کی مار دینے والی گرمی ہو، تمام پرندے وطن چھوڑ کر فرار ہوجاتے ہیں لیکن وفادار چڑیا اپنا وطن نہیں چھوڑتی! تو بہادر اور طاقت ور میں نہیں‘ تم ہو۔ کیوں کہ وطن میں نے چھوڑا تھا‘ تم نے نہیں۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہوائی جہاز کے طویل سفر میں بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آگئی اور میں سوگیا۔ اس دوران میں نے اپنا گزشتہ خواب دوبارہ دیکھا۔ چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی... بہت سارے لوگ آگ پر پانی پھینک رہے ہیں لیکن آگ بجھ نہیں رہی۔ بلکہ اس میں مزید شدت آرہی ہے۔ آگ سے بے پروا‘ بانسری بجانے والا شخص بھی وہاں موجود ہے۔ پھر یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ وہ بے حس شخص اور کوئی نہیں بلکہ میں خود ہوں... اور آگ میں جلنے والا شہر روم نہیں بلکہ میرا اپنا گھر ہے... وہی ہمارا گاؤں والا گھر جسے میں نے جنگ کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہی اس کا سفید دروازہ اور زیتون کی شاخوں سے سجے اونچے برج۔ میں بڑبڑایا۔ جب میں نے لوگوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا... کیوں کہ وہ سب اجنبی اور غیر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پانی سے بھرے برتن تھے اور وہ چیخ رہے تھے کہ جلدی کرو، آگ بجھاؤ ورنہ مزید تباہی پھیل جائے گی۔

اپنے گھر کی محبت مجھے ایسا اندھا کردیتی ہے کہ میں آگ کے سرخ شعلوں کی پروا کیے بغیر گھر کے اندر گھس جاتا ہوں...

اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں سب کچھ تباہ ہوچکا تھا۔ سب وہاں سے جاچکے تھے۔ وہاں جو اکلوتا ذی نفس موجود تھا‘ وہ وہی ننھی چڑیا تھی جو ایک سوکھے درخت کی شاخ پر پریشان بیٹھی تھی... اور جس نے گھر نہیں چھوڑا تھا۔ چڑیا نے جب مجھے دیکھا تو خوش ہوگئی۔ اس نے اپنے پروں کو ہوا میں مارا، اُڑ کر میری طرف آئی اور والہانہ مجھ سے چمٹ گئی۔ میں نے بھی اپنی بانسری دُور پھینک کر اسے خوب چوما۔ ہم دونوں بری طرح رو رہے تھے... اور اس شدت سے رو رہے تھے کہ ہمارے آنسوؤں سے تمام حویلی بھر گئی۔ پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہمارے آنسوؤں کے سیلاب سے وہ بے قابو آگ بجھنے لگتی ہے جسے باہر کھڑے لاتعداد اجنبی بجھانے کی کوشش کرتے نظر آرہے تھے لیکن وہ بجھ نہیں رہی تھی!

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

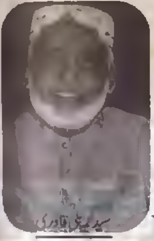
سید محمد علی قادری

آپ کیلئے کون سا سال' مہینہ' دن بہتر رہے گا؟ محبت' دولت اور دیگر معاملات میں کب کامیابی ملے گی؟

معروف ماہر فلکیات سید محمد علی قادری سے راہنمائی حاصل کریں۔

اس کے علاوہ قادری صاحب آپکے دنیاوی مسائل کا حل قرآنی آیات اور اسماء الحسنٰی سے پیش کرتے ہیں۔

☆ بھائی کی شادی "ش" نام کی لڑکی سے ہونیوالی ہے' کیا یہ رشتہ مناسب ہے' شادی کب تک ہوگی۔ (نازیہ' ضلع اٹک)

● آپ کے بھائی کیلئے "ش" کا رشتہ مناسب ہے' آپ کا بھائی ضدی طبیعت کا ہے' آئندہ وقتی طور سے معاشی پریشانی ہوسکتی ہے' اخراجات کو قابو میں رکھیں' بھائی کی شادی کا امکان اگلے ڈیڑھ سال میں ہے۔

☆ ایم بی بی ایس ڈاکٹر بننے کی بہت خواہش ہے' کیا میری یہ خواہش پوری ہوسکے گی؟ (اشتیاق علی خان۔ کراچی)

● انشاء اللہ آپ کی خواہش پوری ہوگی مگر اس کے لیے سخت محنت کرنا پڑے گی۔

☆ میں کافی عرصے سے بیمار ہوں' صحت یابی کب ہوگی' میرا مکان کب تک مکمل ہوگا' خاوند توجہ نہیں دیتے۔ (سلمٰی اختر' ساہیوال)

● منفی رجحانات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کریں' اپنی صحت کا خیال رکھیں' مارچ 2011ء تا نومبر 2012ء اہم ہے' آپ کی صحت یابی ہوسکتی ہے۔

☆ شادی کب ہوگی؟ اپنوں میں یا غیروں میں؟ یہ بھی بتائیں کہ جہاں میں چاہتی ہوں ہو پائے گی یا نہیں؟ (ثیزا' کراچی)

● اسی سال کے آخر تک ہے' اپنوں میں زیادہ امکان ہے' جہاں آپ چاہتی ہیں' وہاں امکان بہت کم ہے۔

☆ میں نے ایف ایس سی کیا ہے' اب میں بی ایس سی کروں یا بی اے؟ کیا مستقبل میں نوکری کرسکوں گی؟ بیرون ملک جانے کا امکان ہے' شادی کب ہوگی' اپنوں میں یا غیروں میں؟ (انجم' فیصل آباد)

● موجودہ صورتحال واضح نہیں ہے۔ بی بی اے کے مضامین کو ترجیح دیں' آپ کی طبیعت میں ٹھہراؤ کم ہے' ذہنی طور سے یکسوئی کی ضرورت ہے' زیادہ باریک بینی سے تجزیہ مت کیا کریں' ذہین ہیں' امتحان میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ شادی کا امکان اپریل 2010ء تا دسمبر 2011ء میں اپنوں میں ہے۔ ممکن ہے آپ کو نوکری نہیں کرنا پڑے' بیرون ملک سفر کا امکان ہے۔

☆ شادی کب ہوگی بندش وغیرہ تو نہیں ہے؟ (شازیہ' گجرات)

● شادی سے منسلک برج کمزور ہے۔ بندش وغیرہ نہیں ہے' اب صورت حال تبدیل ہورہی ہے' خود اعتمادی سے کام لیں' اگلا ڈیڑھ سال اہم ہے' ممکن ہے اس دوران آپ کی شادی ہوجائے۔

☆ لاہور میں رہائش زیادہ بہتر ہے یا کراچی میں؟ (یعقوب' لاہور)

● لاہور زیادہ بہتر ہے۔

☆ قادری صاحب! میری دو بچیاں آپریشن سے تھیں' ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اب آپ کے پاس صرف ایک چانس ہے کیونکہ اس کے بعد آپریشن میں بہت خطرہ ہے۔ میں چاہتی تھی کہ میرے ایک بیٹا ہوجائے' کسی نے آپ کا نمبر دیا' آپ سے بات کرکے دل کو بہت تسلی ہوئی' آپ نے ایک نقشِ مبارک اور سعد پتھر تجویز کیا تھا' میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق وظیفہ پڑھنا شروع کیا اور مبارک نگینے کو انگوٹھی میں بنوا کر پہن لیا' اللہ کا شکر ہوا کہ پہلے مہینے ہی اُمید سے ہوگئی' میری بے تابی بڑھتی جارہی تھی' مجھ سے صبر نہیں ہوا اور میں نے پانچویں مہینے میں ٹیسٹ کروالیا جس سے مجھے پتہ چلا کہ اللہ نے میری دعا سن لی اور میں ایک لڑکے کو جنم دینے والی ہوں' میری خوشی کی انتہا نہیں رہی' سب سے پہلے میرے دل کی گہرائیوں سے آپ کے لیے دُعا نکلی تھی' اللہ کرے آپ یونہی دکھی انسانوں کی مدد کرتے رہیں' اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے' انشاءاللہ' بچے کی پیدائش کے بعد میں' اور میرے شوہر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ (یاسمین' ابوظہبی)۔

● ......بیٹی! اپنا بہت خیال رکھیں' دعا ہے اللہ تعالٰی سے کہ آپ کے سب کام خیر خیریت سے ہوجائیں۔ پیدائش کے بعد لوح کو ٹھنڈا کروا دیجیے گا اور وظیفہ پڑھنا بھی بند کردیجیے گا۔ اور شکرانے کے دو نفل پڑھنا نہیں بھولیے گا۔ نماز کی پابندی کا بھی خیال رکھیں۔

☆......قادری صاحب! میرا مسئلہ یہ تھا کہ شادی سے پہلے میری ایک لڑکے سے دوستی تھی' مگر وہ شادی کے بارے میں ٹال مٹول کررہا تھا اس عرصے میں کہیں اور سے میرے لیے رشتہ آگیا اور گھر والوں نے میری شادی کردی۔ مسئلہ یہ ہوا کہ اس کے موبائل میں میری کچھ تصویریں تھیں اور اب وہ مجھ کو بلیک میل کررہا تھا' اور مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کررہا تھا' میں سخت ٹینشن کا شکار تھی' میرے شوہر کو اس بارے میں پتہ چل جاتا تو میری پوری زندگی تباہ ہوجاتی۔ پھر میں نے آپ کو فون کیا اور آپ نے ایک نقش بنا کر دیا! اللہ کا شکر ہے جب سے وظیفہ پڑھنا شروع کیا ہے' اس کا کوئی فون وغیرہ نہیں آیا' اور مجھے بہت سکون حاصل ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور لمبی عمر دے! (فرزانہ' راولپنڈی)

● ......بیٹی اللہ کا شکر ادا کریں! وظیفہ مکمل ہوجائے تو فون کرکے مطلع کیجیے۔ تاکہ آپ کو آگے کی ہدایات دی جاسکیں۔

☆......سائیں! اولادِ نرینہ کے لیے آپ سے نقش بنوایا تھا' کیونکہ میری چار بیٹیاں تھیں اور لڑکا کوئی نہیں تھا میرے شوہر نے دھمکی دی تھی کہ اب کے لڑکی ہوئی تو میں تجھے طلاق دے دوں گا! سائیں! اللہ نے مجھے ایک لڑکا عطا کردیا ہے' میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں' دن رات آپ کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور آپ لوگوں کے مسائل اسی طرح حل کرتے رہیں (آمین)! (طاہرہ' پرانا سکھر)

● ......بیٹی! اللہ کا شکر ادا کریں اور دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کریں! اللہ آپ کو اور خوشیاں عطا فرمائے (آمین)۔

☆ قادری صاحب! میں نے اپنی بیٹیوں کی شادی کے لیے آپ سے نقش بنوایا تھا' اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایک بیٹی کی نسبت طے ہوگئی ہے جس کے بارے میں آپ سے استخارہ بھی کروایا تھا' آپ نے مناسب بتایا تھا اب اگلے ماہ اس کی شادی ہے' وظیفہ ختم ہونے والا ہے' لوح کا اب کیا کرنا ہوگا؟ (زرین اختر' گلشن اقبال)

جب کوئی حج سے لوٹے تو یہ دعا دیں: قَبِلَ اللّٰهُ حَجَّكَ وَغَفَرَ ذَنْبَكَ وَأَخْلَفَ نَفَقَتَكَ

ترجمہ: اللہ تمہارے حج کو قبول فرمائے' تمہارے گناہ معاف فرمائے اور جو کچھ تم نے خرچ کیا' اس کا بدلہ تمہیں عطا کرے۔

جب کوئی احسان کریں: جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرًا

ترجمہ: تجھے اللہ اس کی جزائے خیر دے۔

● بیٹی جب وظیفے کی مدت ختم ہو جائے تو فون کر کے آگے کی ہدایات لے لیجیے گا! اللہ آپ کی دوسری بیٹیوں کے لیے بھی جلد انتظام فرما دے (آمین)۔

☆ قادری صاحب! میں ایک لڑکے کو پسند کرتی تھی لیکن کچھ عرصے سے اُس نے مجھ سے بات چیت کرنا بالکل ختم کر دی تھی، آپ نے بتایا کہ کوئی اُسے اپنے بس میں کرنے کے لیے عملیات کروا رہا ہے! اور آپ نے مجھے ایک نقش اور اس کے ساتھ وظیفہ پڑھنے کے لیے دیا! قادری صاحب میں آپ کی بے حد مشکور ہوں اور زندگی بھر آپ کے لیے دعا کرتی رہوں گی کیونکہ اب وہ میری طرف پلٹ گیا ہے اور رشتے کے لیے اپنے والدین کو کچھ دنوں میں بھیجنے والا ہے۔ وظیفے کے کچھ دن ابھی رہتے ہیں، نقش کا کیا کرنا ہے۔ (صائمہ، لاہور)

● بیٹی! اللہ کا شکر ادا کریں اور دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کریں، وظیفہ شادی ہونے تک جاری رکھیں، اس کے بعد نقش کو دریا یا سمندر میں ٹھنڈا کروا دیجیے گا۔

☆ بابا سائیں! میں نے آپ سے لوحِ تسخیر خاص بنوائی تھی، مسئلہ یہ تھا کہ میرا ویزا نہیں لگ رہا تھا، بہت عاملوں سے کام کروایا مگر بات نہیں بنی، پھر کسی نے آپ کے بارے میں بتایا! آپ نے نقش اور وظیفہ پڑھنے کے لیے دیا، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وظیفے کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی میرا کام بن گیا، اللہ کرے آپ اسی طرح لوگوں کی مدد کرتے رہیں (آمین)۔ (توقیر احمد، آزاد کشمیر)

● ...... بیٹا! اللہ کا شکر ادا کریں اور دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کریں، وظیفے کی مدت ختم کر کے نقش کو ٹھنڈا کروا دیجیے گا۔ نماز کی پابندی رکھیے گا اور جمعرات والے دن 21 روپے خیرات کر دیجیے گا۔

☆ ...... شاہ صاحب! میں نے اپنی بھانجی کی شادی کے لیے نقش بنوایا تھا، شاہ صاحب! نقش لینے کے بعد دو رشتے آئے مگر ہمارے معیار کے مطابق نہیں تھے! آپ دعا کریں کہ کوئی اچھا رشتہ جلد آ جائے! (میمونہ، ساہیوال)

● ...... بیٹی! انسان بہت ناشکرا ہے، پہلے آپ نے کہا تھا کہ بالکل رشتے آتے ہی نہیں ہیں، اب رشتے آنا شروع ہوئے ہیں تو آپ بجائے اللہ کا شکر ادا کرنے کے، معیار کے پیچھے پڑ گئے ہیں! اب کوئی رشتہ آئے تو فوراً فون کر کے بتایئے گا تاکہ میں استخارہ کر کے آپ کو بتا سکوں کہ یہ آپ کے لیے بہتر ہے یا نہیں!

☆ ...... قادری صاحب! میں نے کسی کے ساتھ مل کر کاروبار کیا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ دھوکہ دیا! اب حال یہ تھا کہ میرا بال بال قرضے میں جکڑ گیا تھا! آپ کو اپنا مسئلہ بیان کیا تو آپ نے مجھے لوحِ غنی بنا کر دی اور اس کے ساتھ ایک وظیفہ بھی پڑھنے کے لیے دیا۔ قادری صاحب 61 دن وظیفہ پڑھنے کے بعد میں بہت مایوس ہو گیا تھا کہ حالات جوں کے توں تھے، آپ سے دوبارہ فون پر رابطہ قائم کیا تو آپ نے 31 دن مزید وظیفہ پڑھنے کا کہا، میں نے اللہ کا نام لے کر دوبارہ شروع کیا، ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میرا ایک بونڈ جو 5 سال سے رکھا ہوا تھا، لگ گیا، جس سے میرے کافی حد تک مسئلے حل ہو گئے! قادری صاحب اب یہ بتایئے کہ وظیفہ کے 31 دن ابھی پورے نہیں ہوئے تو اب نقش اور وظیفے کا کیا کرنا ہے؟ (عدنان علی، گوجرانوالہ)

● ...... ''اللہ تعالیٰ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے'' یہی بات کہی تھی جب آپ نے مجھے فون کیا تھا اور نتیجہ آپ نے خود دیکھ لیا! اللہ آپ کے دیگر مسائل بھی حل کرے (آمین)۔ وظیفہ ابھی جاری رکھیے اور مدت ختم ہونے کے بعد مطلع کیجیے۔

جب کوئی چیز پسند آئے تو یہ دُعا پڑھیں: مَاشَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ

ترجمہ: جیسا اللہ نے چاہا (بنایا) اللہ کے سوا کسی کی قوت نہیں (جس سے یہ چیز ایسی بن سکے)۔

☆ ...... السلام علیکم، قادری صاحب! آپ سے مشورہ کر کے ٹرانسپورٹ کا کام شروع کیا ہے، اللہ کے فضل اور آپکی دعا سے کام بہت اچھا چل پڑا ہے اور گھر کے مالی حالات بھی بہتر ہو گئے ہیں۔ اللہ آپکو مزید ترقی دے اور آپ یونہی لوگوں کی دعائیں لیتے رہیں، لوح کے بارے میں بتا دیں کہ اس کا کیا کروں؟ (فیض علی، کراچی)

● ...... اللہ کا شکر ادا کریں اور دو نفل شکرانے کے پڑھیں۔ لوح کو ٹھنڈا کر دیں، وظیفے کی ایک ایک تسبیح صبح و شام جاری رکھیں۔

☆ ...... باباجی، السلام علیکم! میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں، شادی سے پہلے دکان بنائی اور اپنا کام شروع کر دیا، گزارے لائق کام چل پڑا، پھر اللہ نے 4 بیٹیوں سے نوازا، بیٹا نہیں ہوا، میں اکیلا کمانے والا اور دکان سے بھی اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی، بس جب بڑی بیٹی نے میٹرک کیا تو اس کو گھر بٹھا لیا۔ اس طرح 2 بیٹیاں میٹرک کے بعد گھر بیٹھی تھیں، میں اور میری بیوی ہر وقت یہی سوچتے کہ 4 بیٹیوں کی شادی کیسے ہو گی؟ جبکہ معمولی پڑھی لکھی ہیں۔ ایک بار ایک میگزین پڑھنے کا اتفاق ہوا تو آپ کے کالم پر نظر پڑی، میں نے مکمل یقین اور اعتماد کے ساتھ پڑھا اور اس پر توکل کر لیا، اللہ کے فضل و کرم سے اور آپ کی دعا سے 2 بیٹیوں کے رشتے اچھے لوگوں میں طے ہو گئے ہیں، اب کیا کروں، آگے رہنمائی کر دیں، آپ کی دعاؤں کا طالب! (لیاقت علی، شیخوپورہ)

● ...... صبر سے کام لیں، لوح کو اس وقت تک رکھیں جب تک باقی دو بیٹیوں کے رشتے طے نہیں ہو جاتے اور وظیفہ کی تسبیح صبح و شام کر دیں، اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

☆ قادری صاحب! میرے کپڑے کی دُکان تھی، شروع کے دو سال بہت اچھی چلی، مگر پھر آہستہ آہستہ گاہک آنا بند ہو گئے جو آتے بھی تھے تو سودا طے نہیں ہو پاتا تھا، میں بہت مشکل میں آ گیا تھا حتیٰ کہ دُکان کا کرایہ نکلنا بھی مشکل ہو گیا تو میں نے آپ سے فون پر رابطہ کیا، آپ نے کہا کہ ''بندش'' کروائی گئی ہے، جس کے لیے آپ نے ایک نقشِ مبارک اور سعد پتھر ارسال فرمایا، اب وظیفہ مکمل ہو چکا ہے، 50 فیصد کامیابی ہوئی ہے تقریباً، مزید ہدایت فرما دیں! (ارسلان، کراچی)

● ...... بیٹا! آپ 31 دن مزید وظیفہ پڑھ لیں، انشاءاللہ حالات اور بہتر ہو جائیں گے۔ وظیفہ ختم ہو جائے تو فون کر کے مطلع ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے رزق میں اضافہ فرمائے (آمین)۔

O......O......O

نوٹ: خط لکھتے وقت اپنا نام، اپنی والدہ کا نام، تاریخِ پیدائش اور وقتِ پیدائش ضرور لکھیں۔ براہ راست جواب کے لیے جوابی لفافہ ساتھ بھیجیں۔

رابطے کے لیے:

A-911، سیکٹر 11-B، نارتھ کراچی، نزد ٹیلی فون ایکسچینج، کراچی۔ موبائل: 0300-2756587

E-mall: mashal_e_raah@yahoo.com / mashal_e_raah1@hotmail.co

گناہِ محبت

عافیہ احمد

شمع کا سینہ تو کھول اے کوئی پروانے کا احوال
اس سیاہ کار کے اندر بہت روشنی تھی لیکن کسی نے اُسے روشن کرنا ہی نہیں چاہا

وہ کتنی الہڑ تھی... کیسی حسین تھی۔ چلتی تھی تو بادِ صبا ساتھ رکھتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں بس مڈل اسکول تھا۔ وہ شہر میں اپنے ماموں کے گھر رہ کر کالج تک پڑھ آئی تھی۔ ساتھ میں نہ جانے کتنے کورس کیے تھے کہ گاؤں کی لڑکیاں اس کے آگے پیچھے پھرتی تھیں... کچھ نہ کچھ سیکھنے کے بہانے۔

وہ میرے تایازاد بھائی کی منگ تھی... عادل کی۔ میں اور عادل، ہم دونوں ہی گبرو جوان تھے۔ گاؤں میں کوئی ہم سا نہیں تھا۔ عادل تو خیر الگ طبیعت کا تھا۔ لیکن مجھے شکار کا بہت شوق تھا... ہر طرح کے شکار کا۔ سو میں نے کافی لڑکیوں سے راہ رسم کر رکھی تھی۔

میں نے اسے دیکھا... میری تو جیسے مچان ہی گر گئی بھرے جنگل میں۔ میرے چار سو خواہشوں کے، نت نئے خوابوں کے درندے غرانے لگے۔ اور میں... میں کسی درخت کی آڑ ڈھونڈتا پھرتا تھا۔

◆

مریم کو حویلی بہت اچھی لگتی تھی۔ شہر میں بھی وہ اسے یاد کرتی تھی۔ بچپن میں عادل کے ساتھ اس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ ہمیشہ ان کے درمیان تکرار ہوتی تھی۔ ہمیشہ کھیل لڑائی پر ختم ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کھیلتے ساتھ ہی تھے۔

پھر شعور آتے آتے اسی حویلی کی بھول بھلیاں میں نہ جانے کب وہ عادل کی اسیر ہوگئی۔ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ کم عمری میں آدمی دل سے کیسا بے خبر ہوتا ہے۔ اور جب خبر ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ تو برسوں پرانی خبر ہے۔

پھر نہ جانے کیسے، بڑوں کے درمیان بات چلی اور ان کے حق میں فیصلہ بھی ہوگیا۔ پھر کیا تھا۔ دونوں کے اندر چور خانے بن گئے جن میں انھوں نے ایک دوسرے کے لیے جذبا خواب اور ارمان جوڑنے شروع کردیے۔ اپس میں وہ کبھی بات نہیں کرتے تھے۔ لیکن آنکھیں دونوں کی بولتی تھیں، اور بہت بولتی تھیں جیسے صبح کے وقت پرندوں کے مسلسل چہے چہے، جیسے ساون میں کوئل کی کوک جیسے موسمِ گل میں بلبل کا نغمۂ بے تاب اس بولتی خاموشی میں دونوں گھبرا کر، اپنی اپنی پگ ڈنڈی چھوڑ کر، کسی کھڑی فصل میں چند لمحوں کی عید کرلیتے تھے۔ اپنے اپنے چاند کی دید کرلیتے تھے۔ اور نئے چاند کی دید بھی کتنی دیر کی ہوتی ہے!

◆

سنا جا رہا تھا کہ چند ماہ بعد عادل کی تاریخ پکی ہونے والی ہے... مریم کے ساتھ۔ میں بھی مریم کا عم زاد ہی تھا... عادل کی طرح۔ لیکن میں کہیں بات نہیں کرسکتا تھا۔ اپنے گھر میں بھی نہیں کہ رشتے بڑے سچے اور محبت والے تھے۔ اور مجھ میں اور عادل میں بہت فرق تھا۔ میں اندر سے سیاہ تھا اور وہ اندر سے روشن۔ کون سنتا، کون مانتا کہ روشنی مل جائے تو میں بھی اندر سے روشن ہوسکتا ہوں... عادل سے بھی زیادہ روشن!

سو میں اُن دنوں انگاروں پر چلتا تھا، اور آبلے دل کے تلووں میں پڑتے تھے۔ میں تو کبھی تڑپا ہی نہیں تھا طلب کی شدت سے آشنا ہی نہیں تھا۔ شکار میں لطف ہی نہیں تھا۔ نہ ہرنوں کے پیچھے بھاگنا پڑتا تھا، نہ بندوق تان کر نشانہ لینا پڑتا تھا۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی ڈھیر ہو جاتی تھیں۔ مگر مریم... آہ مریم!

جو شدت، جو تڑپ میرے اندر سے مریم کے لیے ابھری تھی، وہ میرے لیے بالکل نئی تھی۔ اس میں ناکامی کا خوف

تھا... اور زندگی کے پہلے پہلے خوف میں لذّت بھی عجب تھی۔

بہت دن میں نے اس پر نظر رکھی۔ آخر ایک دن اسے تنہا پاکر میں کیکر کے درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔

مریم خالص گاؤں کی لڑکی نہیں تھی، شہر میں رہ کر آئی تھی۔ پھر حویلی کی باسی تھی۔ وہ نہ تو ڈر سکتی تھی اور نہ ہی ڈھیر ہو سکتی تھی۔ البتہ وہ چونکی ضرور ہو گئی۔

"مریم، تم اس شادی سے انکار کر دو۔" میں نے بکھرتے لہجے میں اس سے کہا۔

وہ بگڑی نہیں۔ اس نے بہت رسان سے استفسار کیا۔ "کیوں؟"

"کیوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں... بہت زیادہ۔"

"تم اور محبت؟ ہُنہہ... میں نے بہت چرچے سنے ہیں تمہاری محبتوں کے۔"

"وہ... وہ محبت نہیں تھی۔ محبت تو مجھے اب ہوئی ہے۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔"

"تم تو محبت کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔"

"کیوں نہیں سمجھ سکتا۔ جب ہوئی نہیں تھی تو سمجھتا بھی نہیں تھا۔ اب ہو گئی ہے تو سمجھتا بھی ہوں۔" میں نے بے حد عاجزی سے کہا۔

"خیر... مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"بس تم اس شادی سے انکار کر دو۔ میں تمہیں دکھادوں گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اور محبت کو کتنا سمجھتا ہوں۔"

وہ ایک دم برہم ہو گئی... جیسے انگارہ۔ اور بھی خوب صورت ہو گئی وہ۔ "بکواس مت کرو!"

"دیکھو تو، میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ میں ایسا تو نہیں تھا۔"

"میں رشتے میں تمہاری بھابی لگتی ہوں۔ شرم کرو!"

"بھابی تو جب لگو کہ میں عادل کو بھائی سمجھوں۔ میں تو اُسے رقیب سمجھتا ہوں۔"

"رقیب ہونے کے لیے بڑا دل، بڑا ظرف چاہیے۔ تم تو اشتہار بنے پھرتے ہو۔ کیا مجھے تمہارا پتا نہیں چلا اتنے مہینوں میں۔"

"پتا بھی ہے کہ میں کیا سے کیا ہو گیا، تو اس کا ہی کچھ خیال کرو۔ میں ایسا تو نہیں تھا۔"

"اسی سے تو پتا چلا کہ تمہیں محبت کرنی آتی ہی نہیں۔" وہ کسی طرح بھی لچک نہیں رہی تھی۔

"برسوں سے جانتی ہو کہ میری عادت مانگنا نہیں، چھین لینا ہے۔" میں نے اپنی عاجزی نہیں چھوڑی۔ "مگر یہ معاملہ میرے لیے کچھ عجیب، کچھ نیا ہے۔ اسی لیے تمہارے در کا فقیر بنا ہُوا ہوں۔" میں بے بس سا ہو کر کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔

"تم کسی بھول میں نہ رہنا۔ مریم، عادل ہی کی ہے... اور رہے گی۔" وہ تن فن کرتی واپس مڑ گئی۔

* * *

"یہ انگلیوں کو کیا کرلیا تم نے؟" عادل گنّے لے کر آیا تھا اور اُس سے پوچھ رہا تھا۔

"زردہ پکا رہی تھی۔ آپ کو دیکھا تو دل کے رنگ انگلیوں پر چڑھ گئے۔" یہ کہہ کر وہ جھپاک سے پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

عادل کو زردے سے ایسی رغبت نہیں تھی۔ لیکن جو زردہ دل کے رنگ انگلیوں پر چڑھا دے، وہ کھانے سے کون باز رہ سکتا ہے۔ اس نے چچی کو پکارا۔ "چچی... زردہ ضرور بھجوا دیجیے گا میرے لیے۔" یہ کہہ کر وہ برآمدے کی طرف چل دیا۔

* * *

کاتک کے مہینے میں شادی طے پاگئی!

حویلی تو سب کی مشترک تھی۔ زمین جائیداد تینوں بھائیوں کی تھی۔ عادل کے والد حشمت سب سے بڑے تھے۔ مریم کے ا وجاہت سب سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے اپنی زمین بڑے بھائی کے ہاتھ فروخت کرکے شہر میں کاروبار جما لیا تھا، اور اس میں بہت کام یاب رہے تھے۔ دلاور کے والد شجاعت بیٹے کی بد معاشیوں کی وجہ سے آئے د تھانے کچہری میں الجھے رہتے تھے۔ ان کی اچھی خاصی زمین بِک چکی تھی۔ لیک خاندان میں اتفاق تھا۔ لہٰذا گھر کی با گھر میں ہی رہی تھی۔ بڑے بھائی انہیں کو کمی نہیں ہونے دیتے تھے۔

حویلی مشترکہ تھی۔ مگر بیٹی کی بات پکی ہونے کے بعد وجاہت نے اپنے حص دیوار کھنچوا دی تھی۔ جب کہ حشمت شجاعت کا صحن اب بھی ایک تھا۔

عادل گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ حویلی میں جیسے خوشیاں ابھی سے اُتر آئی تھیں۔ مریم ہفتے میں دو بار شہر جاکر خریداری کرتی۔ عادل کا بھی یہی حال تھا۔

حویلی میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی!

* * *

میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میرا نام دلاور تھا، اور میں نام کا ہی دلاور نہیں تھا۔ یار دوستوں کی کمی نہیں تھی، اور میں ہمیشہ ان کے کام آتا رہتا تھا۔ کون تھا جس پر میرے احسان کا بوجھ نہ ہو۔

یاروں کو ضرورت پڑے تو یار کام آتے ہی ہیں۔ انہیں میرے کام تو آنا ہی تھا۔ حویلی کی خوشیاں بجھ گئیں اور وہ سوگ وار ہو گئی۔ کیسی شادی، کہاں کا بیاہ۔ عادل تو اسپتال میں پڑا تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اب وہ عمر بھر لنگڑا کر چلے گا۔ کبھی نارمل نہیں ہو سکے گا۔

اور میں نے تو ابھی مریم کے نام کا صرف ایک تیر چلایا تھا... ترکش تو بھرا ہُوا تھا!

اس خوشی میں میرے ڈیرے پر جشن ہو رہا تھا۔ یار لوگوں نے شہر سے راگنی کو بلوایا تھا۔ سنا تھا، وہ ناچتی ہے تو کائنات جھومتی ہے۔ ہر شے ناچنے لگتی ہے۔ بڑے چرچے تھے اس کے۔ اور وہ توقع سے بڑھ کر ہی ثابت ہوئی۔ چناں چہ ہم سب مخمور تھے۔ جشن عروج پر تھا کہ فضل بابا ہاتھ باندھے ہال میں چلا آیا۔ مجھے اپنی محفل میں مداخلت ہمیشہ بری لگتی تھی۔ میں نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔

"چودھری جی، کوئی عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔" وہ گڑگڑایا۔

اس وقت... اور کوئی عورت! "کون ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم مالک۔ وہ برقع میں ہے۔"

"کہہ دو، کسی اَور وقت آئے۔"

"وہ کہتی ہے مالک کہ اگر آپ باہر نہیں آئے تو وہ خود اندر جائے گی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دلاور کو ایسا پیغام بھجوانے کی ہمت ان عورت کر سکتی ہے۔

"جاؤ یار!... تمہارے تو مزے ہو گئے۔" ایک دوست نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

مگر مجھے تشویش بھی تھی اور تجسس بھی۔ میں ہال سے نکلا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ "کون ہو تم؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں بھی میرے تعارف کی ضرورت ہے چودھری دلاور؟" آواز تھی کہ سانپ کی پھنکار۔

میرا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں اس کے سامنے پھر عاجز بن گیا۔

"تم جو بھی کر سکو، کرلو۔ میں بھی مریم ہوں۔ بتاؤ، ہماری حویلی سے آج تک کوئی عورت ڈیرے پر آئی ہے؟ کوئی نہیں نا! لیکن میں مریم ہوں۔ کہا نا، میں مریم ہوں۔ اس بار تمہاری ٹکر برابر کی ہے۔ تم نے مجھے شادو، نازلی اور مسرّت کی طرح سمجھ لیا جو تمہارے پیچھے پیچھے پھرتی ہیں۔ نہیں، میں وہ نہیں ہوں۔ ذرا سوچو، میں آج سب کے سامنے تمہارا نام لے دوں تو تمہارا کیا ہو۔ مگر میں تمہیں موقع دے رہی ہوں۔ کچھ رشتوں کا پاس کرو۔ آنکھوں پر ہوس کی پٹی چڑھا کر اندھا دُھند نہ دوڑو۔ سنبھل جاؤ۔ آئندہ کبھی عادل کے راستے میں نہ آنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ انکار کرنے کی، مکرنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی اس نے۔

"اور شکر کرو کہ فضل بابا کے سامنے نقاب نہیں اٹھائی میں نے۔" یہ کہہ کر وہ آندھی کی طرح اسے شرمندگی میں اڑا لے گئی۔

* * *

مریم سب کے ساتھ آتی اور عادل کی حالت دیکھ کر روتی رہتی۔ اس کی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ پلاسٹر اتار کر پھینک دے، اور اس کے زخموں پر اپنی کھال کی پٹیاں لپیٹ دے۔

"یہ سب ہُوا کیسے؟" سب لوگ عادل سے پوچھتے۔

"غلطی میری ہی تھی۔" وہ نظریں جھکا کر کہتا۔

"پھر بھی، کچھ بتاؤ تو... کیا ہُوا تھا؟"

"مجھے کچھ پتا ہی نہیں کہ کیا ہُوا ہے میرے ساتھ۔" وہ بے بسی سے کہتا۔

"یہ کیسے ممکن ہے! تمہاری آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں نا؟"

اس پر اور بعد کے تمام سوالات پر وہ چُپ سادھ لیتا... آنکھیں بند کرلیتا۔

ایک دن اکیلے میں مریم کو موقع مِل گیا۔ اس نے اس سے وہی سب کچھ پوچھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ”تم یقین نہیں کرو گی۔“

”کیوں نہیں کروں گی۔ تمھاری تو ہر بات پر یقین ہے مجھے۔“

”میں تمھارے لیے شاپنگ کرکے لوٹ رہا تھا۔ تمام چیزیں میں نے ساتھ والی سیٹ پر پھیلا کر رکھ دی تھیں۔ پھر میں تصور میں وہ سب کچھ تمھیں پہنا کر دیکھنے لگا۔ مجھے تو اب بھی لگتا ہے کہ وہ بس ایک لمحہ تھا۔ ہاں، شاید کچھ زیادہ طویل ہوگیا تھا۔ ایک دھماکا ہُوا۔ اور مجھے کچھ پتا نہیں۔ آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔“

”عجیب آدمی ہو۔ جو تمھارا ہوچکا ہے، اس کے تصور میں بے خود ہوجاتے ہو۔“ مریم نے بڑی محبت سے کہا۔

* * *

مجھے پہلی بار پتا چلا کہ بعض اوقات تیر اُلٹے بھی چل جاتے ہیں۔ ٹانگ عادل کی ٹوٹی تھی... مگر دل تو میرا چھِد گیا تھا۔ میں بے بسی سے تڑپتا تھا کہ یہ کیا ہوگیا۔ میری چال اُلٹی کیوں ہوگئی۔

وہاں تو اندھیر مچ گیا تھا۔ مریم اپنے ماموں کے گھر میں مقیم تھی۔ ہر روز وہ عادل سے ملنے اسپتال جاتی... ہر روز اس سے محبت بھری باتیں کرتی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ نہ ڈیرے میں دل لگتا تھا، نہ یاروں کے درمیان۔

’ارے... میں دلاور ہوں!‘ میں مٹھیاں بھینچ کر سوچتا۔ ’میں دلاور ہوں۔ تُف ہے مجھ پر! میں خود کو مرد کہتا ہوں۔ کیا ہوگیا تھا اس رات میری مردانگی کو۔ ارے... اٹھا کر پٹخ دیتا اسے اندر مسہری پر۔ یہ لاحاصل کا زہر تو نکل جاتا میرے اندر سے۔ اس کے پارسائی کا زعم بھی ختم ہوجاتا۔‘

مگر اسی لمحے تو بہت کچھ میری سمجھ میں آیا۔ اس سے پہلے میں سینے کی طرف نگاہ کرتا تو وہاں مجھے گہرا... گھپ اندھیرا دکھائی دیتا۔ لیکن اس لمحے وہاں روشنی کا ایک بہت چھوٹا سا نقطہ جگمگا رہا تھا۔ اسی لمحے تو پہلی بار میں نے محبت کو سمجھا۔ اگرچہ پوری طرح نہیں سمجھ سکا... اچھی طرح نہیں سمجھ سکا۔ پھر بھی میں نے اتنا سمجھ لیا کہ اس رات وہ سب کچھ بہت آسان تھا۔ لیکن میں کر نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی مر جاتا۔

پھر بھی وحشت اتنی آسانی سے کہاں ختم ہوتی ہے۔ آگ کو سرد ہونے میں وقت تو لگتا ہے۔ میں اپنی ہی آگ میں جلتا جلتا پھر رہا تھا۔ گھنٹوں ٹیوب ویل کے پانی میں نہاتا۔ پانی کی ٹھنڈ میری روح میں اُتر جاتی۔ مگر جسم اسی طرح شعلوں میں گھرا رہتا۔

ایک دو بار میں اسپتال بھی گیا۔ لیکن مریم جس طرح مجھے گھورتی تھی... آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھی، اس کی دیدہ دلیری نے مجھے... دلاور کو خوف زدہ کردیا۔ اس کی نظریں دیکھتا تو میرا جی چاہتا کہ کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر رینگنا شروع کردوں۔ ایسی تحقیر... ایسی ذلت!

پھر مجھے اسپتال جانے کی ہمت نہیں ہوئی!

* * *

ہفتے، ماہ کے پر بن کر اُڑ گئے۔ گاؤں میں تو موسم سرما ویسے بھی جلد ہی اپنی چھب دکھلاتا ہے۔ شامیں منڈیر پر رُکتیں، مگر ان کا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ تھا۔ مریم بولائی بولائی پھرتی۔ اب تو عادل کی محبت اور بھی گہری ہوگئی تھی۔ وہ تو مقروض بھی ہوگئی تھی اس کی۔ اسی کی وجہ سے تو دلاور نے یہ حملہ کِیا تھا عادل کی جان پر۔ اگر خدانخواستہ... اس سے آگے اُس سے سوچا نہ جاتا۔ بس وہ کپکپا کر رہ جاتی۔

اسے نِٹنگ سے بڑی دل چسپی تھی۔ وہ بڑی چاہت سے عادل کے لیے سویٹر بُن رہی تھی۔ سویٹر کے ایک ایک گھر میں اس کی چاہت اور دعا تھی... عادل کی زندگی کے لیے۔

ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اگلے ہفتے عادل کو ڈس چارج کردیا جائے گا۔ نہ اسے گاؤں میں چین تھا، نہ ماموں کے گھر میں۔ اس کا ایک بھائی کاروبار سنبھالتا تھا۔ دوسرا قانون پڑھ رہا تھا۔ والد نے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنی زمین... اپنی روایات کی پاس داری کی تھی۔ مریم کو ابھی وہ اور پڑھانا چاہتے تھے۔ لیکن حشمت تایا کو شادی کی جلدی تھی۔ اس سے وہ مجبور ہوگئے۔

عادل نے بھی بی اے کے دوران ہی اس وقت پڑھائی چھوڑ دی تھی جب حشمت تایا کو ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہُوا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، ہلکا بھاری کچھ نہیں ہوتا، ہارٹ اٹیک تو بس ہارٹ اٹیک ہوتا ہے۔ یہ سننے کے بعد عادل پڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے باپ کو ذمے داریوں سے نجات دلانی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ گاؤں میں زمینوں کے معاملات خود سنبھالے۔ البتہ اس کے بہن بھائی... اقصیٰ اور زوہیب اب بھی شہر میں اپنی پڑھائی میں مصروف تھے۔

خاندان میں سبھی نے تعلیم حاصل کی تھی۔ شجاعت صاحب کا البتہ سر جھکا رہتا تھا۔ دلاور نے میٹرک تو رو پیٹ کے کرلیا تھا۔ لیکن پھر انٹر میں تین سال ضائع کرنے کے بعد ہار مان لی تھی۔ ہار کیا مان لی تھی، وہ اس میں خوش تھا۔ بس وہ تھا اور گاؤں تھا... اور شکار! کبھی جنگل میں تو کبھی ڈیرے پر!

* * *

حد سی حد ہوتی ہے کوئی۔ میں پہلی بار جان رہا تھا کہ میں جاہل ہوں۔ کوئی بے کلی سی بے کلی تھی۔ سارے شغل بے اثر ہوگئے تھے۔ شراب نشے سے محروم تھی اور شباب رنگینیوں سے۔ پہلی بار پتا چلا تھا کہ نشہ تو خون میں ہوتا ہے، شراب محض بہانہ ہے۔ اور رنگینی نظر میں ہوتی ہے، شباب محض ایک خاکہ ہوتا ہے۔ ہونٹ وہی تھے لیکن ہنسی نہیں تھی۔ یاروں کی باتیں کم سنائی پڑتی تھیں اور جو سنائی پڑتیں، وہ سمجھ میں کم ہی آتی تھیں۔ کوئی بے زاری سی بے زاری تھی۔ یار دوست تدبیریں کرتے کرتے ہار گئے، میری بے زاری نہ دُور کرسکے۔

پھر میں اکیلا بیٹھنے لگا۔ محفلیں بُری لگنے لگیں۔ میں جو اکیلا کبھی رہا ہی نہیں تھا... میں جو کہتا تھا کہ اکیلا تو میں مروں گا بھی نہیں۔ اب اکیلا پن اچھا لگنے لگا۔ اکیلے بیٹھ کر سینے میں جھانکنا اچھا لگتا تھا۔ وہاں اندھیرے میں وہ روشن نقطہ اب بھی تھا۔ کبھی وہ جگنو لگتا کہ ٹھنڈک کا احساس دلاتا۔ مگر پھر اندر کی وحشت زور کرتی تو وہ چنگاری لگنے لگتا... جو پورے جنگل کو جلانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ وہ روشن نقطہ نہ بڑھتا تھا، نہ گھٹتا تھا۔ مجھے اس سے چڑ ہونے لگی۔ وہی تو میری زندگی تبدیل کررہا تھا۔ اس نے مجھے عیش کی سرسبز وادی سے نکال کر بے کیفی کے صحرا میں لا پٹخا تھا۔

حویلی میں آج صدقات دیے جارہے تھے۔ عادل کو اسپتال سے آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ میں اس کا استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے تھا۔ مریم کی نفرت اور حقارت بھری نگاہیں بھی مجھے نہیں ہٹا سکیں۔ عادل کو اب تمام عمر ایک اسٹک کے سہارے چلنا تھا۔ سب خواتین کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ مرد حضرات عادل کو دلاسا دے رہے تھے کہ جان ہے تو جہان ہے۔ اقصیٰ اور مریم نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا تھا۔ ایک میں ہی خوش تھا۔

اس کمینی سی خوشی میں بھیگ کر میں نے اندر جھانکا تو سینے کا وہ روشن نقطہ بجھا ہُوا تھا۔ میں اَور خوش ہوگیا۔ مدت کے بعد میں نے خود کو پہلے جیسا محسوس کیا۔ اور فوراً ہی شکار پر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ جنگل مجھے بلا رہے تھے۔

* * *

وہ اقصیٰ کے ساتھ عادل کے پاس آئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اُداس سا بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہیں۔ لیکن اس کی اُداسی کے خول کو نہ توڑ سکیں۔ وہ تو جیسے مسکرانا بھی بھول گیا تھا۔

اقصیٰ سے دیکھا نہیں جارہا تھا۔ وہ بہانہ کرکے چلی گئی۔

”کچھ بولو نا۔“ مریم نے کہا۔

”ہاں، بولنا تو ہے۔ یہی تو سوچ رہا ہوں۔“

”مجھ سے بات کرنے کے لیے سوچنا بھی پڑتا ہے۔“

”ہاں، اب تو ایسا ہی ہے۔“

”اب ایسا کیا ہوگیا؟“

”دیکھ تو رہی ہو، میں اب نارمل نہیں رہا۔“ عادل نے اُداسی سے کہا۔

مریم نے اسے سر سے پاؤں تک گھورا۔ ”بہ ظاہر تو ایب نارمل نہیں لگتے۔“

"مذاق مت کرو۔ میں سنجیدہ ہوں۔"

مریم بھی سنجیدہ ہوگئی۔ "تو چاہتے کیا ہو؟"

"تم اپنا راستہ بدل لو۔ میں ابا جان سے بات کرنے والا ہوں۔"

"کیوں ... مجھ میں کوئی کمی واقع ہوگئی؟"

"کمی تو مجھ میں ہے۔ تم میں کمی کہاں..."

"تو یوں کہو کہ مجھ میں کمی دیکھنا چاہتے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے بغیر تو میں پوری ہی کم ہوجاؤں گی۔"

وہ تڑپ گیا۔ "دیکھو، تم..."

"سیدھی سی ایک بات پوچھتی ہوں تم سے۔ جواب سچا چاہیے۔ اگر یہ حادثہ میرے ساتھ ہوا ہوتا تو کیا تب بھی تم..."

عادل نے بے ساختہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسے نہ کہو پلیز!"

"میری محبت کوئی اچانک ہونے والی چیز نہیں۔ اس کی بنیادیں تو شعور کے ساتھ ساتھ گہری ہوئی ہیں۔ تم نے سوچا بھی کیسے..." وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو دی۔ "میں تمہارا سہارا بنوں گی۔ تم ایک قدم اٹھانا، دوسرا میرا دل بن جائے گا..."

عادل محبوبیت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

* * *

میرے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ میں شکار پر نکلوں گا اور میرے پیچھے مریم اور عادل کی شادی ہوجائے گی۔ شادیاں ایسے کب ہوتی ہیں! پھر ہمارے خاندان میں تو وہ پہلی شادی تھی۔ میں نے شکایت کی کہ مجھے اطلاع بھی نہ دی۔ لیکن شکایت بلا جواز تھی۔ شکار کے دوران میرا کوئی ایک ٹھکانا تو ہوتا نہیں تھا۔ اور بیٹری چارج نہ ہونے کی وجہ سے میرا سیل فون بھی بند ہی رہتا تھا۔

اس پر ستم یہ کہ میں واپس آیا تو وہ ایک دن پہلے ہنی مون کے لیے نکل چکے تھے.. ہنی مون!

"شادی کے اگلے دن ہی وہ روانہ ہوگئے بابا جان؟" میں نے حیرت ظاہر کی۔

"دراصل عادل بُجھا بُجھا تھا۔ اب شادی کر کے تو خوش ہونا چاہیے بندے کو۔"

"تو؟"

"ڈاکٹر نے کہا، ماحول تبدیل ہوگا تو بہتری آئے گی۔"

"اور وہ گئے کہاں؟"

"شمالی علاقوں میں۔"

"ہُنہہ... عادل کوئی بی ہے کیا کہ ماحول کی تبدیلی سے فرق پڑے گا۔ ڈاکٹر تو پاگل ہیں۔" میں نے نفرت سے کہا۔

بابا جان حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

* * *

شمالی علاقے... ارضی جنت، جیسے خوب صورت خواب! پھر مریم کا ساتھ۔ فرق تو پڑنا ہی تھا۔ عادل کا دل بہل گیا۔ ہونٹوں سے روٹھی ہوئی مسکراہٹیں لوٹ آئیں، جیسے موسم کی سختی سے گھبرا کر کوچ کر جانے والے پرندے موسم بدلتے ہی اپنے ٹھکانوں کا رُخ کرتے ہیں۔

وہ نسبتاً آسان ٹریکس پر جاتے۔ عادل کا اعتماد بھی بحال ہونے لگا۔ اور ان کی خلوتیں اتنی حسین اور خواب ناک ہوتیں کہ ان کے سامنے ناران کا حُسن ماند پڑجاتا۔ اور مریم اس پر نثار ہوتی۔ اس کی وارفتگی سے عادل کو لگتا کہ رنگ، روشنی اور خوش بوئیں اسے اوڑھ لیتی ہیں۔ وہ جب بھی اسے چھوتا، وہ پھلجھڑی بن جاتی۔ وہ سوچتا، اس کے جلنے بجھنے کے ڈھنگ جگنو کیا جانیں، اس کے روشن رنگ ستارے اور چاند کیا جانیں۔

وہ دونوں ہی فاتح تھے، دونوں ہی مفتوح۔ جذبوں کا مالِ غنیمت جتنا وہ لُٹاتے، اتنا ہی بڑھتا..

* * *

حویلی کی روایت تھی کہ ہر ہفتے تینوں بھائیوں کی فیملیز رات کا کھانا تایا ابو کے گھر کھاتیں۔ میں اب اس میں ضرور شریک ہوتا۔ اُن کی خیر خبر مل جاتی۔ عادل کا تو سیل نمبر میرے پاس تھا۔ سنا تھا، اس نے مریم کو بھی سیل فون گفٹ کیا ہے مگر اس کا نمبر کسی کے پاس نہیں تھا۔ عادل کا نمبر بھی کبھی نہیں ملا۔ شاید وہ بند رکھتا ہوگا۔ کیوں؟ اس خیال سے ہی میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔

ان کے پاس وقت اور وسائل کی کیا کمی تھی۔ پہاڑوں میں جتنا عرصہ بھی رہتے، کم تھا۔ میرے لیے مگر ایک ایک دن بلا تھا، ایک ایک رات قیامت تھی۔

گاؤں میں نازلی کی شادی ہوئی۔ وہاں بڑی من موجی کی۔ گھڑی دو گھڑی دل بہل گیا۔ مگر پھر ایک رات مریم کو خواب میں دیکھ لیا تو رات کو اٹھ کر اتنے بڑے صحن میں سردی کے باوجود پھرتا رہا۔ نتیجے میں کئی دن بخار بھگتا...

* * *

"اگر تم نہ ملتے تو میرا کیا ہوتا؟" مریم نے سرشاری سے کہا۔

"تمہارا تو مجھے نہیں پتا... لیکن بھئی، میں تو بہت پچھتا رہا ہوں۔" عادل نے سرد آہ بھرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"پچھتا رہے ہو؟" مریم کو جیسے کرنٹ لگا۔ وہ تیزی سے اس سے دُور ہوگئی۔

"ہاں مومو، اور ساری عمر پچھتاؤں گا کہ اتنی زندگی تمہارے بغیر کیوں گزاری۔" عادل نے دوبارہ اسے لپٹا لیا۔

"بڑے بکواسی ہو تم۔" وہ ناز سے بولی۔

"تم نہ بھی ملتیں، میں نے پھر بھی تمہیں ہی پانا تھا۔ یاد ہے، بچپن میں کتنا لڑتی تھیں تم مجھ سے۔"

"یاد ہے۔ لڑتے تو تم تھے۔"

"میری ہر چیز پر قبضہ جمالیتی تھیں..."

"اور اب تم پر... پورے تم پر میرا قبضہ ہے۔" وہ اس کے چہرے پر جھکی اور ہلکے سے کاٹ لیا۔

"ظالم بھی ہو۔" وہ کراہا۔

"وہ تو ہوں۔" مریم نے دوسری طرف سے بھی کاٹ لیا۔

"پتا ہے، جب تم اپنے ماموں کے گھر رہنے چلی گئیں تو مجھے تمہاری کمی محسوس ہونے لگی۔ اس کمی نے میرے اندر ایک احساس جگایا۔ جب بات سمجھ میں آئی تو میں نے ابا جان سے بات کی..."

"کیا کیا تم نے..." مریم نے اس کے ایک مکّا جڑا۔ "کیا سوچا ہوگا تایا جان نے؟"

"کچھ بھی نہیں سوچا۔ کہنے لگے، یہ تو میری بھی خواہش ہے۔ اب اپنا گھرانا تو تم جانتی ہو نا کہ ہے ہی مثالی۔"

مریم کو میرا خیال آیا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ وہ عادل سے اس کا تفاخر چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ چپ چاپ اس کے سامنے وجود کی سپر ڈال دی۔

* * *

بادل زمین پر اترے ہوئے تھے، اور وہ اُن کے

گلچھرے

- ...اپنے چہرے پر مسکراہٹ کا میک اپ اس خوب صورتی سے کرو کہ چہرے سے دُکھوں اور غموں کی اصول کسی کو نظر نہ آئے۔
- ...زندگی کی مصیبتیں کم کرنا چاہتے ہو تو زیادہ سے زیادہ معروف رہو۔
- ...سب سے محبت کرو مگر کسی سے محبت کی توقع نہ رکھو۔
- ...فکر کرنے سے کیا فائدہ... اپنی فکروں کو ردّی کی ٹوکری میں پھینکو اور مسکراؤ۔
- ...لوگوں سے اس طرح میل جول رکھو کہ اگر تم زندہ رہو تو تم سے ملنا چاہیں اگر مرجاؤ تو تمہارے لیے روئیں۔
- ...کسی کو دل کی گہرائیوں سے مت چاہو کیونکہ اب اس زمانے میں پہلی سی محبت نہیں رہی۔
- ...زندگی محبت کے لیے کم ہے نجانے لوگ نفرت کے لیے وقت کہاں سے نکالتے ہیں۔
- ...زندگی میں اچھے کام کرو... موت کے بعد یاد رہو گے۔
- ...تم مسکراتے رہو، زندگی خود بخود مسکراتی نظر آئے گی۔

ابنِ حسن عثمان آبادی کے قلم سے

درمیان اٹھلاتی پھر رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ اور سنجیدگی سے میری بات سنو۔" عادل کے چہرے پر گھمبیرتا تھی۔

وہ کچھ ڈر سی گئی۔ "کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟" اُس نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"خیر تو بس اس میں ہے کہ مجھے ایسے بچے چاہئیں۔" عادل نے کچھ فاصلے پر کھیلتے سرخ و سفید مقامی بچوں کی طرف اشارہ کِیا۔

مریم کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "منہ دھو رکھو۔"

"اور پہلے بیٹا۔" وہ اور شریر ہُوا۔

"عادل، باز آجاؤ۔"

"ابھی موڈ نہیں ہے تو پھر انہیں ہی ساتھ لے چلو۔" وہ بھلا باز آنے والا تھا۔

"نہیں... ابھی موڈ نہیں ہے۔" اس نے جیکٹ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

"چلو.. اچھا ہے۔" عادل نے پینترا بدلا۔ "ابھی میرے اور تمہارے بیچ کوئی تیسرا نہ آئے۔"

"وہ تو آبھی گیا۔" مریم نے رُخ پھیرا اور گنگنائی۔

"سچ! کیا کہا؟" وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"وہی... جو تم نے سنا۔" وہ انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتی واپسی کے راستے کی طرف پلٹی۔ راستے جو بہت حسین تھے... ہم سفر جو بہت پیارا تھا۔ محبت ساتھ ہو تو کچھ بُرا ہوسکتا ہے بھلا...

* * *

حویلی میں آج پھر جشن کا سماں تھا۔ تین ماہ بعد وہ دونوں لوٹ آئے تھے۔ ان دونوں پر نگاہ نہیں ٹھیرتی تھی۔ قربتوں سے لبالب بھرے ان کے وجود.. ان کی ہنسی نے در و دیوار کے سناٹے ختم کر دیے تھے۔

"بہت مبارک ہو عادل اور مریم۔" میں بھی ان کی طرف لپکا۔

"یونہی خالی ہاتھ مبارک باد۔" عادل نے مجھے چھیڑا۔

"بھئی، وہ تو ادھار رہا۔ تم نے چپکے سے شادی کرلی.. بتائے بغیر ہی۔"

"چلو اگلی بار بتا کر کریں گے۔" عادل کھلکھلایا۔ پہاڑی دوا اُسے سچ مچ راس آگئی تھی۔ "مگر اب تو ہم آگئے ہیں۔"

"آئے بھی بغیر بتائے ہو۔ تحفہ بھی مل جائے گا..." میں نے کہا۔ پھر مریم کی طرف مڑا۔ "تم کیسی ہو مریم... ٹھیک ہو نا؟"

"نام نہ لو میرا۔ اب میں تم سے بڑی ہوں رشتے میں۔ اب بھابی کہا کرو مجھے۔" اس کے لہجے کو صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا۔

"کیوں بھئی، تم بڑی کیسے ہوگئیں مجھ سے؟"

"عادل تم سے بڑے ہیں نا، اور اب میں مسز عادل ہوں۔"

"اوہ... مگر مجھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے نخوت سے کہا۔

ذرا دیر بعد عادل اِدھر اُدھر ہُوا تو میں نے مریم کو کھسکنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ "بڑا روپ آیا ہے تم پر۔"

وہ فوراً ہی ڈٹ گئی۔ "محبت کا کرشمہ ہے۔" اس نے کہا اور فوراً ہی جوابی حملہ کِیا۔ "اور تمھارا روپ رخصت ہو رہا ہے۔ خاصے خزاں رسیدہ لگ رہے ہو۔" مجھے چپ ہوتے ہی بن پڑی۔

مگر وہ رُکنے والی کہاں تھی۔ خود ہی سوال کِیا تھا، خود ہی جواب بھی دے دیا۔ "یہ ہوس کا کرشمہ ہے نا!" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اقصیٰ کی طرف چلی گئی۔

میں نے نہیں سوچا تھا کہ اذیت کو تو اَور بڑھ جانا ہے۔ وہ دونوں دُور تھے تو محض تڑپ ہی تھی۔ اب تو میرا روم روم جلتا تھا۔ کوئی نہ کوئی ان کا تذکرہ کر ہی دیتا.. ایک ساتھ کتنے اچھے لگتے ہیں.. کتنے خوش ہیں.. عادل ٹانگ کی محرومی سے بھی بے نیاز ہوگیا ہے۔

ہمارا صحن بھی مشترک تھا۔ رات کو دیر تک ان کے بیڈ روم میں زیرو کا بلب روشن رہتا، اور اس کی روشنی مجھے کہانیاں سناتی۔ اب وہ باتیں کر رہے ہوں گے... اب ہاتھوں میں ہاتھ ہوگا... اب وہ عادل کے سینے پر ہوگی... اب... اب... اب... اور یہ اب اب کی گردان مجھے پاگل کردیتی۔ میں وحشت سے نڈھال ہوجاتا۔ اپنا سینہ نوچتا رہتا۔

پھر ان راتوں میں کئی بار میں شادو سے اور مسرت سے ملا۔ عجیب حال تھا میرا۔ کبھی تو انھیں چھونے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ یونہی رخصت کردیتا۔ وہ مایوس ہوتیں۔ اور کبھی انھیں اس شدت سے برتتا کہ وہ سسکنے لگتیں۔

مگر خوشی اور لذت کا کوئی زاویہ بھی نہیں تھا۔

* * *

مریم کے سیل فون کا نمبر میں نے اس چالاکی سے حاصل کیا کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ اس کے لیے خاص طور سے ایک سِم بھی حاصل کرلی۔ اس سِم سے اکثر اسے حسبِ حال اشعار سینڈ کردیا کرتا تھا۔ جواب تو کہاں آتا تھا۔ بس دل کی شورش کچھ کم ہوجاتی تھی۔ سینے کی آگ کچھ ماند پڑجاتی تھی۔ سرد ہونے والی تو خیر تھی نہیں۔ یہ جانتا تھا کہ وہ جانتی ہے کہ شعر بھیجنے والا کون ہے۔

عادل کو زخم میں کبھی کبھی ٹیس اٹھتی تھی اِس لیے وہ زوہیب اور اقصیٰ کے ساتھ کچھ دن کے لیے شہر چلا گیا کہ چیک اپ وغیرہ کرانے میں آسانی ہوگی۔ مریم کو تائی امی نے اس کے ساتھ جانے نہیں دیا کہ پہلا پہلا معاملہ ہے۔ ایسے میں احتیاط ضروری ہوتی ہے۔ پھر ان کی فیملی ڈاکٹر ہر دوسرے دن اسے چیک کرنے کے لیے آتی تھی۔ حالاں کہ ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر نازبرداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

اس روز دن بھر آسمان صاف رہا تھا۔ لیکن شام کو کالی گھٹا گھِر کر آئی، رِم جھِم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد جل تھل کر ڈالا۔ میں خوش ہوگیا۔ سمجھو، آج تو میری لاٹری نکل گئی۔ آج تو چاند میری دست رس میں تھا۔

دروازہ لاک نہیں تھا۔ ہر رات وہ عادل کا انتظار کرتی تھی۔ اس موسم میں بھی اس نے آس نہیں چھوڑی تھی... زخموں کو ہرا کرنے والے، پرانے زخموں میں ٹیسیں جگانے والے اس موسم میں بھی! اس نے یہ نہیں سوچا کہ یہ موسم خواہشوں کو بے لگام کردینے والا بھی ہوتا ہے۔

میں نے مین سوئچ بند کردیا تھا۔ برسات کی وجہ سے بجلی تو ایسے ہی غائب تھی۔ مگر وہ غلط وقت پر آ بھی سکتی تھی۔ اور یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ میرا ڈیل ڈول عادل جیسا ہی تھا... اور آواز کی مشابہت بھی۔ اگر میں سرگوشی میں بات کرتا تو مریم فرق نہ کر پاتی۔ صبح جو ہوتا سو ہوتا۔ بات تو اب کی تھی... اس شب کی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ "ایسے موسم میں تم کیسے آگئے عادل؟"

"بس آ گیا تمھارے لیے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"کچھ کھاؤ گے؟"

"تم ہی کافی ہو۔ اور کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ بس تھک گیا ہوں۔ اپنی پوروں سے میری تھکن چن لو۔" میں نے کہا۔ پھر میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں دیوانہ وار اس کا ہاتھ چومنے لگا۔ کیسا لمس تھا اس کا... تتلیوں کے پروں جیسا۔ کیسی خوش بو تھی اس کی... چمپا جیسی۔ میں تو اس کی مہک سے ہی مدہوش ہوگیا۔ اس ایک لمحے میں کتنے سانس لے لیے... کتنی عمر جی لی میں نے!

مگر جب میں نے اسے بازوؤں میں بھرنا چاہا تو اسے کرنٹ سا لگا۔ وہ ایک دم بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم... تم... دلاور! تمھاری یہ جرأت...!" اس کی آواز کانپنے لگی۔

"ہاں، میں... بدنصیب دلاور۔ تم دن کے اجالے میں نہیں ملتی تھیں۔ اب پتا چلا کہ تم رات کے اندھیرے میں بھی نہیں ملتی ہو۔" میں اس کی طرف بڑھا۔

"رُک جاؤ.. ورنہ میں شور مچادوں گی۔"

"میں تو ہوں ہی بدنام۔ عزت والی تو تم ہو۔"

"تم مجھے گولی ماردو۔ مگر میں تمھاری کمینی فطرت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گی۔"

"تمھیں مارنا کون بدبخت چاہے گا..."

"دیکھو.. میرے ہاتھ کے پاس انٹرکام ہے دلاور..." وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ "کیوں خاندان کو توڑنے پر تُلے ہو۔ نکل جاؤ میری زندگی سے۔"

میں ساکت کھڑا بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

"دلاور.. دروازہ کھول، دلاور.."

ماں کی آواز نے مجھے دہلا دیا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ دروازہ نہ کھولتا میں۔ "ماں... تم...!"

"ہاں... میں ماں ہوں تیری۔ سارے تیور پہچانتی ہوں تیرے۔ نکل یہاں سے۔"

میری تو شدھ بدھ ہی جاتی رہی۔ پیاس اور غصے سے کھولتا، میں اپنے کمرے میں آیا.. اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ سارے کمرے کو تہس نہس کردیا میں نے۔ کوئی چیز سلامت نہیں رہی۔

ماں مریم کے ہی کمرے میں رک گئی تھی شاید...

* * *

مریم کئی دن بستر سے نہ اٹھ سکی۔

خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اوپر سے ہاتھ ناپاک ہونے کے وہم میں مبتلا ہوگئی۔ بار بار جاتی اور ہاتھ دھوتی۔ عادل پریشان ہوگیا اس کی طرف سے۔

وہ کسی کو کچھ بتا نہیں سکتی تھی۔ ایک تو چھوٹی تائی کا احسان تھا اس پر۔ انہوں نے ہی تو اسے بچایا تھا، ورنہ... دوسرے وہ زبان کھولتی تو خاندان کا شیرازہ بکھر جاتا۔

پورا گھر پریشان ہوگیا اس کے لیے۔ تائی اماں صدقے خیرات کرتی رہتیں۔ آخر یہی طے پایا کہ اسے شہر والے گھر شفٹ کردیا جائے۔

اس سے بہت فرق پڑا۔ وہاں مریم بڑی حد تک بہل گئی۔ شام کو وہ عادل کے ساتھ پارک چلی جاتی۔ عادل نے بہت کُریدا مگر اس نے کچھ بتاکر نہیں دیا۔ اس کی طبیعت کے پیشِ نظر عادل نے بھی زیادہ اصرار نہیں کِیا...

* * *

عادل کے حادثے کے بعد سے میں نے کبھی دوستوں سے مدد نہیں لی تھی۔ مریم کی بات میں ویسے بھی کسی سے نہیں کرسکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد تو میں دوستوں سے دُور ہی ہوگیا۔ کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

تنہائی مجھ میں تبدیلی لائی۔ میں سوچنے والا جانور بننے لگا۔ سینے میں جھانکتا تو وہ روشن نقطہ جیسے مُنہ چڑاتا کہ نہیں مٹا سکے نا مجھے تم! مٹا بھی نہیں سکوگے۔ کچھ بھی کرلو۔

اس پر میں نے غور کرنا شروع کِیا۔ مریم میں ایسی کون سی بات ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔

ایک بار سوچا تو ریل گاڑی سی چل پڑی۔ شاید اس کی وفا... اس کا کردار... اس کی پاکیزگی! ہاں، وہ مجھے مِل جائے... ایک بار مِل جائے تو میں کتنا اچھا ہوجاؤں۔

میں نے پروردگار کے سامنے سر جھکادیا۔ پہلی بار میں دعا کررہا تھا۔ اے میرے رب... تو ہر قدرت رکھتا ہے۔ دل میں ایک روشن نقطہ ڈالتا ہے تو پورا سینہ ہی روشن کردے۔ تُو مجھے اچھا بنادے۔ تیری ایک بندی مجھے اچھائی کی جھلک دکھاتی ہے۔ تُو چاہے تو میں اندر باہر سے دُھل جاؤں... پاک ہوجاؤں... روشنی میں نہا جاؤں۔ دیکھ تو، کیسا اندھیر مچا ہے۔ وہ میرے ڈر سے دربدر ہے، اور میں مرد ہوکر گھر میں محصور ہوں۔ خدا سے یہ

گاؤں کی زندگی، سب رشتے ناتے کتنے عزیز ہیں۔ مگر میری وجہ سے... صرف میری وجہ سے وہ محروم ہوگئی ہے۔

میں نے اپنا پاس پورٹ نکالا، دل میں ایک ارادہ کیا اور یورپ کی طرف نکل گیا۔

یورپ میں کیا نہیں تھا... حُسن، ادائیں، بے باکی.. مگر سب کچھ سستا تھا... بہت سستا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔ سستی چیزوں سے دل بھر گیا تھا، نہ کہیں دل کشی تھی، نہ رعنائی، نہ رنگینی۔ پر دل کا ارادہ پکا تھا۔ اب واپس نہیں جانا۔

میں نے ایک بار اپنے اندر جھانکا تھا، اور وہاں مریم کی شکل میں سچائی کی رمق... روشنی کا نقطہ پایا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ کسی اور نے میرے سینے میں نہیں جھانکا تھا۔ انہیں... سب کو تو باہر سے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ اب اندر کون جھانکے... اور جھانکنے بھی کون دے۔ میں نے تو خود بھی جھانکنا چھوڑ دیا تھا۔

* * *

عادل اور مریم دونوں کی دل کشی چُرائے اک ننھا پھول سجاد ان کے گلشن میں کھلا تھا۔ زندگی مسکرا اٹھی تھی۔ انہی دنوں اقصیٰ کی بات اپنے ماموں زاد کے ساتھ پکی ہوئی، اور منگنی بھی ہوگئی۔

حویلی بھری رہتی تھی۔ مریم کی تو باری ہی نہیں آتی تھی سجاد کو لینے کی۔ سب کی آنکھ کا تارا تھا وہ۔ خاندان بھر کا پہلا بچہ جو تھا۔

"عادل، بس اب مجھے پکڑادو... میں نے دوپہر سے نہیں لیا۔" مریم فریاد کرتی۔

"تم ایسا کرو، نیا لے آئو۔" عادل اسے چھیڑتا۔

"یہ بازار میں نہیں ملتے ہیں۔ پود پود بنانا پڑتا ہے اپنے اندر... اپنے لہو سے، اپنے گوشت سے۔"

"تو پھر سنو۔ وقت کی بچت کیوں نہیں کرتیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہی کہ اس بار Twins کا سوچو۔"

مریم نے بھنّا کر اس کے بازو میں دانت گڑدیے

"جنگلی بلی... اپنے سجاد کو کاٹو۔"

"کیوں کاٹوں؟ وہ تو میرا بیٹا ہے۔"

"تو میں بھی تو کسی کا بیٹا ہوں۔"

مریم نے بالآخر سجاد کو اس سے چھین لیا۔

"جانتی ہو، یہ سجاد کیا ہے۔" عادل نے کہا۔

"میں تو جانتی ہوں۔ پر تم کیا جانو۔"

"بھلا بتائو تو۔"

"یہ میرا دل بھی ہے اور دھڑکن بھی، آنکھ بھی ہے اور نور بھی، چاند بھی اور ستارہ بھی۔ میرے ایک بوسے میں ہزار لمس ہوتے ہیں اس کے لیے۔ اس کے رونے پر، مسکرانے پر مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کرلوں خود کو.. اس پر نچھاور ہوجائوں... یا اسے لے کر، دُور کسی جزیرے پر چلی جائوں..."

"اور میں موموِ، مومو کرتا تمہیں ڈھونڈتا پھروں... ہے نا!" عادل قریب آکر دونوں کو باہوں کے گھیرے میں لے لیتا۔

* * *

اب وہ چلا گیا تھا تو مریم کا ڈر نکل گیا تھا۔ حویلی کے دو بڑے کمرے اس نے اپنے لیے مخصوص کرکے گائوں کی لڑکیوں کے لیے ایک ادارہ بنادیا تھا، جہاں وہ سلائی، کڑھائی، نِٹنگ اور کمپیوٹر سیکھتیں۔ یہ سب کام وہ فی سبیل اللہ کررہی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جتنا وہ دوسروں کے کام آئے گی، اتنی ہی سجاد کے لیے آسانیاں ہوں گی۔ جتنی وہ خوشیاں بانٹے گی، اتنی ہی سجاد کو خوشیاں ملیں گی۔

اتنی مصروفیت تھی۔ مگر وہ سجاد سے ایک پل کو بھی غافل نہ ہوتی۔ زندگی کچھ ڈھب پر آلی تھی۔ سجاد ایک سال کا ہوچکا تھا۔ وہ چلتا تو مریم کو اس کے قدم اپنے دل پر پڑتے محسوس ہوتے۔ وہ اس کی طرف لپکتا تو وہ نہال ہوجاتی۔ اس کا لمس اسے کئی جہانوں کی سیز کرادیتا۔

ان مصروفیات کی وجہ سے کبھی، عادل اس سے روٹھ جاتا۔ وہ گلہ کرتا کہ وہ اسے بالکل وقت نہیں دے رہی ہے۔ اور جب ایسا ہوتا تو وہ سب کچھ بھول کر اُس کے آگے پیچھے پھرنے لگتی۔ وہ تو تھی ہی محبتوں کی سفیر سب کا خیال رکھنے والی، کیا اپنے کیا پرائے!

پھر دو تین دن بیمار رہ کر میری ماں چل بسیں۔ بے چاری، خالی دامن لیے رخصت ہوگئیں۔ اپنے کسی بچے کی تو انھوں نے خوشی دیکھی ہی نہ تھی۔ مریم کے اور ان کے درمیان کبھی میرے بارے میں بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہیں، اس پر مریم کی شکر گزار رہیں۔ جب کہ مریم تو کسی کو اپنے سامنے شرم سار دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کے باپ کی تربیت تھی۔

دلاور کو اس سانحے کی اطلاع دے دی گئی!

* * *

میں نے کبھی ماں سے معافی بھی نہیں مانگی تھی۔ ماں، جو محبت کرنے والے خدا کی ایک جھلک کہلاتی ہے۔ محبت کا یہ حصہ تو سبھی کو ملتا ہے، تاکہ دنیا میں کوئی خود کو بدنصیب نہ کہے۔ لیکن مجھ سے میرا وہ حصہ بھی چھن گیا۔

میں پردیس میں تھا، اکیلا تھا.. اور ویسے ہی خاموش تھا کہ وہاں کی خوشیوں کو ٹھکرائے بیٹھا تھا۔ میں تو اپنے طور پر وہاں اپنے جرائم کی سزا کاٹ رہا تھا۔ وہ کالا پانی تھا میرے لیے۔

سو اس کالے پانی میں میرے لیے کوئی کندھا نہیں تھا کہ جس پر سر رکھ کر میں رولیتا۔ کوئی سینہ نہیں تھا جسے میں بھگو دیتا۔ میں اپنی تنہائی میں ماں کی تصویر چومتا رہا.. روتا رہا۔

گھر سے رقم منگانی تو کب سے روک دی تھی۔ ایک اسٹور میں جاب کرتا۔ عیاشیاں ترک کرنے کے بعد اخراجات کچھ بھی نہیں تھے۔ کھانے پینے کی اشیا وہاں سستی ہی ہوتی ہیں۔ جاب سے جو ملتا، وہ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ بچت بڑھتی رہی تھی میری۔

کئی دن میں سوچتا رہا... جاؤں کہ نہ جاؤں۔ ارادہ تو اب بھی وہی تھا، اور پکا تھا۔ لیکن ماں پکارتی۔ دیدار نہیں ملا، نہ سہی، اب ماں کی قبر پر مٹی تو ڈال دے آکر۔

آخر وہ پکار جیت گئی۔ ایک دن بے سوچے سمجھے میں نے واپسی کا ٹکٹ کرالیا۔

* * *

رفاہی ادارہ اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ اقصیٰ بھی اس کا ہاتھ بٹادیتی تھی۔ زندگی چین سے گزر رہی تھی کہ ایک دن پھر ہلچل مچل گئی۔

دلاور پھر آپہنچا تھا!

سبھی لوگ اُس سے ملے۔ سبھی نے اُس سے تعزیت کی۔ مگر مریم نہیں ملی۔ اور اس کا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

وہ بہت بدل گیا تھا۔ لوگ کہتے، نگاہ نیچی کرکے بات کرتا ہے۔ کبھی نظر اٹھاتا ہی نہیں۔ کم گو بھی ہوگیا ہے۔ لیکن مریم ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ ایک افسانہ نگار تو ہر شخص میں چھپا ہوتا ہے۔ ایک پَر تھما دو بس، تو اسے کوّا بنادیں۔

ہر روز وہ قبرستان جاتا۔ دیر تک ماں کی قبر کے پاس بیٹھا رہتا۔ سب دوستوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈیرے پر پھر محفلیں سجنے لگیں... مگر صرف دوستوں کی، صرف دوستوں کے لیے۔ وہ ان میں شریک نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن شجاعت صاحب نے اپنے ماموں زاد کی بیٹی سے اُس کی نسبت کی بات شروع کی تو وہ مرجھا گیا۔ ”نہیں ابا جی...“

”تو کہیں اور چاہتے ہو؟ دیکھو، گھر تو بسانا ہی ہوگا. تمہاری ماں کے بعد سونا ہوگیا ہے گھر۔“

”ابھی نہیں ابا جی... کہیں بھی نہیں۔ بس ماں کا غم تازہ ہے ابھی۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

لیکن بات صرف ماں کی نہیں، دل کی بھی تھی۔ مریم کے سِوا تو سب کھلونے تھے... دل بہلانے کے۔ اور گھر کی مالکن! یہ کونا تو خالی ہی رہے گا۔ جسم و جاں کے کچھ کونے مخصوص لوگوں کے نام ہوتے ہیں۔ یہ بات صرف وہی سمجھ سکتا تھا، کوئی اُور کیسے سمجھتا کہ جیسے وہ مریم کو چھونا چاہتا تھا، ویسے کسی اُور کو کیسے چھوسکتا ہے! وہ اپنے جسم کے ایک ایک ریشے سے اس پر فدا ہوجانا چاہتا تھا۔ وہ کہتی تو وہ اپنی آنکھیں نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیتا۔ وہ اشارہ کرتی تو وہ جاں ہتھیلی پر رکھ کر اسے پیش کردیتا۔ اور عادل میں کیا کمی تھی۔ اسے تو بہت لڑکیاں مل جاتیں۔ نہ تو مریم کے ملنے سے وہ کچھ اچھا ہُوا، اور نہ مریم کے نہ ملنے سے اس کا کچھ بگڑتا۔ مگر دلاور کو تو سنورنا ہی صرف مریم کے ہاتھوں سے تھا۔ اس نے بگاڑ تو دیکھ لیا... سنورنے کی گنجائش نہیں دیکھی۔ کبھی ٹٹولا ہی نہیں۔ اے ٹٹول کر دیکھا تو ہوتا۔ کچرے کے ڈھیر کے نیچے سے ملنے والے خزانوں کے سامنے تو دنیا کے خزانے ہیچ ہوتے ہیں۔

وہ بس آہ بھر کر رہ گیا۔ ”نہیں ابا جی... ابھی نہیں۔“

* * *

اب اقصیٰ کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ برات شہر سے آنا تھی۔ انتظامات بہت زیادہ تھے۔ ملازموں کی کمی نہیں تھی لیکن کام نمٹ ہی نہیں پارہے تھے۔ مریم کے ادارے کی سب لڑکیاں بھی ہاتھ بٹارہی تھیں۔ رات ہوتی تو سب ڈھولک لے کر بیٹھ جاتیں۔

تایا ابو نے اسے کسی کام سے بلوایا۔ وہ ان سے ملنے کے لیے نکلا تو مشترکہ صحن میں وہ سجی سنوری، ہنستی مسکراتی نظر آگئی۔ جب سے وہ آیا تھا، آج پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کون کہتا ہے... محبت بھول جاتی ہے... زخم سِل جاتے ہیں... داغ بھر جاتے ہیں... محبت تو محبت ہے۔ نارسا ہو تو دیمک بن جاتی ہے۔ اور وہ سودا ہی کیا جو دماغ سے نکل جائے۔

اس نے حیرت سے دیکھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی جاذب نظر تھی... اتنی ہی حسین... اتنی ہی بے نیاز... حد درجہ بے نیاز. اسے پہلی بار یہ ادراک ہُوا کہ اس کی تمام رسائیوں سے بڑی... بہت بڑی... وہی ایک نارسائی تھی!

* * *

مہندی کی شب میں کپڑے تبدیل کرنے اپنے کمرے میں آیا تو حیران رہ گیا۔ سجاد میرے بیڈ پر سویا ہُوا تھا۔ سجاد... میری مریم کے وجود کا ایک حصہ، اس کے دل کا ٹکڑا! جانے کون اُسے یہاں لِٹا گیا تھا، یا وہ خود ہی آ کر سو گیا تھا۔

مجھے لگا، میری دنیا بدل رہی ہے۔ نظر جھکا کر سینے میں دیکھا تو حیرت ہوئی۔ روشنی کا وہ نقطہ غائب تھا۔ وہاں تو پورا سینہ ہی جگمگا رہا تھا۔ ایسی روشنی کہ آنکھیں چُندھیا جائیں۔ سینے میں محبت کی روشنی کا پورا سمندر موجیں مار رہا تھا۔

میں نے کسی چھوٹے بچے کو کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ اتنے نازک ہوتے ہیں بچے... اور میں سخت پتھر جیسا۔ ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن دل تھا کہ کسی طرح مان ہی نہیں رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بہت نزاکت سے اٹھایا اور نرمی سے اسے بازوؤں میں بھر کر خوب پیار کیا۔ سوتے میں بچے اور خوب صورت ہو جاتے ہیں۔ وہ میرے بوسوں سے کسمسایا۔ مگر نیند گہری تھی۔ سوتا ہی رہا۔ اس کی نیند کی وجہ میرے کمرے کا گہرا سکون تھا جو گھر میں قدرے ہٹ کر تھا۔

میرا وجود سجاد کے لمس سے قطرہ قطرہ پگھلنے لگا۔ کمرا لاک کرکے، اسے اپنے سینے پر لِٹا کر میں گاؤ تکیے پر سر ٹکا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ ایسی خوشی تھی کہ جس نے نارسائی کے ہر احساس کو مٹادیا تھا۔ اب مجھے کیا چاہیے تھا۔ پھول نہیں ملا، خوش بو تو مل گئی۔ چاند نہیں ملا، چاندنی تو مل گئی۔ کتنے لمحے گزر گئے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میرے اِردگرد تو مریم کی مہک کی سمفنی بج رہی تھی۔ اور میں مدہوش سا مدہوش تھا۔

پھر اچانک مجھے وائبریشن کا احساس ہُوا۔ میں چونکا۔ سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ کال تو ختم ہوچکی تھی۔ اسکرین پر گیارہ مس کالز چمک رہی تھیں۔ چیک کِیا تو حیران رہ گیا۔ سب کی سب مریم کی تھیں۔ یہ... یہ... کیا...؟! ابھی میں سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ شاخِ ثمر بار کو بستر پر لِٹا کر میں اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔

سامنے سوجی ہوئی لال سرخ آنکھیں لیے مریم کھڑی

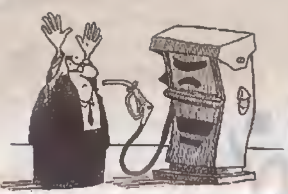

تھی۔ ”سجاد تمہارے پاس ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، ہے۔“

”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔“ وہ مجھ پر جھپٹی۔ میرے چہرے پر کئی خراشیں پڑ گئیں۔

”ہوا کیا ہے؟“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

”تم نے سوچا، سجاد کے بدلے مجھے حاصل کرلو گے۔ ہے نا؟ تو غلط سوچا۔“ اب میرے بال اس کی مٹھیوں میں تھے... وہ مجھے بولنے کا موقع بھی نہیں دے رہی تھی۔ اور میں بولتا بھی کیا۔ میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آرہا تھا۔

”میں تم سے رحم مانگنے نہیں آئی سجاد کے لیے۔ یاد رکھو، مریم تمہارے لیے شجرِ ممنوعہ ہے اور رہے گی۔ تم کچھ بھی کرلو۔“ اب بات سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں! کہاں تک سُنوں گا!

”تم تو اپنی ماں کے سامنے بھی شرم سار نہیں ہوئے تھے، اب کیا ہوگے۔ نام کے دلاور ہو۔ چھپ چھپ کر وار کرتے ہو۔ اور کتنے وار کرو گے!“ اس نے بال چھوڑے، گریبان تھاما اور میری قمیص چیر کر رکھ دی۔ دل اور روح پر کہاں کہاں چرکے لگے تھے، کون جانتا... کون دیکھتا!

”مریم، تم نے جو کہا، سچ کہا۔ تم بھلا غلط ہوسکتی ہو...“ میں نے محبت اور عاجزی سے کہا۔ ”چلو، تم میرے پاس آئیں تو۔ مجھے چھوا تو، چاہے مُنہ نوچنے کے لیے ہی سہی۔ گریباں تار کِیا۔ مگر اب وہاں سینہ کہاں... وہاں تو کرچیاں ہی کرچیاں ہیں۔ تم تو آنکھوں والی ہو۔ دیکھ سکتی ہو۔ تمہیں میری آنکھوں میں ہوس تو نظر آگئی تھی دو سال پہلے... اب کی بار محبت نظر نہیں آئی... کوئی پاکیزگی نظر نہیں آئی... ہاں، تم ہمیشہ کی طرح ٹھیک ہو۔“ لہجے میں محبت اور عاجزی کے بیچ دیوانگی داخل ہوئی تو میری آواز بلند ہوگئی۔

سجاد ڈر کر اٹھ بیٹھا اور گھبرا کر رونے لگا۔

لیکن مریم نے اسے نہیں اٹھایا۔ ایک پل... بس ایک پل اس نے میرے خراشوں سے سجے چہرے کو، اور ایک پل میری تار تار قمیص کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

* * *

عادل اسے اپنے برآمدے میں ملا۔

"کہاں تھیں تم؟ تمہارا سیل فون بھی بیڈ روم میں ہے۔"

وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔

"فضل بابا ملا تمہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ اپنے کوارٹر میں سورہا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سجاد شور سے گھبرا رہا تھا، سو نہیں پارہا تھا۔ اور تم اقصیٰ کے ساتھ تھیں۔ تو اس نے سجاد کو دلاور کے کمرے میں سُلادیا تھا۔"

وہ کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہوش و حواس جواب دے گئے۔

وہ وہیں ڈھے گئی۔

* * *

کتنے اعزاز ملے... کتنے تمغے سج گئے میرے وجود پر۔ یہ خراشیں تو نہیں، اُس کی انگلیاں، اُس کی ہتھیلیاں ہیں... میرے دُکھتے ہوئے سر پر... کھنچے ہوئے بالوں پر... میرے سینے پر اس کے مکّے... ارے، کوئی ایسے بھی مالا مال ہوتا ہے... اتنی شدتوں کے ساتھ!

میری پھٹی کی قمیص میرے لیے خزانہ تھی۔ کبھی میں اسے مُنہ پر رکھ لیتا، کبھی گولا سا بنا کر سینے پر رکھ لیتا۔ کبھی میں ہنس دیتا... اپنے اعزاز پر۔ کبھی میں رو دیتا اپنی تذلیل پر۔ اور اُس کی باتیں، اُس کے طعنے، اُس کے لہجے کی نفرت، حقارت...

مجھے محبت کرنی بھی نہیں آئی تھی، اور نفرت بھی نہیں کرسکا تھا۔ میں ہوس میں بھی ہارا، عشق میں بھی ذلیل ہُوا۔ در و دیوار بھی مجھ پر ہنستے تھے۔ آئینہ میرا مذاق اُڑاتا تھا۔ میں اپنے قدموں میں بکھرا ہُوا تھا... ہزاروں کرچیوں کی صورت... ارے میں شیشہ تو نہیں تھا۔

فضل بابا آیا... نہ جانے کیا کرنے آیا۔ میرے وصل کی پونجی... میرے سجاد کو چُرانے آیا تھا۔ میرے اتنے ارفع پل، جو سجاد کے ساتھ گزرے تھے، وہ چُرانے آیا تھا۔ 'میرا کیا کیا چُراؤ گے تم لوگ؟ کیا کیا...؟' میں نے میز اُلٹ دی۔ درازیں پلٹ دیں۔ پھر ہوش و حواس میں جو آخری چہرہ میں نے دیکھا، وہ تایا ابو کا تھا۔

* * *

اس حویلی کو خوشیاں راس کیوں نہیں آتیں۔ سب لوگ اُداس تھے۔ اقصیٰ کی رخصتی ہوگئی تھی۔ مریم ٹھیک تھی مگر چپ چاپ۔ اور دلاور اسپتال میں تھا۔ جب بھی ہوش میں آتا تو چیخ پکار شروع کردیتا کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا ہوا۔ فضل بابا کو کچھ کچھ اندازہ تھا۔ مگر مالکوں کے معاملات میں نوکر کب زبان کھولتے ہیں۔ یہ تو گستاخی ہوتی۔ البتہ اسے دلاور سے ہم دردی تھی۔

اور مریم چپ تھی۔ وہ سوچتی، میں لبالب بھری ہوں عادل کی محبت میں... اس کی سنگت میں۔ جو میرے پاس آئے گا، وہ خود ہی چھلکے گا... اپنے کناروں سے بہے گا۔ وہ جس نے میرے عادل کو چھڑی کا محتاج بنایا... جس نے سجاد... میری زندگی کو مجھ سے جدا کیا۔ وہ نفرت سے سوچتی اور آئندہ کے لائحۂ عمل کے بارے میں غور کرتی...

* * *

"تایا ابو، اگر آپ خوشی سے اجازت دیں تو ہم مستقل طور پر شہر شفٹ ہوجائیں۔" وہ ان کے کندھے سے جھول گئی۔ یہ بات منوانے کا اس کا پرانا انداز تھا۔

"نہیں پُتری، ابھی نہیں۔ ابھی کون سی سجاد کی پڑھنے کی عمر آئی ہے۔ پھر دلاور کی بھی فکر ہے۔ اقصیٰ بھی رخصت ہوگئی۔ زوہیب ہاسٹل میں رہتا ہے۔ اور تمہارا باپ... وہ تو کتاب کا کیڑا ہے، کتابوں میں جیتا ہے۔ ہم نے بھی تو جینا ہے نا۔ میرا نہیں تو اپنی تائی امی کی تنہائی کا خیال کرو۔"

وہ بے دلی سے اٹھ کر وسیع لان میں آگئی۔

کتنے رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے۔ ہر سُو بہار تھی۔ مگر دل خزاں کے پتّے کی طرح لرزتا رہتا تھا۔ کہنے کو تو اس رات کی آزمائش میں وہ سجاد سے دست بردار ہوگئی تھی۔ 'لیکن اگر دلاور سجاد کو...' اس کے بعد وہ سوچ نہ پائی اور بے تابی سے سجاد کو خود میں سمیٹ لیا... اس کا روم روم چوم لیا۔ اللہ مجھے بادل بنادے، میں جی بھر کر سجاد پر برس جاؤں۔ مجھے گُلستاں کردے، میں پتی پتی ہوکر اس پر نچھاور ہوجاؤں۔ مجھے گھنی چھاؤں بنادے کہ میں سجاد پر دھوپ نہ آنے دوں... اللہ میرے اللہ... سجاد... میرا سجاد اس کے اندر بس یہی دو نام ردھم بن گئے تھے

* * *

شجاعت صاحب کا بہت برا حال تھا۔ بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اب جوان گبرو بیٹا دیوانگی کے عالم میں مینٹل ہاسپٹل میں پڑا تھا۔ نوجوانی میں اُن سے بڑی لغزشیں ہوئی تھیں۔ کس سے نہیں ہوتیں۔ مگر انہوں نے اپنے خاندان اور اپنے گاؤں کی عزت کا ہمیشہ پاس رکھا تھا۔ اس لیے تو تینوں بھائیوں کی دُور دُور تک دھاک تھی۔ عزت شرافت ان کی شان تھی۔ وہ گڑگڑا کر اللہ سے بیٹے کی صحت اور سلامتی کے لیے دعائیں کرتے۔ لیکن شاید دعا کے لیے اٹھنے والے ہاتھوں کو دیر ہوگئی تھی۔ شاید وقت نکل گیا تھا۔

* * *

سات ماہ بعد دلاور کہیں نارمل ہُوا۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ بہتری بس ظاہری ہے۔ اندر تو بس ایک ہی منظر چلتا رہتا تھا... سجاد کے ننھے منے وجود کا الوہی لمس... شاید وہ اس کے لیے عبادت تھا۔ پھر اگلا منظر، مریم کی آمد... اور اس کے بعد... وہ سب کچھ اس کے ذہن میں بار بار ری وائنڈ ہوتا اور بار بار پلے ہوتا۔ وہ تڑپتا، بے حال ہوتا۔ کبھی حظ اٹھاتا تو کبھی نڈھال ہوتا... اور کبھی مخمور ہوجاتا۔ چاک گریباں والی قمیص کبھی اس کے پہلو سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ بال وہ سنوارتا ہی نہیں تھا کہ کہیں لمس نہ مٹ جائیں۔ چہرے کی خراشوں پر کم از کم ہوش میں تو وہ مرہم لگواتا ہی نہ تھا۔ اور جب ہوش میں ہوتا تو مرہم کو یوں ہٹاتا کہ خراشیں پھر سے تازہ ہوجاتیں۔

* * *

"تم میں کتنی شدت آگئی ہے موسو" عادل حیران ہوکر اٹھ بیٹھا۔ "تم تو شبنم تھیں"

مریم کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"اور اب؟"

"اب تم آبشار ہو... تُندو تیز آبشار۔ بہا کر لے جاتی ہو مجھے۔ ایسا تو اوائل کی راتوں میں بھی کبھی نہیں ہوتا تھا۔"

"تو تمھیں برا لگتا ہے؟"

عادل سوچتا رہا۔ "برا تو نہیں لگتا۔ لیکن اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ تم کسی سے خائف ہو... کیوں... کچھ تو ہے جو میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

مگر مریم نہ کچھ سُن رہی تھی، نہ سمجھ رہی تھی۔ اس کی دیوانگی عروج پر تھی۔ وہ اسیرِ محبت تھی تو عادل اسیرِ قربت۔ وہ کہاں تک ضبط کرتا، کہاں تک ہوش سے کام لیتا۔

آبشار اور بادل باہم ایک ہوگئے تھے!

* * *

"ابا جان، مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔" دلاور نے کہا۔

اور شجاعت جیسے پھر سے جی اٹھے۔

"کتنے میری جان؟" بیٹے نے کتنی مدت بعد انہیں پکارا تھا۔ وہ جان بھی مانگ لیتا تو کم تھا۔ اپنے پیاروں کو کسی لاش کی

صورت' ہوش و حواس سے بیگانہ دیکھنا' جیتے جی مرجانے کے برابر ہوتا ہے... اور وہ بھی اکلوتا بیٹا!

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" دلاور نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

ابا جان نے بغیر گنے' نوٹوں کی بہت بھاری گڈی اس کی جیب میں ڈال دی۔

* * *

وہ دو دن میرے لیے بہت سخت تھے۔ مجھے خود کو نارمل ثابت کرنا تھا۔ اس کے لیے سب کچھ بھول جانا، کچھ یاد نہ کرنا ضروری تھا... اور یہ ایسا تھا جیسے سانس روک لینا۔ لیکن مقصد بڑا ہو تو آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔

تیسرے دن موقع پا کر میں ہاسپٹل سے نکل آیا۔ ذہن میں سب کچھ واضح تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، کب کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔

بازار جا کر سوٹ لیا، اور وہ بھی ڈُلھا والا۔ بال ترشوائے، شیو بنوایا، ایک ہوٹل میں کمرا لیا۔ وہاں جی بھر کے نہایا۔ سوٹ پہن کر باہر نکلا اور دوبارہ بازار گیا۔ اس بار دُلھنوں کی ورائٹی نکلوائی۔ جو کچھ بھی مریم کے قابل لگا، بغیر بھاؤ تاؤ کے خرید لیا۔ پھولوں کے زیور اور نازک چوڑیاں اس کی کلائی میں کتنی بجتی تھیں، اور گھنگھرو اس کے پیروں میں۔

سب کچھ لے کر ٹیکسی میں بیٹھا اور دو گھنٹے میں گاؤں پہنچ گیا۔

رات گہری ہو چلی تھی۔ گاؤں میں تو راتیں ویسے بھی گہری نیند سوتی ہیں۔ میرا کمرا لاک تھا۔ مخصوص اوزار سے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ وہاں سے کلوروفارم لے کر نکلا اور عادل کے کمرے کی طرف گیا۔ اسی انداز میں اس کا دروازہ بھی کھولا اور اندر چلا گیا۔

وہ نائٹی میں تھی اور عادل کے ساتھ سو رہی تھی۔ وصل کے بعد کی نیند تو بہت ہی گہری ہوتی ہے۔ اس منظر پر حسرت نے کتنی آہ و بکا کی۔ پھر میں نے عادل کو بے ہوش کیا اور آخری بار سجاد کو چوما۔ پھر مریم کو کسی گڑیا کی طرح اپنے مضبوط ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ ایک ہاتھ مُنہ پر جما دیا تا کہ وہ چیخ نہ سکے۔

وہ جاگ گئی۔ کتنا ڈر، کتنا نشہ بھرا ہوا تھا وصل کا اس کی آنکھوں میں۔ میرے اندر پھر کچھ ماتم سا ہُوا۔ لیکن فرصت کہاں تھی۔ وہ بے کار ہاتھ پاؤں چلاتی رہی۔ اسے اپنے کمرے میں لے جا کر میں نے پردے برابر کیے۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر اُس کے مُنہ پر ٹیپ لگا دیا۔ "آج تمھیں بولنا نہیں ہے۔ بس سننا ہی سننا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں خوف سے زیادہ حیرت تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آج تو اسے باتیں ہی انوکھی سننی ہیں۔

* * *

آنکھ ایک غیر معمولی احساس کے تحت کھلی... پر آنکھ کھلی تو مریم نے دیکھا کہ وہ تو غیر معمولی سے بھی آگے کی سچویشن ہے۔ نائٹ بلب کی روشنی میں بھی اس کا چہرہ واضح تھا۔ اور وہ اُس کے ہاتھوں پر تھی۔ اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن اُس کا ہاتھ مُنہ پر جما تھا۔

مریم نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ اس پر وحشت نہیں تھی، سکون ہی سکون تھا۔ اس نے گھبرا کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ عادل اور سجاد دونوں ہی خیریت سے تھے اور گہری نیند سو رہے تھے۔

وہ اسے لے کر دروازے کی طرف چلا تو اس نے ہاتھ پاؤں چلائے۔ پہلی بار اسے اندازہ ہُوا کہ وہ کتنا طاقت ور ہے۔ پہلی بار اسے اپنی وہ جرأت مندی حماقت لگی جب عادل کے حادثے کے بعد وہ دندناتی ہوئی اُس کے ڈیرے پر پہنچ گئی تھی۔ اگر اُس دن وہ اپنی اس طاقت کا مظاہرہ کرتا تو... ؟ اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکی۔ اس کے اندر تشکر ابھرا۔ دلاور نے ایسا کِیا بھی نہیں تھا۔

لیکن اب کیا ہو رہا ہے... کیا ہونے والا ہے؟

دلاور نے اسے بیڈ پر بٹھایا اور مُنہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ "آج مجھے تمھارے چیخنے کا ڈر نہیں ہے۔ بس میں چاہتا نہیں ہوں کہ تم کچھ بولو۔ آج تمھیں صرف سننا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی طرف گیا اور پردے برابر کردیے۔

مریم کے ہاتھ کھلے تھے اور پاؤں بھی۔ مگر نہ تو اس نے ٹیپ نوچا اور نہ ہی دروازے کی طرف لپکی۔ عورت کے دل میں ایک انٹینا ہوتا ہے جو کبھی غلط سِگنل نہیں دیتا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اس کی عزت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

وہ واپس آکر اُس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ وہ بدن چُرانے لگی۔ اس کی نائٹی بہت مختصر تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ وہ خود بھی اُس سے نظریں چُرا رہا تھا۔ اُس نے اس کے سامنے لباس ڈال دیا۔ "مومو... جائو' یہ لباس پہن کر آئو۔ بہت جلدی۔"

وہ دُلھنوں والا جوڑا تھا۔ لیکن اُس کے سامنے اس نائٹی میں آنے سے بچنے کے لیے تو وہ کچھ بھی پہن سکتی تھی۔ وہ کپڑے لے کر ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی۔

دل کے سِگنل تو اب بھی پہلے جیسے ہی تھے لیکن عروسی جوڑا پہن کر وہ اندیشوں کا شکار ہونے لگی۔ ایک پل کو اُس نے سوچا کہ ٹیپ اُکھاڑے اور شور مچادے۔ مگر پھر سوچا، تماشا بننے کا کیا فائدہ۔ البتہ ضرورت پڑنے پر یہ بھی کِیا جاسکتا ہے۔

وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ قدِ آدم آئینے میں اس نے دیکھا، وہ کام دار لہنگا اس پر بہت سج رہا تھا۔

"آئو... بیٹھو" دلاور نے کہا۔

وہ بیٹھ گئی۔ وہ بڑی چاہت سے اسے پھولوں کے زیور پہنانے لگا۔ وہ خوف زدہ تھی۔

* * *

میں نے اسے پھولوں کا زیور پہنایا۔ ان کانوں نے کبھی میری مدھ بھری سرگوشیاں نہیں سُنی تھیں، کبھی میری آہ و بکا بھی نہیں سنی تھی، جنھیں میں پھولوں کے آویزے پہنا رہا تھا۔ پھر میں نے اسے چوڑیاں پہنائیں اور بیٹھا دیکھا کیا۔ "بات نہیں بنتی..." میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دُلھن تو مجھے مکمل ہی چاہیے۔" میں نے اس کے ہونٹوں پر سے ٹیپ ہٹا دیا۔ "لیکن تم یہی سمجھنا کہ ٹیپ موجود ہے۔" پھر میں نے اس کے ہونٹوں پر خود ہی لپ اسٹک لگائی۔

اب وہ مکمل تھی۔ میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ میں اسے جتنا دیکھنا چاہتا تھا، اس کے لیے ایک عمر بھی کم تھی۔

مگر پھر مجھے ایک خیال نے چونکا دیا۔ میں پھر خود غرض بن رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "سجاد رات کو دودھ کے لیے اٹھتا ہے؟"

* * *

مریم اُس کی بات سُن کر چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ یہ اس کے لیے اچھا موقع تھا۔ دلاور نے جس انداز میں اس سے یہ بات پوچھی تھی، اس سے پتا چلتا تھا کہ یہ اس کے لیے نجات کا راستہ ہے۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ اُسے اثبات میں جواب دے گی تو شاید وہ اُسے چھوڑ دے گا۔ لیکن اسے یہ احساس بھی ہوگیا کہ اس ساعت میں جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہوگا۔ اس کے سینے میں موجود عورت کا دل اسے یقین دلا رہا تھا کہ اسے کوئی ضرر نہیں پہنچنے والا ہے۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ سچائی کی رات ہے۔

وہ جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

مریم نے نفی میں سر ہلادیا۔

اس کی حیرت دیدنی تھی!

* * *

میں حیران بھی ہُوا اور شکر گزار بھی۔ میں نے تو اسے جھوٹ بولنے کی دعوت دی تھی۔ مگر وہ سدا کی سچی تھی۔

"تو میں تمھیں اور دیر تک دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے خوشی سے کہا۔

اس نے سر جھکا لیا۔

"مریم، میں تمھارے ساتھ جی نہیں سکا... مر تو سکتا ہوں نا۔" میں نے کہا۔

اس کی خوف زدہ نظریں اور خوف زدہ ہوگئیں۔

"تمھیں اس روپ میں دیکھ لیا، حسرت پوری ہوگئی۔ تم معتبر ہی رہو گی۔ تمھاری پاکیزگی اور حرمت پر میں آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں تمھیں اپنے نفس کی تسکین کے لیے یہاں نہیں لایا..."

مریم نے چونک کر ٹٹولتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ اب اس کی نگاہوں میں کھلا تشکر تھا۔

''... میں دل کی رانی بنا کر لایا ہوں تمہیں۔'' میں کہتا رہا۔ اس کے تشکر نے کچھ تلافی تو کر دی تھی۔ ''میں تو تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا تھا۔ اسی کا دکھ مجھے کھینچ لایا... دوبارہ۔ واپس آ کر میں تمہاری راہ کا پتھر تو نہیں بنا تھا کبھی۔ تم نے پھر بھی میرے پہلے تاثر کو آخری تاثر بنائے رکھا۔ تم نے معاف ہی نہیں کیا مجھے...''

اب وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔

''کبھی سوچا تم نے کہ میں نے تمہارے لیے کیا کیا کیا... کبھی ایک... صرف ایک لمحہ بھی تم میرے لیے سوچ لیتیں تو شاید آج میں ایک اچھا انسان ہوتا۔ اللہ نے تمہارے وجود میں میرے لیے ہدایت اور نیکی بھیجی تھی۔ مگر تم نے بخل کیا۔ وہ ہدایت، وہ روشنی تم نے مجھ پر خرچ ہی نہیں کی۔ مجھے اصلاح کا موقع ہی نہیں دیا۔ یہ زہر دیکھ رہی ہو... اور میں نے کہا نا کہ ہم ساتھ جی نہیں سکتے، لیکن مر تو سکتے ہیں نا ساتھ...''

اس کے ہونٹ لرزے۔ وہ کچھ کہنے والی تھی۔

مگر میں نے اسے بولنے نہیں دیا۔ ''تم مت بولنا۔ سمجھ لو، تمہارے ہونٹوں پر ٹیپ لگی ہے۔ تمہیں بولنا نہیں ہے، صرف سننا ہے۔ تم نے تو میرے ساتھ بخل کیا۔ لیکن سجاد نے... تمہارے بیٹے نے لمحوں میں مجھے انسان بنا دیا۔ آج یہ زہر ہم دونوں نے پینا تھا۔ لیکن جاؤ، تمہیں سجاد کی خاطر معاف کیا... ایک موقع دے رہا ہوں کہ زندگی میں کبھی کوئی دلاور جیسا مل جائے تو اسے سنوار دینا... دھتکار مت دینا...''

بس اس سے آگے میں کیا بولتا۔ اس کے بعد تو میں زار زار رویا۔ کبھی اسے نہ دیکھنے پر رویا کرتا تھا... اور آج دیکھ کر بھی رو رہا تھا۔

مریم نے ہاتھ باندھے' معافی کے لیے...

میں نے تڑپ کر جدا کر دیے۔ ''بادشاہ لوگ تو کرم کرتے ہیں' ظلم کرتے ہیں' کمال کرتے ہیں۔ معافی تو زیب نہیں دیتی انہیں۔ یہ تو ہم جیسوں کا وصف ہے... ضبط کرنا، ظلم سہنا، بادشاہوں کے کسی کمال کا منتظر رہنا... اور پھر ناکردہ گناہوں کی بھی معافی مانگ لینا۔ تم تو میری بادشاہ ہو مومو۔''

میں پھر ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا... دیکھتا رہا۔

پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا اور اسے سرتاپا دیکھا... الوداعی نگاہ! پھر میں آگے بڑھا... بڑھتے بڑھتے رُکا... پنجوں کے بل گھوما، اور زہر کی شیشی کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ اگلے ہی لمحے سریع الاثر زہر میرے حلق سے اُتر رہا تھا۔

وہ میرے قدموں میں آ گری۔ میں لڑکھڑایا... سنبھلنے کی کوشش کی، جان نکل رہی تھی۔ قدموں میں سہار نہیں تھی۔ میں بھی گر گیا۔ آخری دید کے لیے میں نے آئینے میں دیکھا۔ پتا نہیں، آئینہ دُھندلا رہا تھا یا میری آنکھیں۔ مگر آخری دید تو آخری تھی۔ وہ کیسا انوکھا منظر تھا۔ ایک مُردہ دُلہا کے قدموں میں گری ہوئی دُلھن کتنی خوب صورت لگ رہی تھی...

* * *

مریم نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن وہ مر چکا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے اُس کی کھلی ہوئی آنکھوں کو بند کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

دلاور نے اس کی عزت، اس کی پاکیزگی اور حرمت کا... اس کے اعتبار کا بھرم رکھ لیا تھا۔ لیکن اب باقی کام اسے کرنا تھا۔ وہ جھکی اور اس نے دلاور کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے۔ وہ ایک طویل بوسہ تھا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اپنی نائٹی تھی۔

اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ اپنے کمرے میں گئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے سجاد کے پورے چہرے کو بوسوں سے بھگو دیا۔ وہ بوسے اس کے نہیں تھے۔ وہ تو بس اسے دلاور کی امانت پہنچا رہی تھی۔

پھر اس نے عروسی لباس اتار کر اپنی نائٹی پہن لی۔ عروسی لباس اس نے پھولوں کے زیور کے ساتھ اپنی الماری کے سیف میں رکھ دیا۔ اب یہ سیف محبت سے مہکتا رہے گا۔

الماری بند کر کے وہ بستر پر عادل کے پہلو میں لیٹ گئی۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں سے دُور تھی۔ ایسے میں کوئی سو سکتا ہے بھلا۔ آنکھوں میں تو مرنے والے کی دید تھی... پھر آنسو بھی اُمڈ آئے۔

صبح ہونے والی تھی!